



ابتدائیہ

متفرق کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی، پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر ماہنامہ 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

معروف انتخاب

سلسلے وار ناول

مستقل سلسلے

خط وکتابت کا پتا: ماہنامہ افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبر 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 برائے مطبوعات: ماہنامہ افق ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

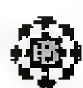
یہ وطن تمہارا بھی تو ہے......؟

کراچی کے حساس علاقوں میں شرپسندوں کے خلاف آپریشن کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔ وزیراعظم پاکستان کراچی میں امن و امان کے خواہش مند ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کراچی کے حالات سے پورا ملک متاثر ہوتا ہے۔ کراچی ملکی معیشت کی شہ رگ ہے اس لیے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ان شرپسند عناصر سے سختی سے نمٹنا چاہیے۔ شرپسند عناصر کراچی میں لسانی، مذہبی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر تصادم کی آگ بھڑکانا چاہتے ہیں۔ اس سے جہاں کراچی کے حالات خراب ہورہے ہیں وہیں ملکی معیشت پر بھی برے اثرات مرتب ہورہے ہیں۔ ویسے بھی یہ تو حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ ملک میں اور اس کے ہر شہر و قریہ میں امن و امان اور ہر قسم کے جرائم کی روک تھام کرے۔ اگر پولیس، عدلیہ اور انتظامیہ مل کر دیانت داری، سچائی اور اخلاص کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں پوری ایمانداری سے ادا کریں تو کوئی کام مشکل یا ناممکن نہیں۔ پولیس ایسے ہنگامی حالات میں کمر تو کس لیتی ہے لیکن جرائم کی بیخ کنی کے لیے نہیں بلکہ ان بڑھتے ہوئے جرائم کو اور ہوا دینے کے لیے کیونکہ جب ہنگامے اور بدامنی بڑھتی ہے تو پولیس گناہ گاروں اور مجرموں کو پکڑنے کے بجائے جو ہاتھ آئے بے گناہ، معصوم تماش بینوں یا پہلے سے ان کی لسٹ پر موجود اسامی پر ہاتھ ڈالتی ہے تاکہ ان تلوں سے زیادہ سے زیادہ تیل نکالا جاسکے۔ کیونکہ پولیس کا کام آپ کی مدد کرنا نہیں اپنی مدد آپ کرنا ہے۔ اس اصولوں پر پولیس منظم طور پر اپنے فرائض انجام دیتی ہے۔ جرائم پیشہ شرپسند افراد بھی تو آخر اس معاشرے کے فرد ہوتے ہیں اور وہ بے چارے تو خود اپنی کارکردگی کا بہتر مظاہرہ کرنے کے لیے پولیس سے بھرپور معاونت اور مدد کا اظہار کرتے ہیں۔ پولیس کے ہاتھ کو وہ اس طرح بھر دیتے ہیں کہ ان پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ہاتھ خالی رکھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ بس عوام بے چارے ملک و قوم کی سلامتی و بقا کی خاطر قربانی پہ قربانی دیے جارہے ہیں۔ دہشت گردوں کو سوچنا سمجھنا چاہیے کہ یہ وطن ان کا بھی ہے۔ خوف کی فضا کراچی پر ہی نہیں چھائی ہوئی پورا ملک ہی خوف زدگی کا شکار ہے۔ سوات، مالاکنڈ، دیر، بونیر، پشاور، وزیرستان، اسلام آباد، لاہور کون سا شہر کون سی جگہ ایسی ہے جہاں کے لوگ بے خوفی، امن، چین سے رہ رہے ہوں۔ ہر جگہ ہر روز کوئی نہ کوئی حادثہ کوئی نہ کوئی واقعہ رونما

ہو جاتا ہے۔ دہشت گرد اپنی کارروائیاں کر رہے ہیں اور فوج اور انتظامی ادارے اپنی کارروائی کر رہے ہیں۔ کتنے بے گناہ ان دہشت گردوں کے حوالے سے لقمہ اجل بن رہے ہیں۔ وطن عزیز کی کتنی بڑی آبادی دربدر ہو چکی ہے۔ دہشت گرد جو اسلام کی نیک نامی پر سیاہی مل رہے ہیں اسلام کو بدنام کر رہے ہیں صرف اس لیے کہ ان کی من پسند شریعت کا نفاذ کیوں نہیں ہو رہا۔

داعی برحق نبی مکرم حضرت محمد مصطفی ﷺ نے نہ ان کے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے نہ ان کے بعد آنے والوں نے کبھی شمشیر کے زور پر طاقت کے زور پر اسلام کی تبلیغ کی نہ اسلام یا اسلامی شریعت نافذ کرنے کی کوشش کی نہ ہی کسی کو جبریہ مسلمان بنایا گیا۔ دین تو خوف الٰہی سے جنم لیتا ہے چاہے وہ اسلام ہو یا کوئی اور مذہب۔ اسے اختیار کرنے اس پر عمل پیرا رہنے کے لیے دو کیفیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلی خوف دوسری شوق۔ انسانی فطرت ہے کہ حالت خوف میں ہی اسے اللہ یاد آتا ہے۔ مسلمان ایک اللہ کی اور غیر مسلم مشرک و کافر اللہ کے ہی حوالوں سے اپنے اپنے معبودوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کسی بندوق یا توپ کا خوف اسے اللہ کی طرف نہیں موڑتا نہ ہی اسلام کسی بھی طرح کسی دنیاوی خوف سے پھیلا پھولا ہے۔ اسلام تو اللہ کے خوف سے آخرت کے خوف سے بغیر کسی انسانی خوف کے پھیلا ہے۔ اسلام میں جبر کا کوئی دخل نہیں ہے۔

دہشت گرد جس شریعت کے نام پر جس دین الٰہی کے نام پر اپنے اسلحہ کے زور پر وطن عزیز کے تمام مسلمانوں کا جینا دوبھر کر رہے ہیں وہ ان کا دین الٰہی تو ہو سکتا ہے دین اسلام نہیں۔ یہ اسلام کو بدنام و رسوا کرنے کی کوئی بیرونی غیر مسلموں کی سازش ہو سکتی ہے جس میں نا سمجھ اور شدت پسند مزاج کے لوگ ان کے آلہ کار بن کر نہ صرف اپنی عاقبت خراب کر رہے ہیں بلکہ ملک کا چین و سکون اور امن و امان بھی غارت کر رہے ہیں۔ اللہ تمام شر پسند دہشت گردوں اور وطن دشمن اسلام دشمن قوتوں کو نیک توفیق دے۔ ان کے دلوں کو اللہ اپنی جانب پھیر لے اور ان کے دلوں میں صحیح اسلام سے محبت وطن سے محبت جو اسلام کے نام پر بنا ہے جس میں مسلمانوں کی بڑی کثیر تعداد رہتی بستی ہے عطا فرمائے اور ملک میں امن چین سکون اور دین حق کا بول بالا فرمائے آمین۔



گفتگو

عمران احمد

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جس نے اللہ ہی کے لیے کسی سے محبت کی اور اللہ ہی کے لیے دشمنی رکھی اور اللہ ہی کے لیے دیا (جس کسی کو کچھ دیا) اور اللہ ہی کے لیے منع کیا اور نہ دیا تو اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی۔" (ابوداؤد)

عزیزان محترم ..... سلامت باشد!

جون کا شمارہ حاضر مطالعہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ جون کی کڑکتی گرمی میں آپ کے ذہن و دل کی تسکین کا باعث بنے گا اور اس کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ گرمی کی شدت کو کچھ لمحوں کے لیے فراموش کر دیں گے۔ موسم کے ساتھ ساتھ بجٹ کی گرمی بھی آپ کے دماغ کو تپا دینے کی تیاری میں مصروف ہے۔ ایک بار پھر ہمارے موجودہ وزیر خزانہ ماضی کے اپنے ہم منصبوں کی طرح یہ بیان دینے کو تیار ہیں کہ بڑھتے ہوئے ٹیکس اور آٹا دال چینی دودھ اور دیگر اشیا صرف کی قیمتوں میں اضافے سے عام آدمی متاثر نہیں ہوگا لیکن حسب سابق وہ اس عام آدمی کا پتا نہیں بتائیں گے کہ وہ عام آدمی رہتا اور ملتا کہاں ہے، جو مہنگائی، گیس و بجلی کی لوڈشیڈنگ سے بھی متاثر نہیں ہوتا۔ ہمارے خیال میں وہ عام آدمی ایوان صدر، ایوان وزیر اعظم میں رہتا ہوگا کیونکہ انہیں تو نہ تو خریدنا پڑتا ہے نہ ہی تیل اور گوشت یہ سب کچھ تو انہیں بیت المال سے ہی فراہم ہو جاتا ہے۔ خریداری کے لیے تو صرف نچلا طبقہ اور مڈل اور لوئر مڈل کلاس کے امیر کبیر لوگ ہی بازار جاتے ہیں اور بلاوجہ روتے دھوتے ہیں حالانکہ انہیں غریب و مسکین حکمران طبقے کے لیے قربانی دینا چاہیے جن کو قوم کی خدمت کے باعث لگنے والی بیماریوں کے علاج کے لیے بھی بیرون ملک جانے کی زحمت اٹھانا پڑتی ہے۔ سو قارئین تیار ہو جائیں آپ کو اس مہنگائی کے سونامی کا استقبال کرنا ہے جس کے اثرات دن بدن دکھائی دینے لگے ہیں۔

طاہرہ جبین تارا..... لاہور۔ محترمی عمران صاحب آداب! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ نئے افق ملا ٹوٹل اچھا تھا لیکن اتنا نہیں کہ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا۔ "دریچہ" "مشتاق انکل کی تحریر" سے ہمارے حکمران بھارت نواز پالیسی اپنائے ہیں کبھی بجلی خریدنے کی بات کرتے ہیں تو کبھی زرعی تجارت کی مگر کشمیر کے ایشو پر مذاکرات مسلسل تعطل کا شکار نظر آتے ہیں کیونکہ بھارت کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ سمجھتا ہے اور اس پر مذاکرات کرنے کے لیے بہانے بازی کرتا ہے۔ اللہ ایسے منافق دشمنوں سے نجات دے اور حکمرانوں کو بھی دشمن کو پہچاننے کی صلاحیت عطا کرے۔ گفتگو میں کافی محفل گرم تھی بہت سارے ساتھی غائب ہیں انکل صابر بخش رنج کو اللہ تعالیٰ صحت اور سلامتی عطا کرے آمین۔ "اقرا" نے دل کی نگری میں اجالا کیا ہماری محبت اور دشمنی صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے جب انسان خود اپنی ذات کو اللہ کے لیے فنا کرتا ہے اس کی رضا کو اپنی رضا بنا لیتا ہے تو وہ دنیا و آخرت میں سرخرو ہو جاتا ہے۔ "آتش زیر پا" "قلندر ذات" اور "حکمت سنگھ" بہترین جا رہی ہیں کہ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ "مجازی خدا" شروع میں بہت اچھی تھی لیکن اختتام فلمی اسٹوری کی طرح ہوا جس کی وجہ سے کہانی نے اپنا تاثر کھو دیا۔ "بخت کا دار" ایک بہت اچھی کہانی تھی یقین کامل ہو تو منزل خود چل کر آپ کا دامن تھام لیتی ہے۔ آفرین ہے مقبول نے امید کا دامن تھامے رکھا اور قسمت نے اسے سرخرو کر دیا۔ "محبت نفرت" کینہ اور نفرت پر مبنی کہانی لیکن جیت ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔ "تاوان" آنکھ کے بدلے آنکھ کان کے بدلے کان ہاتھ کے بدلے ہاتھ۔ "نایاب" اسے کہتے ہیں آنکھوں میں دھول جھونکنا۔ "تیغ و تیر" یہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ "صید و صیاد" سیپ کی کہانی تھی۔ "ایک ستارہ" ایک طرف محبت کے نام پر انتہائی فضول کہانی چلیے ماشذ کریں مجھے اس کہانی کا مقصد سمجھ ہی نہیں آیا یقین کامل ایک اچھی کہانی تھی خود

سانحہ دشمنی قائم کر لینا نقصان کا باعث ہی بنتا ہے "زخمی مسیحا" اسٹارٹ اچھا تھا مگر اینڈ بچوں والا جنوں کا وجود ہے مگر.....؟ مستقل سلسلوں کے علاوہ کسی کہانی نے کوئی خاص متاثر نہیں کیا پلیز اچھی اچھی کہانیاں شائع کیا کریں ایک نظم بھیج رہی ہوں امید ہے شائع کر کے مشکور کریں گے ماہنامہ نئے افق کو ترتیب دینے والوں کو آداب عرض کر دیں اللہ آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔

محمد بخش صابر لنگاہ ...... خانیوال محترمی و مکرمی عمران احمد صاحب خداوند کریم آپ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین ثم آمین۔ میں گزشتہ 9 ماہ سے بیمار ہوں آپ سب دوستوں عزیزوں بہن بھائیوں کی دل سے نکلی ہوئی دعاؤں اور ڈاکٹر محمد خالد رفیق کے علاج نے اب پہلے کی نسبت کافی بہتری کے آثار پیدا کر دیے ہیں مگر علاج بہرحال جاری ہے اور چلنے پھرنے کی ابھی مکمل طور پر طاقت پیدا نہیں ہوئی اور نہ ہی روانی سے کچھ لکھ سکتا ہوں۔ مجھے آپ سب کی دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔ شاید اللہ پاک آپ میں کسی بہن بھائی کی دعا کو سن کر منظور فرماتے ہوئے مجھے مکمل طور پر صحت کاملہ عطا فرمادے اور میں ایک بار پھر دوبارہ آپ کے ساتھ شامل محفل ہو سکوں۔ یہی میری خیر خیریت ہے ہونے کی اطلاع ہے اور اگر اس بیماری کے دورانیے میں مجھے کوئی خوشی ملی ہے تو وہ یہ ہے کہ میرے بڑے صاحبزادے محمد شفاعت حسنین نے اپنے چھوٹے بھائی محمد ثقلین کی شادی خانہ آبادی ماں کوٹ تحصیل ملتان کے ایک بہت اچھے گھرانے کی پیاری سی لڑکی ثریا مصطفیٰ سے کر کے مجھے ایک پیاری سی بہو سے نواز کر خوش کر دیا ہے۔ شاید اس بے بہا خوشی مل جانے کی وجہ سے میں جلد از جلد صحت یاب ہو جاؤں۔ باقی آپ سب عزیزوں بہن بھائیوں کی صحت وتندرستی کے لیے صدق دل سے دعا گو ہوں کہ آپ سب بھی خیر وخیریت سے ہوں گے۔ شمارہ تو ہر ماہ مل رہا ہے لیکن مطالعہ کسی کا بھی نہیں کیا ہے جب مکمل طور پر صحت یاب ہو جاؤں گا تو مطالعہ کروں گا اور پھر تفصیلی محبت نامہ بھی تحریر کروں گا۔ بعض دوستوں نے فون کر کے میرے حال احوال سے آشنائی حاصل کی اور میرے لیے دعا گو ہوئے میں ان کا دل سے شکر گزار ہوں۔ اللہ پاک انہیں خوش رکھے اور جو بہن بھائی مجھے بھول گئے ان کے لیے بھی دعا گو ہوں کہ وہ ہمیشہ خوش رہیں۔ حسیم احمد چوہدری، آشہ عظیم، ملک علی رضا اعوان، مدثر احمد ناز، نگہت اکرم، عائشہ اکرم، فریدہ خانم، تحسین ارشاد، عالیہ انعام الحق، شہناز بانو، ماہ لقا، محمد انور ساجد، ایم اے راحت، ایم اے زاہد، ناصر خان، ڈاکٹر عطا، طاہرہ، نجیب تارا، انجم فاروق ساحلی، عمیرہ بانو، محمد شہزاد، ریاض حسین قمر، شجاعت جعفری، ریاض بٹ، ریحانہ سعید، دلشاد حسین، ریاض حسین شاہد، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، اسد علی شہاب، سعد علی شہاب، ماہ نور رضا، فرزانہ، ڈاکٹر عالیہ، قیصر خان، محمد سرور شاذ، وجیہہ شنیزہ، احمد علی کیف، عبدالمالک کیف سب عزیز میرے حق میں دعائے خیر وشفا بھی کریں اور جن کے نام تحریر کرنے سے میں قاصر رہا ہوں ان سب کو بھی سلام محبت پیش ہے۔ زندہ رہا اور شفا کاملہ مقدر ہوئی تو پھر ماہنامہ نئے افق کی تحریروں پر اپنے خیالات کے ساتھ حاضری دوں گا۔ اب تو اتنا کچھ لکھنے پر ہی تھک گیا ہوں۔ والسلام

اصیب سمیع حسن ...... حیدر آباد قابل احترام عمران احمد صاحب السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ آپ اور تمام اہل مجلس بخیریت ہوں آمین۔ کراچی دنیا کا ساتواں بڑا شہر تو بن گیا ہے مگر یہاں نہ کسی کی جان محفوظ ہے اور نہ کسی کی عزت آبرو۔ شہر میں روزانہ سترہ اٹھارہ چلتے پھرتے جیتے جاگتے بے قصور لوگوں کو موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے اس پر بھی کوئی سوگ کوئی ہڑتال کوئی دھرنا نہیں ہوتا مگر جہاں کسی پارٹی کا کارندہ کسی بھی وجہ سے مر جاتا ہے فوراً اہل کراچی وحیدر آباد کی مصیبت آ جاتی ہے آ ناً فاناً میں چلتی جاگتی زندگی ساکت اور مرحوم کر دی جاتی ہے خوف ودہشت ایسی کہ پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا ہے۔ دراصل ایک قائد کو چھوڑ کر سب نے اپنے اپنے قائد چن لیے ہیں جس کی سزا محب وطن لوگوں اور پاکستان کو دی جا رہی ہے۔ مئی کا شمارہ کافی ضخیم ہے علاوہ آپ سے گزارش ہے کہ مکمل ڈاک سے کسی کو بھی اعزازی پرچہ ارسال کریں۔ آپ کے ڈائجسٹ میں شاید انسانی تصاویر پر پابندی ہے اسی وجہ سے کہانیوں تحریروں کے ساتھ ساتھ سرورق بھی ان سے محروم ہے۔ مئی کے شمارے کا سرورق مشرقی نہیں مغربی عکاسی کرتا نظر آ رہا ہے۔ فہرست خوب صورت ہے ترتیب بھی آسان ہے۔

دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب جو ایک محب وطن پاکستانی اور دردمند اسلام سے محبت رکھنے والے ہیں۔ سے اتفاق کیا ہے اتحاد کا درست کریں۔ ہر مکتبہ فکر کے احساسات کی ترجمانی کریں۔ خلیل جبار سے لے کر محمد اعظم خان بزدار سعید تک کیا معلوم ہوتا ہے سب کی سوچ اور فکر ایک ہی سمت رواں دواں ہے ایک ہی چاشنی پر چلتے نظر آ رہے ہیں وہی عشق کا چکر وہی بے راہ روی کا درس وہی جنسی چاشنی کا استعمال۔ ٹی وی ڈراموں کی کاپی کرنے سے معیاری ادب تشکیل نہیں ہو سکتا۔ معاشرہ میں ہزاروں مسئلے ہزاروں موضوع بکھرے پڑے ہیں۔ یقین مانیے ان جنسی تحریروں کو پڑھ پڑھ کر بجائے تسکین اور سکون کے ذہن میں کوفت ڈپریشن پیدا ہوتی ہے۔ اب ذرا آنچل دیکھیے کیا یہ خاتون کے پردہ میں ہوتا ہے تمام سے طاہرہ بخش تاڑاں کو بھی تقسیم کا درس ہے۔ اذان میں جو ماہ پہلے جو میں پانچ سال بچی سے ساتھ پیش آیا اس کو موضوع بنا کر جو صوفی نے کیا اب کی ایسی تیسی کر دی ہے پہلے تو یہ بتائیے آپ سے پندرہ بیس سال پہلے ہمارے یہاں سی ڈی، ڈی وی ڈی وغیرہ تھے؟ لکھتے وقت یہ بھی خیال کر لیا کریں کہ کس کا حوالہ دے رہا ہوتا یاد اس دور میں تھے یا نہیں۔ یہی حال خلیل جبار صاحب کا ہے یہ بھائی بھی ہر تحریر میں ہر لڑکی کو جوان پر شیطان کا جال دکھاتے نظر آتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو صرف کراچی میں ہزاروں ایسی لڑکیاں اور قصے میں مل سکتے ہیں جو بے چاری خواتین اور لڑکیاں باپ بنتی ہیں۔ ہاں ہو سکتا ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ آپ کی ہر تحریر میں یہ گندگی کا دریا بہتا نظر آ رہا ہے۔ پورے معاشرے کو خدارا مت کیجیے اور اچھا سبق پڑھائیے۔ ایسے تمام لکھنے والوں کے لیے میرا یہ پیغام ہے مخلصانہ مشورہ ہے خدارا نوجوان نسل کو غلط سمت مت لے جائیے۔

ریاض حسین قمر ... منگلا ڈیم۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد صاحب سلام شوق۔ ہے! آپ کا آنچل جس طرح شوق اور لگن سے ہم سب ان پیارے جریدے کو دن رات ایک کر کے سجاتے اور پھر قارئین کی تسکین قلب کے لیے بروقت بک اسٹالوں پر لاتے ہیں یہ آپ لوگوں کا ہی کام ہے۔ ماہ مئی کا شمارہ بہت ہی خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ بروقت مارکیٹ میں آ گیا۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے جس کشمیر مسئلے کی نشاندہی کی ہے وہ اس خطہ کے لیے ایک اہم جزوی حیثیت رکھتا ہے جس کے چھٹ جانے سے پورے خطے میں سوائے تباہی کے کچھ بھی نہیں باقی طاقتیں اس میں نہایت ہی گھناؤنا کردار ادا کر رہی ہیں۔ دراصل تمام کافر ایک منظم گروہ کی شکل اختیار کیے ہوئے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو ہر لحاظ سے نقصان پہنچانے کے چکر میں ہیں رہا ادارہ اقوام متحدہ تو کفار کا بغل بچہ ہے اور ان کے مفاد کا محافظ ہے اس کا نام تو اقوام متحدہ کے بجائے اقوام کافرہ ہونا چاہیے۔ ہم مسلمان ہیں کہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے چکر میں ہیں۔ خدا ہم پر رحم کرے ہمیں سمجھ اور شعور عطا فرمائے اور کافروں کے مقابلے میں امت واحدہ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ عمران صاحب آپ نے گفتگو کے ابتدائیے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ ایک سو بیس فیصد ٹھیک ہے۔ سیاست پر چند لوگوں کی اجارہ داری ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ہم ان کو ووٹ نہ بھی دینا چاہیں تو وہ ہم سے ووٹ لے لینے کی طاقت رکھتے ہیں ہم ان کے سامنے مجبور ہیں خدا ہمیں ہمت اور حوصلہ عطا فرمائے آمین۔ گفتگو میں اس بار کرسی صدارت محترمہ ریحانہ سعیدہ صاحبہ کے حصے میں آئی وہ اپنی بہت ہی اچھی شاعری کی طرح بہت اچھا تبصرہ لائی ہیں تبصرہ بالکل اسی طرح کا ہونا چاہیے کہ کسی کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ محترمہ آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے کہنے پر خوش ہوتے نظم پر تبصرہ کرنے کا سوچا مگر تبصرہ کیا نہیں صرف اپنی نظم دوبارہ شائع ہونے کا ذکر کر کے بات گول کر دی۔ حالانکہ اب عمران صاحب نے یہ مسئلہ بہت آسان کر دیا ہے اتنے بڑے جریدے کے ایک شمارے میں صرف چار غزلیں اور دو نظمیں بھلا پڑھنا کتنا مشکل ہے۔ ان کے تو ایک ایک مصرعے پر تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ نسیم سکینہ صدف صاحبہ مختصر تبصرے کے ساتھ تشریف لائیں۔ صدف صاحبہ آپ کے طویل تبصرے کا انتظار رہے گا۔ محفل میں مسلسل حاضری کو یقینی بنائیے گا۔ جناب عمر فاروق ارشد صاحب بڑے اچھے خیالات کے ساتھ تشریف لاتے ہیں۔ عمر فاروق بھائی پوٹھوہاری زبان کی ایک مثل ہے "منہ دے دی چل چل کون سنے" یعنی منہ دی کی بک بک کون سنتا ہے۔ ہم عوام وطن عزیز میں تنکے ہیں بونے ہیں ہماری ساری باتیں بک بک ہوتی ہیں اسے کون سنتا ہے آپ نے پرچے پر تبصرہ بھی خوب فرمایا ہے۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دعا گو ہوں کہ

رب ذوالجلال آپ کے والدین کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے انہیں عمر دراز عطا فرمائے اور ان کا سایہ تادیر آپ پر سلامت رکھے آمین۔ محترم جناب انجم فاروق ساحلی صاحب مختصر مگر جامع تبصرے کے ساتھ تشریف لائے انجم بھائی برا بھی چیز کو اچھا کہنا میرا شیوہ ہے۔ خداوند کریم مجھے اس میں استقامت بخشے آمین۔ پیارے بھائی ریاض بٹ صاحب بہت خوب صورت انداز میں تبصرہ کرتے ہیں اس بار بھی انہوں نے اپنی روایات کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ ریاض بھائی یہ بڑی ہی خوشی کی بات ہے کہ آپ کو میری شاعری اس درجہ پسند ہے اور میرے کئی اشعار آپ کی ڈائری کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ یہ بات میرے لیے بہت ہی اعزاز کی بات ہے میں سمجھتا ہوں کہ میری عمر بھر کی محنت رنگ لائی ہے۔ اس بار آپ کا خط تو خوب ہی تھا آپ کی نئی کہانی صفحات پر نہ پا کر دل کو تکلیف سی محسوس ہوئی۔ محترم شجاع جعفری نے فرمایا کا شکریہ خدا آپ کو دائمی خوشیوں سے نوازے آمین۔ محترم ادیب حق آپ کا خصوصی نامہ بہت پسند آیا یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ ایک رسالہ بچوں کا "دوست" نکالتے ہیں بچوں کا ادب تخلیق کرنا اور اس کی اشاعت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ غیروں کی بے ہودہ ثقافت نے ہمارے بچوں پر ہر طرف سے یلغار کی ہوئی ہے۔ وہ ہماری اخلاقی قدروں کو پامال کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے انہوں نے ہماری نسل کو چنا ہے کہ میڈیا کو بھی خراب کر دیں۔ خدا تعالیٰ ان کے برے ارادوں کو ناکام بنائے آمین ناصر اقبال بیان وید اجازت ہے شیریں اور ایمان کو دوبارہ خوش ہو گیا۔ خوشبوئے سخن کا انتخاب بہت بے ترتیب غزلیں اور دونوں نظمیں ناب کا اس کی زینت آئیں گی خوب رہا۔

عمر فاروق ارشد — فورٹ عباس شفق کی سرخی لیے نئے افق کا دیدار اس مرتبہ کافی جلدی ہو گیا۔ ویسے آپ نے اس شمارے کو ٹھنڈا کر کے کمال کر دیا اسی لیے سرورق منظر تھا جس میں لگا کہ پانام کراچی کے سمندر پر لانچ بازی کا نظارہ کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے مشتاق احمد قریشی کی رحمت کا بغور مطالعہ کیا۔ بلاشبہ وہ حوالوں کے ساتھ لکھتے ہیں اور سچ لکھتے ہیں۔ اس بار بھی پاک بھارت تعلقات پر بے لاگ لکھا مگر نجانے کیوں ہمیں محسوس ہوا کہ محترم قریشی صاحب بھی بھارتی روشن خیالی کا بھرم رکھنے کی جد وجہد کر رہے تھے قلم سے اگر سچ اگل رہا ہو تو اس کے آگے احتیاط پسندی کا بند نہیں باندھنا چاہیے۔ مذاکرات 65 سال میں بڑی دفعہ ہو چکے ہیں اور ہر بار پاکستانی حکمران بھارت کے روایتی کھانوں سے لطف اندوز ہونے کے سوا کچھ نہیں حاصل کر سکے۔ ادھر سے کئی بار لوگ مینار پاکستان پر آ کر بڑے بلند بانگ دعوے تو کر کے گئے مگر واپس جاتے ہوتے خون مسلم سے ہولی کھیلنا شروع کر دی۔ مذاکرات ہوتے ہیں بار بار ہوتے ہیں پر آج تک بھارتی فوج کے مقابلے میں کوئی دو لاکھ پاکستانی فوج کشمیر میں اتار دی جائے اور پھر مذاکرات کی میز سجائی جائے کامیابی نہ ملے تو ہمارا سر اور آپ کے جوتے۔ اگر کوئی طاقت کا استعمال کیے بغیر بھارت کو مذاکرات پر راضی کرنے کی بات کرتا ہے تو وہ عالمی اداروں کا بے وقوف ہے۔ بھارت کے پاس کشمیر ہے۔ ڈیم وہ تعمیر کر رہا ہے۔ اپنے گلے سڑے آلو پیاز ہمیں بیچ رہا ہے۔ ہمارے تجارتی ٹرکوں کو واہگہ بارڈر کے ادھر ہی روک دیتا ہے۔ اس کو کیا ضرورت مذاکرات کرنے کی۔ وہ مذاکرات کی طرف تب چلے گا جب اس کی پٹائی ہو گی۔ مختصر یہ سمجھ لیں کہ بھارتیوں کو ان کی زبان میں جواب دے کر ہی مذاکرات پر مائل کیا جا سکتا ہے۔ گفتگو کی محفل میں اس بار روایتی جوش و خروش دیکھنے کو ملا۔ اچھی بات ہے کہ سعید تاب پر موجود تھیں۔ جن میں انقلابی ضرور ہوں مگر تحریک انصاف وغیرہ کا نہیں۔ باقی آپ کی فرمائش پر نو شکل فلمی اشعار کو پڑھنے کے متعلق غور کر رہا ہے۔ ریاض بٹ صاحب بھی حاضر تھے اچھا لگا۔ عبداللہ شاہد اور ارشاد کی خاصی کمی محسوس ہوئی۔ کا بتا کر یاد دیا ہے پردہ کس کر گئی۔ ادیب حق نے بالکل ٹھیک مشورہ دیا۔ قیمت کم از کم 50 روپے کرنے کے متعلق ادارے کو کچھ سوچنا چاہیے۔ اب کہانیوں کا رخ کرتے ہیں فہرست میں ریاض بٹ کا نام نہ دیکھ کر دکھ ہوا خیر ادیب حق نے ان کی کمی خاصی حد تک پوری کر دی۔ انداز تحریر عمدہ تھا۔ ایک ستارہ نامی کہانی شاید غلطی سے سلیکٹ کر لی گئی۔ نہایت بے تکی قسم کا آغاز تھا۔ کوئی مقصد یا سبق اجاگر کیے بغیر اختتام کر دیا گیا۔ مجازی خدا کا آخری حصہ ہوا اثر کن رہا۔ قارئین کے اندازوں کے برعکس انجام ہوا۔ اعظم خان مبارک باد کے مستحق ہیں۔ سچا وار اور یقین کامل بھی اس

ناول تھیں کوئی خاص تاثر چھوڑنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ تابوت نامی کہانی آپ نے مغرب کا لیبل لگا کر چھاپ دی جبکہ یہ کہیں سے بھی مغربی کہانی نہیں لگی حسن اختر پریم کی اپنا نا مک تو پاپ تھیں جو کہ نئے افق کے صفحات پر ماردی گئی۔ اس کے علاوہ دیگر انتخاب زبردست تھے۔ خصوصاً محبت نفرت بہترین کہانی تھی۔ اب سلسلے وار ناولوں پر کچھ بات ہو جائے آ تش زیر پا کے مصنف بدل چکے ہیں لگتا ہے یعقوب بھٹی صاحب کی طبیعت ابھی تک ناساز ہے خیر سید بدر سعید نے حق قلم ادا کر دیا۔ کیونکہ ناول کا معیار قائم ہے۔ قلندر ذات میں امجد جاوید صاحب نے اپنے ہیرو کو صرف دیواریں پھلانگنے، بندے مارنے اور برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہونے والے دشمنوں کا دھڑن تختہ کرنے پر ہی لگایا ہوا ہے۔ ہیروئن صاحبہ بھی شان بشانہ مار دھاڑ میں مصروف ہیں۔ ناول پر کسی پنجابی فلم کے اسکرپٹ کا شبہ ہوتا ہے۔ میں نے ایک بار پہلے بھی وضاحت سے بات کی تھی کہ کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے مگر امجد جاوید صاحب نے جس ٹریک پر ناول کا آغاز کیا تھا آج بھی اسی ٹریک پر ناول چل رہا ہے۔ جس طرح جنت تلے میں ایک بہترین تبدیلی کا موڑ آیا ہے یہی کسی اچھے ناول کا خاصہ ہوتا ہے۔ اگر امجد جاوید صاحب سے بات نہیں بن رہی تو ان کو چاہیے کہ گھمانے پھرانے کے بجائے آرام سے لپیٹ کر ختم کر دیں۔ جہاں تک خوشبوئے سخن کا تعلق ہے تو اس دفعہ بہت ہی کم شاعری شائع کی گئی میرے خیال میں اس سلسلے کے صفحات میں اضافہ کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو موقع دینا چاہیے۔ ہمیشہ کی طرح دریچۂ حسین قمر صاحب کی غزل سب سے بہتر تھی۔ دو آزمودہ شاعر ہیں۔ سوکلام میں پختگی ہونا فطری بات ہے۔ آج کل نئے افق میں آزاد نظموں کا بھی خاصا شوق پھیلا ہوا ہے اور اس کو فلسفے کا نام دے دیا جاتا ہے۔ خیر فلسفے کی ایک فضا سے اس دفعہ اپنے جذبات کی ترجمانی کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ آخر میں سب ساتھیوں کے لیے دعائیں ہمیں بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ والسلام

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی ۔۔۔ راولپنڈی۔ محترم عمران احمد السلام علیکم! جنی کا شمارہ دوشن روشن ٹائٹل والا بہترین دیکھتے ہی دل میں گھر کر گیا۔ زبردست سادگی۔ بہت دنوں کے بعد محفل میں حاضر ہو رہا ہوں۔ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب جنرل ضیاء کی انتہا سے دوستی ازکشن پا بنے ورنہ ہماری بھی مسلمانوں کا تمیں ہو سکتا۔ گفتگو میں عمران جی نے حدیث شریف کا جو حوالہ دیا ہے کاش ہم اس کی روح تک پہنچ سکیں۔ اللہ سوچنے سمجھنے کی ہر ایک کو توفیق دے آمین۔ عمران جی آپ نے اداریے میں نان ٹیکنیکل لوگوں کا سربراہ بنانے یا کم تعلیم سے حامل لوگوں کو اعلیٰ وزارت کا قلمدان سونپنے کا لکھا ہے بالکل سچ ہے یاد نہیں بھٹو صاحب کے زمانے میں بھی ایک پٹواری کو صحت کا قلمدان پکڑا دیا گیا تھا اور اس نے اس وزارت کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی تھی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم و کرم کرے اور فضل کرے آمین ثم آمین۔ پہلا خط تو ریحانہ سعیدہ صاحبہ کا ہے۔ جی ہاں عمران صاحب آپ کو جواب مل گیا اور تسلی ہو گئی۔ ریحانہ آپ نے بہت سچ لکھا ہے۔ ویسے ضروری نہیں کہ ساری نفسیات یا فلسفہ صرف پڑھنے والے ہی سمجھیں تو ادراک رکھنے والے لوگ بھی ان چیزوں کا پتا ادراک رکھتے ہیں اور بڑے بڑے نفسیات دان ان کو بھی پیچھے چھوڑ دیتے ہیں خیر یہ تو ویسے ہی جملہ معترضہ لکھ دیا آپ نے خوب وضاحت کر دی۔ آپ نے جو مشورہ جناب ریاض بٹ کو دیا ہے کیوں محترم حامد میر کی طرح انہیں بھی گولیوں کا نشانہ بناتے۔ بٹ صاحب آپ لکھ رہے ہیں خوب ہے اور اسی طرح لکھتے رہیں۔ باقی مجموعی تبصرہ تھا۔ بے حد پسند آیا۔ اس مرتبہ آپ کی کہانی سے قارئین کیوں محروم رہے؟ سکندر صدف صاحب ضرور آیا کریں اور تفصیلاً تبصرہ کریں۔ ہمیں اچھا لگا آپ کی تحریر کے منتظر ہیں۔ ہمارے عمر فاروق ارشد صاحب دور دراز سے فورٹ عباس سے آتے ہیں اور خوب بڑا خوب صورت تبصرہ کرتے ہیں اور ساحل دعا بخاری صاحب عمر فاروق کی معذرت قبول کر لیں اور ہمارے یعقوب بھٹی صاحب کے لیے بھی دعا کریں۔ عمران جی عمر فاروق نے بہت سچ لکھا ہے بعض کہانیاں ذرا مختصر اور جلد ختم ہونے والی ہونی چاہئیں۔ غیر ضروری طوالت سے کہانیاں بور کرتی ہیں۔ پر اسرار کہانیوں کے لیے تو میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ کہانی کو بلاوجہ طول دے کر ایک انہونی سی کہانی بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ اسرار سے اتنا غصہ محسوس ہوتا ہے اسی غلطیاں سب سے سرزد ہو جاتی ہیں۔ ویسے تو فورٹ عباس میں بارڈر پار سے خشک پھل آتا ہی ہے بادام بھی آتے ہوں گے مہربانی کر کے

ہمدردی کے طور پر عمر اسرار کو بھیجوا دونا۔ عمر اسرار جی یہ سارا غصہ تین تین غزلیں شائع نہ کرنے پر ہے۔ دھیان دیجیے اور آپ کی والدہ اور محترم والد صاحب کے لیے خصوصی دعا کر رہی ہے۔ اللہ سب پر اپنا فضل و کرم فرمائے آمین۔ ریاض حسین قمر صاحب کا تبصرہ خوب تھا۔ تفصیلاً لکھا گیا تھا اور ہر چیز کا احاطہ کر دیا تھا کرکٹ کیا ہزاروں سال سے یہ لوگ مسلمانوں کو تو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ یہ پہلے بھی بغل میں چھری منہ میں رام رام اور ہم ہیں کہ ''امن کی آشا'' کے بہانے ان کے آگے پیچھے پھر رہے ہیں جیسے ہمارے کوئی قریبی ہم سے دور ہیں۔ عمر اسرار صاحب یہاں ریاض حسین قمر کا بھی گلہ موجود ہے۔ انجم فاروق ساحلی آپ اپنے تبصرہ میں خصوصی اور کلی دعا عدم کرنے والی بات کیوں کرتے رہتے ہیں۔ ریاض بٹ صاحب کے پڑوسی شہر میں ہمیں آپ کی طرف سے ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے آتے رہتے ہیں آپ کی کہانی ہر ماہ نئیں مزہ دے جاتی ہے۔ زبردست لکھنے پر مبارک باد۔ تبصرہ مختصر مگر جامع تھا۔ بٹ جی عمران صاحب سے میرا فون نمبر لے لیں رابطہ کریں گے اور تجی مل جھیں گے۔ سید عبداللہ شاہد، ریاض بٹ کی بات مان جائیں اور ادھورا ناول تو مکمل کریں تاکہ گاڑی آگے چل سکے اور یاں ذرا اس کو مکمل نہ کرنے میں اتنی دیر کیوں لگی۔ تمام وجوہات ضرور لکھیے گا۔ شجاع ظفری مختصر تبصرہ کے ساتھ حاضر تھے۔ ابوادیب تسنیم بھی حاضر ہیں بھئی آپ کا حالات پر تبصرہ اپنے بچوں کے رسالے کا تعارف اور عمران جی کو تنگ کرنے کی قیمت پر نظر ثانی تمام کو خوب لکھا ہے۔ آپ میں تو لکھنے کی ٹھیک ٹھاک صلاحیت موجود ہے۔ باقی یہ ہمارے دیرینہ ساتھی تقیر محمد بخش لنگاہ صاحب کدھر ہیں؟ باقی ناظم بخاری، عاکف، عبداللہ شاہد، شبنم ارشاد، محمد حنیف قادری، ساحل دعا بخاری، شہناز بانو اور محمد اسلم جاوید جو گفتگو کے جگمگاتے ستارے ہیں جلدی سے محفل میں حاضر ہوں۔ بجو ذکی خدا اعظم صاحب کی نہایت ہی خوب صورت تحریر ہے۔ طاہرہ نے بہت اچھے اور مضبوط طریقے سے کہانی کو ٹریٹ کیا۔ صید وصیاد ادیب تسنیم چمن کی اچھی کاوش ہے۔ خلیل جبار بہت خوب صورت لکھتے ہیں۔ انجم فاروق کی زخمی ممتا بھی اچھی لگی۔ بد لگی کہانیوں میں پختہ کار محبت نفرت خوب تھیں۔ باقی دونوں ناول۔ سلسلے وار ناول تو ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ذوق آگہی میں تمام انتخاب خوب تھا۔

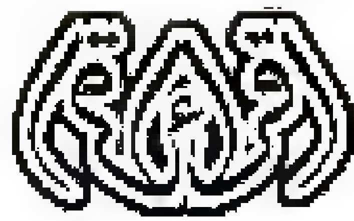
کنیز فاطمہ۔ کراچی۔ محترم عمران بھائی السلام علیکم امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کی ہمت کو قوی اور ادارے کو ترقی عطا فرمائے آمین۔ بڑی مدت کے بعد قلم ہاتھ میں لیا ہے ایک اجنبی سا احساس ہے ہوتے تو اپنا گھر لگتا ہے کہ زندگی کی افراتفری کے میلے میں کسی ضدی بچے کی طرح انگلی چھڑا کر بچھڑ گیا تھا اب ملا ہے تو روٹھ رہا ہے۔ بسورتا گالوں پہ آنسوؤں کی لکیر لیے ہوئے ہے اپنائیت کے احساس کو مٹانے کے لیے کچھ تو کرنی ہی پڑے گی۔ کسی آس کا سہارا کہیں یقین کھونے کا ناچ، دیکھیں یہ قلم چل پڑتا ہے کہ نہیں۔ بہت سے پیاروں سے، بہت سے اپنوں سے ہم کلام ہوئے عرصہ بیت گیا مگر کوئی تو ویسے ہی میرا خاص رہی ہے۔ اب تو لگتا ہے کہ گویا کسی الجھائے سمندر میں جا کر غرق ہوئی۔ شہناز باجی کی محبت کو اپنی بے اعتنائی کے باعث یقیناً میں اپنی ذات کے لیے گم کر چکی ہوں آپ معاف کر دیں محبت سے دو بولوں اور دعاؤں کو میرے لیے کبھی بھی کم مت کیجیے گا۔ انشاء آپ کی شفقت سے ہمیں نوازتا رہے آمین۔ بخش ذکی کی بیماری کا احوال انتہائی پریشان کن ہے۔ اللہ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ میں واقعی میں ان کی طرف سے بڑی فکر مند ہوں کہ بزرگوں کی محبت اور دعائیں ہی تو اصل سرمایہ ہوتی ہیں۔ ریاض بٹ صاحب کی محنت اور محبت کا ذخیرہ اللہ ہمیشہ بڑھاتا رہے۔ عبداللہ شاہد بھائی کی قابلیت اور قلم کی گہرائی سدا قائم رہے۔ شبنم ارشاد سے لڑائی کے بعد میری دوستی بڑی دلفریب ہے۔ ان کی ہر تحریر کی طرح جس کو میں اب ہمیشہ خاصے کی چیز سمجھتی ہوں نازش تو پرائی ہوگئی۔ اس کی محبت مجھے اپنے دل میں تالاب میں کھلے کنول کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ اس کی تحریر شہر آزار نے مجھے اس کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ قصے پڑھنے کے بعد مجھے اپنی ذات کو سنبھالنا دشوار ہو گیا تھا۔ درد کا ایسا عجیب احساس جاگا تھا کہ دل کرتا تھا کہ اپنی ذات کے پرزے پرزے کر کے ہوا میں اڑا دوں۔ عمران بھائی مصروفیت کے باعث پچھلے تقریباً سال بھر کے رسائل بنا پڑھے ہوئے ہیں جنہیں اب میں پڑھ رہی اس لیے نازش کی اس تحریر پر تبصرہ بھی اب کر رہی ہوں۔ ستارا کے افسانے اب بھی چند و نصائح کے بنا رہتے ہوتے ہیں۔ لکھنا تو انہیں ویسے ہی خوب آتا ہے۔ قادری صاحب بھی اچھا لکھ رہے ہیں۔ امجد جاوید نے بھی جو نا

دینے والی اشری ہوئی تھی۔ ان کا ناول بھی شروع کی اقساط کے بعد پڑھنے سے قاصر رہی ہوں۔ اب ان شاء اللہ پڑھنے کے بعد تبصرہ کروں گی۔ انجم فاروق ساحلی بھی جم کر لکھ رہے ہیں۔ عبداللہ لک کیف کے تبصرے کم کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ریحانہ سعید خوب جا رہی ہیں۔ بہت سے نام لکھنے سے رہ جائیں تو معذرت۔ سرور شاذ بھائی غیر حاضری کے معاملے میں مجھ پر بھی سبقت لے جا رہے ہیں۔ بھائی لوٹ آئیں۔ دستک مشتاق انکل کے قلم کی سچائی کے حالات کی بدصورتی کو الفاظ کی صورت میں بیان کرنا ایک بہت بڑی خوبی ہوتی ہے۔ گفتگو میں رونقیں نظر آئیں کیونکہ یہ تو دنیا کا دستور ہے کہ ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا۔ اقرا کا سلسلہ ہمارے لیے باعث رحمت ہے کہ ہم نادانوں کو انگلی پکڑ کر حق کی راہ پر چلانے والا کوئی تو موجود ہے اور یہ ہماری خوش نصیبی ہے۔ "مجازی خدا" اعظم خان کی اچھی تحریر، جو کسی طرح سے ہمیں اپنے شکنجے میں لے کر چلا لیکن بانی آشندہ نے مزہ خراب کر دیا۔ انسانی نفسیات کو جملوں سے جس خوبی کے ساتھ تحریر میں بیان کیا گیا ہے کہ بے اختیار عش عش کر اٹھے۔ میاں بیوی کے درمیان ابھرنے والے تنازع سے لگتا ہے کہ کسی سانحہ کا روپ دھار لیتا ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ اپنی حیثیت رکھتا ہے۔ مقابلے بازی جہاں عود کر آتی ہے تو پھر فسانے تو جنم لیتے ہی ہیں۔ عمران بھائی کنیز فاطمہ سوسائٹی میں جب سے شفٹ ہوئے ہیں شہر سے دوری بڑھ گئی ہے۔ والد صاحب کے نئے نئے خریدنے کا شوق اب بالآخر پورا ہو گیا ہے زندگی ویسے ہی فلیٹ ہو کر رہ گئی ہے۔ سامان سمیٹنے اور کھولنے کا عرصہ اتنا طویل اور تھکا دینے والا ہوتا ہے کہ خود سے ملاقات کا وقت بھی مشکل سے ہی ملتا ہے۔ میری کتابوں اور رسائل کے ڈھیر کے بڑے بڑے بورے تو ابھی تک بندھے ہیں کہ کیا پتا پھر آواز لگ جائے کہ سامان باندھو اب پھر کہیں جانا ہے۔ ویسے عمران بھائی ابھی تو سکھ کا سانس آیا ہی ہے اور اندیشے کے آثار دکھائی دینے شروع ہو گئے ہیں۔ ہمارے لیے دعا کریں کہ ہمارے حق میں جو بہتر ہو وہی ہو۔ اجازت دیں اور دعاؤں میں یاد رکھیں۔ اللہ حافظ

انجم فاروق ساحلی... لاہور امید ہے کہ آپ اور ادارہ کے دیگر افراد خیریت سے ہوں گے۔ ریحانہ سعید، ریاض بٹ، شجاع جعفری، ادیب سمیع چمن تذکرہ قلمبند کرنے کا شکریہ۔ "زخمی ممتا" شائع کرنے پر عمران صاحب کا مشکور ہوں۔ کہانیوں میں بخت کار، محبت نفرت تفاوت، دریاب، آتش زیر پا، خود فراموش، آواز یقین کامل اچھی تحریریں تھیں۔ ٹائٹل اس بار ذاتی منفرد تھا۔ خوشبوئے سخن اور ذوق آگہی بھی تمام کا تمام خوب تھا۔

ساحل دعا بخاری ..... بصیر پور السلام علیکم! اس ماہ خلاف معمول ٹائٹل اچھا نہیں تھا۔ ورنہ تو سحر انگیز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے گفتگو میں آنا چاہا گی۔ ریحانہ صاحبہ نے اچھا تبصرہ کیا۔ عمر فاروق صاحب آپ نے بجا فرمایا۔ آج کل تو ہر زبان پر یہی سوال ہے کہ "کوئی بستی ایسی بستی ہو جہاں روٹی زہر سے سستی ہو"۔ ریاض حسین قمر، ریاض بٹ، شجاع جعفری اور ادیب سمیع چمن آپ سب بھائیوں کا بے حد شکریہ اس ناچیز کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن ہیں آپ سب نے ہی غلط سمجھا۔ ہم..... خیر آپ سوچیے گا کہ ہمارا اشارہ کس جانب ہے۔ آتش زیر پا کہانی ہمیشہ کی طرح اچھی رہی۔ بخت کار کا اختتام مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ سعید وسیاد بھی اچھی تحریر رہی۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ خوشبوئے سخن میں ریحانہ جی کی نظم نے دل مٹھی میں لے لیا۔ باقیوں میں تمثیلہ لطیف کے علاوہ سبھی نے اچھا لکھا۔ خوشبوئے سخن میں تمام انتخاب اچھا تھا۔ آخر میں سب کو سلام۔ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت والسلام۔





ترتیب: طاہر قریشی

آداب معاہدہ:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ خبردار! جس شخص نے ظلم کیا اس پر جس سے معاہدہ ہو چکا یا اس کے حق کو نقصان پہنچایا یا اس کو تکلیف دی اس کی طاقت سے زیادہ یا اس کی رضامندی کے بغیر اس سے کوئی چیز لے لی تو میں اس سے قیامت کے دن جھگڑوں گا۔''

لفظ عقود عقد کی جمع ہے۔ عقد کا معنی ہے باندھنا لہٰذا جو معاہدہ دو شخصوں یا دو جماعتوں میں بندھ جائے اسے عقد کہا جاتا ہے۔ علامہ جصاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کسی معاملہ کو عقد کہا جائے یا عہد و معاہدہ اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ دو فریقوں نے آئندہ زمانے میں کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کی پابندی اپنے لیے لازم کرلی ہو اور دونوں متفق ہو کر اس کے پابند ہو گئے ہوں۔ آج کل ہمارے دور میں اس کا نام معاہدہ ہے۔

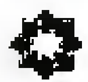
اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ ''اے ایمان والو! تم اپنے معاہدہ کو پورا کیا کرو۔'' اس ارشاد باری میں ہر طرح کے معاہدے شامل ہیں اس سے مراد وہ معاہدہ بھی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے ایمان و اطاعت کے سلسلے میں کیا ہے۔ وہ معاہدات بھی شامل ہیں جو دو فرد کریں جیسے شادی بیاہ کے معاہدے اور خرید و فروخت کے معاہدے اور وہ معاہدے بھی داخل ہیں جو دو قومیں کرلی ہیں لہٰذا بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی بھی لازم ہوگی۔ زمانہ اسلام سے پہلے بھی لوگ معاہدے کرتے تھے لیکن عموماً معاہدات کی پابندی محکومی کی علامت اور معاہدات کو توڑنا جرأت اور برتری کی نشانی سمجھا جاتا تھا لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاہدات فرمائے وہ معاہدات کی تاریخ میں مثالی معاہدے تسلیم کیے جاتے ہیں۔

ان معاہدات میں بنیادی معاہدہ وہ ہے جو صلح نامہ ''حدیبیہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ حدیبیہ ایک کنویں کا نام ہے اس کے ساتھ ایک گاؤں آباد تھا اس وجہ سے اس کا نام حدیبیہ ہوا۔ یہ علاقہ مکہ معظمہ سے تقریباً 9 میل کے فاصلہ پر ہے اکثر حصہ حرم میں ہے باقی حرم سے باہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے ارادہ سے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کیم ذی قعدہ 6ھ کو روانہ ہوئے تقریباً پندرہ سو انصار و مہاجرین صحابہ آپ کے ہمراہ تھے۔ جب آپ حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قریش مکہ سمجھے کہ یہ جنگ کرنے آئے ہیں۔ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قاصد بنا کر بھیجا تاکہ وہ قریش کو آگاہ کردیں کہ مسلمان جنگ کے ارادہ سے نہیں آئے۔ کفار نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو روک لیا، مسلمانوں کو یہ افواہ پہنچی کہ حضرت عثمان کو شہید کردیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے قصاص عثمان کے لیے موت تک لڑنے کی بیعت کی جو کہ بیعت رضوان کہلاتی

ہے۔ قریش کو جب بیعت کی خبر ہوئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو رہا کر دیا اور سہیل بن عمرو کو صلح کا پیغام دے کر بھیجا طویل گفتگو کے بعد ایک معاہدہ تیار ہوا جو کہ "صلح نامہ حدیبیہ" کہلاتا ہے۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ لکھنے کا حکم دیا اور سب سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھوائی۔ عرب میں قدیم دستور یہ تھا کہ وہ باسمک اللھم لکھا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے سہیل نے کہا میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کو نہیں جانتا قدیم دستور کے مطابق باسمک اللھم لکھو چنانچہ یہی لکھا گیا۔ پھر جب آپ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ لکھوایا تو پھر سہیل نے کہا ہم تو آپ کو رسول اللہ نہیں مانتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کی قسم میں اللہ کا رسول ہوں اگرچہ تم میری تکذیب کرو۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یہ مٹا دو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں تو ہرگز نہیں مٹاؤں گا پھر آپ نے خود مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھوایا۔ معاہدہ لکھنے کے آداب میں اسوۂ حسنہ سے یہ مثالیں ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔
پھر معاہدہ کی شرائط میں سے وہ شرط خوب توجہ کے مقابل ہے۔
ایک شرط یہ تھی کہ دس سال تک لڑائی نہیں ہوگی۔ دوسری شرط یہ تھی کہ قریش کا جو شخص بغیر سرپرست کی اجازت سے مدینہ جائے گا وہ واپس کیا جائے گا اگرچہ وہ مسلمان ہو اور جو شخص مسلمانوں میں سے مکہ آئے گا اسے واپس نہیں کیا جائے گا اور یہ کہ اس سال محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی بغیر حج و عمرہ کیے مدینہ واپس جائیں اور آئندہ سال صرف تین دن مکہ میں رہ کر عمرہ کر کے واپس ہو جائیں تلوار کے علاوہ کوئی ہتھیار نہ ہو اور تلواریں بھی نیام میں ہوں اور یہ بھی شرط تھی کہ قبائل عرب کو یہ آزادی ہوگی کہ وہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ کر لیں۔
یہ شرائط ہر مسلمان کی کمزوری پر دلالت کرتی ہیں بلکہ بعض مسلمانوں کے ذہنوں میں کچھ بوجھ بھی محسوس ہوا لیکن اس معاہدہ کے بعد پیش آنے والے مفید نتائج نے ثابت کر دیا کہ یہ معاہدہ تاریخ اسلام کا ایک ایسا اہم واقعہ تھا جو مسلمانوں کی آئندہ کامیابیوں کا پیش خیمہ بنا۔
چنانچہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ سے واپس ہوئے تو راستے میں سورۂ فتح نازل ہوئی جس میں اس صلح کو فتح مبین کہا گیا۔

(جاری ہے)

بشکریہ: "درس حدیث" مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفی
نائب مہتمم واستاذ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور



ارشد علی ارشد

صیہونی قوتیں صدیوں سے مسلم امہ کے خلاف ہر محاذ پر سرگرم ہیں۔ مسلمانوں میں جنم لینے والے فرقوں اور فسادات کے پس پشت میں بھی انہی کا ہاتھ کارفرما ہے۔ کبھی ان کی سازشیں حسن بن صباح کے روپ میں سامنے آتی ہیں تو کبھی غلام احمد قادیانی کی شکل میں خلافت ترکی کا خاتمہ کر کے انہوں نے پورے عالم کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور اب ان کا نشانہ مسلم دنیا کی واحد ایٹمی طاقت پاکستان ہے' جو ہمہ وقت خار کی طرح تکلیف پہنچا رہا ہے زیر نظر ناول انہی سازشوں کے پس منظر میں ہے۔ گو اس کے حالات و واقعات خیالی ہیں' اس کے کسی کردار و علاقہ کا تعلق حقیقت سے نہیں ہے لیکن اس کا تھیم اور خمیر اصل واقعات سے ہی اٹھایا گیا۔

وطن پرستوں کے لیے بطورِ خاص' دلوں کو جھنجوڑتا ہوا ایک دلچسپ ناول

نثار پور کا علاقہ ڈیرہ اسماعیل خان سے تقریباً 150 کلومیٹر اور کوئٹہ سے 60 کلومیٹر دور ہے۔ یہ بڑا پرفضا اور راحت آمیز علاقہ ہے۔ قدرتی سبزہ زار کا چار سو پڑاؤ ہے۔ کھیت کھلیان، باغات اور دل موہ لینے والے مناظر۔ نثار پور سے دو کلومیٹر ہٹ کر مشرق کی طرف دریا بہتا ہے۔ دریا کی افادیت اپنی جگہ مگر اس سے کچھ ہی دور تخت سلیمان کی گیارہ ہزار فٹ بلند چوٹی واقع ہے۔ تخت سلیمانؑ "درازدا" گاؤں کے مقابل ہے۔ مقامی روایت کے مطابق جب حضرت سلیمانؑ جن اور پریوں سے ناراض ہو جاتے تھے انہیں اس پہاڑ میں قید کر دیتے تھے۔ تاہم یہ مقامی لوگوں کی روایت ہے' نسل در نسل منتقل روایت کے بارے میں کوئی حتمی مستند ثبوت موجود نہیں تھا۔ تخت سلیمان قدرتی آرٹس کا بہترین نمونہ ہے۔ وادی کے وسط میں صاف و شفاف پانی کا چشمہ بہتا تھا۔ تخت سلیمان کو لوگ جن اور پریوں کا مسکن تصور کرتے تھے۔ تخت سلیمان کی منفرد چوٹی کے علاوہ سلسلہ کوہ میں جابجا سیدھی چٹانیں تھیں۔ کچھ چوٹیوں پر عمودی چٹانیں تھیں۔ عمودی چٹانوں سے چار پانچ فٹ لمبی سل باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ چٹانیں عمودی اور سیدھی تھیں اس لیے اوپر سے نیچے کئی ہزار کلومیٹر تک بیچ میں کوئی روک نہیں تھی۔ چٹانوں پر ہریالی کا ڈیرہ تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کا بسیرا تھا، لمبی لمبی کئی فٹ گھاس تھی، چشمے بہتے تھے اور پرندے کھیلتے تھے۔ خصوصاً نسیم سحر میں یہ کھیل بڑا دلچسپ اور نرالا ہوتا تھا۔ سیدھی چٹانوں کی چوٹی سے پرندے جیٹ طیارے کی طرح نیچے گرتے تھے پروں کو پھیلا کر سرعت سے نیچے آتے تھے دیکھنے والا گمان کرتا سیدھا زمین سے ٹکرا کر چیتھڑوں میں بدل جائیں گے مگر ایسا ہوتا نہیں تھا زمین سے دو سو فٹ اوپر ہی وہ یک لخت پروں کو حرکت دیتے اور گول چکر میں اڑنے لگتے تھے۔ کبھی درختوں کی لچکدار ٹہنی پر بیٹھ جاتے تھے لچکدار ٹہنی جھولا بن جاتی، پرندے کے بوجھ سے ہولے ہولے اوپر نیچے حرکت کرتی تھی، یہ مناظر خواب آور اور بہت دلکش تھے۔ بہت سے شوقین حضرات صبح کو یہ مناظر دیکھنے وادی کے کنارے کھڑے ملتے تھے۔ ان میں چکور کی دلکش اور نرالی اڑان دیکھنے کے قابل تھی جس سے لوگ خوب محظوظ ہوتے تھے۔

سلسلہ کوہ کے ساتھ ساتھ جڑ میں جہاں خوبصورت وادیاں تھیں وہاں گھنے دراز جنگل بھی موجود تھے۔ جنگلوں کی خاصیت یہ تھی کہ ان میں جابجا پہاڑوں سے آنے والے چشمے مل جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شکاری حضرات کئی کئی ہفتے جنگلوں میں گھسے رہتے تھے۔ شکاری کوئی کی

نہیں تھی; بھیڑیے، سور، لکڑ بھگڑ، مارخور شوق کی تسکین کے لیے بہت مل جاتے تھے۔ جھیلوں پر مرغابی، تلور، تیتر اور دوسرے آبی پرندے بھی بکثرت پائے جاتے تھے۔ ہرن، نیل گائے، خرگوش بھی شکار کا اہم حصہ تھے۔ چند بڑے چشمے دریا کی طرف نکلتے تھے جن میں اچھی خاصی مچھلی بھی مل جاتی تھی۔ وہ ایک آئیڈیل علاقہ تھا۔ شکار پور میں کئی ریٹائرڈ آفیسروں نے ڈیرے جمارکھے تھے، زندگی کے آخری دور میں وہ خوب لطف اندوز ہورہے تھے۔

اس طرف جہاں گھنا جنگل تھا، تین افراد عقابی نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے جا رہے تھے۔ انداز میں تیزی تھی اور چہرے پر فکرمندی کے آثار۔ انہیں دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کسی خاص چیز کی تلاش میں ہیں۔ راستے میں جہاں گھنی جھاڑیاں آتیں وہاں وہ ٹھہر جاتے۔ جھاڑیاں کھنگال کر دیکھتے اور آگے بڑھ جاتے۔ جھاڑیوں میں چکور، جنگلی کبوتر، تیتر اور بٹیر کے مسکن تھے۔ تینوں افراد کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں مگر انہیں شکار کی نہیں کسی خاص چیز کی تلاش تھی۔ جنگل سے شناسائی ان کی پھرتی سے عیاں تھی۔ ایک طرف درختوں کا گھنا سلسلہ تھا اس طرف قدآور جنگلی گھاس راستے کی بڑی رکاوٹ تھی۔ غیر معمولی سرسراہٹ سے ان کے بڑھتے قدم تھم گئے۔ اس سے ہوا بندگی ماحول میں حبس تھا، بند ہوا کے حبس زدہ ماحول میں قدآور گھاس کی سرسراہٹ انہیں چونکنے پر مجبور کرگئی۔ لاشعوری طور پر ان کے اعصاب تن گئے تھے اور بندوقوں پر گرفت مضبوط ہوچکی تھی۔

”اے کون ہے وہاں؟“ کرخت آواز سے پوچھا گیا۔

”باہر آؤ ورنہ گولی چلادیں گے۔“ انہوں نے باقاعدہ پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔

”رحیم گولی مت چلانا، یہ ہم ہیں۔“ گھاس سے برآمد ہونے والے لمبے شخص نے بلند آواز میں کہا۔

غبارے سے نکلنے والی ہوا کی طرح ان کے پھیپھڑوں سے تیز سانس خارج ہوئی۔ تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے اور آہستہ آہستہ بندوقیں نیچے کردی تھیں۔

”کیا ہوا اقبال، ملا کیا؟“

”نہیں یار! اتنی ایریا کا چپہ چپہ ہم نے دیکھ لیا ہے وہ کہیں نہیں ہے۔“ آنے والے شخص نے اطلاع دی۔ اس کے پیچھے گھاس سے دوسرا شخص بھی نمودار ہوچکا تھا۔

”ہم بھی تمہاری طرح ناکام ہیں۔“ رحیم نے مایوس کن لہجے میں بتایا۔

”یار! اس کا ملنا بہت ضروری ہے۔“ اقبال کے ساتھی نے فکر انگیز لہجے میں کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو ساجد، ہمیں ہر حال میں اسے ڈھونڈنا ہے۔“

”عظمت تم دونوں اپنے رخ پر سیدھا جاؤ، ہم دائیں طرف نکلتے ہیں۔“ اقبال نے تیز لہجے میں کہا، دوسرے لوگ کس طرف ہیں۔

”یار پورے جنگل میں پھیلے ہوئے ہیں، کچھ لوگوں کو پہاڑوں کی طرف روانہ کیا گیا ہے ہوسکتا ہے وہاں مل جائے۔“

”اللہ کرے یار جہاں بھی ہو بس ایک بار مل جائے۔“

”اچھا ٹھیک ہے، ہم چلتے ہیں، تم لوگ بھی جاؤ۔“

وہ ایک بار پھر مختلف گروہ سمتوں میں پھیل گئے۔ ان کے پاؤں میں لانگ سیفٹی شوز تھے، بدن میں سخت چمڑے کی حفاظتی جیکٹ، سر پر سایہ دار کیپ اور چہرے پر حفاظتی تہہ چڑھائی گئی تھی۔ اس کے باوجود عجلت کے سبب خود کو ہلکی چوٹوں اور خراشوں سے بچانا مشکل تھا۔ کئی گھنٹوں کی پیدل مشقت بدن پر تھکاوٹ کا غلبہ کر رہی تھی۔ پیٹ میں بھوک کی وجہ سے اینٹھن اٹھ رہی تھی، وہ چاہتے تو کسی بھی شکار سے بھوک مٹا سکتے تھے۔ ان کے پاس کمر سے جھولتے والے بیگ میں تمام ضروری اشیاء موجود تھیں مگر شکار ان کا مقصد نہیں تھا۔

اچانک رحیم چلا اٹھا! ”وہ دیکھو......“ عظمت اور منصب نے چونک کر اس کے اشارے کا تعاقب کیا۔

”وہی ہے۔“ ان کے منہ سے بے اختیار چیخ نما

آوازیں نکلیں۔

"چلو بھاگو۔" وہ ان سے سو گز کے فاصلے پر گھٹنے ٹیکے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی پوزیشن ماہر نشانہ باز کی طرح تھی۔ سیدھی رائفل خم شدہ گردن، ایک آنکھ بند، دوسری شکار پر مرکوز، انگلی رائفل کی لبلبی دبانے کے لیے تیار۔

"اے کیا کر رہے ہو؟" عظمت نے چیخ کر اسے متوجہ کرنا چاہا تھا مگر شاید اس نے آواز نہیں سنی تھی۔ نہ ان کے بھاگنے کا احساس ہوا تھا۔ کیونکہ گولی چل گئی تھی خاموش جنگل میں یکے بعد دیگرے دو S.G کارتوس کے فائر نے ہلچل مچا دی تھی۔ درختوں سے پرندے پھر پھر اڑ رہے تھے، جھاڑیوں اور قد آور گھاس میں رہتے چھوٹے بڑے جانور بدحواسی میں بھاگنے لگے تھے۔ پرندوں اور جانوروں کی ملی جلی آوازوں نے شور کی کیفیت طاری کی تھی۔ رحیم، عظمت اور منصب تینوں بھاگتے ہوئے اس کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ وہ حیران آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ زمین سے دو ہزار فٹ بلند پہاڑی شگاف میں کھڑا ہوا تھا۔ یہاں سے اس کا دیکھا جانا ناممکن تھا۔ جبکہ وہ خود آنکھوں سے دوربین لگائے پورے علاقے کا نظارہ کر رہا تھا۔ نشیب میں نثار پور کی سبز وادیاں نظر آ رہی تھیں۔ لوگ گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ جانور باندھے جا رہے تھے۔ سورج مغرب کی طرف دھیرے دھیرے ڈوب رہا تھا۔ پرندوں کے غول اپنے مسکن کی طرف محو پرواز تھے۔ مکانوں کی چھتوں سے دن کا اجالا چھٹ رہا تھا، چمنیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ گھر والیاں کھانا بنانے میں مگن تھیں۔ کھیت ہوا سے لہلہا رہے تھے۔ رات کی رانی نے خوشبو کے دہانے کھول رکھے تھے۔ موتیے اور گلاب کی خوشبو نے فضا کو مسحور کن کر دیا تھا۔ دریا کی روانی میں ٹھہراؤ تھا، ندی کے پانی میں ڈوبتے سورج کا عکس ٹوٹ ٹوٹ کر لہرا رہا تھا۔

"صداقت علی خان ماننا پڑے گا تمہارا علاقہ مثل جنت ہے۔"

"فقط میرا علاقہ ہی نہیں جوزف۔ پورا پاکستان قدرت کے خوبصورت رنگوں کا بہترین نمونہ ہے۔" صداقت علی خان نے کہا جو جوزف کے عقب میں بڑے پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔

"شاید ایسا ہی ہو میں چاہنے کے باوجود پورا پاکستان نہیں دیکھ سکتا مگر...... تیری یہ جنت ضرور دیکھوں گا۔ اس کے جنگلوں میں شکار کروں گا اور سبز میدانوں میں گالف کھیلوں گا۔" جوزف نے دوربین آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"موسٹ ویلکم جوزف لیکن ابھی نہیں۔ یہ کسی مناسب وقت میں طے کریں گے۔"

"اینی پرابلم؟" جوزف نے صداقت علی خان کے پریشان چہرے پر کھوجتی نگاہ ڈالی۔

"نثار پور میں بہت سے ریٹائرڈ فوجی آفیسر آباد ہیں۔ کچھ حاضر ڈیوٹی پولیس آفیسر بھی یہاں رہتے ہیں۔ میں فی الحال تم لوگوں کو ان کے سامنے نہیں لا سکتا۔ تم لوگوں کو چند ماہ پوشیدہ رہنا ہوگا۔"

"صداقت علی خان ہمارے سامنے تمام قانونی کاغذات موجود ہیں۔" جوزف نے اسے اطلاع پہنچائی۔ "ہم لوگ پاکستان میں موجود ہیں تو قانونی اعتبار سے۔"

"یہ بات مجھ سے بہتر کون جانتا ہے جوزف پھر بھی میں نہیں چاہتا ہے کہ کسی کو کوئی کھٹکا ہو۔"

"کھٹکا......" جوزف نے لمبی سانس کے ساتھ لفظ دہرایا۔

"جوزف آپ کو تسلیم کرنا ہوگا پاکستانی لوگ آپ کے ملک کو پسند نہیں کرتے۔" صداقت علی نے حقیقت پسندانہ لہجے میں کہا۔

"اس لیے کہ ہم نے پاکستان کی معیشت کو تھام رکھا ہے؟" جوزف کے لہجے میں بڑا واضح طنز تھا۔

"تم لوگ بھول جاتے ہو پاکستانی برآمدات کی منڈیوں میں سات ممالک شامل ہیں ان میں 23.9

فیصد کے ساتھ ہم سرفہرست ہیں۔ برآمدات کی بڑی مارکیٹیں 28.4 فیصد ہمارے ملک میں ہیں۔ ہم اگر پاکستان کو معاشی طور سے مستحکم کرنا چاہتے ہیں تو کیا غلط کرتے ہیں؟"

"غلط یا صحیح کی تعریف اس طرح نہیں ہوسکتی جوزف۔ حالانکہ سب کچھ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔" جوزف فوراً بولا۔

"بات برآمدات کی ہو یا درآمدات کی ہر صورت میں پاکستان کا انحصار ہمارے ملک پر ہے۔ پاکستان کی درآمدات کے ذرائع میں آٹھ فیصد کے ساتھ ہمارا پہلا نمبر ہے۔ بات یہاں آکر نہیں رکتی تمہارے ملک سے پاکستانی ورکرز کی ترسیل کردہ رقوم دنیا کے تمام ممالک سے اول نمبر پر ہے۔ تم جانتے ہو یہ رقم کتنی ہے؟" صداقت علی خاموش رہا تو جوزف بولا۔ "یہ رقم 1176.12 ملین ڈالر ہے۔"

"میں اتنے اعداد و شمار نہیں رکھتا جوزف۔"

"ہاں تم لوگ صرف نفرت کی کتاب پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔" جوزف کے لہجے میں ہلکا سا غصہ تھا۔ "میں اس نفرت کی توجیہہ کچھ نہیں سکا صداقت علی خان۔"

"نہیں نہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے جوزف۔ ورنہ پاکستانی قوم محبت کرنے والی قوم ہے۔"

"معاف کرنا صداقت علی خان، احسان فراموش بھی ہے۔" جوزف کی کاٹ دار بات پر صداقت علی کو ہلکا سا جھٹکا لگا تھا اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے تھے۔

"دنیا کے ٹاپ تین آئل ریزرو ممالک میں سات اسلامی ممالک ہیں جوزف نے اپنے وار جاری رکھے۔ کتنے ہیں جو تمہارے ہمدرد اور خیر خواہ ہیں؟ کتنے ہیں جو تمہاری پیٹرولیم ضروریات کو پورا کرتے ہیں؟ حالانکہ پاکستان واحد اسلامی ایٹمی طاقت ہے۔"

"جوزف میں تمہاری طرح نہ ماہر معاشیات ہوں۔ نہ سائنسدان۔ البتہ کسی حد تک نفرت کی بنیاد کو جانتا ہوں۔

"تو بتاؤ مجھے۔" جوزف فوراً بولا۔ "پہیلی سی۔"

"پہلے آپ یہ بتاؤ آپ لوگ یہاں جو کچھ کررہے ہو پاکستانی حکومت کو اس کا پتہ ہے؟"

"حکومت کو ہماری موجودگی کا پتہ ہے۔ ہم غیر قانونی نہیں ہیں۔" جوزف نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"میرا سوال یہ نہیں ہے کہ آپ قانونی ہو یا غیر قانونی۔ سوال یہ ہے کہ آپ جو کچھ کررہے ہو وہ حکومت کے علم میں ہے یا نہیں؟" اب کی بار صداقت علی خان نے بات پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

"کسی ایک مجبوری کے تحت ہم یہ سب خفیہ رکھنے پر مجبور ہیں۔ مگر جلد یا بدیر حکومت کو بتادیں گے۔"

"آپ ایسا کبھی نہیں کروگے جوزف آپ لوگ ایسا کرہی نہیں سکتے۔" صداقت نے پراعتماد لہجے میں اعتراض کیا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا صداقت علی خان۔"

"فرق پڑتا ہے مسٹر جوزف۔ ہاتھی کے کئی دانت ہماری قوم کو نفرت پر مجبور کرتے ہیں۔ تمہارے ملک کے تم سب سے بڑے خیر خواہ ہو۔ ہماری معیشت کو سنبھالنے میں مرکزی کردار ہو۔ وفاقی امور میں ہمارے دست دراز ہو۔ ہماری برآمدات اور درآمدات کے اہم ستون ہو مگر مسٹر جوزف آپ ہاتھی کے دانت بھی ہو۔ جو کھانے کے اور دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔ سچ کی یہ گرہ کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ یہ وہ گتھی ہے جو تمہارا ملک کبھی سلجھانا ہی نہیں چاہتا۔" صداقت علی خان کے لہجے میں فطری جذباتی پن امڈ آیا تھا۔ یہاں اس نے جوزف کو آپ کی بجائے تم کہہ کر پکارا تھا۔

"تم لوگ کبھی نہیں سمجھ سکتے صداقت علی خان۔" جوزف نے مایوس لہجے میں کہا۔

"یہ کچھ سامان چاہیے ہمیں۔" جوزف نے ایک کاغذ صداقت علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مل جائے گا۔" صداقت علی نے سامان کی فہرست جوزف کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگوں سے ایک ریکویسٹ ہے۔ فی الحال اس پہاڑی تک محدود رہیے گا دائیں بائیں جانے کی ضرورت نہیں۔"

"ہم آبادی سے کوسوں دور ہیں صداقت علی اور کافی بلندی پر بھی۔ میرے خیال میں ہمیں کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ رسک تو آپ لے چکے ہیں صداقت جو ہمیں دائیں بائیں کی پہاڑیوں سے دیکھ سکتے ہیں وہ اس پہاڑی پر بھی آسکتے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس پہاڑی کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا ہے یہ پہاڑی جن و پریوں کے مسکن کے طور پر مشہور ہے اس طرف کوئی بھی آنے کی جرأت نہیں کرتا۔"

"جن و پریوں کا مسکن؟" جوزف نے بلند قہقہہ لگایا۔ "آئی کانٹ بلیو اٹ۔ میں اس پر یقین نہیں کرسکتا۔ آج کی دنیا سائنس کی جدید ترین دنیا ہے مگر تمہاری قوم آج بھی اندھیروں میں بھٹک رہی ہے۔ صداقت علی پاکستان کی شرح خواندگی کا تناسب کیا ہے؟" کہتے ہوئے جوزف نے اچانک سوال پوچھ لیا۔

"تقریباً 59 فی صد...... کیوں؟ کیونکہ تم لوگ حد سے زیادہ دقیانوسی ہو۔ پسماندہ سوچ کی حامل قوم ہو۔"

"ہم لوگ کیا ہیں؟ یہ آپ لوگ کبھی نہیں سمجھ سکتے۔" صداقت علی خان نے تنے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

صداقت علی نے جوزف کو عقب سے دیکھا وہ سامنے کا موڑ مڑ کر بڑے شگاف میں غائب ہوچکا تھا۔ صداقت علی خان نے تاسف بھری نگاہ سے ہاتھ میں پکڑی لسٹ کو دیکھا۔ آج وہ بہت اچھی طرح جان گیا تھا یہ وہ انسان ہیں جن کا ظاہر گورا اور باطن سیاہ ہے۔ انسان کی پہچان ہی من کے انسان سے ہوتی ہے۔ باہر جیسا بھی ہو من پاکیزہ، صاف اور شفاف ہو تو وہی اشرف المخلوق کہلانے کے لائق ہوتے ہیں۔ باہر سے چٹے سفید اور سب اچھا کا راگ الاپنے والے من کے کھوٹے ہوں تو انسانیت ان پر فخر نہیں کرتی اپنی ہتک پر ماتم کرتی ہے۔ دو ہزار فٹ بلند پہاڑی کے بڑے پتھر پر بیٹھے ہوئے صداقت علی خان نے من کے انسان کے پیمانے پر خود کو پرکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ وہ بچوں کی طرح رونے لگا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

اس بات کا تعین کرنا محال تھا کہ وہ بحرالکاہل، بحر اوقیانوس یا بحر ہند ہے۔ کسی ایک کا نام لینا بعید از قیاس تھا۔ پانی کا جوش و خروش معمول سے اوپر کا تھا بے لگام لہریں خطرناک بھبھوکائی آسمان کی طرف اچھل رہی تھیں۔ پانی کی ہیبت ناکیاں بادی النظر غضب ناک سمندری طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھیں۔ لہروں کی طغیانی بتا رہی تھی کہ بڑے سے بڑے بحری جہاز کو وہ تنکوں کی طرح روند لیں گی۔ اس کے باوجود سطح سمندر سے ایک فٹ اوپر فضاء میں معلق تخت و تخت نشیں کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ دس بائی دس مربع فٹ کے تخت پر تینوں اطراف میں ہوئی شکل کے گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ تخت کے وسط میں وہ اکیلا شان بے نیازی سے ٹیک لگائے براجمان تھا۔ غرور اور تکبر نے گردن میں جیسے لوہے کا راڈ فٹ کررکھا تھا۔ وحشت زدہ لہریں جو بڑے بحری بیڑے کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جانے کی روادار تھیں تخت کا بال بانکا کرنے سے قاصر نظر آتی تھیں۔ موجیں گہرے بھنور کو آغوش میں لے کر زعم لیے بڑھتی تھیں کہ ٹکرانے والا پاش پاش ہوجائے گا مگر تخت کے نزدیک پہنچ کر گاؤدی کی طرح سرنگوں بیٹھ رہی تھیں یوں جیسے پانی سے غرق کرنے کی صلاحیتیں سلب کر لی گئی ہیں۔ یہ منظر تخت نشیں کا سر فخر سے کچھ مزید بڑھا رہا تھا۔ تخت نشیں کے سامنے پانی پر انگشت چیلے آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے۔ نہ سمندر کے تھپیڑے پانی کا ڈر تھا نہ لہروں کی وحشت ناکی کا خوف۔ بصارتوں میں گرو کی صورت اور سماعتوں میں اس کی آواز تھی۔

"میں نے آج ایک انتہائی اہم مقصد کے لیے سب کو جمع کیا ہے۔" گرو کی آواز ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی ہر سماعت تک پہنچ رہی تھی۔ یہ گرو کی غیر معمولی مادی طاقت کا کرشمہ تھا ورنہ چیلوں کا جمع نگاہوں کی حد رسائی سے

تجاوز تھا۔

"جیسا کہ تم سب جانتے ہو دنیا میں کوئی ہمارا ثانی نہیں ہے، ہم لاثانی ہیں۔ انسان، حیوان، جنات، چرند، پرند، بحری و بری کوئی مخلوق ایسی نہیں جس پر ہمیں دسترس حاصل نہ ہو۔ اس بات سے یہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ ہم ہی اس دنیا کے اصل حکمران ہیں۔"

"گرو آپ حق اور سچ ہو۔" چیلوں نے بلند و بانگ نعرہ بازی شروع کردی تھی۔ "حق گرو...... سچ گرو......"

گرو نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "ساری دنیاوی مخلوقات ہمارے سامنے پست ہیں۔ ہماری غلام ہیں۔ پھر بھی انسانی مخلوق میں ایک گروہ ہمہ وقت ہم پر غلبہ پانے کی تگ و دو میں جتا ہوا ہے۔" گرو کی بات سن کر چیلوں میں حیرت، غم اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔

"اس گروہ کو ہم تہہ و بالا کردیں گے گرو جی۔" چیلوں کا مجمع بیک وقت پکار اٹھا تھا۔ یہ پکار بے ہنگم شور وغل اور کان پھاڑ دینے والی چیخ و پکار کے مشابہ تھی۔

"وہ نادان ہیں خوش فہمی میں مبتلا ہیں خود کو فریب دے رہے ہیں کہ ہمیں فتح کرلیں گے مگر وہ نہیں جانتے کہ میں ہی اللہ کا مقرب تھا اور جو میں جانتا ہوں وہ کوئی اور نہیں جانتا۔"

"حق گرو...... سچ گرو۔" مجمع پھر سے نعرہ بازی پر اتر آیا تھا۔ "آپ بجا فرماتے ہیں گرو جی۔"

"یہ بات تم سب جانتے ہو ہم بے انتہا مادی طاقت کا سرچشمہ ہیں زمین و آسمان پر ہماری حکمرانی ہے، فضاء اور خلا میں صرف ہماری برتری کا شور ہے۔ بظاہر ایسی کوئی طاقت نظر نہیں آتی جو ہمارے غلبے کے طلسم کو توڑ سکے۔"

"حق گرو...... سچ گرو۔" بے ڈھنگے شور چیخ و پکار اور نعرہ بازی کے چلے خوشی سے ناچنے لگے تھے۔

"مگر پھر بھی اس کے بیچ میں ایک خلا ہے۔"

"بیچ میں ایک خلا......؟" چیلوں کی سانسیں تھم گئی تھیں۔

"ہاں بیچ کا یہ خلا انسانی مخلوق کے اسی مخصوص گروہ کا پیدا کردہ ہے۔ جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ اس خلا کو ہم نے ہر حال میں پر کرنا ہے۔"

"گرو جی! اس گروہ میں ایسا کیا ہے؟ جس نے ہماری آسمان ایسی بلندیوں کی اڑان میں خلل ڈالنے کی ہمت کی ہے۔ ہم نے زمین و آسمان کو تسخیر کر رکھا ہے۔ بلاشبہ ہم نے زمین و آسمان کو تسخیر کیا ہے اور عنقریب ہم زمین کے موسموں، بارشوں، ہواؤں اور فصلوں پر حکمرانی کریں گے۔ ہم نباتات، جمادات اور جنگلات کے بھی بادشاہ ہوں گے۔"

"گرو جی! آپ کے ایک اشارے سے موسم کی روانی میں لڑکھڑاہٹ آجاتی ہے، ہواؤں کے رخ بدل جاتے ہیں، سمندروں کی طغیانی تھم جاتی ہے۔ گرو جی آپ ہی حاکم ہیں، باقی جو بھی ہے سب تابع ہیں مطیع ہیں۔ انسان کے پیدا کردہ کسی بھی گروہ کو ہم حقیر مکھی کی طرح مسل دیں گے۔"

"میری بات غور سے سنو، میں خوشامد پسند نہیں ہوں مگر حقیقت کو رد بھی نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے طاقتور مضبوط اور مربوط کوئی مخلوق بنائی ہے تو اس کا نام ہے انسان۔" گرو کی بات نے مجمع میں ہلچل مچادی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا انسان ان سے افضل ہوجائے جبکہ زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ہر چیز کو انہوں نے فتح کر رکھا تھا۔ گرو کہہ رہا تھا۔

"تمہارے لیے خوش آئند بات یہ ہے کہ انسانوں میں عقائد ہیں نظریات ہیں اور مذاہب ہیں ہر عقیدہ دوسرے عقیدے کی ضد ہے، ہر نظریہ دوسرے نظریے کی چڑ ہے اور ہر مذہب دوسرے مذہب کا دشمن ہے، ہر مذہب میں فرقے ہیں، فرقوں میں عداوتیں ہیں اور عداوتوں میں ذلتیں رسوائیاں اور شکستیں ہیں۔"

"گرو جی! جب شکستیں ہی ان کا مقدر ہے تو ہمیں ان کا ڈر کیسا؟ فاتح ہم ہیں۔ حکمرانی کا تاج آپ کے سر پر ہے۔"

"میری بات کو سمجھو ہم سب کچھ ہیں ماسوائے بیچ

کے اس خلا کے جس کا سرا انسانوں کا ایک مخصوص گروہ تھامے ہوئے ہے۔"

"آپ حکم کریں گرو جی ہم پلکوں کی جنبش میں ایسے ہر گروہ کو تہہ و بالا کر دیں گے جس نے یہ خلا ڈالنے کی سنگین غلطی کی ہے۔ ہم مثل آگ بن کر جلا دیں گے۔ مثل آب بن کر بہا دیں گے، ہم لحظہ بھر میں مغرب و مشرق میں پھیل جائیں گے۔"

"یہ کام پلکوں کے اشاروں سے ممکن نہیں۔" گرو نے کہا۔

"میں مانتا ہوں ہم میں ایسی طاقت ہے کہ لحظہ بھر میں مشرق و مغرب میں پھیل جائیں چاہیں تو آگ بن جائیں۔ چاہیں تو آب بن جائیں اور آگ میں دنیا کو جلا کر بھسم کر ڈالیں، پانی میں مشرق و مغرب کو غرق کر دیں میں یہ بھی جانتا ہوں حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں بلقیس کا تخت پلک جھپکنے کی دیر میں لے آنے والے جنات بھی ہمارے تابع ہیں مگر....." گرو چند ثانیے رکا۔ چیلوں کی سانسیں اکھڑ گئی تھیں وہ بولا۔

"جس گروہ کی میں بات کر رہا ہوں ان کے پاس چند ایسے ہتھیار ہیں جو ہماری کمر توڑ دیتے ہیں۔"

گرو کی بات سن کر پورے مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ انہیں گرو سے مایوس کن بات کی توقع نہیں تھی۔

"گرو جی ہم ان سے وہ ہتھیار چھین لیں گے۔"

"ان ہتھیاروں کو چھیننے کے لیے ہمیں وسیع دماغ کشادہ دل اور مضبوط منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔"

"گرو جی کیا وہ ایسے خطرناک ہتھیار ہیں؟"

"ہاں بہت زیادہ خطرناک....."

"گرو جی! کیا وہ ہتھیار آپ کے پانچ لڑکے بھی نہیں چھین سکتے؟"

"تم سب جانتے ہو میرے پانچ لڑکوں کے مخصوص کام ہیں۔ وہ بحسن و خوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ گرو کے انداز میں ناگواری تھی۔

"میں نے ایک منصوبہ بنایا ہے جس کی تکمیل کے بعد سب کچھ ہماری مٹھی میں ہوگا تم سب غور سے سنو۔"

"زندگی کے تمام وسائل پانی، آگ، بجلی اور غذا پر قبضہ کرنا ہے۔ تمام قدرتی وسائل، بارشیں، دھوپ، چھاؤں، قحط اور خشک سالی تک رسائی کو یقینی بنانا ہے۔ دائیں ہاتھ میں جنگ، بائیں میں جہنم کو لے کر چلنا ہے۔ دنیا والے جس کو مردہ سمجھ کر دفنا دیں ہم اسے زندگی بخش دیں اور پھر اسے من مرضی سے استعمال کریں۔"

گرو کی ناقابل یقین باتیں سن کر دم بخود مجمع حرکت کرنے سے بھی قاصر تھا۔ "کیا ایسا ممکن ہے گرو جی؟"

"ممکن ہے..... بالکل ممکن ہے۔ جب ہم تمام طاقتوں سے بالا و برتر ہیں تو ہمارے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔" گرو کے لہجے کا اعتماد چیلوں کو یقین دلانے کے لیے کافی تھا۔

"اس معرکۃ الآراء منصوبے کے لیے ہی تم سب کو جمع کیا ہے۔"

"ہم حاضر ہیں گرو، ہماری جان، مال بیوی بچے سب آپ پر قربان ہیں۔"

"مجھے یہی امید ہے۔" گرو نے کہا۔

"سب سے پہلے اس گروہ کا نام سنو جو ہماری ہٹ لسٹ پر ہے۔"

چیلوں میں بے چینی دوڑ گئی تھی وہ کیسا گروہ تھا جس نے بے مثال طاقتور گرو کو اتنا بڑا منصوبہ بنانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"اس گروہ کا نام ہے....." گرو نے نام بتایا تو چیلے حیرت سے ہکا بکا ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

وہ ہال نما بڑا کمرہ تھا، کمرے کے وسط میں مخروطی شکل کا میز پڑا ہوا تھا، میز کے دونوں اطراف آمنے سامنے آٹھ کرسیاں پڑی تھیں۔ جن پر آٹھ آدمی خاموش سر جھکائے براجمان تھے۔ میز کے آخری دونوں سروں پر ایک ایک بڑی کرسی پڑی تھی۔ آمنے سامنے کی دونوں بڑی کرسیاں

خالی تھیں۔ کمرے میں تین دروازے کھلتے تھے۔ بڑی کرسیوں کے عقب میں ایک ایک دروازہ تھا۔ تیسرا دائیں طرف دیوار کے وسط میں تھا۔ کمرے کی چار کھڑکیاں تھیں جنہیں لوہے کی موٹی سلاخوں سے بند کیا گیا تھا۔ چھت سپاٹ کسی بھی اضافی چیز سے عاری تھی۔

کمرے میں گہرا سکوت اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آٹھ زندہ انسانوں کی موجودگی بھی گہرے سکوت میں مخل نہیں ہو رہی تھی۔ ان سب پر گہری سوچ کا جمود چھایا ہوا تھا۔ ایک کو دوسرے، دوسرے کو تیسرے کی کوئی خبر نہیں تھی۔ سانسوں کا مدوجزر معمول کے گراف سے نیچے تھا۔ نصف گھنٹے کے بعد بڑی کرسی کے عقب کا دروازہ کھلا۔ دروازے کی چرچراہٹ اور آنے والے کے قدموں کی چاپ سے آٹھ انسانوں کے اندر پہلی بار حرارت کا احساس جاگا۔ دروازے سے دراز قد شخص نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا کرسی کے پاس پہنچا۔

”گڈ مارننگ ایوری باڈی۔“ اس نے کرسی سنبھالتے ہوئے پراعتماد لہجے میں کہا۔

”گڈ مارننگ مسٹر ڈیوڈ۔“ سب نے یک زبان جواب دیا۔ آٹھ سنجیدہ چہروں پر ڈیوڈ نے طائرانہ نظر ڈالی ان سب کی نظروں کا محور ڈیوڈ تھا۔

”مسٹر ڈیوڈ! ہم اس اچانک کال کا مقصد سمجھ نہیں پائے؟“ ڈیوڈ کے بائیں جانب کی لائن کے تیسرے شخص نے پوچھا وہ پچاس پچپن سال گوری رنگت، مناسب جسم کا مالک شخص تھا۔

”مسٹر رابرٹ! آپ سب کو اچانک جمع کرنے کا مقصد اس مشن سے آگاہ کرنا ہے جو ہم سب کے لیے ناگزیر ہے۔“

”ایسا کون سا مشن ہے ڈیوڈ؟ جس کے حصول کے لیے ہمارا مل بیٹھنا ضروری ہے؟“ دائیں جانب کی لائن سے پہلے شخص نے پوچھا۔ جسامت کے اعتبار سے وہ دبلا پتلا شخص تھا، چہرہ چوڑا، ناک چپٹی اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔

”مسٹر ڈیوڈ وکٹری مارک ایک ہونے کے باوجود ٹریک پر بہرحال الگ الگ ہی دوڑا جاتا ہے۔ جس میں جتنی ہمت اور طاقت ہو وہ منزل کو پہلے پالیتا ہے۔“ چوتھا شخص بولا اس کے چہرے پر کرختگی نمایاں تھی بیٹھنے کا انداز ایسا تھا جیسے ابھی اٹھ کر چلا جائے گا۔

”مسٹر تھامس! ہم اس کی نوعیت بدل سکتے ہیں اگر ہم باہم اتفاق کریں تو ہزاروں کھلاڑیوں کی دوڑ میں ہم نو افراد ہی وکٹری اسٹینڈ کا حصہ بنیں گے۔“

”تم بھول رہے ہو ڈیوڈ! وکٹری اسٹینڈ پر صرف ایک کھلاڑی ہوتا ہے نو نہیں۔ ہاں دواس کے دائیں بائیں ضرور ہوتے ہیں مگر وہ بھی بہرحال نیچے ہوتے ہیں۔“ مخنی صورت کا شخص بولا اسے دیکھ کر اس پر ترس آتا تھا۔

”درست ہے مگر آپ نے میری بات پر غور نہیں کیا ہم بنیادی نوعیت کو بدل دیں گے ایسے کہ وکٹری اسٹینڈ پر نو افراد کا حق بن جائے گا۔ کیونکہ اس کھیل میں لاکھوں کا مقابلہ ہے چند دہائیوں کا نہیں۔“

”آپ زمین پر بیٹھ کر آسمان کے خواب دیکھ رہے ہیں ڈیوڈ۔“

”نہیں میں اس سے بھی آگے دیکھ رہا ہوں۔“ ڈیوڈ کے پراعتماد لہجے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

”تمہاری بصارت خوش فہمی اور سوچ غلط فہمی کا شکار تھی ہے۔“ تھامس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

”اگر میری بات کو صبر و تحمل سے سنیں، تبھی تو میری سوچ کا حصہ بن جائیں گے۔“ ڈیوڈ کے اعتماد میں کمی نہیں آ رہی تھی۔

”میں اپنے دلائل سے ثابت کروں گا کہ میں نے رائٹ وے کا انتخاب کیا ہے۔“

”مگر اس بات کو مدنظر رکھنا چاہیے ہم ہر لحاظ سے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ بائیں طرف سے اعتراض آیا۔ ہمارے نظریات، عقائد، مذاہب، حتیٰ کے ملک بھی الگ الگ ہیں۔“

”میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ یہ سرین۔ ہم

ہر لحاظ سے مختلف سمتوں میں چلنے والے لوگ ہیں مگر......" ڈیوڈ چند ثانیے رکا۔

"ہمارے مقاصد ایک ہیں۔"

"یہ کیسی احمقانہ باتیں ہیں ڈیوڈ؟ مختلف سمتوں میں چلنے والے لوگوں کے مقاصد کیسے ایک ہو سکتے ہیں؟ وہ بھی ایسے کہ نظریات، عقائد، مذاہب اور ملک بھی الگ ہوں؟" رابرٹ فوراً بولا۔

ڈیوڈ نے اس کے اعتراض کو نظر انداز کرتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"تیس منٹ پہلے آپ لوگ یہ باتیں کرتے تو میں آپ کا ہمنوا ہوتا مگر اب نہیں۔ تیس منٹوں میں دنیا نے کون سی کروٹ لی ہے ڈیوڈ؟"

"تیس منٹ پہلے ڈیوڈ یہاں نہیں تھا۔" اب کہ ڈیوڈ نے باری باری سب کو دیکھا۔

"میرے پاس ایسا منصوبہ ہے جو آپ سب کو ہلا کر رکھ دے گا۔"

"میرے خیال میں تو دی پوائنٹ بات کی جائے۔" بائیں طرف کی آخری کرسی پر بیٹھے شخص نے پہلی بار اس بحث میں حصہ لیا تھا۔ وہ باڈی لینگویج سے خاصا بیزار دکھائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے زبردستی میٹنگ میں بٹھایا گیا ہے۔

"اوکے مسٹر کینیڈی! مبہم بات کرنے سے بہتر ہے کہ اوپن بات کی جائے۔" ڈیوڈ نے طویل سانس خارج کی۔ لحظہ بھر رک کر آٹھ چہروں کو نظروں میں تولا۔ "میرا منصوبہ یہ ہے کہ ہم نے......" ڈیوڈ کی پہلی بات سن کر آٹھ انسان ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے۔ وہ بے حس و حرکت سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھا ڈیوڈ کو حیرانگی سے دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

"شانی کہاں تھے تم؟"

"پاپا! جنگل میں تھا شکار کھیلنے گیا تھا۔"

"شانی! کئی بار منع کیا ہے تمہیں اکیلے مت جایا کرو تم جانتے بھی ہو وہ کتنے خطرناک جنگل ہیں۔"

"پاپا! جب سے سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا ہوں یہی سنتا آ رہا ہوں۔ بہت خطرناک جنگل ہیں۔ جنگل کے ملحق پراسرار پہاڑیاں ہیں مگر سترہ برس بیت گئے ہیں آج تک میں کوئی خطرناک یا پراسرار چیز نہیں دیکھی۔"

"حادثہ ایک روز ہوتا ہے جتنا روز روز نہیں ہوتا۔ تمہیں پتہ ہے ہم بارہ آدمی تمہیں چار گھنٹے کھوجتے رہے ہیں۔ جنگل اور پہاڑوں میں ہم پریشان حال گھومتے رہے اور یہاں گھر میں تمہاری بہنیں اور ممی نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا انہیں ڈر تھا کہیں تم جنات کی پہاڑیوں کی طرف نہ نکل گئے ہو۔"

"سوری پاپا۔" شانی نے ممی اور بہنوں کو دیکھا اسے احساس ہو رہا تھا کہ واقعی وہ غلطی پر ہے۔ کنزہ اور منزہ اس کی دو جڑواں بہنیں تھیں ان دونوں اور ممی کی سرخ آنکھیں اسے احساس دلا رہی تھیں کہ وہ انہیں مسلسل چار گھنٹے رلاتا رہا ہے۔

"آئیم سوری ممی۔" شانی نے ممی کے ہاتھ تھام لیے۔ ممی نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر اور پیار سے بولیں۔

"اٹس اوکے شانی بیٹا میرا بیٹا بھوکا ہوگا میں کھانا لگوا دیتی ہوں تم کھانا کھاؤ اور کچھ دیر آرام کرو۔"

"شانی تم فریش ہو کر کمرے میں ہی رہنا میں کھانا وہیں لے آتی ہوں۔" کنزہ نے آگے بڑھ کر اسے بتایا۔ منزہ اس کے عقب میں آ کر بولی۔

"پوچھو گے نہیں کھانے میں کیا بنا ہے؟"

"آپ ہی بتا دو۔" شانی نے گھوم کر کہا۔ اس کی پشت ممی کی جانب اور چہرہ منزہ کی طرف ہو چکا تھا۔ ممی اس کے شانوں سے گرد جھاڑنے لگی۔

"ہم نے وہی بنایا ہے جو تم شکار کر کے لائے ہو۔"

"سچ......؟" شانی کے چہرے پر خوشی کی تازہ لہر دوڑ گئی تھی چار گھنٹوں میں شانی نے جنگلی کبوتر، تیتر اور کچھ چکور تو مار ہی لیے تھے۔ ساتھ میں ایک ہرن کا بھی شکار کیا تھا۔ اس نے منزہ اور کنزہ کو انتہائی پر مسرت نگاہوں سے دیکھا اور پھر ممی اور پاپا کو تصدیق آمیز نگاہوں سے پوچھا۔

"ہاں بھئی شانی ہمارے بیٹے نے اکیلے جرأتمندی سے شکار کیا ہے، ہم بھلا کیسے ووٹ نہ بنائیں۔" پاپا نے مسکراتے ہوئے تصدیق کردی تھی۔ "ایک بات ہے کلثوم بیگم تمہارا بیٹا کمال کا نشانہ باز ہے، رحیم اور عظمت کہہ رہے تھے اس نے ہرن کو ایک ہی فائر سے مار گرایا تھا۔"

"پاپا! آخر بھائی کس کا ہے۔" منزہ نے تفاخر آمیز لہجے میں باور کرایا۔

"میرا......" کنزہ فوراً آگے بڑھی سارا کریڈٹ لینے پر منزہ اسے گھور کر رہ گئی۔ پاپا اور ممی مسکرا رہے تھے شانی کے چہرے پر شادمانی کی لوئیں پھوٹ رہی تھیں۔

"اچھا بیٹا تم جاؤ فریش ہو جاؤ اور چینج کرلو دیکھو تمہاری شرٹ بازو سے پھٹ گئی ہے۔"

"ممی جنگل بے حد گھنا اور گنجان ہے، کانٹے دار جھاڑیاں اور قد آور گھاس تو آتی ہے کہ راستے بھائی نہ دیں۔ اوپر سے بڑے بڑے پتھر جابجا ملتے ہیں۔"

"تمہارے پاپا بتاتے ہیں بیٹا بہت خطرناک جنگل ہیں اس لیے آئندہ وہاں مت جانا۔" ممی نے اس کے گال تھپتھپائے۔

"خطرناک ضرور ہوں گے ممی مگر جنگل میں بہتی آبشاروں کا اپنا ہی نظارہ ہے۔"

"وہ آبشاریں نہیں نہریں ہیں بیٹا جنگل کے ساتھ جڑے ہوئے پہاڑ ہیں پہاڑوں سے آبشاریں گرتی ہیں اور جنگل میں نہریں بن کر بہتی ہیں۔" پاپا نے اس کی اصلاح کی۔

"شانی بیٹا تم شکار کے بہت شوقین ہو ویک اینڈ پر پاپا کے ساتھ چلے جایا کرو ہر دوسرے تیسرے ویک اینڈ پر جاتے ہی ہیں۔"

"کیا واقعی ممی؟" شانی خوشی سے اچھل پڑا پاپا کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"پاپا! میں آپ کے ساتھ شکار کے لیے جا سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا اس بار تمہیں ساتھ لے کر جائیں گے...... خوش؟"

"اوہ ویری نائس۔ آر یو گریٹ پاپا۔" وہ پاپا سے چھوٹے بچے کی طرح لپٹ گیا۔ "آئی لو یو پاپا۔"

"لو یو ٹو بیٹا۔ اب جاؤ تمہیں بھوک لگی ہوگی۔" پاپا نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"کنزہ بیٹا! تم شانی کا کھانا اس کے کمرے میں پہنچا دو۔"

"او کے پاپا۔" کنزہ منزہ اور شانی کمرے سے جا چکے تھے۔

"آپ کو پتہ ہے شانی شکار کا بے حد شوقین ہے اسے اپنے ہمراہ لے جایا کریں ورنہ یہ اسی طرح اپنا شوق پورا کرتا رہے گا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو بیگم اس ویک اینڈ پر کوئٹہ سے میرا دوست اظہر بلوچ آرہا ہے ہمارا شکار کا پروگرام طے ہے شانی کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔"

کنزہ اور منزہ بانس کی فصل کی طرح قد نکالے کھڑی ہیں اوپر سے جڑواں بھی ہیں ادھر پڑھائی مکمل ہوئی ادھر دونوں کے ہاتھ پیلے کردیں گے گھر کی رونق شانی سے وابستہ ہے کامران اور اذان تو آنے سے رہے۔ کلثوم بیگم کے لہجے میں اداسی در آئی تھی۔

"بیگم ہم بچوں کی خوشی میں خوش ہیں۔ دیکھا جائے تو کامران اور اذان بیٹے کا شہر میں رہنا ان کی مجبوری بن گیا تھا۔" میجر ریٹائرڈ اسد محمود خان نے بیگم کلثوم اسد کی طرف تسلی آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"ان کا شہر جانا مجبوری تھا۔ یا ہمارا ان کے بغیر رہنا مجبوری ہے۔ یہ طے کرنا مشکل ہے۔" بیگم کلثوم کا لہجہ گلوگیر تھا۔

"بیگم تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ ہمارے بچے اپنی فیملیوں کے ساتھ اتنی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

"اس بات پر بہت خوش ہوں۔ میرے دونوں بڑے بیٹے اپنی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ مرضی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر اس بات پر کیسے خوش رہوں ہم ان

کی قربت سے محروم ہیں۔ یہ اتنی بڑی حویلی بچوں کے بغیر سونی اور بے رونق لگتی ہے۔" بیگم کلثوم نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

"ارے بیگم شانی، کنزہ اور منزہ کیا یہ بچے نہیں۔ یہ ہمارے بچے ہیں۔ میں بچوں کے بچوں کی بات کر رہی ہوں۔ اس گھر میں ہمارے پوتے گلزار اذان کی قلقاریاں گونجتی تو کتنا اچھا لگتا۔ حویلی کے ہال میں ثمینہ کامران کی شرارتی ہوتیں..." بیگم کلثوم کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

"بیگم یہ خواہشیں سنبھال رکھو ان شاء اللہ شانی کی اولاد تمہاری یہ حسرتیں پوری کر دیں گی۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ ہم شانی کی خوشیوں تک زندہ رہیں۔ اب تو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ خدانخواستہ شادی کے بعد یہ بھی پرواز نہ کر جائے۔"

"بیگم اب تم دل میں وہم پالنے لگی ہو تم اب واقعی ہی بوڑھی ہو رہی ہو۔" اسد محمود نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا من گھر میں خوش رہتا ہے اور آپ کا من زمینوں میں۔"

"ارے بیگم زمینیں ہمارا مان ہے۔ نثار پور کا پورا ایک حصہ ہماری ملکیت ہے جو ہمارے لیے قابل فخر بات ہے۔"

"اس فخر نے ہی آپ کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں ورنہ ہم بھی اذان اور کامران کے ساتھ شہر میں رہ سکتے تھے۔"

"بیگم ایک بات یاد رکھنا' یہ حویلی تمہارا گھر' تمہاری عزت' تمہارا وقار اور مان ہے۔ اپنا گھر انسان کا بھرم رکھتا ہے۔ شہر میں جو دو گھر ہیں وہ تمہارے نہیں تمہارے بیٹوں اور ان کے بیٹوں کے ہیں۔" اسد محمود خان نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ بیٹوں کے گھر والدین کے لیے پرائے نہیں اپنے ہوتے ہیں' اذان اور کامران ہمارا خون ہیں' آپ ان کے گھروں کو پرایا سمجھ رہے ہیں۔" بیگم کلثوم نے ناراض لہجے میں کہا۔

"تم میری بات کو سمجھ نہیں پائیں میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا..... اچھا چھوڑو اس قصے کہانی کو تمہارے بیٹے کی تلاش میں سر درد کر رہا ہے کڑک کافی پلا دو پلیز۔" اسد محمود نے موضوع بدلنا بہتر سمجھا۔

"آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں ابھی لاتی ہوں۔" بیگم کلثوم چونک کر بولیں

وہ تیزی سے کچن کی طرف بڑھیں اسد محمود خان نے پرسوچ انداز میں آنکھیں بند کر لی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

گرو نے نام بتایا تو چیلے حیرانگی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر چہ مگوئیاں ہوئیں شور شرابا ہوا موجوں میں تیزی آئی پھر چیلوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

"گرو جی! اس گروہ کو ہم انگلیوں پر گھمی کا ناچ نچا دیں گے۔ آپ ہم کو حکم دیں ان کی ہمارے سامنے کیا وقعت۔"

"بظاہر ایسا ہے اور نہیں بھی۔ کچھ حقیقتیں بڑی تلخ ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمیں انہیں نچانے کے لیے خود بھی ناچنا ہوگا۔" گرو کی بات چیلوں کے پلے نہیں پڑی تھی۔

"سنو! دنیا میں اربوں کھربوں کی تعداد میں انسان بستے ہیں۔ ہزاروں مذاہب ہیں، لاکھوں فرقے ہیں، کروڑوں کی تعداد میں ایسے بھی انسان ہیں جنہیں مذہب نام کی چیز کا کچھ پتہ نہیں۔ وہ دھرتی کے لیے بے ضرر ہیں۔ وہ ہو کر بھی نہ ہونے کے برابر ہیں اس لیے پوری انسانیت ہمارا ہدف نہیں' نہ سارے مذاہب ہمارا ہدف ہیں بلکہ چند مخصوص مذاہب ہمارے عتاب کا نشانہ بنیں گے۔ ان کی بھی مختلف کیٹیگریز ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو خود بخود پکے ہوئے پھل کی طرح ہماری گود میں آ گرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جن پر ہمیں تیس سے چالیس فیصد کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد وہ ہمارے

ہمنوا ہوتے ہیں۔ اب آتے ہیں اس مذہب کی طرف جو اس مشن میں ہماری ہٹ لسٹ پر ہے۔" گرو کا لیکچر ماہر معلم کی طرح جاری تھا۔ چیلے ہمہ تن گوش تھے......

"اس مذہب کو ہمیں اپنا ہمنوا بنانے کے لیے ہر دن، ہر لمحہ، ہر گھڑی پوری یکسوئی کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔"

"گرو جی! جس گروہ کا آپ نے تذکرہ کیا کیا وہ بھی اس مذہب کی پیداوار ہے؟"

"ہاں وہ اس مذہب کا اہم حصہ ہیں۔ یوں سمجھ لو ریڑھ کی ہڈی ہے۔ جسے ہم نے توڑ دیا تو مذہب کا پورا جسم بے کار ہو جائے گا تب ہمارا وہ خواب سو فی صد مکمل ہو جائے گا جو ہم نے دیکھ رکھا ہے۔"

"گرو جی! وہ اتنے کامل انسان ہیں کہ آپ بھی ان سے خوف محسوس کرتے ہیں؟"

"وہ من کے انسان ہیں۔ من کے انسان خواہشات کے غلام نہیں بنتے۔ خواہشات کو غلام بنا کر خود حاکم کی کرسی پر فائز ہو جاتے ہیں۔ وہ فتح و نصرت، کامیابی، ترقی اور منزل مقصود تک پہنچانے والے چاروں ٹائروں علم، تقویٰ، جہاد اور دعوت کو زندگی کی گاڑی میں فٹ کر کے چلتے ہیں۔"

"گرو جی! یہ درس ان کے پورے مذہب کا ہے یا فقط من کے انسانوں کا اپنا طرز زندگی ہے؟"

"گروہ کا نہیں مذہب کا درس ہے بس اسے اپنانا کوئی کوئی ہے۔ ورنہ ہمیں ارتدادی فکر کے شکار نام نہاد مذہب کے پیروکار بھی بہت مل جاتے ہیں۔ نااہل، مفاد پرست، مذہب سے دور افسانوی دنیا کے پابند اور جدید دنیا کے رنگوں میں رنگے لوگ بھی اسی مذہب کا حصہ ہیں اور وہی ہماری سیڑھی ہیں۔"

"ہماری سیڑھی؟" چیلوں نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

"ہاں ہم انہیں استعمال کر کے من چاہے نتائج حاصل کریں گے مذہب کے تمام من کے انسانوں سے ان کا نظم و ضبط، تعلیم و تربیت، اعلیٰ اخلاقیات، بلند نظری، صبر و تحمل، اجتماعیت، تقویٰ اور وہ سب کچھ دھیرے دھیرے ضبط کر لیں جو انہیں ہم سے اعلیٰ و ارفع بناتی ہے۔ ان میں خدا بیزاری اور مادہ پرستی کوٹ کوٹ کر بھر دیں گے۔ دنیا کی فانی روشنیوں کو اس قدر روشن کریں گے کہ وہ انہیں دائمی سمجھ کر اس کی چکاچوند میں ڈوب کر رہ جائیں گے۔"

"گرو جی! ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

"پھیل جاؤ پوری دنیا میں اور انہیں اپنا غلام بنا لو۔ یاد رکھو تم میں سے جو بھی اچھا کام کرے گا وہ میرے اتنا ہی نزدیک ہوگا۔ میرے ساتھ اس تخت پر ہوگا۔ یہ گاؤ تکیے اسی لیے ہیں۔ بس مجھے دنیا اپنی مٹھی میں چاہیے۔"

"ہم حاضر ہیں گرو جی! ایسا ہی ہوگا کیونکہ زمین و آسمان میں ایک ہی حاکم ہے اور وہ آپ ہیں گرو جی۔"

"حق گرو، سچ گرو، بے شک گرو۔" چیلے جوش و خروش میں نعرہ بازی کر رہے تھے۔ اس کے پانی میں ٹھہراؤ آ گیا تھا اور وہ پانی کے اوپر کھڑے تھے۔ گرو فخریہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا گرو جانتا تھا لاتعداد چیلوں کی مدد اور بے پناہ مادی قوت سے وہ پوری دنیا کا کنٹرول حاصل کر لے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

"میں کئی دنوں سے محسوس کر رہی ہوں آپ کچھ پریشان رہتے ہیں؟"

"تمہارا وہم ہے بیگم۔"

"پچیس سال بیت گئے ہیں آپ کے ساتھ ہر ادا سے واقف ہوں۔ غم و خوشی کی ہر حرکت نوٹ کر سکتی ہوں۔"

"وہم اس لیے کہا کہ کوئی بڑی پریشانی نہیں ہے۔ بزنس کے سلسلے میں چھوٹی موٹی پریشانیاں آتی ہی رہتی ہیں۔" صداقت علی خان نے بیگم کو مطمئن کرنے کی غرض سے کہا۔ ورنہ بیگم کا خدشہ درست تھا۔

"ایک اسائنمنٹ بھیجی تھی چند غلطیوں کے سبب گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ آپ ماشاء اللہ ماہر بزنس مین ہیں۔" بیگم نے کھوجتی نگاہ صداقت خان

کے چہرے پر ڈالی۔

"ماہر بزنس مین ضرور ہوں۔ مگر ایک انسان بھی ہوں' غلطیوں کا مجموعہ۔" صداقت خان نے چہرے کو حتی المقدور کوشش سے نارمل رکھا۔

"ویسے آپ اچھے اور کامیاب بزنس مین ضرور ہیں پر اچھے اداکار نہیں۔"

"جو تم سوچ رہی ہو ویسا نہیں ہے۔ تمہیں پتہ ہے میں حقیقت پسندانہ طبیعت کا مالک ہوں۔ میں مسکراہٹ کے پردے میں غم نہیں پال سکتا۔"

آپ جو بھی کہیں پریشانی آپ کے چہرے سے ہویدا ہے۔ ہم نے آج تک دکھ سکھ اکٹھے دیکھے ہیں۔ پلیز مجھے بتایئے مسئلہ کیا ہے؟" بیگم بضد تھیں۔

"ایسی کوئی بڑی پریشانی ہوتی تو تم سے ضرور شیئر کروں گا۔ بس وہی غلط اپائمنٹ کی ہلکی سی پریشانی ہے۔ آج آفس ورک زیادہ تھا اس لیے تھکاوٹ بھی محسوس ہو رہی ہے۔" صداقت علی خان بیگم کو اصل وجہ نہیں بتا سکتا تھا۔

چائے بناؤں آپ لیے؟

"بہت اچھا ہوگا۔ اگر اس وقت بیگم کے ہاتھوں کی چائے مل جائے۔" صداقت خان نے تنہائی حاصل کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

"ابھی لائی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے بیگم کمرے سے باہر نکل گئیں۔ صداقت خان نے طویل سانس خارج کی اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ کر کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکا دیا۔ بیگم کا قیاس صد فیصد درست تھا۔ وہ بے انتہا پریشان تھا۔ پریشانی کی ایسی کڑوی گولی اسے دے دی گئی تھی جسے نہ وہ اگل سکتا تھا نہ نگل سکتا تھا۔ وہ بیچ منجدھار میں پھنسا ہوا تھا۔ فی الحال گھر کے کسی دوسرے فرد کو وہ اس کی لپیٹ سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے بچوں سے تو کیا بیگم سے بھی اپنی پریشانی کو مخفی رکھا تھا۔ تب تک بیگم کو اس راز میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا جب تک بیچ میں کوئی بہتری کا راستہ نہ نکالا جاتا۔ ایک ایسا راستہ جس پر پاؤں بکھرنے سے نہ صرف اس کا ضمیر مطمئن رہے بلکہ وہ اپنا مقصد بھی پا لے۔ چند مہینے پہلے تک وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص سمجھتا تھا۔ جس کے دامن میں ہمیشہ خوشیوں کا بسیرا رہا۔ وہ ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ پانچ اولادیں تھیں عاصمہ بیگم کی شکل میں بہترین جیون ساتھی تھا۔ خوشحالی تھی اور مسرتیں تھیں۔ مگر دو مہینے پہلے اسے امریکہ سے ایک کال موصول ہوئی تھی جس نے اس کی پرسکون زندگی میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس کے اندر ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ جس کے سامنے زندگی کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ صداقت علی خان عزم و ہمت کا پیکر بکھرنے لگا تھا۔ اس کی ساری خوشیاں اپاہج ہوگئی تھیں۔

چائے پی کر وہ گھر سے نکل آیا تھا۔ جیپ کی ڈگی میں سامان پڑا ہوا تھا۔ وہ سامان جو جوزف نے مانگا تھا۔ اسے سامان کی ڈیلیوری کرنا تھی۔ پچپن برس کی عمر میں وہ کبھی ان پراسرار پہاڑیوں کی طرف نہیں گیا تھا۔ سارے پراسرار قصے کہانیاں ادھر ادھر سے اس تک پہنچے تھے۔ صداقت خان کو خود ان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی تاہم اتنا ضرور جانتا تھا کہ شارپور کے لوگوں میں ان پہاڑوں کا ایک پراسرار خوف مسلط ہے اور وہ پہاڑیوں سے منسوب عجیب و غریب واقعات کا ذکر تسلسل سے کرتے رہتے ہیں۔ یہ جانکاری صداقت خان کے لیے جگہ کے انتخاب میں معاون ثابت ہوئی تھی۔ جب جوزف نے اپنے گروپ لیے ایسے ٹھکانے کا مطالبہ کیا تھا جو ہر لحاظ سے محفوظ بھی ہو اور طویل المیعاد بھی۔ صداقت خان کو پراسرار پہاڑیوں کے علاوہ کوئی دوسرا ٹھکانہ معیاری نہیں لگا گزشتہ دو ماہ سے پراسرار پہاڑیاں جوزف اینڈ گروپ کا مسکن بن چکی تھیں۔ بالفرض محال وہاں کوئی پراسرار واقعہ رونما ہوا تب بھی جوزف اور اس کا گروپ زد میں آئے گا۔ جو صداقت علی خان کے لیے سود مند رہے گا۔

جیپ کھردرے پہاڑی راستوں پر ہچکولے کھا رہی تھی۔ اتار چڑھاؤ خطرناک موڑ اور چھوٹے راستوں کے باوجود جیپ دو سو فٹ تک اوپر پہنچ جاتی تھی۔ اس کے بعد

جوزف نے حیرت انگیز انتظام کر رکھا تھا۔

صداقت علی خان نے مطلوبہ سامان جوزف کو تھمایا۔ سامان لے کر جوزف کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ کھل اٹھی تھی۔

"تم بہت اچھے جا رہے ہو صداقت خان تمہیں جو کچھ کہا جائے جانفشانی سے پورا کرتے رہو۔"

"جوزف ہم پاکستانی لوگ ہیں نفرت سے لے کر محبت تک جو بھی ہو جی جان سے کرتے ہیں۔ صداقت خان نے خشوع لہجے میں کہا۔

"مگر تم بالکل بھی اچھے نہیں جا رہے ہو۔"

جوزف نے چونک کر اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ پہاڑوں پر روانی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے گھاس اور پودوں کی متفرق خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ صداقت خان کہہ رہا تھا۔

"دو مہینے ہوئے ہیں میں نے آپ کی ہر بات پر بلا چوں چرا عمل کیا ہے۔ مگر آپ نے میری ایک بات نہیں مانی۔"

"کون سی بات؟"

"میں امریکا بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"صداقت خان گو کہ میں تمہاری بات ماننے کا پابند نہیں ہوں مگر پھر بھی ایک ہفتہ مزید صبر کرو اس ویک اینڈ پر تمہاری بات کروا دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"مجھے اُمید ہے کہ آپ اپنے وعدے کے پکے نکلو گے۔"

بالکل۔" جوزف نے مختصر جواب دے کر اشارہ کر دیا تھا کہ اب وہ جا سکتا ہے۔

ہمیشہ کی طرح وہاں سے لوٹتے ہوئے صداقت خان اس دن بھی بہت اداس اور پریشان تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

وہ صبح سویرے جاگ کر اٹھ بیٹھا۔ شاید تاخیر ہو چکی ہے۔ یہ پہلا احساس تھا۔ مجھے آج اپنے نئے مشن پر نکلنا ہے۔ عجلت میں اٹھتے ہوئے یہ دوسرا احساس تھا۔

دوسرے احساس نے اس کے اندر برقی رو دوڑا دی تھی۔ وہ چند منٹوں میں جنگل کے بیچوں بیچ تھا۔ چلتے ہوئے اس کا ذہن مکمل طور پر اپنے مشن پر فوکس تھا۔ گرو جی نے اسے مشن سونپا تھا جسے وہ ہر حال میں پایۂ تکمیل تک پہنچا کر گرو جی سے داد و تحسین وصول کرنا چاہتا تھا۔ گرو نے کہا تھا جو بھی دیئے گئے کام کو حسن و خوبی پورا کرے گا وہ میرا بہت قریب ہوگا۔ میرے ساتھ تخت پر بیٹھے گا۔ وہ گرو کا قرب چاہتا تھا۔ دوسرے چیلوں میں نمایاں نظر آنا چاہتا تھا۔ گرو کے تخت پر بیٹھ کر خود کو قابل فخر بنانا چاہتا تھا۔ چلتے ہوئے وہ مشن کے اہم نقطوں پر غور و خوض کر رہا تھا۔ بظاہر یہ کام اس کے لیے انتہائی سہل تھا۔ اس سے پہلے وہ مشکل ترین کام با آسانی نمٹا چکا تھا اور بار ہا گرو کی نظروں میں کرتب بھی دکھا چکا تھا۔ مگر مذکورہ کام کی تکمیل اسے گرو کا قرب بخش سکتی تھی۔ گرو نے قبل از وقت اسے اپنے قرب کی نوید سنا دی تھی۔ وہ متفرق سوچوں میں گرا ہوا چہرہ لیے جا رہا تھا۔ ایک دم چلتے چلتے اسے پراسراریت نے آلیا تھا وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ ذہن سوچوں سے نکل کر حقیقی دنیا میں پلٹ آیا نظروں نے دائیں بائیں آگے پیچھے تیزی سے دیکھا وہ جہاں تک دیکھ سکتا تھا وہاں تک دیکھ لیا۔ اس کے ہر طرف حیرانی پھیلی ہوئی تھی۔ چاروں طرف دنگ کر دینے والی حیرانی وہ اپنے مسکن سے نکل کر گھنے جنگل میں آیا تھا ایک ایسا گھنا جنگل جس میں چلنا اس کے سوا کسی کے لیے بھی انتہائی دشوار تھا۔ وہی گھنا جنگل اس وقت میدان بنا ہوا تھا۔ دیو ہیکل درخت بلند و بالا درخت زمین بوس تھے۔ خون خوار جانور، پرندے، کیڑے مکوڑے سب ہی زمین بوس تھے۔ اس نے ہراساں خوف کی نگاہوں سے یہ مناظر دیکھے۔ اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ یہ عجیب و غریب چوٹشن وہ قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ حیران و پریشان تھا۔ اتنا بڑا گھنا جنگل سارے کا سارا زمین بوس ہوا پڑا ہے اور کسی کو کچھ پتہ نہیں۔ سوچ خوف بن کر اس کے دماغ کی چولیں ہلانے لگی تھی۔ وہ خود پراسراریت کا مجموعہ تھا۔ مگر اس صورت حال کو قبول

نہیں کر پا رہا تھا۔ چند منٹوں میں خوف اس پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ جس مشن کی کامیابی کے لیے وہ پلان ترتیب دے رہا تھا۔ خوف نے وہ سب غبارے سے نکلی ہوا کی طرح ذہن سے محو کر دیا تھا۔ وہ اپنا مقصد بھول گیا تھا۔ وہ سرپٹ بھاگ پڑا۔ تب تک بھاگتا رہا جب تک گرو کی محفل میں جا نہ پہنچا۔

گرو کی محفل روایتی انداز میں بام عروج پر تھی۔ ان گنت چیلوں کی موجودگی میں اس نے سارا ماجرا من و عن گرو کے گوش گزار کر دیا تھا۔ گرو نے اس کی بات کے اختتام پر گرو نے بلند قہقہہ لگایا۔ گرو کی ہنسی میں تیزی آتی دیکھ کر بھی چیلے بھی ہنسنے لگے اس کے سوا وہاں ہر کوئی بلند قہقہے میں ہنس رہا تھا۔ وہ بے وقوفوں کی طرح انہیں دیکھ کر شرمندہ ہو رہا تھا۔

"ہم کل کائنات کے گرد ساری مخلوقات سے افضل، زمین و آسمان پر حکومت کے خواب دیکھنے والا گرو اور گرو کا ایسا چیلا۔" گرو نے استہزائی طنزیہ انداز میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ شرمندگی سے پانی پانی ہو گیا تھا۔ کروڑوں چیلوں کی طنزیہ نگاہیں اسے بدن کے آر پار محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ جیت سے پہلے ہار گیا تھا۔ گرو نے ایک اشارہ کیا۔ اشارے پر یکدم گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ قہقہوں کو بریک لگ گئی تھی۔ وہ اس سے مخاطب ہوا۔

"سنو سیلیا تم میرے نائب ہو میں جہاں کہیں کسی بھی چیلے کی ڈیوٹی لگاتا ہوں تو وہ میرا نائب ہوتا ہے دوسرے لفظوں میں طاقتور ترین ناقابل شکست اور مافوق الفہم صلاحیتوں کا مالک۔ پھر وہ کیسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوف محسوس کرے۔"

سیلیا کو احساس ہوا کہ گرو ٹھیک کہہ رہا ہے بجائے اسے خوف کھانے کے اسے وہاں سوچنا چاہیے تھا کہ وہ سب کیا ہے؟

"سیلیا جو کچھ تم نے دیکھا وہ تیرے لیے نہیں ہے جن کے لیے ہے وہ دیکھنا نہیں چاہتے۔ جو دیکھنا چاہتے ہیں وہ سمجھ نہیں سکتے اور جو دیکھ کر سمجھ سکتے ہیں میں انہیں ایسا کرنے نہیں دیتا۔"

"میں سمجھا نہیں گرو جی۔" سیلیا نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی کم علمی کا اظہار کر دیا تھا۔

"تو تجھے کا بھی نہیں اور جو چیز تیرے لیے ہے نہیں اس کا سمجھ لینا تیرے لیے ضروری نہیں۔ تو ان باتوں پر توانائی ضائع مت کر اسے مت دیکھ بلکہ اسے دیکھ جو تیرے حوالے کیا گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے گرو جی آئندہ ایسا نہیں ہوگا بلکہ وہ ہوگا جیسا آپ چاہتے ہیں۔"

"لہٰذا اب تم جا سکتے ہو۔" گرو نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ سیلیا نے گرو کی قدم بوسی کی اور ایک بار پھر اپنے مشن پر نکل کھڑا ہوا۔

☆☆☆☆☆☆☆

"کیا ایسا ممکن ہے مسٹر ڈیوڈ...؟" آٹھ افراد ورطہ حیرت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انہیں ڈیوڈ کی بات دیوانے کا خواب لگ رہی تھی۔

"مجھے یہ ناممکن لگتا ہے۔" کیمرن نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے برملا اظہار کر دیا تھا۔

"یہ ایک انسانی سوچ تو ہو سکتی ہے حقیقت ہرگز نہیں۔" تھامس نے الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ کیمرن کی تائید کی تھی۔

"تخیل اور صلاحیت میں فرق ہوتا ہے مسٹر تھامس میں نے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لا کے منصوبہ ترتیب دیا ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں یہ گورکھ دھندہ ہے۔" ڈیوڈ نے پراعتماد انداز میں کہا۔

ہم چاہیں گے ڈیوڈ آپ اس پر مکمل روشنی ڈالیں۔ کیمرن نے کہا۔

"ہم یہاں دنیا کے نو اہم ترین ملکوں کے نمائندے تنظیم ہیں۔ معیشت، وسائل اور ٹیکنالوجی ان نو ممالک کے پاس موجود ہے۔ ماہر معاشیات مسٹر رابرٹ آپ کے پاس ہیں، ذہین ترین سائنسدان تھامس کے پاس، بہترین عسکری قیادت کیمرون کے پاس ملتی ہے، ذہانت

اور بہترین تکنیکی صلاحیتیں مسٹر لی چنگ کے پاس ہیں، جدید ترین ٹیکنالوجی مسٹر پیٹرسن کے ملک میں ہے۔ غرض یہاں جو بھی موجود ہے اس کے ملک کے پاس کوئی ایک خاص چیز ضرور ہے جو دوسرے ملک کے پاس نہیں۔ یہ تمام چیزیں ہم میں تقسیم ہیں۔ اگر ہم اسے یکجا کردیں، یکمشت کردیں تو کیا ہوگا؟ اس کی میں ایک مثال دیتا ہوں۔ کمپیوٹر جدید ترین ایجاد ہے ہم انسانی دماغ کی پوری میموری جو تقریباً ایک سو ارب بلین خلیوں (Sells) پر مشتمل ہوتی ہے ان میں ہنڈرڈ بلین خلیے گفتگو کے لیے استعمال ہوتے ہیں ہم اس پوری یاد داشت کو کمپیوٹر پر ڈاؤن لوڈ کرسکتے ہیں اس کے بعد ایک مخصوص پروگرام میں انسانی یادداشت میں ایڈیٹنگ بھی کرسکتے ہیں۔ یعنی کانٹ چھانٹ اور کچھ نئی چیزوں کا اضافہ ہم اس یادداشت میں کچھ تھوڑی بہت خامی ہو تو اسے حذف کرسکتے ہیں اور کچھ مزید صلاحیتیں اس میں ایڈ کرسکتے ہیں مثلاً ہم ایک قابل اور اعلیٰ انجینئر کی یادداشت ڈاؤن لوڈ کرتے ہیں اس میں ممتاز سائنسدان اور ذہین ترین جرنیل کی یادداشت بھی اپ لوڈ کردیتے ہیں انہیں ایک پروگرام کے تحت باہم ضم کرتے ہیں پھر یہ مختلف آدمیوں کی یادداشت ایک ہوکر ایک ہی دماغ میں سینڈ کردی جائیں تو نتیجہ کیا ہوگا؟ ایک محیر العقول مہارت کا حامل شخص وجود میں آئے گا جو بیک وقت اعلیٰ انجینئر، ممتاز سائنسدان اور ذہین ترین جرنیل ہوگا۔ یوں ہم ایک مثالی آدمی سپر مین بنا سکتے ہیں۔ جو بیک وقت تمام تر صلاحیتوں سے مالا مال ہوگا۔ اس چیز کو مدنظر رکھتے اگر ہم تو ممالک کی صلاحیتیں ایک دوسرے میں ضم ہوجائیں......" ڈیوڈ نے چند ثانیے توقف کیا۔ پھر لہجے کو مزید پراسرار بناتے ہوئے بولا۔

"اس اشتراک سے ایک ایسی پاورفل طاقت معرض وجود میں آئے گی جو ناقابل شکست، ناقابل تسخیر اور ناقابل عبور ہوگی۔ کیا آپ لوگ میری باتوں میں دلچسپی لے رہے ہیں؟"

"بات جاری رکھیے ڈیوڈ ہم پوری توجہ سے سن رہے ہیں۔" پیٹرسن نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسٹر ڈیوڈ! آپ نے جو کمپیوٹر کے ذریعے سپر مین بنانے کی بات کی ہے کیا وہ محض مثال ہے یا ایسا حقیقت میں ہونا ممکن ہے؟"

"مسٹر تھامس یہ مثال نہیں بلکہ میرا ملک اس کا تجربہ کرچکا ہے اور آپ لوگوں کو جان کر خوشی ہوگی کہ ہم اس میں 90 فی صد کامیاب ہوچکے ہیں۔" ڈیوڈ کی بات پر اسے رشک آمیز نگاہوں سے دیکھا گیا تھا۔ تاہم تھامس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ ڈیوڈ کہہ رہا تھا۔

"جب ہم ایک ہوکر سپر پاور بن جائیں گے تب ہمارے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں رہے گا۔ ہم نے بری و بحری تمام وسائل پر قبضہ جمانا ہے۔ زمین کے چپے چپے پر اور اس کی تہ میں جو کچھ ہے سب تک رسائی حاصل کرنی ہے۔ سمندر کے نہاں خانوں میں اپنی طاقت کا سکہ جمانا ہے۔ خلاؤں کو تسخیر کرنا ہے زمین پر بشمول چاند کے تمام سیاروں پر حکمرانی کرنی ہے۔ ہم جدید ترین ٹیکنالوجی سے ایسی حیرت انگیز ایجادات کریں گے کہ ہمارے سوا دوسرا کوئی جواں ملک اس کا تصور بھی نہیں کرسکے گا۔ یہ ایسے ہی ہوگا جیسے زمین پر کھڑا شخص ہاتھ بلند کرکے آسمان کو چھونے کی جسارت کرے۔ ہم ترقی کی بلندیوں پر بیٹھ کر دوسروں کی بے بسی کا نظارہ کریں گے۔"

"مسٹر ڈیوڈ! آپ کے بیان کا پہلا حصہ روشن دن کی طرح عیاں ہے۔ اسے ہم مکمل طور سے سمجھ گئے ہیں آخری حصہ کسی نئے حصے کی تمہید ہے اس پر مزید روشنی ڈالیے۔" آخری کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

"میری ایک بات جدید ترین ٹیکنالوجی سے حیرت انگیز ایجادات پر توجہ دیں۔ بات واضح ہوجائے گی۔"

"مثلاً یہ حیرت انگیز ایجادات کون سی ہوں گی ڈیوڈ؟" تھامس نے زور دیتے ہوئے پوچھا۔ ڈیوڈ محسوس

کر رہا تھا کہ تجسس ضرورت سے زیادہ دل رہا ہے تاہم وہ نظر انداز کر رہا تھا۔

"میں آپ کی تشفی کے لیے ایک کا ذکر کیے دیتا ہوں۔ ورنہ یہ قبل از وقت ہے آپ سب برمودا تکون کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ برمودا ٹرائی اینگل ایک مقناطیسی تکون ہے اس میں انتہائی خطرناک اور ناقابل فہم لہریں پائی جاتی ہیں برمودا تکون میں پورے ہوائی جہاز اور بحری جہاز غائب ہو جاتے ہیں اصل میں وہ غائب نہیں ہوتے بلکہ ان حیرت انگیز لہروں کی زد میں آکر پگھل جاتے ہیں ان شعاعوں میں ایسی خطرناک طاقت پنہاں ہے کہ اگر انسانوں کے ہجوم پر ڈالا جائے تو پورا ہجوم جل کر راکھ ہو جائے۔ زیونگ جہاز بلند و بالا عمارتیں پگھل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ سرسبز و شاداب کھیتوں پر ڈالا جائے تو وہ راکھ بن جائیں اور زمینیں بنجر ہو جائیں۔ اگر ہم ان شعاعوں پر کنٹرول پالیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟" ڈیوڈ کا لہجہ آخر میں سوالیہ تھا۔

"مگر مسٹر ڈیوڈ برمودا تکون تو انتہائی خطرناک جزیرے ہیں۔ بقول آپ کے وہاں سالم ہوائی اور بحری جہاز تک جا کر غائب ہو جاتے ہیں یا لہروں کی زد میں آکر پگھل جاتے ہیں تو سوچنے کی بات ہے کہ ہم ان لہروں کو کیسے کنٹرول کریں گے؟"

"مسٹر لی چنگ! بے شک وہ تصور سے زیادہ خطرناک جزیرے ہیں مگر جو میں جانتا ہوں وہ کوئی اور نہیں جانتا۔" ڈیوڈ کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

"ہم آپ کی حیرت انگیز سوچ کے قائل ہیں ڈیوڈ" کینیڈی نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ دوسرے افراد کی آنکھوں میں بھی دلچسپی کے تمام عناصر جھلک رہے تھے۔

"کینیڈی! برمودا تکون کی یہ لہریں طاقتور ترین ذریعہ توانائی ہیں۔ ہم انہیں بروئے کار لا کر وہ کام کریں گے جو آج ناقابل یقین، ناممکن اور ناقابل فہم سمجھے جا رہے ہیں ہم انہیں منفی اور مثبت دونوں طریقوں سے استعمال کر سکتے ہیں مثلاً لہلہاتے کھیت پر ان لہروں کو ڈالا جائے تو وہ جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ مگر سوکھے اور بنجر کھیت پر ڈالا جائے تو وہ سرسبز و شاداب ہو جائیں گے۔"

"وہ سب تو بعد کی باتیں ہیں ڈیوڈ سوال تو یہ ہے لہریں خود ناقابل تسخیر ہیں۔ انہیں کیسے تسخیر کیا جائے گا؟"

"دیکھیے ان مافوق الفہم جزیروں کے درمیان اڑن طشتریاں اڑتی ہیں۔" ڈیوڈ کی بات نے ان سب کو ایک بار پھر چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ "اڑن طشتریاں ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے کا سفر کرتی ہیں سوچنے کی بات ہے اتنی خطرناک لہریں جو پورا بحری جہاز نگل لیتی ہیں وہ ان اڑن طشتریوں کو کیوں نہیں چھوتیں۔ وہ اڑن طشتریاں ان جزیروں میں اڑتی دیکھی گئی ہیں۔ سب سے اہم نقطہ وہ اڑن طشتریاں جو ان جزیروں کا سفر کرتی ہیں انہیں کون سی مخلوق اڑا رہی ہے؟" ڈیوڈ کی باتوں نے سحر انگیزی کا جال پھینک دیا تھا۔ وہ سب حیرت سے منہ کھولے ڈیوڈ کو دیکھ رہے تھے۔

"ہم نے اس مخلوق پر قبضہ کرنا ہے اس کے بعد برمودا تکون کی لہریں فتح کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔"

"آپ نے کمال کا نقطہ اٹھایا ہے ڈیوڈ مجھے لگتا ہے کہ ہم ان لہروں تک رسائی پا سکتے ہیں۔" ہم نے دوسرے لوگوں کی طرف رائے طلب نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بات کافی حد تک معقول ہے شاید ہم ایسا کر سکتے ہیں ہم۔" یوں نے تائید میں پہل کی تھی۔ جو ایک منٹ میں آٹھ دولوں میں بدل گئی تھی۔

"بالفرض ہم سب نے مل کر جدید ترین ٹیکنالوجی اور بے پناہ وسائل سے اڑن طشتریاں حاصل کر لیں، پھر شعاعوں پر بھی کنٹرول حاصل کر لیا تو کیا ہم اس سے دنیا میں تباہی پھیلا دیں گے؟ یا اس سے دنیا ہمیں اپنا آقا ماننے پر مجبور ہو جائے گی؟"

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ہم ان شعاعوں سے ابتدا میں بلکی پھلکی ایجادات کو سامنے لائیں گے جو ہمارے لیے ثانوی سطح کی ہوں گی جبکہ دنیا کے لیے جدید ترین اور حیرت انگیز ہوں گی۔ جسے دیکھ کر دنیا ہماری صلاحیتوں کی

متعارف ہوئی تب ہم اپنے معنوں میں ٹاپ یونیورسٹیاں، کالجز اور انسٹیٹیوٹ بنائیں گے۔ دنیا ہمارے دروازے پر دستک دے گی۔ اعلیٰ اقدار، بہترین انٹیلی جنس کے حامل ان کالجز، یونیورسٹیوں اور انسٹیٹیوٹ میں دنیا کے ذہین ترین دماغ داخلہ لیں گے اس کے بعد وہ ہماری پرکشش مراعات اور بہترین سہولیات زندگی کو پا کر ہمارے ہو کر رہ جائیں گے ان کی تمام صلاحیتوں کا ہم فائدہ اٹھائیں گے اور دنیا جس حالت میں ہے اسی حالت میں ہماری غلام ہوگی۔ ڈیوڈ نے اس بات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی باتوں میں بہت وزن ہے مسٹر ڈیوڈ۔'' کیم نے پہلی بار باقاعدہ اعتراف کیا تھا وہ میٹنگ کی ابتداء میں بیزار اور بے دلی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ تھامس کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں چھائی ہوئی تھیں۔ دیگر افراد بھی تجسس اور تحسین آمیز نگاہوں سے ڈیوڈ کو دیکھ رہے تھے۔

''مسٹر کیم! میں ایسا مربوط پلان بناؤں گا کہ کرۂ ارض پر چلنے والا ہر انسان خواہ وہ مرد ہے، عورت، چھوٹا بچہ ہے یا بوڑھا آدمی وہ پوری انفارمیشن کے ساتھ ہمارے سامنے ہوگا۔ ہم ایک بٹن پریس کریں گے اور جسے چاہیں گے اسے اس کے شخصی خاکے، پسند و ناپسند، رجحانات، نفسیات اور پوری تفصیل کے ساتھ سامنے لا کھڑا کریں گے۔''

''کیا ایسا ہو سکتا ہے مسٹر ڈیوڈ! کرۂ ارض کا ہر فرد ہمارے ایک بٹن پریس کرنے کا محتاج ہو؟''

''بالکل ہو سکتا ہے! اور یہ میں کر کے دکھاؤں گا۔ یہی نہیں آپ کسی بھی ملک کے پرائم منسٹر، صدر یا وزیر دفاع کو اس کی سالگرہ پر ایک تصویر پیش کریں گے اور اس کی وہ تصویر تب کی ہوگی جب وہ سات پردوں میں انتہائی پرسنل رہائش گاہ میں اخبار پڑھ رہا ہوگا۔ ڈیوڈ کے لہجے میں اعتماد اور فخر کی آمیزش تھی۔

''آپ کی یہ بات بھی بہت دلچسپ ہے ڈیوڈ۔''

''دلچسپ ضرور ہے مگر حیرت انگیز نہیں ہاں میرے پاس بہت سی ایسی باتیں ہیں جو واقعی حیرت انگیز ہیں۔ ہم وہ سب سننا چاہیں گے۔''

''محکمہ موسمیات کہے گا چین میں آج بارش ہوگی مگر ایسا نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہم ہونے والی بارش کو تھام لیں گے۔ محکمہ موسمیات اشارہ دے گا تیونس میں موسم خشک رہے گا دھوپ چمکے گی، بادلوں کا نام و نشان نہیں ہوگا بلکہ ہم وہاں بارش برسا دیں گے۔ دوسرے لفظوں میں ہم جسے چاہیں گے خوشحالی دیں گے جسے چاہیں گے قحط سالی بخشیں گے۔'' ڈیوڈ نے پراسرار انداز میں کہا۔ ڈیوڈ کی بات سن کر ایک بار پھر وہ ایک دوسرے کو دیکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

''معاف کرو ڈیوڈ یہ کام خدا کے ہیں ہم اور تم چاہے جتنی بھی ترقی کر لیں ہم انسان ہیں خدا نہیں۔''

''مسٹر تھامس اسی خدا نے ہمیں عقل دی، سوچ و فکر دی ہے، خدا نے ہمیں صلاحیتیں بخشی ہیں تو ہم کیوں نہ انہیں بروئے کار لائیں۔''

''ایک بات بتاؤ ڈیوڈ۔'' تھامس نے براہ راست ڈیوڈ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''جب تمہارے پاس اتنی صلاحیتیں ہیں، تمہارے ملک کے پاس جدید ترین ٹیکنالوجی ہے اس حد تک کہ تم لوگ چار ذہین ترین دماغوں کو یکجا کر کے ایک سپر مین بنانے کا 90 فی صد کامیاب تجربہ کر چکے ہو تو پھر پوری دنیا پر حکمرانی کا پلان ہمارے ساتھ شیئر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ کام تمہارا ملک تن تنہا بھی کر سکتا ہے۔'' تھامس نے اپنے دلی خدشے کا برملا اظہار کیا تھا۔

''مسٹر تھامس! آپ کی صاف گوئی مجھے پسند آئی۔ میں بھی کسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لوں گا۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں معیشت، وسائل اور ٹیکنالوجی فی الحال کسی بھی ایک ملک کے پاس مکمل نہیں ہے۔ بہت سے شعبے ہیں جن میں میرا ملک ابھی بہت پیچھے ہے اس وجہ سے ہمیں اس پلان میں آٹھ ملکوں کو شامل کرنا پڑا ہے۔''

''مسٹر تھامس میرا خیال ہے کہ ہمیں ڈیوڈ کی باتوں کو

سمجھنا چاہیے۔" پیٹرسن نے تھامس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"پیٹرسن ڈیوڈ کی باتوں کو ہم مکمل طور پر سمجھ گئے ہیں۔ ڈیوڈ کی باتیں الجبرا کا الجھا ہوا سوال نہیں جسے حل کرنے کے لیے کند ذہن فاالعلم کو پسینے آجاتے ہیں۔ ہم نیوکلیئر ریسرچ لیبارٹریز بنا کر حیرت انگیز ایجادات کا انبار لگا دیں گے۔ اس کے بعد پوری دنیا پر حکمرانی کریں گے میں ٹھیک کہہ رہا ہوں مسٹر ڈیوڈ؟" تھامس کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری تھی تھامس یہ کہتے ہوئے رو ئے سخن ڈیوڈ کی طرف موڑا۔

"میری باتوں کا مختصر خلاصہ پیش کیا جائے تو تھامس آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اگر آپ لوگ مجھ سے متفق ہیں تو یقین جانیے ہم نیو ورلڈ آرڈر بن جائیں گے۔ دنیا ہماری مٹھی میں ہوگی ہم تمام ملکوں کی سیاسی، فکری، معاشی، عسکری حتی کہ ذہنی قوت پر مکمل عبور حاصل کر لیں گے۔"

"مسٹر ڈیوڈ ہم آپ کے ساتھ ہیں ہم چاہیں گے کہ دنیا کا نظام ہم چلائیں۔" سات افراد نے فوراً تائید کر دی تھی۔ تھامس خاموش تھا اور سب کی نظریں اسی پر مرکوز تھیں۔

"تھامس آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

آپ کے پلان میں کہیں بھی کوئی کمی نہیں ہے ڈیوڈ اب یہ مکمل ہو چکا ہو کر شاید ہم پوری دنیا کے حکمران بن جائیں مگر مجھے لگتا ہے کہ ایک قوم ایسی ہے جو ہماری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے۔"

"آپ کھل کر بات کیجیے تھامس میں آپ کے ہر اعتراض کا معقول جواب دینے کی کوشش کروں گا۔"

"دنیا کا کوئی خاص ملک یا مذہب ایسا نہیں جو ہمارا مخالف ہو سو فیصد ممالک آل ریڈی ہمارے ہمنوا ہیں ماسوائے مذہب اسلام کے۔ اسلام وہ مذہب ہے جو ہمارے ملک کو اپنا دشمن تصور کرتا ہے۔"

"میں تھامس کی اس بات سے متفق ہوں۔ ہمارے ملک کی کسی سے دشمنی نہیں مگر اسلام ہمیں اپنا دشمن سمجھتا ہے۔" رابرٹ فوراً بولا۔

"شاید ہمارا بیان بھی آپ سے مختلف نہ ہوگا۔" لی چینگ نے اعتراف کیا۔ ان کی باتیں سن کر ڈیوڈ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ کیونکہ ایک منٹ میں آٹھ افراد نے اعتراف کر لیا تھا کہ مذہب اسلام انہیں اپنا دشمن سمجھتا ہے۔

"اس مشترکہ اعلامیے سے میری ابتدائی بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ہمارا مقصد ایک ہے ہم الگ الگ ٹریک پر دوڑ ضرور رہے ہیں مگر وکٹری مارک ایک ہی ہے۔" ڈیوڈ کی بات میں سچائی تھی۔ چند لمحے سب خاموش ہو گئے تھے۔

"تو مسٹر ڈیوڈ کیا ہم اسلامی ممالک کو بھی اپنا غلام بنا سکیں گے؟"

"آف کورس۔ کل کائنات پر ہمارا کنٹرول ہوگا۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ مسلمان ہماری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن سکتے ہیں؟"

"بالکل لگتا ہے۔ تم نگر میں نے اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔ اگر آپ لوگ چاہیں تو اس کی تفصیل سن سکتے ہیں ورنہ آئندہ میٹنگ میں سہی۔ کیونکہ ابھی تک میرے پلان کے بہت سے حصے عیاں ہونا باقی ہیں۔"

"باقی حصوں سے آگاہی تو وقتاً فوقتاً ہوتی رہے گی۔ آپ مسلمانوں کے لیے کی گئی منصوبہ بندی سے آگاہ کریں۔"

"ٹھیک ہے پہلے میں وہ بتاتا ہوں۔"

☆☆☆☆☆☆☆

زیشان اس مریض کی طرح مضطرب تھا جس کے زخموں سے درد کی تیز ٹیسیں اٹھ رہی ہوں۔ آج بستر میں کانٹے کی چبھن تھی اور کمرہ بچھو کی طرح ڈس رہا تھا۔ ہوم ورک بار گراں کی طرح بھاری تھا۔ کتابوں کا حجم اور لفظوں کے معنی بڑھ گئے تھے۔ بے چینی کے عالم میں وہ ننگے پاؤں چلتے فرش پر ٹہل رہا تھا۔ اگر میں کل رات تھوڑی سی ہمت کرتا تو آج یہ حال نہ ہوتا۔ اس نے ٹہلتے ہوئے

سوچا۔ بہت کی بات نہیں وہ منظر اتنی سرعت سے نمودار ہوا تھا کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں پر روک لگ گئی تھی۔ اس نے اپنی سوچ کے ساتھ خود ہی دلیل دی۔ وہ ایسا منظر تھا جسے دیکھ کر وہ خوف سے کانپ اٹھا تھا۔ وہ ایک عجیب و غریب پراسرار معمہ تھا جس کے بارے میں وہ تا حال سوچ کر الجھ رہا تھا۔ وہ آوازیں کس کی تھیں؟ کہاں سے آرہی تھیں؟ اور ان کا مفہوم کیا تھا؟ وہ سمجھ سے بالاتر کیوں تھیں؟ وہ کل رات سے سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ عجیب پرنور بے تحاشہ روشنی جس کے منبع کا پتہ نہ انتہا کا ابتدا۔ کیا آخر وہ سب کیا تھا؟ ذیشان بے تحاشہ سوچوں میں پریشان تھا۔

پچھلی شب کا واقعہ تھا اس کے دوست اور کلاس فیلو دانیال کی برتھ ڈے پارٹی تھی، پارٹی میں خوب ہنگامہ ہوا تھا شور و غل، ہنسی مذاق اور ہلا گلا رہا تھا۔ سب دوستوں نے خوب انجوائے کیا تھا۔ رات گئے پارٹی اختتام پذیر ہوئی تو سبھی لوگ اپنی اپنی سواری پر روانہ ہو چکے تھے۔ ذیشان عاطف کے ساتھ آیا تھا۔ جو وقت سے پہلے چلا گیا تھا۔ دانیال کے پاس اپنی سواری نہیں تھی وہ ٹیکسی کروا سکتا تھا مگر عاطف نے اسے گھر سے پک کر لیا تھا وہ چاہتا تو دانیال کے ساتھ جا سکتا تھا مگر اس کی تھکاوٹ کا احساس کر کے پیدل ہی نکل آیا تھا ویسے بھی اس کا گھر دانیال کے گھر سے دو کلو میٹر دور تھا۔ رات کے تین بجے روڈ بالکل سنسان تھا۔ گلیاں ویران اور ماحول پراسرار سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی کہیں دور سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔ ہوا کے چلنے سے درختوں کی سرسراہٹ ڈراؤنے انداز میں سنائی دیتی تھی۔ شاد پور کے گھر چونکہ فاصلے پر بنے ہوئے تھے اس لیے سڑک پر چلنے والی لائٹوں سے جو روشنی روڈ کی طرف آتی تھی اس میں کہیں کہیں اندھیرے کا دورانیہ بھی آتا تھا۔ یہاں اسٹریٹ لائٹس کی سہولت موجود نہیں تھی۔ ذیشان فطری طور پر بہادر لڑکا تھا اس لیے بے دھڑک چل رہا تھا مگر اچانک چلتے چلتے وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی سماعت سے کچھ مانوس آوازیں ٹکرائی تھیں۔ اس نے دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھا اسے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ چند گلیوں میں بھی جھانک کر دیکھ لیا ایسا کچھ نہیں تھا۔ جن پر نامانوس آوازوں کا شبہ کیا جاتا۔ یہ وہم بھی ہو سکتا تھا اور نیند کا غلبہ بھی۔ کیونکہ نیند ذہن پر سوار ہو تو دماغ اور کان سائیں سائیں کرتے ہی ہیں۔ وہ ذہن جھٹک کر چل پڑا تھا۔ لیکن چند میٹر چلنے پر ایک بار پھر آوازیں سنائی دیں۔ آوازوں کا مفہوم ناقابل فہم تھا۔ سمت کا تعین ہو رہا تھا نہ یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ آوازیں آخر ہیں کس کی؟ چند لمحوں میں ذیشان نے سوچ کے کئی مراحل طے کر لیے تھے خوف جسم میں چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگا تھا۔ بے دھیانی میں اس نے پیچھے سے مڑ کے دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں کچھ ہوتا تو نظر بھی آتا۔

وہ بہت خوف محسوس کرنے لگا تھا۔ آوازیں تھیں کہ رک ہی نہیں رہی تھیں۔ اسے قرآن پاک میں سے جو کچھ یاد تھا جلدی جلدی پڑھ کر خود پر پھونک دیا۔ خود کو تسلی دینے کے لیے اس نے دل و دماغ کو باور کرایا کہ یہ وہم ہے۔ اس نے قدم تیز کر دیے تھے۔ یہ بھی ابھی ٹھیک سے نہیں تھی کہ اس نے ایک کوٹھی کی چھت پر نور و روشنی کوٹھی کو دور سے دیکھا۔ روشنی بہت بلند تھی اور سبز مائل سے جاری تھی یا آسمان سے آ رہی تھی آوازوں کی طرح یہ تعین کرنا بھی ناممکن تھا۔ ذیشان کی گھگی بندھ گئی تھی۔ بلکہ وہ تھر تھر کانپنے لگا تھا پھر بھی اس کے دل میں خیال ابھرا کہ کوٹھی میں جا کر دیکھنا چاہیے یہ کیا ماجرا ہے؟ دل کے خیال پر دماغ ہرگز متفق نہیں تھا۔ رات بہت بیت گئی تھی اسے جلدی سے گھر پہنچنا چاہیے کسی بھی پراسرار واقعے میں الجھنے سے بچنا ہی بہتر ہے۔ دماغ کی بات معقول اور مدلل تھی کیونکہ پہلے نہ آوازوں کا پتہ چلا تھا نہ روشنی کا معمہ سمجھ میں آ رہا تھا وہ سب کچھ جھٹک کر تیز قدموں سے گھر پہنچا تھا۔

دوسرے روز وہ کالج نہ جا سکا وہ تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ گھر والے پریشان ہو گئے تھے۔ پاپا اور ممی نے اسے شب بیداری کا شاخسانہ قرار دیا تھا۔ رات کا پراسرار واقعہ وہ چھپا گیا تھا۔ اگر پاپا کو بتا دیتا تو وہ اسے آئندہ کسی پارٹی میں

جانے سے روک دیتے۔ اس لیے وہ خاموش رہا تھا۔ تین دن بعد وہ صحت یاب ہوا تو ایک بار پھر اس کی سوچوں میں وہ پراسرار آوازیں اور روشنیوں کی آماجگاہ بن گئی تھی۔ بے چینی سے ٹہلتے ہوئے اسے بار بار وہاں پھر سے جانے کا خیال آ رہا تھا۔ دماغ نے اسے خوف دلانے کی بھرپور کوشش کی مگر دل نہیں مانا تھا۔ وہ آج رات تین بجے پھر سے وہاں جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"ہم نے پانچ اسلامی ٹاپ ملکوں کی لسٹ بنائی ہے۔ ایسے پانچ ممالک جو پورے عالم اسلام میں انتہائی اہم ہوں جو اسلامی ریاستوں میں ریڑھ کی ہڈی ہوں۔ ان کا ٹوٹ جانا اسلام کے مٹ جانے کے مترادف ہوگا۔ گویا ہمیں انہیں پانچ ملکوں پر کنٹرول حاصل کرنا ہوگا۔ اس لیے ہمیں ان ملکوں میں نام نہاد محب الوطن لیڈر تلاش کرنا ہیں مادہ پرست، سہولیات زندگی، ذاتی خوشحالی اور ذاتی مفاد کے حامل لوگوں کا چناؤ کرنا ہے ایسے لوگ ہمارے رفیق اور دست راز ہوں گے۔ جنہیں ہماری دوستی پر فخر ہوگا۔ ہم انہیں استعمال کریں گے ان کے توسط سے ہم سے قوم سے تعلیم و تربیت، نظم و ضبط، بلند نظری، اعلیٰ اخلاقیات، اعتمادیت، اجتماعیت، ذہانت اور بہادری سب کی دھیرے دھیرے کمی کر دیں گے وہ روشنی کی طرف اندھیرے کے حصول کے لیے بڑھیں گے۔ ہماری تقلید قابل فخر سمجھیں گے۔ یہی فخر ان کی بربادی کا سامان پیدا کرے گا۔ مسلم لیڈروں کو فکری امداد میں ڈبو دیں گے وہاں عداوتوں کو پروان چڑھائیں گے، نسلی تعصب فرقہ وارانہ فسادات، سماجی طبقات کو ہوا دیں گے وہ ایک دوسرے کے دست و گریبان ہوں گے۔ جس کا فائدہ ہم اٹھائیں گے پوری مسلم امہ پر من چاہی حکومتیں مسلط کریں گے۔"

"آپ لوگوں کو کوئی اعتراض ہو تو بتا سکتے ہیں۔"

"آپ اٹھتے جا رہے ہو ڈیوڈ۔"

"جی ہاں بولتے جائیں ہمیں کہیں اعتراض ہوگا تو بتا دیں گے۔"

"مسلم سربراہ کٹھ پتلیوں کی طرح ہمارے اشاروں پر ناچیں گے۔ معیشت ہمارے حوالے کریں گے، وسائل پر ہمارا قبضہ ہوگا۔ ہم ان کی خوشحالی کے لیے مدد دیں گے۔ وہ قرضے کے بوجھ میں دب جائیں گے تب عوام پر ہمارے من چاہے ٹیکس لاگو کریں گے۔ مہنگائی کا بوجھ ڈالیں گے آئے دن پستی کی طرف کریں گے۔ کبھی سر نہیں اٹھا سکیں گے۔ پھر ہم ہی ان کے آقا ہوں گے اور وہ آزاد ہو کر بھی ہمارے غلام ہوں گے۔ آپ لوگوں کو کچھ کہنا ہے تو کہہ سکتے ہیں۔"

"آپ نے کہنے کے لیے کچھ نہیں چھوڑا ڈیوڈ۔" ویلڈان، ہیم نے تحسین آمیز نگاہوں سے ڈیوڈ کو دیکھا۔

"ڈیوڈ ہم آپ سے مکمل طور پر متفق ہیں۔" لیون تائید کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں اب اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔" پیٹرسن نے اعتراف کیا، تاہم ڈیوڈ کی نظریں تھامس پر تھیں۔

"مسٹر تھامس! آپ کو کچھ کہنا ہے؟"

"نہیں ڈیوڈ! میں دوسرے لوگوں کی تقلید میں ہوں۔"

"آپ تمام حضرات کا اعتماد کرنے کا بے حد شکریہ بس آخری بات کہوں گا۔ اس کے بعد میٹنگ کا اختتام ہوگا۔ آپ لوگ یہ خالی کرسی دیکھ رہے ہیں۔" ڈیوڈ نے ٹیبل کی دوسری طرف بالکل سامنے خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہم اس کی وجہ پوچھنے والے تھے مگر آپ کی سحر انگیز باتوں میں ڈوب گئے۔"

"یہ عالمی لیڈر کی کرسی ہے۔" پے در پے انکشافات کے بعد ڈیوڈ کی ایک اور انکشاف تھا۔

"عالمی لیڈر؟" بیک وقت کئی آوازیں ابھریں۔

"جی ہاں عالمی لیڈر۔ کرسی کے عقب میں جو دروازہ ہے عالمی لیڈر اس دروازے سے داخل ہوگا۔ خالی کرسی پر

بیٹھ کر عالمی حکومت کا اعلان کرے گا۔"

"ہم تجھے نہیں ڈیوڈ! ہم اپنی تمام تر صلاحیتیں، ٹیکنالوجی، وسائل خرچ کرتے ہوئے کیا فتح کریں۔ دنیا ہماری مٹھی میں آئے مگر حکومت کوئی دوسرا لیڈر کرے۔" تھامس کے لہجے میں کسی حد تک درشتی تھی۔ ڈیوڈ! ہم بوئیں اور پھل کوئی اور کھائے۔

"ایسا کیسے ممکن ہے مسٹر تھامس! آپ لفظ "کوئی اور" کو حذف کردیں عالمی لیڈر ہم نو ممالک کا مشترکہ منتخب شدہ لیڈر ہوگا۔"

"ڈیوڈ! ہم نو ممالک اس پر اتفاق کیوں کریں گے۔" کیمرون بولا۔ "کسی کو اس سے اختلاف بھی ہوسکتا ہے اور پھر آخر وہ کسی ایک ملک کا ہی ہوگا۔" کی چنگ نے اضافہ کیا۔

"ہم نو ممالک اس لیڈر پر اس لیے اتفاق کریں گے کہ وہ محیر العقول تمام تر مادی طاقت کا سرچشمہ، عقل و فہم سے ماورا ایک مثالی آدمی ہوگا اور وہ کسی ایک ملک کا نہیں ہوگا۔ آپ نے ایک ہی بحث کو طول دیا ہے ڈیوڈ۔ عالمی لیڈر ہوگا۔ مثالی آدمی ہوگا۔ اور اگر وہ کسی ملک سے نہیں ہوگا تو کیا وہ آسمان سے ٹپکے گا؟"

"میں تفصیل بتاتا ہوں۔" ڈیوڈ نے فوراً کہا اور عالمی لیڈر کے بارے میں تفصیل بتانے لگا۔ ڈیوڈ کے الفاظ کی جادوگری تھی جس نے ان سب کو صرف آدھا گھنٹہ میں آنے والے تمام عالمی لیڈر کا عقیدت مند بنا دیا تھا۔ "ہماری آج کی میٹنگ کا اختتام ہوتا ہے۔ تین دن بعد ہم دوبارہ جمع ہوں گے۔ اس کے بعد نو ممالک کے چیدہ چیدہ لوگوں کی اعلیٰ سطح پر میٹنگ بلائی جائے گی۔ اور پھر عملی اقدام کا آغاز ہوگا۔ وش یو گڈ لک۔" ڈیوڈ نے آخر میں سب کو باری باری دیکھا اس نے میٹنگ برخاست کا کاشن دے دیا تھا۔ وہ کرسیاں پیچھے گھسیٹ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈیوڈ خود بیٹھا ہوا تھا۔ آٹھ افراد ایک لائن میں خالی کرسی کو عقیدت سے چھو کر کھڑکیوں کے درمیانی دروازے سے نکل رہے تھے۔ تھامس سب سے آخر میں تھا۔ اس نے دوسرے لوگوں کی طرح خالی کرسی کو چھوا نہیں بلکہ کرسی کے پاس رک کر سینے پر صلیب کا نشان کھینچا اور ہاتھ کو چوم کر باہر نکل گیا۔ ڈیوڈ سب کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ تھامس کی حرکت پر اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کی وجہ سمجھتا تھا مگر تھامس یا دوسرے لفظوں میں تھامس کے ملک کو برداشت کرنا مجبوری تھی۔ کیونکہ تھامس کا ملک ہی ڈیوڈ کے لیے وہ مہرہ تھا جس کے استعمال پر ہی ڈیوڈ اپنا مشن مکمل کرسکتا تھا۔

☆☆☆

تھامس حساس ادارے کا سربراہ تھا۔ جان رائٹ خفیہ تنظیم کا مایہ ناز ایجنٹ جب ان کے ملک کو اسرائیل کی طرف سے انتہائی اہم میٹنگ کے لیے مدعو کیا گیا تھا تو ایک اعلیٰ سطح اجلاس میں تھامس اور جان رائٹ کو اسرائیل روانہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چونکہ اسرائیل میں بلائی گئی میٹنگ میں ایک ہی فرد کو شریک ہونا تھا۔ اس لیے طے پایا تھا کہ تھامس میٹنگ اٹینڈ کرے گا۔ جان رائٹ نے وہاں کا جائزہ لینا ہے۔ دونوں نے مل کر رپورٹ تیار کرنی ہے۔ اسرائیلی سرزمین پر منعقدہ انتہائی خفیہ میٹنگ اختتام پذیر ہو چکی تھی۔ تمام مدعو ممالک کے نمائندے اپنے ملکوں کو واپس چلے گئے تھے۔

تھامس اور جان رائٹ بھی واپس لوٹ آئے تھے۔ تیار کردہ رپورٹ پیش کرنے دونوں ہیڈ کوارٹر جا رہے تھے۔

تھامس کے ہاتھ میں بریف کیس پکڑا ہوا تھا۔ جان رائٹ کا خالی ہاتھ تھا۔ وہ عمارت کے مین گیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ تھامس آگے تھا۔ جان رائٹ اس کے پیچھے گیٹ کے وسط میں دو انتہائی باریک ناقابل شناخت سوراخ تھے۔ تھامس عین ان کے سامنے کھڑا تھا۔ سوراخ سے دو بلیو کلر کی باریک شعاعیں تھامس کی آنکھوں میں پڑیں۔ تھامس نے انتہائی سختی سے آنکھیں کھول رکھی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد شعاعیں غائب ہو گئیں۔ دروازے میں ایک نیلی لکیر کی نمودار ہو چکی تھی۔ جو اس سے پہلے کہیں بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ حساس ادارے کا ہیڈ کوارٹر

ہونے کی وجہ سے سیکیورٹی کا انتہائی سخت انتظام تھا۔ تھامس اور جان رانٹ اندر داخل ہو گئے تھے۔ عمارت کے اندر بھی انہیں کئی چیکنگ کے مراحل طے کرنا پڑے تھے۔ اس بات سے قطع نظر کہ تھامس یہاں کا سربراہ تھا اور جان رانٹ انتہائی اہم ایجنٹ ان کی عام آدمی کی طرح چیکنگ کی گئی تھی تقریباً آدھا گھنٹہ کے بعد انہیں کلیئرنس کا کاشن ملا تھا۔ اب وہ عمارت کے اصل حصے میں پہنچ گئے تھے۔ ان کا رخ میٹنگ ہال کی طرف تھا۔ جہاں پہلے سے وزیر دفاع ایلن ٹیگس، وزیر خارجہ این اے میتھوس، ہوم منسٹر ایڈورڈ اور نیوکلیئر ریسرچ لیبارٹری کے انچارج ول ڈیورنٹ ان کے منتظر تھے انہیں پرتپاک طریقے سے خوش آمدید کہا گیا تھا۔ موسٹ ویلکم تھامس اینڈ جان رانٹ سب نے باری باری پرجوش انداز میں مصافحہ کیا۔

رسمی گفتگو کے بعد سب نے اپنی اپنی کرسیاں سنبھال لی تھیں۔

"ہمارے پاس صرف ایک گھنٹہ ہے۔" ہوم منسٹر نے میٹنگ کی ابتداء کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے دوسرے شہر جانا ہے اس لیے ہم براہ راست موضوع پر گفتگو کریں گے۔"

"جان رانٹ اینڈ تھامس! آج تو یہ ہے کہ ہم سب متجسس ہیں۔ اسرائیل کو ایسی کیا سوجھی کہ اس نے ہمیں خفیہ ڈائیلاگ ٹیبل پر مدعو کیا۔" وزیر خارجہ این اے میتھوس نے دونوں کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"سر! اسرائیل نے دنیا کو فتح کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔"

"اوہ!" ہونٹ سکیڑتے ہوئے این اے میتھوس نے آدھی تیوری چڑھا کر تمسخرانہ لہجے میں بولا۔

"صرف یہ پروگرام بتانے کے لیے وہ ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔"

"اگر مختصراً کہا جائے تو ایسا ہی ہے۔" جان رانٹ نے جواب دیا۔

"آپ لوگ مرتب کردہ مکمل رپورٹ پیش کریں۔" ایلن ٹیگس نے تھامس کی طرف دیکھ کر کہا۔ جس نے سر ہلاتے ہوئے بریف کیس کھولا۔ ول ڈیورنٹ نے ٹیبل کی ایک طرف کا بٹن دبایا۔ ہلکی سے کلک کے ساتھ ہر فرد کے سامنے ٹیبل پر کمپیوٹر اسکرین نمودار ہو چکی تھی۔ تھامس بریف کیس سے فلاپی نکال چکا تھا۔ ول ڈیورنٹ نے تھامس سے فلاپی لے کر کمپیوٹر میں ایڈجسٹ کر دی۔ چند منٹوں کے اندر وہ سب ماسٹر اسکرین پر نظریں جمائے رپورٹ پڑھنے میں محو ہو چکے تھے۔

تھامس اور جان رانٹ بھی دوبارہ رپورٹ پڑھ رہے تھے تاکہ پوچھے جانے والے سوالات کا جواب دے سکیں۔ رپورٹ پڑھنے میں آدھا گھنٹہ لگا تھا۔

"مجھے تو یہ ڈیوڈ انتہائی بے وقوف شخص لگتا ہے۔" ایلن ٹیگس نے رپورٹ پڑھنے کے بعد بات کی شروعات کی تھی۔

"وہ کیسے......؟"

"دیکھو ناں اس نے بہت سے قیمتی راز کھو مختلف ممالک پر افشا کر دیے ہیں۔ ڈیوڈ اسرائیل کا نمائندہ ہے اسرائیلیوں کی فطرت ہم بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ بلا مقصد کوئی بات نہیں کرتے اس میں بھی ان کا کوئی اہم مقصد پنہاں ہے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ کھلے گا۔ مگر اسرائیل یہ نہیں جانتا کہ ہم پہلے سے دنیا کو فتح کرنے کا جامع پروگرام تشکیل دے چکے ہیں۔" ہوم منسٹر ایڈورڈ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"پھر بھی ہم ول ڈیورنٹ سے جاننا چاہیں گے۔ کیا آپ کو اس رپورٹ میں کوئی نئی بات نظر آئی جس کے بارے میں ہم نے ابھی تک سوچا نہیں۔"

"ڈیوڈ نے برمودا تکون میں پائی جانے والی شعاعوں کا ذکر ہے۔ یہ نئی بات ہے۔ باوجود اس کے کہ ہم موت کی شعاعیں ایجاد کر چکے ہیں مگر وہ موت کی شعاعیں ہیں زندگی کی نہیں۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ول؟"

"ہم نے جو شعاعیں ایجاد کی ہیں وہ کسی بھی چیز کو بشمول انسان کے اسے راکھ کا ڈھیر بنا سکتی ہیں مگر ڈیوڈ کا کہنا ہے کہ برمودا تکون سے حاصل کی جانے والی

شعاعوں کو منفی اور مثبت دونوں طریقوں سے استعمال کر سکتے ہیں۔ بنجر زمین کو ہریالی بخش سکتے ہیں۔ یہ بہت چونکا دینے والی بات ہے۔ اگر ہم اس پر تھوڑی سی مزید ریسرچ کریں اور مردہ انسان کو زندہ کر سکتے ہیں۔" ول ڈیورنٹ کی بات پر وہ سب چونک پڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی سوال پوچھتا ول ڈیورنٹ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ڈیوڈ جس سپرمین کی بات کرتا ہے تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ وہ ہم کر چکے ہیں۔ انسانی دماغ کی پوری میموری (یادداشت) کو ہم کمپیوٹر میں فیڈ کر کے دیکھ چکے ہیں۔ عنقریب کمپیوٹر سے انسانی دماغ میں من چاہی میموری اپ لوڈ کر دیں گے۔ آپ لوگوں کے علم میں یہ بات ہے کہ ہم اس کا ایک تجربہ کر چکے ہیں۔ اس میں تشویشناک بات یہی ہے کہ جس انسان کی میموری کمپیوٹر میں فیڈ کی جاتی ہے وہ انسان دماغ سے فارغ ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کا بہترین دماغ کمپیوٹر کو ٹرانسفر ہو جاتا ہے۔ اس میں تشویش والی بات نہیں ول ڈیورنٹ ہم نے اس انسان کی یادداشت لینا ہوتی ہے جس میں اس کے دماغ سے مطلب ہوتا ہے انسان سے نہیں۔" وزیر دفاع نے ایلن گینس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ہم نے تجربے کے طور پر سکس ملین ڈالر مین اور ٹرمینیٹر کے کرداروں میں جزوی طور پر دھات کے اعضاء شامل کیے تھے۔ یہ بھی ایک ناقابل تسخیر سپرمین بنانے کی طرف تجرباتی قدم تھا۔ بہرحال ہم تین ارب حروف کا امتزاج انسانی جینیاتی کوڈ پڑھ چکے ہیں اور یہ مسودہ ٹکڑوں کی شعاعیں ہمیں ایک نئی دنیا بخش سکتی ہیں۔"

"یہ بات واقعی انتہائی حیران کن ہوگی ول کہ ہم موت کو شکست دے دیں مرے کو پھر سے زندہ کر دیں مجھے رپورٹ کا پانچواں حصہ بھی انتہائی دلچسپ اور عجیب لگا ہے۔" وزیر خارجہ ایلن اسے متھوس نے چشمہ لگاتے ہوئے غور سے اسکرین کو دیکھا۔

"یہ واقعی دلچسپ و عجیب ہے۔" ایلن گینس نے ان کی تائید میں کہا۔ اس پر مکمل روشنی مسٹر ول ڈیورنٹ ہی ڈال سکتے ہیں۔

"پانچواں حصہ واقعی قابل توجہ اور انتہائی اہم ہے۔" ول ڈیورنٹ نے اسکرین پر نمودار رپورٹ کے پانچویں حصے کو زوم کرتے ہوئے کہا۔

"اس حصے میں بتایا گیا ہے کہ ہم زمین کی نبض کو چھیڑ کر شمسی نظام میں ٹھہراؤ لا سکتے ہیں۔ آسان لفظوں میں بات کروں تو اس سے زمین کی گردش تھم جائے گی۔ اس طرح ہم وقت کو قید کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک دن کو ایک ماہ کے برابر طویل کر دیں گے اور ایک ماہ کو چھ ماہ جتنا لمبا کر دیں۔"

"حیرت انگیز۔" ول کی بات سن کر وہ حیرت کے سمندر میں اتر گئے تھے۔

"اگر ہم دو چیزوں پر عبور حاصل کر لیں۔ یعنی موت و زندگی اور وقت پر تو کل کائنات واقعی ہماری ہے۔" وزیر دفاع کے چہرے پر جوش ہچکولے لے رہا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں اسرائیل کا ساتھ دینا چاہیے۔"

"یہ ہم ابھی طے نہیں کر سکتے۔ ہم نے اس رپورٹ کے ساتھ آج کی میٹنگ کی رپورٹ بھی تیار کرنی ہے۔ یہ دونوں رپورٹس ایک مہینہ بعد مسٹر پریذیڈنٹ کی سربراہی میں ہونے والے انتہائی اعلیٰ سطح کے اجلاس میں پیش کی جائے گی اس کے بعد حتمی فیصلہ انہوں نے ہی کرنا ہے۔" ہوم منسٹر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"ڈیوڈ کی آخری بات سمجھ سے بالاتر ہے۔" تھامس نے آخری پوائنٹ کی طرف توجہ دلائی۔ "ڈیوڈ ممکنہ آنے والے لیڈر کی بات کرتا ہے۔ جو محیر العقول اور ناقابل شکست سپرمین جیسا ہوگا۔ وہ اسرائیل میں بیٹھ کر عالمی حکومت کا اعلان کرے گا۔ اس کے لیے تو وہاں باقاعدہ خالی کرسی رکھی گئی ہے۔"

"ڈیوڈ ٹھیک کہتا ہے؟" ول ڈیورنٹ کی بات سب نے بیک وقت دہرائی تھی۔

"کیا ایسا کوئی لیڈر ہے جو فی الحال نظروں سے اوجھل ہے؟"

"جی ہاں! ایسا لیڈر ہے فرق یہ ہے کہ ڈیوڈ اور اس کا فلک اندھیرے میں ہیں۔ عالمی حکومت کا اعلان کرنے والا لیڈر ان میں سے کسی جسم میں سے ہوگا۔"

"سوری ولی ڈیونٹ۔ آپ کے مبہم اشارے کو ہم سمجھ نہیں پائے۔"

"آسان بات ہے۔ وہ خالق کرتی مقدس باپ کی ہے۔ جو دنیا میں عالمی حکمرانی کے لیے تشریف لائے گا اور ہم سب کو آسمانوں پر اٹھالیا جائے گا۔ اس کے بعد ہم بالا خانوں میں بیٹھ کر زمین والوں کی تباہی دیکھیں گے اور حکمرانی کریں گے۔"

"گریٹ ولی ڈیونٹ! آپ نے کمال کی دور اندیشی کا مظاہرہ کیا۔ اس طرف ہمارا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔" سب نے تحسین آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ کر کہا۔

"مجھے وہ کرسی انتہائی عجیب لگی تھی۔ میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ مگر میں نہیں جانتا تھا اصل میں وہ کرسی مقدس باپ کی ہو سکتی ہے۔" تھامس نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔

"ایک بات تو واضح ہو چکی ہمیں ڈیوڈ کا ساتھ بہر حال دینا ہی ہوگا۔" جان رائٹ نے خیال ظاہر کیا۔

"یہ طے ہونا ابھی باقی ہے۔ سردست میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ اس میں ہمیں کوئی نقصان نہیں۔ ہم انہیں استعمال کر سکتے ہیں اور اپنے مفادات کو حاصل کر سکتے ہیں۔ اس بات کا حتمی فیصلہ اعلیٰ سطح کی میٹنگ میں ہو جائے گا۔" وزیر دفاع نے جان رائٹ کی تائید میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اب ہم مفصل رپورٹ تیار کرتے ہیں تاکہ اسے محترم پریذیڈنٹ کی میٹنگ میں پیش کیا جا سکے۔" ہوم منسٹر ایڈورڈ نے انہیں ہدایت کی۔ وہ سب رپورٹ تیار کرنے میں مگن ہو گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اس بار سیلیا نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ براہ راست اپنے مشن پر پہنچے گا۔ راستے میں پھر سے کوئی پراسرار واقعہ رونما ہوا بھی تو نظر انداز کر جائے گا۔ وہ ایک بار اپنے گرو کے سامنے شرمندہ ہو چکا تھا دوسری بار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ بلکہ اب کی بار مشن کی تکمیل کے بعد ہی گرو کے سامنے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مطلوبہ جگہ پہنچ کر وہ حیران رہ گیا تھا اس کی سوچ میں ایک مشن اور مشکل مشن کی واضح فرق تھی۔ مگر یہاں پہنچ کر اسے مایوسی ہوئی تھی وہ اپنے ہدف کو دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ گرو نے سولہ سترہ سالہ لڑکے کا انتخاب کیا تھا اس سے پہلے وہاں کسی اور کی ڈیوٹی تھی۔ اب سیلیا کو یہ کیس سونپا گیا تھا۔ سیلیا سوچ رہا تھا شاید گرو نے مجھ سے مذاق کیا ہے۔ اس مشن میں کوئی چارم نہیں تھا۔ سولہ سترہ سالہ لڑکے پر بھلا اسے کیا محنت کرنا ہوتی ہے عمر تو ویسے بھی لچکتی شاخ کی طرح ہوتی ہے۔ جس طرف چاہو موڑ لو۔ سیلیا کا تجربہ تھا وہ 30 تک زندگی کے پڑاؤ سے ان کے لیے مسائل کھڑے کرتے ہیں۔ چالیس کے اوپر والے بہت پریشانیاں دیتے ہیں۔ وہ بھی کسی ایسے ہی مشکل مشن کی خواہش رکھتا تھا۔ مگر اس لڑکے کو دیکھ کر اسے دھچکا لگا تھا۔ اسے گرو کے تخت پر بیٹھ کر گرو کی قربت حاصل کرنے کا خواب چکنا چور محسوس ہو رہا تھا۔ مگر ڈیوٹی اسے بہر حال سرانجام دینا ہی تھی۔ گرو کے سامنے انکار کی جرات کسی میں بھی نہیں تھی۔ پھر گرو کی گرو جانے اس کی منطق بھی عجیب ہوتی ہے۔ گرو اپنے بیٹے کو چالیس سال تک سلائے رکھتا ہے اس لیے کہ گرو کو بیٹے سے ایک خاص کام لینا ہوتا ہے۔

سیلیا سالوں سے اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ فی الحال اسے کوئی خاص محنت نہیں کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ اس کے پر پوری نظر رکھے ہوئے تھا لڑکے کا نام ذیشان تھا۔ گھر والے اسے شانی کہتے تھے شانی بہت شرارتی تھا۔ دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ ہوٹلنگ محفل موسیقی، ہنگامہ آرائی، لوگوں سے چھیڑ چھاڑ اس کے محبوب مشاغل تھے۔ تیسری رات کے آخری پہر سیلیا چونک پڑا تھا اسے شانی کی سرگرمیوں میں پہلی بار اسرار اور تجسس نظر آیا تھا۔ وہ رات کے تین بجے گھر

والوں سے چھپ کر باہر نکلا تھا۔ باہر جانے کے لیے اس نے خفیہ راستہ اپنایا تھا۔ سیلیا نے محسوس کیا تھا۔ ذیشان چلتے ہوئے خوف محسوس کر رہا تھا کہیں کہیں اس کے قدم لڑکھڑا جاتے تھے۔ دو تین جھنیوں پر وہ بے مقصد رکا تھا۔ رات کی روایتی خاموشی بہت گہری تھی۔ بادلوں کی وجہ سے چاند چھپا ہوا تھا۔ ہوا نہ ہونے کی وجہ سے ماحول گرم تھا۔ شاید پچھ تذبذب کا شکار تھا۔ وہ تقریباً ایک کلومیٹر چلا تھا۔ اس کے بعد رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔ سیلیا نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ذیشان کیا دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سیلیا کو وہاں کوئی انوکھی چیز نظر نہیں آئی۔ جسے ذیشان کی نظروں کا ہدف جانا جاتا۔ سیلیا ابھی قیاس کے گھوڑے دوڑا رہا تھا کہ اچانک تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ موسم کی اچانک تبدیلی سمجھ میں نہ آنے والی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے کہیں پتہ بھی حرکت میں نظر نہیں آتا تھا۔ سیلیا نے ذیشان کی طرف دیکھا وہ حیرت سے اچھل پڑا تھا۔ انتہائی پراسرار اور حیرت ناک منظر سیلیا نے دیکھا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"ویلڈن ڈیوڈ ویلڈن! تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم عظیم اسرائیل کا عظیم سرمایہ ہو۔" ڈیوڈ جیسے ہی آفس میں داخل ہوا اسے دفتر خارجہ کے سیکریٹری ایبن کے لیوڈ نے گلے سے لگا لیا۔ اس کے چہرے پر غیر معمولی خوشی تیر رہی تھی۔ جنہیں ان تمام حصوں سے لیٹر موصول ہو چکے ہیں جنہیں میٹنگ میں بلایا گیا تھا۔

"گڈ نیوز مسٹر لیوڈ!" ڈیوڈ نے کرسی سنبھالتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔

"اس سے بڑھ کر گڈ نیوز یہ ہے کہ وہ سب ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں۔"

"مجھے صد فیصد یقین تھا۔ میں نے دانہ ہی ایسا پھینکا ہے۔ جس کا چکھنا ان کی مجبوری تھی۔ آپ کا کہنا حرف بہ حرف درست ثابت ہوا۔ حالانکہ میرے پلان کو اسرائیل کے بہت سے اعلیٰ حکام نے طویل المعیاد اور صبر آزما قرار دیا تھا۔ ڈیوڈ نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

"سچ تو یہ ہے کہ ڈیوڈ تب ہی اس کی کامیابی کا چالیس فیصد امکان تھا کیونکہ جن ممالک کا آپ نے انتخاب کیا تھا وہ خود اپنی جگہ پہاڑ ہیں یہ ہر دوسرے ملک کو اونٹ سمجھتے ہیں جس کا پہاڑ کے نیچے آ کر غرور خاک میں مل جاتا ہے۔ مگر تمہارے بے مثال منصوبے نے سب کو سر خم کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"میں نے کہا تھا لیوڈ سفر ہو ہزار میل کا بھی، شروعات ہر حال ایک قدم سے ہی ہوتا ہے۔"

"آپ حق بجانب ہیں ڈیوڈ! آپ نے اس سفر کا کامیاب آغاز کیا ہے۔ مسٹر پریذیڈنٹ اس کامیابی پر بہت شاداں ہیں۔ انہوں نے اس مشن کی باضابطہ منظوری دے دی ہے۔"

"یہ دوسری بڑی گڈ نیوز آپ دے رہے ہیں۔"

"آپ کو اس مشن کا سربراہ چنا گیا ہے۔ جس کا باقاعدہ آئندہ میٹنگ میں اعلان کیا جائے گا۔ لیوڈ نے تفصیل جاری رکھی۔ آپ کی خواہش کے مطابق نیوکلیئر ریسرچ لیبارٹری کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ یہ اسرائیل کے مایہ ناز سائنسدان مسٹر باورڈ ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے جو نئی نیوکلیئر ریسرچ لیبارٹری بنائی جائے گی اس کا سربراہ مسٹر باورڈ کو بنایا جائے۔ تاہم مسٹر باورڈ آپ کی زیر نگرانی کام کریں گے۔" لیوڈ نے کہتے ہوئے ایک فائل ڈیوڈ کی طرف بڑھائی۔ آپ اس کا مطالعہ کریں۔

ڈیوڈ نے فائل کو ایک نظر دیکھا۔ اس کے اوپر جلی حروف میں باورڈ لکھا ہوا تھا۔

"ہم نے آپ کی فائل باورڈ کو بھجوا دی تھی۔ آپ انہیں یہاں مل سکتے ہیں۔" ڈیوڈ نے لیوڈ کے ہاتھ سے وزٹنگ کارڈ لے کر جیب میں رکھ لیا۔

ڈیوڈ دو دن بعد باورڈ کو ملا تھا۔ باورڈ ساٹھ باسٹھ سال کا شخص تھا۔ سر اور بھنوؤں کے بال برف کے گالوں کی طرح سفید تھے۔ چہرے سے داڑھی اور مونچھیں غائب تھیں۔

"ڈیوڈ! میں نے آپ کی فائل پڑھی ہے مجھے لگتا ہے جس پرسن یا موقع الفرصت کی آپ بات کرتے

ہو اس کا تجربہ خود پر آزما چکے ہو؟"
"میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا؟"
"سیدھی سی بات ہے ڈیوڈ! آپ لاتعداد صلاحیتوں کے مالک ہو۔ دنیا کا کوئی بھی موضوع ہو آپ اس پر مدلل بات کر سکتے ہو۔ سائنس کی دنیا میں دیکھا جائے تو آپ سے بڑا کوئی سائنسدان نظر نہیں آتا۔ فلکیات، طبعیات معاشیات اور ریاضیات آپ کو ہر شعبے میں ماہر پایا گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کئی ذہین انسانوں کی میموری آپ نے اپنے دماغ میں اپ لوڈ کر لی ہے۔"
"آپ کا اندازہ غلط ہے ہاورڈ۔ میں جو سپر مین بناؤں گا وہ مجھ سے سو گنا زیادہ صلاحیتوں کا مالک ہوگا۔"
"ڈیوڈ مجھے جو فائل دی گئی تھی اس میں آپ کا بیان کردہ پورا پلان بھی شامل تھا۔ وہ تمام تجربات بھی جو آپ کروانا چاہتے ہیں ان میں کچھ باتیں بہت عجیب و غریب ہیں۔"
"مثلاً...... وہ کون سی باتیں ہیں جو عجیب و غریب ہیں؟"
"مثلاً ہم وقت کو تھام لیں گے۔"
"ہاورڈ! آپ ماہر سائنسدان ہیں۔ کم از کم آپ کے لیے یہ بات عجیب نہیں ہونی چاہیے میں پھر بھی اس پر روشنی ڈالتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے یہ زمین ایک دیو ہیکل مقناطیس کی طرح ہے۔ یہ گردش کے مختلف درجوں کے ساتھ مقناطیسی میدان تخلیق کرتی ہے۔ اس کا طاقت ور اور کثیف مقناطیسی میدان زمین کی تیز گردش سے ماخوذ ہے......"
"یہ تو ایک عام سی بات ہے۔ اس میں وقت کو کیسے تھاما جا سکتا ہے؟"
"آپ میری بات مکمل ہونے دیں۔ زمین کی گمک کا تواتر اس کی گردش سے براہ راست تعلق رکھتا ہے ہم زمین کی گمک کے تواتر کو زمین کی نبض کہہ سکتے ہیں آج سے چار یا تین صدیاں قبل کا فارمولا ہے زمین کی نبض 7.8 ہرٹز یا 7 سائیکل فی سیکنڈ تھی۔ اگر ہم زمین کی گمک کو 7 سائیکل فی سیکنڈ سے بڑھا کر 13 سائیکل فی سیکنڈ تک لے جائیں تو......" ڈیوڈ کی بات سن کر ہاورڈ حیرت سے اچھل پڑا تھا۔
"او نو! یہ کیسے ممکن ہے؟"
"گردش کی فضا کو چھیڑ کر زمین کی نبض میں تیزی لا سکتے ہیں۔ اگر زمین کی نبض میں 13 سائیکل فی سیکنڈ تک تیزی آ جائے تو زمینی مقناطیسی فیلڈ زیرو کے قریب آ جائے گا۔ مقناطیسی میدان تھم جائے گا۔ زمین کی گردش رک جائے گی۔ گویا وقت رک جائے گا۔ ایک دن ایک ہفتے کے برابر یا عین ممکن ہے ایک ماہ کے برابر ہو جائے۔"
"آپ واقعی حیران کن شخص ہو ڈیوڈ۔ ہاورڈ نے اسے رشک آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاورڈ! ہم نے اسرائیل کو عظیم تر بنانا ہے۔ دنیا کو مٹھی میں لینا ہے۔ اس دنیا پر صرف ہماری حکمرانی ہوگی۔ صرف یہودیوں کی۔"
"آپ کا منصوبہ مجھے اس لیے بھی بے حد پسند آیا ہے ڈیوڈ کہ اس میں اسرائیل کو پوری دنیا کا حاکم بنانے کی بات ہے۔ ورنہ آج تک دنیا کی اہم ایجادات کے پیچھے ہمارا ہاتھ ہونے کے باوجود ہم سے زیادہ دنیا فائدے اٹھا رہی ہے۔"
"آپ ٹھیک کہتے ہو ہاورڈ! دنیا آج ترقی کی جس راہ پر گامزن ہے وہ یہودی سائنسدانوں کا کمال فن ہے۔ سب سے پہلے اہم ایجاد مائیکرو پروسیسنگ چپ کا خالق گروو عظیم سائنسدان یہودی تھا۔ نیوکلیئر چین ری ایکشن کے پیچھے لیو۔ آپٹیکل فائبر کیبل کا خالق چارلس کاؤ، فیس بک کا ایجاد کرنے والا مارک زکربرگ سب ہی ہمارے بھائی ہیں۔ سب یہودیوں کے بے مثال دماغوں کی ایجادات پر مزے اڑا رہے ہیں۔"
"ان تمام عظیم سائنسدانوں میں اب ایک اور با کمال اور ذہین ترین دماغ ڈیوڈ جوہانسن کا نام شامل ہو چکا ہے۔" ہاورڈ نے انتہائی خلوص سے داد و تحسین کے پھول نچھاور کیے تھے۔

"تھینک یو بابا جان۔"

"ڈیوڈ! آپ نے کن چیزوں موسموں کی تبدیلی کا بھی ذکر کیا ہے۔ کیا آپ کا اشارہ مصنوعی بارش کی طرف ہے؟"

"جہاں زمین بنجر ہو وہاں مصنوعی بارش سے انہیں کارآمد بنایا جا سکتا ہے اور جہاں بے پناہ قدرتی بارشوں کو روک کر علاقوں کو دراز کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں یہ سوال ہو کہ یہ کیسے ممکن ہے تو اس کا آسان کلیہ ہے زمین کے کسی بھی مخصوص حصے میں فضا کو الیکٹرونک بیم کے ذریعے آئیونائز کیا جا سکتا ہے یا پھر اسی حصے کو ڈی آئیونائز بھی کیا جا سکتا ہے۔" ڈیوڈ نے کہا۔

"آپ کی تمام وضاحت کا قائل ہو گیا ہوں ڈیوڈ! آپ کے ساتھ کام کرتے ہوئے فخر ہوتا ہے۔"

"مجھے بھی بابا جان آپ کے زرخیز ذہن سے بہت کچھ لینا ہے۔" ڈیوڈ نے کہا اس کے بعد وہ نیوکلیئر ریسرچ لیبارٹری جو عنقریب بنائی جا رہی تھی اس کے بارے میں ڈسکس کرنے لگے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"ہیلو اعجاز بیٹا میں صداقت علی خان بول رہا ہوں۔"

"ڈیڈی شکر ہے اللہ کا۔ میں نے آپ کی آواز سنی۔" دوسری طرف سے صداقت علی خان کے بڑے بیٹے اعجاز علی کی سسکی بھری آواز ابھری۔ صداقت خان بیٹے کی آواز سن کر وہ بے چین ہو رہا تھا۔

"بیٹا! کیسے ہو تم اور ایاز بیٹا کیسا ہے؟" صداقت خان نے بمشکل لہجے پر قابو پایا تھا اس کی آنکھیں پرنم تھیں اور چہرے پر فکرمندی کی لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔

"ڈیڈی! میں آپ کی آواز سن رہا ہوں۔ آپ لوگ کیسے ہیں ڈیڈی گھر میں سب خیریت ہے نا؟" اس بار چھوٹے بیٹے ایاز علی کی آواز نے صداقت خان کو رنجیدہ کر دیا تھا ایاز علی اعجاز سے چھوٹا تھا مگر وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اس نے اپنے لہجے پر ممکنہ حد تک قابو رکھا ہوا تھا۔ اعجاز کے لہجے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔

"بیٹا! تم لوگوں کو وہاں کوئی تکلیف تو نہیں تمہیں ٹارچر تو نہیں کیا جا رہا؟"

"نہیں ڈیڈی! ان لوگوں کا کہنا ہے جب تک تمہارے ڈیڈی ہماری باتیں مانتے رہیں گے تم بھائیوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔"

"بیٹا! تم لوگ پریشان مت ہونا اعجاز بیٹا تم دل چھوٹا مت کرنا۔ عنقریب تم دونوں بھائی پاکستان میں ہو گے۔"

"ڈیڈی! آپ جلدی کچھ کیجئے میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔" اعجاز نے لڑکھڑاتے لہجے میں بمشکل کہا تھا۔ وہ رو رہا تھا اور صداقت علی خان اس کے آنسو اپنے دل پر گرتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

"ایاز! تم بھائی کو سنبھالو بیٹا اللہ تعالیٰ نے یہ ہم پر کڑا امتحان ڈالا ہے۔"

"ڈیڈی آپ فکر مند نہ ہوں ان شاء اللہ اس امتحان میں سرخرو ہوں گے۔ ڈیڈی آپ نے ممی کو بتایا۔" ایاز نے باحوصلہ جواب دے کر صداقت خان کو سنبھالا دیا تھا۔

"نہیں بیٹا! میں خود اس آگ میں جل رہا ہوں۔ میں نے گھر میں کسی کو نہیں بتایا نہ بتا سکتا ہوں۔"

"یہ بہت اچھا کیا آپ نے ڈیڈی۔"

"بیٹا! اعجاز کو دلاسہ دینا یہ بہت حساس اور چھوٹے دل کا مالک ہے۔"

"ڈیڈی! آپ فکر نہ کریں ان شاء اللہ اللہ بہتر کرے گا۔"

"بیٹا! میں ان کے ساتھ مکمل تعاون کر رہا ہوں چند ہی دنوں کی بات ہے تم لوگوں کو رہا کر دیا جائے گا۔" صداقت علی خان چاہنے کے باوجود لہجے پر قابو نہ پا سکا تھا۔ اس کے ہونٹ کپکپانے لگے تھے۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس کے سامنے جوزف اور ٹوتھم سپاٹ چہرے کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کی نظروں میں سفاکی تھی۔

"ڈیڈی! ہم یہاں اعلیٰ تعلیم کے لیے آئے تھے تقدیر نے قیدی بنا دیا۔ مقدر کا لکھا کوئی نہیں ٹال سکتا۔ آپ کو اور ہم کو ہمت سے کام لینا ہو گا۔" بیٹے نے باپ کی ہمت بندھانے کی اچھی کوشش کی تھی۔ صداقت علی خان اعجاز سے

بات کرنے میں پرہیز کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اعجاز کے آنسو اور کھرا ہوا لہجہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ جوزف نے اسے کال منقطع کرنے کا اشارہ کیا تھا۔

"او کے اعجاز بیٹا، میں پھر فون کروں گا۔ ایاز بیٹا تم سمجھ گئے ہو نا میں کیا چاہتا ہوں؟"

"جی ڈیڈی، گھر میں سب کو سلام کہیے گا۔"

"او کے بیٹا، اللہ حافظ۔" صداقت خان نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دیا تھا۔ شاد پور کے جنگلات میں شکار پر چیتے کی طرح جھپٹنے والا صداقت خان آج بہت بوڑھا ہو گیا تھا اس کے چوڑے شانے ستے ہوئے تھے۔ اس نے کانپتے لرزتے ہاتھ جوزف کے سامنے جوڑ دیے تھے۔

"پلیز جوزف، تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ، تم یہ اتنا بڑا ظلم مت کرو میرے بیٹوں کو چھوڑ دو ان کی پریشانی نے مجھے مغلوب کر دیا ہے۔"

"صداقت خان! جب تک تمہارا تعاون جاری رہے گا وہ محفوظ رہیں گے۔" جوزف نے اطمینان سے جواب دیا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں میرا تعاون اسی طرح جاری رہے گا بس تم لوگ میرے بیٹوں کو چھوڑ دو میں ان کے دکھ میں نڈھال ہو گیا ہوں میں ٹوٹتے بکھرتے وجود کے ساتھ کچھ نہیں کر پاؤں گا۔"

"سوری مسٹر صداقت خان فی الحال تمہیں یہ دکھ جھیلنے ہوں گے۔" اس بار بوتھم نے سپاٹ انداز میں کہا تھا۔

"بوتھم! تم میرے بیٹوں کو آزاد چھوڑ دو انہیں پہلے کی طرح پڑھنے دو پاکستان میں آنے دو بے شک ان کی نگرانی کرو میرے تعاون میں کہیں بھی کوئی لچک دیکھو تم پھر سے انہیں قید کر لینا۔"

"تمہاری بات معقول ہے۔" بوتھم نے لہجے کی تلخی کا گراف نیچے نہیں آنے دیا تھا۔

"صداقت خان! ہم نے وعدہ کے مطابق تمہاری امریکہ میں بیٹوں سے بات کروا دی ہے اب مزید کچھ نہیں کر سکتے۔ اب تمہیں کرنا ہے۔ ہمیں یہ چاہیے۔" جوزف نے اس کی طرف تصویر بڑھاتے ہوئے کہا۔ صداقت خان نے تصویر کو دیکھ کر حیرت سے گنگ ہو گیا وہ کبھی تصویر کو دیکھتا اور کبھی جوزف کو۔ اس قدر حیران کیوں ہو؟

"یہ..... یہ تصویر....." بوکھلاہٹ میں صداقت خان کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔

"لڑکی کی ہے۔" بوتھم نے طنزیہ انداز میں اس کی ادھوری بات مکمل کی تھی۔

"اور یہ لڑکی ہمیں چاہیے۔" جوزف نے مسکرا کر بوتھم کو دیکھا۔

"یہ تصویر اسد محمود خان کی بیٹی کنزہ کی ہے۔" صداقت خان نے کہا۔

"ہم نہیں جانتے یہ کس کی ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں آئندہ دو تین دنوں میں ہمارے پاس ہونی چاہیے۔" اس بار جوزف کے لہجے میں کرختگی تھی۔

"نہیں جوزف ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اسد میرا بہترین دوست ہے اس کی بیٹی مجھے اپنی بیٹی جیسی لگتی ہے۔"

"سوچ لو صداقت خان ایک طرف دو سگے بیٹے ہیں دوسری طرف بیٹی جیسی لڑکی مگر بیٹی ہے نہیں۔"

"میں سب کچھ کر سکتا ہوں مگر عزت کا سودا نہیں کر سکتا۔ کنزہ میرے دوست کی بیٹی ہے تم کسی عام لڑکی کا کہتے تب بھی میں یہ کام نہیں کرتا۔ میں وطن کی بیٹی فروخت نہیں کر سکتا۔" صداقت خان کی بات سن کر بوتھم نے امریکہ رابطہ کر لیا تھا۔ صداقت خان بوتھم کی بات سن کر اچھل پڑا تھا بوتھم کہہ رہا تھا۔

"ہمیں صداقت کے چھوٹے بیٹے ایاز کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسے مار دو۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

شانی رات کے تین بجے گھر سے نکلا تھا وہاں تک پہنچتے ہوئے بہت ڈر لگا تھا۔ جہاں اس نے پر اسرار روشنی دیکھی تھی اور ناقابل فہم آوازیں سنی تھیں۔ کبھی کبھی اس کے دل میں واپس پلٹ جانے کا خیال آتا تھا۔ قدم تھم

جاتے تھے اور وہ خطرہ ہر سوچوں میں گھر جاتا تھا۔ مگر خوف و ہراس کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ پلٹ جانے کی سوچ ضرور آئی تھی لیکن دل میں لبالب بھرا تجسس قدم آگے بڑھانے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ چلتے رکتے اور پھر چلتے آخر وہاں پہنچ گیا تھا۔ جہاں روشنیوں کا ہالہ فلک کو چھو رہا تھا۔ جہاں پر اسرار آوازوں نے اسے سوچوں کے سمندر میں اتار دیا تھا۔ رات کی تاریکی عروج پر تھی۔ ہاتھ سے ہاتھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ روشنی کی باریک لکیر بھی میلوں دور سے دیکھی جا سکتی تھی لیکن جس روشنی کی کھوج میں وہ یہاں چلا آیا تھا وہ آج غائب تھی۔ نہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ماسوائے جھینگروں اور کتوں کے بھونکنے کی آواز کے فضا پر مہیب سناٹا تھا۔ شانی سوچوں میں گھر چکا تھا۔ ابھی وہ کسی فیصلے کی دہلیز پار نہیں کر پایا تھا کہ تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ جھکڑ اتنے اچانک چلنا شروع ہوئے تھے کہ شانی کے اوسان خطا ہو گئے تھے رات کے گہرے سناٹے میں تیز ہواؤں کی تیز شائیں شائیں دل کو دہلانے لگی تھی۔ شانی واپس پلٹنے لگا تھا کہ ہوا کا تیز بگولا اس کے گرد لٹو کی طرح گھومنے لگا تھا شانی نے ایسا ہوا کا گول چکر دور کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔ جو اچانک کہیں بھی تیز چرخی کی طرح گھومتا تھا اس کے ساتھ کسی دوست کا بقول مٹی پوری رفتار سے گھومتے تھے کبھی اس چکر میں کوئی پیڑ یا پلاسٹک کی تھیلی آ جاتے تو بگولا اسے سیکنڈوں میں آسمان کی بلندیوں میں پہنچا دیتا تھا۔ شانی کا دماغ گھومتی ہوا کے ساتھ گھومنے لگا تھا۔ ہوا کے زوردار تھپیڑے جسم کے آر پار ہو رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جسم پر نشتر برسائے جا رہے ہیں وہ تیز گرد و غبار سے باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے لگا تھا لیکن ہوا کے پھندے جسم کے گرد جیسے لپٹ گئے تھے۔ وہ انجانی بری طرح پھنس گیا تھا۔ وحشت، دہشت اور تیز ہواؤں کے امتزاج نے ذہن کو بانٹ دیا تھا۔ اس کے دماغ پر دھند چھانے لگی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ موت کے کنوئیں میں گھوم رہا ہے۔ یکلخت زمین سے اس کے قدم اکھڑ چکے تھے۔ گولی کی طرح تیز چلنے والے بگولے میں شانی چیخ رہا تھا۔ دور دور سے مدد کے لیے چلا رہا تھا۔ وہ یہ بات جاننے سے قاصر تھا کہ اس کی چیخ و پکار فقط ہوا کے چکر تک محدود ہیں۔ اس کی آوازیں نزدیک ترین مکان والے بھی نہیں سن سکتے تھے۔ وہ بے خبر نیند کی میٹھی آغوش میں سکون کی سانس لے رہے تھے اس خوفناک عمل میں مشکل دو منٹ صرف ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بگولا شانی کو فضا میں بلند کر چکا تھا۔ تیسرے منٹ میں وہ شانی کو ناقابل شناخت حدوں میں لے گیا تھا تب تک شانی ہوش و حواس کی دنیا سے بے خبر ہو چکا تھا۔

☆☆☆

شانی کو جب ہوش آیا تو وہ بوکھلاہٹ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بوکھلاہٹ کی وجہ شعور کا اسے سابقہ واقعہ یاد دلانا نہیں تھی بلکہ بوکھلاہٹ کا سبب وہ عجیب قہقہے تھے جو ہوش میں آتے ہی اس کے کانوں میں پڑے تھے۔ اس نے متوحش نگاہوں سے ارد گرد دیکھا۔ اس پاس عجیب الخلقت ہوائی مخلوق تھی جن کی شکلوں کو کوئی واضح نام دینا انتہائی مشکل تھا۔ وہ شانی کی طرف دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے شانی کو رفتہ رفتہ گزری شب کا واقعہ یاد آنے لگا تھا۔ خوفناک بگولے کی یاد نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے وہ کہاں ہے؟ یہ کون سی مخلوق ہے؟ کیا وہ زندہ ہے؟ یا قبر میں ہے سوالوں کا ناگ پھن پھیلائے ڈسنے لگا تھا مگر یہ قبر نہیں ہو سکتی وہ تو انتہائی تاریک گڑھا ہے جبکہ یہ روشن کھلا میدان تھا۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ ہوا نے اسے چابک کی طرح پیٹا تھا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ رہا تھا اور خوف زدہ نظروں سے ہوائی مخلوق کو دیکھ رہا تھا جن کی تعداد تیس سے چالیس کے قریب تھی جو اسے خوفناک نظروں سے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ مگر ان کی ہنسی بھی عجیب تھی شانی کا پسینے میں تر بتر وجود کانپ رہا تھا۔ وہ ایسی خوفناک صورت حال کا شکار تھا کہ قرآن پاک میں سے اسے جو کچھ یاد تھا سب بھول گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ گلے میں خراشوں سے

اٹھنیں ہو رہی تھی۔ وہ کچھ بھی کہہ نہیں پا رہا تھا۔ بہت جتن کے بعد اس کے ہونٹوں سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا خروج ہوا تھا۔

"میں..... میں کہاں ہوں؟" شانی کی آواز سن کر عجیب الخلقت مخلوق خوشی سے چھلانگیں لگانے لگی تھی۔ وہ میدان میں ادھر اُدھر بھاگنے لگے تھے۔ کبھی اچھل کر فضا میں بلند ہو جاتے تھے کبھی قلانچیں بھرتے ہوئے دور تک چلے جاتے تھے۔ شانی کے لیے ہر لمحہ دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار تھوک نگل کر خشک حلق کو تر کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم کے مصداق شانی خان ان کی خرخراتے برتنوں کی مشابہ زبان سمجھ پا رہا تھا۔ نہ وہ شانی کا کہا سمجھ سکتے تھے۔ شانی پر حیرتوں کا نزول جاری تھا۔ کچھ دیر میں میدان میں بڑے بڑے پیالے نمودار ہو چکے تھے۔ پیالے کہاں سے اور کیسے آئے تھے۔ شانی سمجھنے سے قاصر تھا۔ پیالے اتنے بڑے تھے کہ ہر پیالے میں ایک شخص با آسانی بیٹھ سکتا تھا۔ بونی مخلوق جمپ لگا کر پیالوں میں سوار ہو رہے تھے۔ شانی پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پیالے گیس بھرے غبارے کی طرح فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ میدان میں شانی تنہا رہ گیا تھا۔ وہ سر اٹھائے پیالوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو کافی بلندی پر پہنچ چکے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ کافی بلندی پر جانے کے باوجود ان کا اصل حجم برقرار تھا۔ جس سائز میں نیچے نظر آتے تھے اسی سائز میں اوپر نظر آ رہے تھے۔ البتہ نیچے سے صرف سواری دکھائی دیتی تھی مگر سوار نظروں سے اوجھل تھے۔ مگر کچھ دیر بعد پیالوں نے پلٹا کھایا۔ پیالے الٹے ہو چکے تھے۔ ان سے مقناطیس کی طرح چپکے ہوئے سوار اب واضح نظر آنے لگے تھے۔ شانی کی نظروں کا محور وہی تھے۔ وہ کسی نئے ڈرامے کی توقع کر رہا تھا کہ اسے خوف سے جھرجھری آ گئی۔ پیالوں نے اپنی سواری کو چھوڑ دیا تھا۔ اب بونی مخلوق کا جتھا کولی جیسی رفتار سے شانی کی طرف آ رہا تھا۔

☆☆☆

پر فضا شار پور کی سرسبز وادیوں پر خوف اور دہشت مسلط تھا۔ بیٹے کے بعد دیگرے دو المناک واقعات نے لوگوں کے دلوں میں وہم اور وسوسوں کو بھر دیا تھا۔ لوگوں کی آنکھوں میں ڈر کے سائے دراز ہو گئے تھے۔ دہشت زدہ چہروں کے ساتھ شار پور کے طول و عرض میں لوگ چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔ شار پور متفرق سوسائٹی کا علاقہ تھا۔ اس لیے لوگ اپنی اپنی بساط کے مطابق قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ دس دنوں سے اسعد محمود خان کا بیٹا شانی غائب تھا۔ جس کی تلاش میں اسعد محمود خان اور پولیس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ مگر تا حال اس کا کوئی سراغ نہیں لگایا جا سکا تھا۔ ابھی شانی کا معمہ حل نہیں ہوا تھا کہ جن و پریوں کا مسکن تصور کی جانے والی پہاڑی کی جڑ میں صداقت علی خان کی لاش پائی گئی تھی۔ صداقت خان کو دل کے عین عقب میں پیٹھ پر کسی نادیدہ قوت نے خنجر مارا تھا۔ جس سے اس کا دل پھٹ گیا تھا۔ صداقت خان کی پیٹھ پر پنجوں سے تھوڑا نیچے بہت بڑے ہاتھ کے پنجے کا واضح نشان تھا۔ پنجے کا سائز اونٹ کے پاؤں جتنا بڑا تھا۔ کہ ایسا نشان دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ عام آدمی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

شار پور کے نا خواندہ لوگوں کی ایک ہی رٹ تھی یہ جنات کا کام ہے۔ اس پہاڑی پر جنات و بھوتوں کا بسیرا ہے۔ جو بھی ان کے پاس جائے گا موت کو منتظر پائے گا۔ پڑھے لکھے لوگ جو جنات پر یقین نہیں رکھتے تھے اسے اتفاق قرار دے رہے تھے۔ یہ واقعات جو بھی اور جیسے بھی ہوں۔ حالات خوف زدہ کر دینے والے تھے۔ جن میں یہ دوسرا دہشت زدہ واقعہ تھا۔ تین ماہ قبل رفیق نامی شاہد پرویز کا ملازم جنگل میں لکڑیاں کاٹنے کے لیے گیا تھا مگر وہ بھٹکتے ہوئے اس پہاڑی کی طرف جا نکلا تھا۔ جہاں اسے موت نے دبوچ لیا تھا۔ رفیق کو بھی خنجر مارا گیا تھا۔ تب بھی لوگوں کی اکثریت کی رائے یہی تھی کہ اسے جنات نے مارا اور اب بھی یہی بات زبان زد عام تھی۔

صداقت علی خان، اسعد محمود خان کا بہترین دوست تھا۔ اسعد محمود کو پہلے ہی اس کی ناگہانی موت کا دکھ تھا۔ وہیں اسے

یہ سوچ کر غش آ رہے تھے کہ خدانخواستہ شانی بھی انہی پہاڑیوں میں نہ بھٹک گیا ہو صداقت خان کی پراسرار موت نے خوف کو اس قدر ہوا دی تھی کہ عام بندہ تو کیا اب پولیس بھی اس طرف جانے سے کتراتی تھی۔ پولیس اسد محمود خان کے اصرار پر کہہ تو رہی تھی کہ ہم پہاڑیوں اور اس کے اردگرد کی تمام جگہ چھان چکے ہیں اور مزید تلاش جاری ہے مگر اسد محمود کو ان کی کھوکھلی باتوں میں وزن کا فقدان لگتا تھا۔ اسد محمود کے دونوں بیٹے کامران اور اذان کوئٹہ سے فیملیوں کے ساتھ گھر آئے ہوئے تھے۔ [illegible] کہرام مچا ہوا تھا۔ ایک طرف صداقت کے گھر صف ماتم بچھی ہوئی تھی دوسری طرف اسد محمود خان کے گھر پریشانیوں کے سائے منڈلا رہے تھے۔ اسد محمود خان صداقت خان کے بڑے بیٹے [illegible] تھا۔ [illegible] جہاں ان سے [illegible] مستقل وقت میں وہ پہلے سے [illegible] سے رابطہ کر رہا تھا۔ لفظاً ڈیڈی سے حال احوال پوچھ لیا کرتا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا۔ پولیس اس کیس میں خاص دلچسپی نہیں لے رہی ہے۔ جنات کے خلاف بھلا ہم کیا کارروائی کریں گے۔ پولیس کے یہ الفاظ اس کے کانوں تک پہنچ چکے تھے۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچا جائے تو پولیس حق بجانب تھی۔ انہیں قسمت کا لکھا یہ افسوسناک واقعہ برداشت کرنا ہی تھا۔ [illegible] غشی کے دورے پڑ رہے تھے اور [illegible] رو رو کر نڈھال ہو رہی تھی۔ [illegible] خان نے عقل و فراست سے کام لیتے ہوئے تمام انتظامات سنبھالے تھے۔

اسد محمود جلدی دوست کو لے کر [illegible] آیا تو غم سے نڈھال تھا۔ بیٹے کی گمشدگی کا غم اسے نچوڑ رہا تھا۔ شانی پہلے بھی شوق کے شوق میں غائب ہوا تھا۔ مگر چند گھنٹوں کے لیے اس بار پورے دس دن بیت چکے تھے۔ صداقت خان کی سنگین موت نے ان کے دلوں میں لرزہ خیز امکان کو جنم دے دیا تھا کہ شانی بھی کہیں انہی پہاڑیوں میں غائب نہ ہوا ہو۔ یہ سوچ گھر کے تمام افراد کے دلوں میں جڑ پکڑ چکی تو اسد محمود خان نے تمام تر خطرات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خود شانی کی تلاش میں پہاڑوں پر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ جسے سن کر اس کی فیملی کو گہرا شاک لگا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔" بیگم کلثوم نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ کنزہ اور منزہ پاپا کی بات پر لرز گئی تھیں۔

"پاپا! میرے خیال میں یہ کام پولیس کو کرنے دیں تو [illegible] پاپا [illegible]"

"[illegible] پولیس کا [illegible] دو دن ہو گئے [illegible] وہاں تک جانے [illegible] پہاڑیوں میں موت [illegible] ہے۔"

"[illegible]"

"پولیس ٹھیک کہتی ہیں۔" کامران نے بھی ان کی تائید میں کہا۔ "مجھے میری ایک [illegible] کامران کا دوست [illegible] پولیس کو وہاں جانے پر مجبور کر دیں گے۔"

"تب تک بہت دیر ہو جائے گی۔ میں شانی کو کھونا....." اسد محمود نے روتے ہوئے کہا۔ ان کے لہجے میں گہرائی تک کرب اور دکھ تھا۔ وہ ہاتھ سے چہرہ ڈھانپ کر رو رہے تھے۔

"ان شاء اللہ شانی کو کچھ نہیں ہوگا پاپا!" دونوں نے آگے بڑھ کر ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں حوصلہ دیا۔

کنزہ اور منزہ نے بھی ان کے دائیں بائیں شانوں سے سر ٹیک رکھے تھے۔ جو بمشکل آنسو ضبط کیے ان کے گال گیلے آمیز انداز میں تھپتھپا رہی تھی۔ کنزہ منزہ سے آنسو [illegible]

سکے شانے تر کر رہے تھے۔

"پاپا! ہمیں اللہ پر بھروسہ رکھنا ہوگا۔ ان شاء اللہ شانی بحفاظت لوٹ آئے گا۔"

"مجھے اللہ پر بھروسہ ہے بیٹا! بس پتہ نہیں مجھ سے کون سی ایسی غلطی سرزد ہوئی ہے جس کی سزا دی جا رہی ہے۔ آج دس دن ہو چکے ہیں شانی کو غائب ہوئے مگر کوئی ایک کلیو ہمارے ہاتھ نہیں لگا ہے۔"

"اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا پاپا! زندگی غم و خوشی کا امتزاج ہے اور آزمائشوں کا طویل میدان بھی اس میدان میں صبر والے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔" اذان نے پرامید انداز میں پاپا کا ہاتھ ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ شاید وہ پہلا موقع تھا بیٹے باپ کو تسلیاں دے رہے تھے۔

اسد محمود خان بظاہر تو جانے پر راضی ہو گیا تھا مگر رات جب اپنے حجرے پر اترتی تو انہوں نے چپکے سے اپنا شکار والا لباس پہنا لانگ جنگلی جوتے پاؤں میں ڈالے اور ریوالور ہولسٹر میں ٹھونس کر باہر نکل آیا اس کا رخ پراسرار پہاڑیوں کی طرف تھا۔

☆☆☆

ڈیوڈ کے پلان کا کامیاب آغاز ہو چکا تھا۔ تین ماہ میں انتہائی اہم اقدام اٹھائے گئے تھے۔ نو ممالک نے مل کر نیو ورلڈ آرڈر کے انعقاد کے لیے تیاری شروع کر دی تھی۔ فی الحال مشن کو دو درجوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلا درجہ سیاسی اور سفارتی سطح کا تھا۔ دوسرا درجہ سائنسی ایجادات کی سطح کا تھا۔ جیوگرافیائی ریسرچ اداروں اور سائنسی ایجادات کا انچارج ڈیوڈ جوہانس کو بنایا گیا تھا۔ ڈیوڈ کے ساتھ نو ممالک کے چیدہ چیدہ سائنسدان مل کر کام کرنے جا رہے تھے۔ فی الحال ایک جدید ترین لیبارٹری مسٹر ہاورڈ کی نگرانی میں بنائی جا رہی تھی۔ ڈیوڈ کی تجویز پر ایک بین الاقوامی ریسرچ ادارے کا قیام بھی عمل میں لایا گیا تھا۔ ڈیوڈ کا خیال تھا کہ اس سے ہم پوری دنیا کے ذہین ترین دماغوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کریں گے۔ ڈیوڈ کی باتوں اور باتوں پر لائحہ عمل اتنے مربوط ہوتے تھے کہ مد مقابل اس کا قائل ہو کر رہ جاتا تھا۔ ڈیوڈ جوہانس نیو ورلڈ آرڈر مشن کے ایک اہم درجے کا سربراہ تھا اور اسرائیل کے اندرونی معاملات میں بھی اس کا مرکزی کردار تھا۔ ڈیوڈ نے اسرائیلی وزیر خارجہ الشن پی کو ایک تجویز دی تھی۔ الشن پی نے جب وہی تجویز سیاسی و سفارتی درجے میں پیش کی تو اسے فوراً منظور کر لیا گیا تھا۔ بلکہ نیو ورلڈ آرڈر کے لیے اس تجویز کو ایک سنگ میل قرار دیا گیا تھا۔

تجویز کے مطابق ایک بین الاقوامی ادارہ بنایا گیا تھا۔ جس کے کرتا دھرتا اصل میں تو یہی نو ممالک تھے مگر اس میں شمولیت پوری دنیا کے ممالک کر سکتے تھے۔

ادارے کا نام بین الاقوامی متحدہ ادارہ رکھا گیا تھا۔ اس کا باقاعدہ چارٹر مرتب کر دیا گیا تھا ایک ایسا منشور جو ظاہر میں کچھ تھا اور باطن میں کچھ تھا۔ اس کا ظاہری منشور بہت روشن اور چمکدار تھا۔ منشور کے مطابق

1: آئندہ آنے والی نسلوں کو دنیا میں ہونے والی جنگوں کی تباہ کاریوں سے بچانا ہے۔

2: جو ملک کسی بھی وجہ سے باہمی تنازعات میں الجھے ہوئے ہیں ان تنازعات کا حل نکال کر باہمی خوشگوار تعلقات قائم کرنے ان کے درمیان معاشرتی و معاشی تعاون کی فضا پیدا کرنا ہے۔

3: بہت سے ممالک میں انسانوں کے بنیادی حقوق کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی جا رہی ہے متحدہ ادارہ دلیقین و احترام کی راہ ہموار کرتے ہوئے رنگ و نسل، زبان و مذہب اور جنس کی بنیاد پر امتیازات کے بغیر انسانی حقوق تسلیم کروائے گا۔

4: اقوام کو ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں مداخلت سے روکنا بھی ادارہ کا کام تھا۔

منشور مرتب کرنے کے بعد یہ طے کر لیا گیا تھا جو ملک بھی اس منشور سے اتفاق کرے گا اور رکنیت کی درخواست دے گا تو جنرل اسمبلی کی منظوری کے بعد اسے رکنیت دے دی جائے گی۔

یہ ادارے کا روشن اور چمکدار پہلو تھا دوسرے لفظوں میں انسانوں کا ظاہری روپ تھا۔ باطنی روپ ہی جو اصل انسان کا روپ ہوتا ہے یعنی من کے ایسان اصل انسان ہوتے ہیں اگر من صاف وشفاف ہو تو یہی انسانیت اس پہ فخر کرتی ہے اور اسے اشرف المخلوقات کا لقب دیتی ہے۔ مگر ظاہر صاف اور من سیاہ ہو تو وہ نام کی حد تک انسان رہ جاتا ہے ورنہ ان میں اور جانوروں میں فرق مٹ جاتا ہے۔

بین الاقوامی ادارے ان کا بھی باطنی روپ کچھ اور تھا۔

آنے والی نسلوں کو جنگ کی تباہ کاریوں سے بچانے کی غرض سے قوموں کو ان کی تباہ کاریوں سے آگاہی دی جائے گی۔ ان کے لاشعور میں کوٹ کوٹ کر جنگ وجدل کا خوف بھر دیا جائے گا۔ جب قومیں جنگ سے دور بھاگنے لگیں گی تب ایسے اسباب پیدا کیے جائیں گے کہ پڑوسی ممالک ایک دوسرے سے خطرات محسوس کریں گے۔ جب ایسے حالات پروان چڑھ جائیں گے تو قومیں ان کی طرف دوڑیں گی۔ یہیں کئی پڑوسیوں کے باہمی تنازعات کا حل تلاش کرنے کے منشور کے مطابق وہ وہاں جائیں گے اور ناپسندیدہ حکومت ہٹا کر من پسند حکومت لائیں گے۔

یہ بات فائل کر لی گئی تھی کہ ادارہ جب اقوام عالم میں مقبول ہو جائے گا اور ملک اس کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کریں گے تب ایک اور قدم اٹھایا جائے گا اس قدم میں دو اپنے ذیلی ادارے بنائے جائیں گے جو دنیا کی معیشت کا دھیرے دھیرے کنٹرول سنبھال لیں گے ان کی معاونت کے لیے ایسی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی بنیاد ڈالی جائے گی جن کا بجٹ تیسرے درجے کے ملک سے زیادہ ہوگا۔

دنیا پر نیو ورلڈ آرڈر کے لیے دھیرے دھیرے گھیرا تنگ کرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

جس برق رفتاری سے بونی مخلوق شانی کی جانب گر رہی تھی اس سے شانی نے سمجھ لیا تھا کہ اس کے جسم کے چیتھڑے اڑنے والے ہیں وہ لمحوں میں سر دبائے آنکھیں بند کیے بیٹھ گیا تھا۔ لرزتے وجود کے ساتھ وہ خوفناک ٹکراؤ کا منتظر تھا۔ لمحے گزر رہے تھے اس کا دل پھٹنے کی حد تک تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ لحہ بہ لحہ ٹکرائے جانے کا خوف اس پر حاوی ہو رہا تھا۔ لیکن یہ خوفناک جان لیوا تصادم نہیں ہوا تھا۔ بونی مخلوق اس کے سر سے صرف دو میٹر اوپر آ کر یک لخت چمگادڑوں کی طرح دائیں بائیں تقسیم ہو گئی تھی۔ شانی کے خطا ہوتے ہوئے اوسان میں تب جان آئی جب اس نے اردگرد عجیب و غریب قہقہے سنے اس نے فوراً آنکھیں کھول دیکھا بونی مخلوق اس کے گرد گھیرا ڈالے ہنس رہی تھی۔ ہنسنے سے ان کی ڈراؤنی شکلیں پہلے سے مزید ڈراؤنی ہو رہی تھیں۔ شانی کو پہلی بار احساس خوشی دلا گیا تھا کہ وہ جان لیوا تصادم سے بچ گیا ہے۔ اس نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس کا ذہن فکر و اندیشوں نے گھیر رکھا تھا۔ اسے یہ تک پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ سوچیں الٹ گئی تھیں یا ذہن کے در پر خوف نے تالا چڑھا رکھا تھا۔ وہ کچھ بھی واضح طور سے سوچ نہیں پا رہا تھا۔ وہ بوجھل ذہن کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اسے ایک زوردار دھکا لگا۔ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ دھکے کا مرکز سمجھنے کے لیے اس نے اردگرد دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے سامنے وہی پیالہ تھا جس میں بونی مخلوق نے بیٹھ کر ہوا کا سفر کیا تھا۔ دھکے کی وجہ سے پیالہ دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ بونی مخلوق اسے پیالے میں بیٹھنے کا اشارہ دے رہی تھی۔ شانی خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے قدم زمین چھوڑنے پر رضامند نہیں تھے۔ بونی مخلوق نے اسے دھکے دے کر پیالے میں بٹھا دیا تھا۔ وہ حیران تھا اس عجیب الخلقت مخلوق پر جن کا قد اس کے گھٹنوں کے برابر تھا مگر وہ جب اسے دھکا دیتے تھے تو شانی کو اپنی پشت پر بھاری چیز کے ٹکرانے کا شدید ترین احساس ہوتا تھا۔ اسے زبردستی پیالے میں بٹھا دیا گیا تھا

جو اس کے بیٹھتے ہی ہوا میں بلند ہو گیا تھا۔ شالی نیچے چھلانگ لگانا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ اس سواری کا سفر دیکھ چکا تھا۔ مگر خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ پیالے کے ساتھ یوں چپک گیا تھا جیسے گوند سے کاغذ کو چپکا دیا جاتا ہے۔ اوپر فضا میں جسم کو سن کر دینے والی ہوا چل رہی تھی۔ وہ ڈر سے نیچے نہیں دیکھ رہا تھا جو اس میں اس کے منہ سے کربناک چیخیں خارج ہو رہی تھیں۔ کیونکہ پیالہ ایک دم الٹ چکا تھا۔ لیکن وہ پیالے سے چپکا ہوا تھا شالی کو اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی کیونکہ پیالہ سے آزاد ہو کر وہ زمین کی طرف بڑی تیزی سے گر رہا تھا۔ ہوا کی تیز رفتاری سے اس کے لیے چیخنا بھی محال تھا۔ ہوا کے تھپیڑے سے لگ رہا تھا کہ اس کے جسم کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ پانچ منٹ کے جان لیوا سفر کے بعد وہ دھڑام سے نیچے گرا تھا۔ جس رفتار سے وہ نیچے کی طرف آ رہا تھا اگر اسی رفتار سے گرتا تو یقیناً اس کی ہڈی پسلی بکھر گئی ہوتی لیکن وہ کم رفتار سے نیچے گرا تھا۔ پھر بھی جسم کا جوڑ جوڑ ہل گیا تھا۔ گو کہ جسم کے کسی حصے سے خون نہیں نکلا تھا۔ نہ کوئی ہڈی پسلی ٹوٹی تھی لیکن وہ بے تحاشا ڈر گیا تھا۔ وہ درد سے بلبلا اٹھا تھا۔ اس کی کربناک چیخوں سے بونی مخلوق کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ وہ شالی سے کھلونے کی طرح کھیلتے تھے۔ شالی کی شامت ہی آ گئی تھی۔ وہ اسے فٹ بال کی طرح پاؤں پر رکھتے تھے شالی کے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ جب وہ اسے فٹ بال کی طرح ککس لگاتے تو اس کا قد دراز ہو جاتا تھا کبھی وہ اسے دراز قد میں بھاگنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ شالی آگے اور وہ پیچھے ہوتے تھے۔ شالی کو اتنا دوڑاتے تھے کہ سانس لینا دوبھر ہو جاتا تھا۔ سانس اس قدر پھول جاتی تھی کہ اسے لگتا بے ترتیب سانسوں کے ساتھ دل بھی اچھل کر حلق میں آ جائے گا۔ یا پھر جگر پھٹ جائے گا۔ شالی کو کئی بار کئی کئی میل دوڑایا گیا تھا۔ اس پر عجیب و غریب ظلم ڈھائے جانے لگے تھے۔ وہاں بہت بڑے بڑے گڑھے تھے گہرے اور لمبے۔ بونی مخلوق اڑ کر گڑھے عبور کر لیتی تھی جبکہ شالی کو بھگا کر چھلانگ لگانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ کئی بار شالی گڑھے میں گر کر جان کھو بیٹھا تھا مگر رفتہ رفتہ وہ بھی چھلانگیں لگانے کا عادی بن چکا تھا۔ شالی ان کی کارستانیوں سے عاجز تھا مگر بے بسی کے عالم میں وہ کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ جب بونی مخلوق نے دیکھا کہ شالی کئی میل بھاگنے کے باوجود تھکتا نہیں اور طویل گڑھے سے بھی چھلانگ لگا لیتا ہے تو انہوں نے شالی کے ساتھ باکسنگ کھیلنا شروع کر دی تھی۔ چاروں طرف سے اس پر وار کیے جاتے تھے۔ اس کا پورا بدن لاتوں اور شدید ضربوں کی زد میں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی زچ آ کر وہ بھی کسی کو مکا یا لات جڑ دیتا تھا۔ جس سے بونی مخلوق مزید لطف اندوز ہوتی۔ ان کے حملوں میں شدت آ جاتی تھی جب شالی پر چاروں طرف سے حملے شروع ہونے لگتے تو وہ اچھل اچھل کر اپنا بچاؤ کرنے لگتا تھا۔ جب شالی پھرکی کی طرح گھوم کر خود کو بچاتا تو بونی مخلوق خوشی سے ناچنے لگتی۔ شالی کو لگ رہا تھا کہ وہ اب زندگی بھر اس دنیا میں چین نہیں لے سکے گا۔ وہ کئی بار گھر اور گھر والوں کو یاد کر کے رویا تھا۔ شالی اس وقت انتہائی حیران رہ جاتا جب بھوک لگنے پر اس کے سامنے اچھے اچھے مزے دار کھانے موجود ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ اس کے سامنے بھنا ہوا گوشت بھی موجود رہتا تھا۔ وہ حیران ہو جاتا کہ جب بڑی بھوک لگتی تو اسے بونی مخلوق اچک لیتی اور شالی یہ دیکھ کر مزید حیرت میں گر جاتا کہ اس کی چکھی ہوئی بوٹی پر گوشت ہوتی ہے۔ شالی جب حد سے بڑھ کر تھک جاتا تو کہیں بھی سو جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک بار جب وہ سو کر اٹھا تو چند منٹ آنکھیں مسلتا رہا تھا کیونکہ اس کے سامنے ایک اور دنیا تھی۔ وہ حیرت کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا کیونکہ بونی مخلوق کی جگہ دراز قد اور دیوہیکل مخلوق نے لے لی تھی ان کی شکلیں بھی ڈراؤنی اور وحشت ناک تھیں وہ تعداد میں بھی بہت زیادہ تھے تاہم وہاں کسی گاؤں جیسا ماحول تھا سب اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے۔ کسی کی بھی شالی کی طرف توجہ نہیں تھی۔ شالی ڈرتے ڈرتے

ادھر ادھر گھومنے لگا۔ وہ کھردری زمین تھی۔ یہاں بڑے بڑے پتھر بھی تھے اور ناقابل شناخت درخت بھی شانی ریچھ کی شکل کی مادی مخلوق کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر ایک طرف سمٹ جاتا تھا۔ تاہم وہ شانی کو بنا پوچھے پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ شانی چلتے چلتے ایک جگہ پہنچ گیا۔ وہاں اس کے لیے ایک اور حیران کرنے والا منظر منتظر تھا۔ وہاں ایک چوبی تخت بنا ہوا تھا۔ تخت پر کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ انسانی شکل سے مشابہ تھا اور اس کے سامنے رحل کھلی ہوئی تھی۔ شانی اسے دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ کسی انسان کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر سفید لمبی داڑھی تھی اور وہ قرآن پڑھ رہا تھا۔

شانی تیز قدموں کے ساتھ وہاں پہنچا۔

"السلام علیکم۔" قریب پہنچتے ہی اس نے بے اختیار سلام کیا تھا اور جواب بڑی خوش دلی سے دیا گیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" شانی کو خوشی سے چپ لگ گئی تھی۔ کوئی سوال کوئی بات اس کے حلق سے لبوں کی حد پار نہیں کر رہی تھی۔

"تم انسان اور یہاں؟" شانی کے کانوں میں حیرت میں ڈوبی آواز پڑی۔

"جی... جی میں... آپ کون ہیں... میں کہاں ہوں؟" وہ بمشکل کہہ پایا تھا۔ کیونکہ وہ آواز تھی خوابی آواز اسے اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔ الفاظ کا مفہوم اسے بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بول رہے ہیں۔

"میں تو جن ہوں اور تم اس وقت جنات کی بستی میں ہو۔" شانی نے گویا سنا تھا وہ کسی طاقتور بم پھٹنے سے کم نہیں تھا اسے پاؤں سے زمین نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

"جن... جنات... میں... جناب..."

"ہاں تم جنات کے زنداں میں اسیر ہو... مگر ڈرو نہیں یہاں بیٹھ جاؤ۔" بوڑھے جن نے اسے پیار سے تخت پر بٹھا دیا تھا۔ جس کے سامنے قرآن مجید کھلا ہوا تھا اور وہ سورۂ جن پڑھ رہا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"جی... شا... شانی۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد شانی کو اپنا نام یاد آیا تھا۔

"پاکستان کے رہنے والے ہو؟" بوڑھے جن کے سوال پر شانی نے اسے پریشان نظروں سے دیکھا تھا۔ اسے خاموش پا کر جن بولا۔

"انڈیا یا پھر بنگلہ دیش ہو؟"

"میں پاکستانی ہوں۔ کیا ہم اس وقت پاکستان میں ہیں؟"

"ہم پاکستان میں نہیں ہیں بلکہ ہم اس وقت فلسطین کی مقدس فضاؤں میں ہیں۔"

اس پر شانی کو لگا جیسے اس کے سر پر پورا پہاڑ گر پڑا ہے اور وہ نیچے دب کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بوڑھے جن نے اس کی پوری روداد سن کر ہوا سے جھولے سے لے کر اب تک کی حیرت ناک روداد سن کر بوڑھا جن اسے تخت پر بٹھا کر کہیں غائب ہو گیا۔ جب بوڑھا جن واپس پلٹا تو اس پر سب کچھ عیاں ہو چکا تھا۔ وہ شانی کے پاس بیٹھ کر بولا۔

"اس وقت ہم گولان کے پہاڑی سلسلے کی سب سے اونچی چوٹی جبل الشیخ پر موجود ہیں۔ اس کی اونچائی 9232 فٹ ہے۔ جبل الشیخ کے ایک طرف بیت المقدس ہے دوسری طرف اس کے بالکل پیچھے کی طرف دمشق ہے۔ میں اسے بیت المقدس کے تقدس کی وجہ سے فلسطین کا حصہ سمجھتا ہوں۔ جبکہ گولان کی پہاڑیاں پہلے شام کے پاس تھیں۔ جنہیں جنگ کے بعد اسرائیل نے چھین لیا۔ اس وقت جبل الشیخ کا جو پہاڑی سلسلہ ہے اس پر لبنان، شام اور اسرائیل کا قبضہ ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟"

"جی... جی۔" شانی جو سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا سب کچھ سن رہا تھا۔ چونک کر بولا اسے حیرت ہو رہی تھی کہ ایک جن کس انسانی صورت کی طرح اسے تاریخ بتا رہا تھا۔

"ہمارے آباؤ اجداد اسی جبل الشیخ پر رہائش پذیر تھے جب گولان کی پہاڑیوں پر کفر کا قبضہ ہوا تو ہم دل برداشتہ ہو گئے اور یہاں سے ہجرت کی ٹھان لی ہمارا ایک گروپ جو چالیس مسلمان جنات پر مشتمل تھا یہاں سے ہجرت کر گیا۔"

"مسلم...... مسلمان جنات۔" شانی کو یہ بات ناقابل یقین لگی تھی۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ ہماری مخلوق میں بھی مسلم اور غیر مسلم ہوتے ہیں؟"

"نن...... نہیں۔" شانی نے اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا اور اب اسے وہاں رحل میں کھلے قرآن مجید کی حقیقت کا بھی علم ہو چکا تھا۔

"میں تمہیں جنات کی حقیقت اور ان کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا فی الحال تمہیں یہاں لانے کی وجہ بتاتا ہوں۔" شانی اس بار خاموش رہا تھا۔

"ہم میں سے باقی کے ہم چالیس مسلمان جنات نے جبل الشیخ سے صرف اس لیے ہجرت کی تھی کہ ہمیں کفر کی غلامی میں نہیں جینا تھا۔ ہمارے آقا و مولا حضرت محمد ﷺ کی خاص عنایت سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ طاقت عنایت فرمائی ہے کہ ہم انسانوں کو نظر نہیں آتے مگر ہمیں وہ نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہماری غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ ہم کفریہ حکومت میں سانس لیں اس لیے ہم ہجرت کر کے ان دیکھی منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ جہاں ہمارا قافلہ رکا وہ ایک خوبصورت ملک تھا اس میں مسلمان بستے تھے جو اسلام کا بہت احترام کرتے تھے ہم نے وہاں باقاعدہ ڈیرے جما لیے جانتے ہو وہ کون سا ملک تھا؟" شانی نے ہونقوں کی طرح بوڑھے جن کو دیکھا۔ یہ تمام باتیں ہی اس کے لیے عقل سے ماورا تھیں۔ بوڑھا جن سمجھ گیا کہ شانی کچھ پوچھنے کی حالت میں نہیں ہے۔ جن نے بات جاری رکھی۔

"وہ خوبصورت ملک تھا پاکستان......"

"پاک...... کستان۔" اس بار الفاظ خود بخود شانی کے ہونٹوں سے نکلے تھے۔

"ہاں ہم نے پاکستان کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ کیونکہ پاکستان پورے عالم اسلام میں ایک ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان میں اسلام کے شیدا لوگ رہائش پذیر ہیں۔ اس لیے ہمیں وہاں سکون ملا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ پاکستان کے حالات کروٹ لینے لگے اور بالآخر پاکستان بھی غلام بن گیا۔"

"غلام......؟ پاکستان غلام نہیں آزاد ہے۔" شانی کو جذبات میں کہے گئے اپنے الفاظ پر حیرت ہوئی تھی۔

"تم ابھی بہت چھوٹے ہو نوجوان ہو پرجوش ہو اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے عاری ہو۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ نے شعور دیا ہے تو [illegible] باتوں پر غور کرنا۔ پاکستان [illegible] دیکھنے میں واقعی آزاد ہے [illegible] ظاہری صورت سے باطنی صورت اس سے مختلف ہے [illegible] تمہیں سمجھا نہیں پاؤں گا۔ [illegible] واپس پلٹ جاؤ گے [illegible] بتاؤں ہم پاکستان میں ہمارے تعلقات بہت اچھے استوار ہو گئے تھے۔ جب ہم نے اپنے آباؤ اجداد کے آشیانوں میں پلٹنے کا فیصلہ کیا تو وہ بھی ہمارے ساتھ تیار ہو گئے۔ ان میں کچھ غیر مسلم جنات بھی تھے۔ خیر ہم نے اچھے تعلقات کی بنا پر انہیں بھی ساتھ لیا اور رخت سفر باندھا۔ سفر کے دوران بہت خوبصورت پہاڑیاں اور وادیاں دیکھ کر ہم وہاں اتر گئے وہاں گھنے جنگلات، بلند پہاڑیاں اور سرسبز وادیاں تھیں۔ ہم اپنی اپنی طبع کے مطابق پھیلاؤ ہی کے لیے پھیل گئے۔ جنات کے مختلف درجے ہیں خالص جن بولنا مقصود ہو تو جن ہی کہا جاتا ہے۔ آبادی میں رہنے والے جنات عامر کہلاتے ہیں، بچوں کو ستانے والے جن ارواح ہیں۔ بہت ہی گندے غیر مسلم اور خبیث قسم کے جنات کو شیطان کہتے ہیں۔ بہت زیادہ شریر جنات کو مارد کہتے ہیں اور سب سے

زیادہ عیار و مکار جنات کو عفریت کہتے ہیں۔ ہمارے قافلے میں مادہ جنات اور ان کے بچے بھی شامل تھے۔ مادہ جنات کے بچے وہاں جنگل میں کھیل کود میں مگن ہو گئے تھے وہاں تم شکار کھیلنے کے لیے گئے تھے تمہارے کیے ہوئے فائروں نے ان بچوں کو ڈرا دیا تھا اور وہ روتے ہوئے والدین کے پاس پہنچے تھے تب ہم نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اس لیے تمہیں چھوڑ کر گیا۔ مگر اجداز ان بچوں کی بے حد ضد پر مادہ جنات نے تمہیں یہاں گوالان کی پہاڑیوں میں پہنچا دیا۔ ابتدا میں انہی جن بچوں نے تمہیں اپنے کھیل کود کے میدان میں خوب ستایا تھا اور جب ان کا جی بھر گیا تو یہاں لے آئے آبادی کی طرف۔"

شانی تعجب سے یہ وضاحت سن رہا تھا۔

شانی کو اب ساری صورت حال کا علم ہو چکا تھا۔ وہ جتنی اذیتیں اور پریشانیاں سہہ چکا تھا اب مزید کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ ممکن تھا وہ شریر بچے اسے پھر سے میدان میں لے جاتے اور ایک بار پھر وہ ان مصیبتوں کا شکار ہو جاتے مگر بوڑھے مسلمان جن کو دیکھ کر شانی کو ڈھارس بندھی تھی۔ اس کے ذہن میں بہت سے سوالات بھی ابھر رہے تھے۔

"آپ جن ہو مگر میرے ساتھ انسانوں کی طرح میری زبان میں باتیں کر رہے ہو۔"

"جنات کی بہت سی قسمیں ہیں ان میں ایک قسم ایسی بھی ہے جس کا آدھا دھڑ انسانوں جیسا ہوتا ہے اس کا نام شق ہے مگر شق کی برائی یہ ہے کہ وہ تنہا مسافروں کو بہت پریشان کرتے ہیں بلکہ بعض دفعہ جان سے مار دیتے ہیں۔ جہاں تک میری باتوں کا تعلق ہے تو میں پاکستان کی بستیوں میں لوگوں کے درمیان رہتا ہوں۔ مجھے مٹھائی پسند ہے میں نے کئی بار حلوائی کی دکان سے مٹھائی بھی خریدی ہے۔"

"کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟" شانی کے لیے ہر موڑ پر نیا تجربہ تھا تا ہم دھیرے دھیرے اس کا خوف کم ہو رہا تھا۔

"آقائے مدنی حضرت محمد ﷺ کے زمانے میں مسلم اور مشرک جنات مکانات کے بارے میں جھگڑا کر رہے تھے۔ تب آپ ﷺ نے مسلم جنات کو بستیوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں میں رہنے کا کہہ دیا اور مشرک جنات کو پہاڑوں کی وادیوں میں اور جزیروں میں رہنے کے لیے کہہ دیا۔ یوں ہم مسلم جنات بستیوں میں ہی رہتے ہیں....." بوڑھا جن کہتے کہتے چند ثانیے رکا پھر بولا۔

"نماز کا وقت ہو چکا ہے میں نماز پڑھتا ہوں تم میرے ساتھ باجماعت نماز ادا کرو۔"

شانی تذبذب میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔

"ہم مکلف ہیں۔ مدنی آقا حضرت محمد ﷺ جس طرح انسانوں کی طرف اللہ تعالیٰ کے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اسی طرح وہ ہماری طرف بھی رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں تم میری امامت میں نماز ادا کر سکتے ہو۔"

جن یہ سمجھ رہا تھا کہ شانی اس کے پیچھے نماز ادا نہیں کرنا چاہ رہا ہے مگر بات کچھ اور تھی جن کو وہ بات سمجھ دیر بعد سمجھ آئی۔

"تمہیں نماز آتی ہے؟"

"نہیں... نہیں....." شانی کے لیے یہ شرمناک حقیقت تھی کہ اس کے گھر میں اس کے سامنے کسی نے بھی کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ نہ کبھی اسے سکھانے یا پڑھانے کی کوشش کی گئی تھی۔

"تمہاری عمر کیا ہے؟"

"سترہ برس۔"

"انسانوں میں جب مسلمان بچے کی عمر سات برس ہو جائے تو اسے نماز کا حکم دیا گیا ہے اور دس برس کی عمر میں تو سختی سے نماز ادا کرنے کو کہا گیا ہے۔ تمہیں سترہ برس تک نماز ادا کرنی نہیں آتی۔ شانی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔"

"تم بیٹھو میں نماز ادا کرتا ہوں۔ اس کے بعد باتیں ہوں گی۔" بوڑھا جن نماز ادا کرنے میں مگن ہو گیا تھا۔ شانی پر سوچوں کا بے حد بوجھ بڑھ گیا تھا۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

ابتدائی چند منٹ میں سیلیا کو اصل ماجرہ کی سمجھ نہیں آئی۔ اس کے سامنے جو واقعہ رونما ہو چکا تھا اس کی تہہ تک پہنچنے میں اسے چند منٹ لگے تھے۔ جو اس کی نظروں نے دیکھا تھا وہ اب وہاں نہیں تھا۔ نہ شانی تھا۔ نہ شانی کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ہوا کا بگولا۔ سیلیا کو فیصلے کی دہلیز پار کرنے میں کچھ وقت کا سامنا ہوا اسے گرو کی باتیں یاد آنے لگی۔ چاہے کچھ بھی ہوا پنے ہدف کو تنہا نہیں چھوڑنا ہے۔ گرو کی بات یاد آتے ہی اس نے شانی کے پیچھے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تاہم اس بار شانی کو اس نے الگ دنیا میں پایا تھا۔

سیلیا کے لیے باعث مسرت بات یہ تھی کہ نئی دنیا میں شانی کو بے انتہا ستایا جا رہا تھا۔ شانی وہاں ظلم و ستم کی چکی میں پس رہا تھا۔ یہ فرحت بخش احساس سیلیا کو خوش کر رہا تھا۔ اسے خوش ہونا بھی چاہیے ہر کوئی اپنے دشمن کی ذلت و شکست اور تکالیف پر خوش ہوتا ہے۔ شانی اس کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اپنے دشمن کو اذیت میں دیکھ کر شادمانی فطری بات تھی۔ جب جنات نے شریر بچے شانی کو ایذا پہنچاتے اور خوشی سے چیخا کرتے تو سیلیا بھی ان جنوں میں ناچنے لگا تھا۔ کئی بار جب شانی کو فٹ بال بنا کر پیا جا رہا تھا تو سیلیا نے بھی اس دہشت میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔ سیلیا چونکہ انتہائی منفی فطرت کا مالک تھا اس لیے دوسروں کی تکالیف میں خوش ہونا اس کی فطرت کا حصہ تھا۔ خصوصاً اپنے ہدف کی پریشانیوں پر وہ جھوم رہا تھا۔ سیلیا کو وہاں بہت لطف آ رہا تھا مگر اچانک اس کا مزہ بوڑھے جن نے غارت کر دیا بوڑھے جن کے پاس جاتے ہی شانی کو دی جانے والی تکالیف میں ٹھہراؤ آ گیا تھا پھر بوڑھے جن کی ایک بات نے اسے گہرے اندیشوں میں دھکیل دیا تھا۔ بوڑھے جن کی شانی کو دی جانے والی نصیحت پر سیلیا کو گرو کی بات یاد آ گئی تھی جس سے سیلیا کو صحیح معنوں میں فکر کی زنجیر نے جکڑ لیا تھا۔ گرو نے کہا تھا۔

"میں صرف مومن کے انسان سے ڈرتا ہوں مومن کے انسان خواہشات کے غلام نہیں بنتے خواہشات کو غلام بنا کر خود حاکم کی کرسی پر فائز ہو جاتے ہیں۔ وہ فتح و نصرت، کامیابی، ترقی اور منزل مقصود تک پہنچانے والے چاروں ٹائروں علم، تقویٰ، جہاد اور دعوت کو زندگی کی گاڑی میں فٹ کر کے چلتے ہیں۔" بوڑھا جن شانی کو مومن کا انسان بن جانے کی نصیحت کر رہا تھا۔ سیلیا کو پہلی بار شانی سے خوف محسوس ہوا تھا۔ اب تک وہ اسے بہت سہل ہدف سمجھ رہا تھا۔ یہ بہت اہم بات تھی جس کا گرو کے علم میں لانا ضروری تھا۔

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں سیلیا کہ ایک آسان ہدف پر اپنی صلاحیتیں ضائع کروں۔" اس کی بات سن کر گرو نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"دنیا میں کروڑوں انسان رہتے ہیں جو ہمارے لیے بے ضرر ہیں میں انہی کو ٹارگٹ کرتا ہوں۔ جن کی کوئی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ جو ہمارے مشن میں رکاوٹ بن سکتے ہیں میں صرف انہیں ذلیل و خوار کرتا ہوں جو ہماری حکمرانی زمین و آسمان اور سمندروں پر تسلیم کرنے میں روڑے اٹکاتے ہیں ایسے ہی انسان ہمارے دشمن ہیں اور میں انہی کو شکست دیتا ہوں۔ اور پریشانیاں ان کا مقدر بنا دیتا ہوں۔"

"آپ تو ہر دور کے مومن کے ساتھ کیسے دشمنی کرتے ہیں مگر آپ جو کرتے ہیں وہ ٹھیک کرتے ہیں اور آپ جو جانتے ہو وہ ہم نہیں جانتے۔" سیلیا نے انتہائی مودبانہ انداز میں کہا۔

"بس تمہارے لیے وہی سب کچھ ہے جو تمہارے حوالے کیا گیا ہے۔ کبھی شانی کو مومن کا انسان مت بننے دینا اسے غفلت کے صحراؤں میں بھٹکائے رکھنا۔ اسے اوہام اور شکوک میں رکھنا اور اسے اس حد پر پہنچا دینا جہاں وہ چیخ چیخ کر ہماری بڑھائی اور عظمت کا اعلان کرنے میں ہر حیلے سے یہی چاہتا ہوں۔"

"آپ کا ہر حیلہ جی جان سے آپ کی بات پوری کرے گا گرو۔ تب تم دیکھنا نظام کائنات ہماری مرضی سے چلے گا۔ ہمیں کائنات کے تمام معدنی اور قدرتی

وسائل پر عبور حاصل ہوگا۔" گرو خوابوں کی دنیا میں رہ کر کائنات کو سن مرضی کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔

"گرو! ہم حق ادا کریں گے۔" سلیمان نے پرجوش لہجے میں یقین دلایا۔

"مجھے یقین ہے اس دن پر جب دنیا ہماری مٹھی میں ہوگی۔ غذاؤں کے پہاڑ ہمارے پاس ہوں گے اور دنیا ایک لقمے کو ترسے گی۔ سمندر، چشمے، ندیاں، آبشاریں سب ہمارے اشاروں کے تابع ہوں گے اور دنیا ایک بوند پانی کو ترسے گی۔" گرو نے بلند قہقہہ لگایا۔ "پھر ہم اپنے دوستوں کو خوراک و پانی سے نوازیں گے۔ مال و دولت سے مالا مال کریں گے اور دشمنوں کو ترسا ترسا کر ماریں گے اور ہمارے دشمن کون ہیں وہ انسان ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ان میں پروان چڑھتے ہیں جانتے ہو جب [illegible]

[illegible]

[illegible] اس نے [illegible]

اسے [illegible] وقت یہ احساس شدت سے [illegible] اتنا آسان نہیں جتنا اس نے [illegible] تھا۔

☆☆☆

ان کا سب سے بڑا مسئلہ ان کی قومی غیرت ہے۔ یہ غیرت نہ خود انہیں چین سے جینے دیتی ہے نہ یہ دوسروں کو جینے دیتے ہیں۔ بلقم نے صداقت خان کی موت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

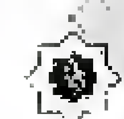
"تریسا! ایک ہی ریسٹورنٹ سے کھاتے کھاتے دل یکسانیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یار منہ کا ذائقہ تبدیلی چاہتا ہے۔" تریسا اور جولی کے علاوہ سب جوزف کی بات پر ہنس پڑے تھے۔ تریسا نے غصیلی نگاہوں سے جوزف کو گھورا۔ جوزف تریسا کا بوائے فرینڈ تھا۔

"جوزف! ہم لوگوں کے ذائقہ بدلنے کی خواہش میں ہم صداقت خان جیسے اہم مہرے سے ہاتھ دھو بیٹھے یار تنگل شاید اب ہمیں اس کی خاص ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔"

"ہم منزل کی طرف تیزی سے گامزن ہیں۔ تاہم نیکسٹ اسٹیپ ابھی دور ہے۔ تب تک ہمیں کوئی تو ایسا شخص چاہئے جو مقامی ہو ہماری ہر بات مانے۔" جولی نے رنگ محفل بدلتے دیکھ کر بہتے پانی کو ڈھلوان کی راہ دکھائی۔ "نیکسٹ قدم سے تمہاری مراد علاقے میں این جی اوز کا دفتر اور اسپتال کا قیام ہے۔" مارک براؤن جولی کے ساتھ تقریباً چپک کر بیٹھا تھا۔ بات کرتے ہوئے اس نے جولی کی طرف سر گھمایا تھا۔ سر گھمانے سے اس کے لب جولی کے گداز گالوں سے مس ہو گئے تھے۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے [illegible] نے چہرہ تھوڑا سا مزید آگے جھکا دیا۔ [illegible] اس کے ہونٹ جولی کے نرم گالوں میں [illegible] ہاتھ [illegible] لیتے [illegible] جولی نے اس حرکت کا کوئی [illegible] اپنے جولی [illegible] بولی۔

"ہمارے پانی کے لیے باقی سیٹ کے بعد این جی اوز اور اسپتال کا قیام حقیقی ہو جاتا ہے [illegible] ہمارا کام ہیں [illegible] یقیناً اس پر ہو [illegible] رہے ہوں گے۔"

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)



چالاک بوڑھی

محمد ندیم

عام طور پر نئی نسل بزرگوں کو احمق ناکارہ اور بے بس تصور کرتی ہے لیکن وہ یہ بات فراموش کر دیتی ہے کہ انہیں اپنے قدموں پر کھڑا کرنے میں ان کے بزرگوں کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔
دو نوجوانوں کا احوال واقعی انہوں نے ایک بزرگ خاتون کو احمق سمجھنے کی غلطی کی تھی

وہ موسلا دھار بارش میں مضافات کے ایک وسیع و عریض مکان پر نظریں جمائے اپنی وین میں بیٹھا تھا۔ جم نے اسے بتایا تھا کہ یہاں سے خاصی بڑی رقم بے حد آسانی سے اڑائی جا سکتی ہے۔ اس مکان میں برآمدے اور دروازوں کو چھوڑ کر تمام اطراف میں کھڑکیاں تھیں جو رنگ و روغن کی محتاج تھیں۔ ان پر اس کے کم و بیش پچاس ڈالر خرچ ہوتے لیکن اس پچاس ڈالر میں اس کے وارے نیارے ہو جاتے۔ اس کے باریک ہونٹوں پر ایک باریک سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ اگر بڑھیا واقعی مالدار ہوئی اور اس کی دولت اس کے ہاتھ لگ گئی تو ممکن ہے یہ اس کی آخری واردات ثابت ہو۔ اس نے اپنی جیب سے رقم نکال کر گنی اور اس کے سینے سے اطمینان کی ایک گہری سانس خارج ہوگئی۔ اس مکان میں کئی جگہ نوٹوں سے بھرا ہوا اس کا ایک بکس رکھا تھا اور وہی اس کا ہدف تھا۔ اس نے رقم دوبارہ اپنی جیب میں ٹھونس کر اپنے لمبے لمبے ملائم بالوں میں انگلی پھیری اور تیز بارش میں وین سے اتر کر مکان کی جانب چل پڑا۔

اطلاعی گھنٹی کے جواب میں دروازہ تھوڑی ہی دیر بعد کھل گیا اور سفید بالوں والی ایک بڑھیا نے نمودار ہو کر اس کے درمیان پیدا ہونے والا خلا پر کر دیا۔ وہ اپنے ظاہری حلیے سے جم کے بیان کے مطابق عیار چالاک اور کنجوس نہیں معلوم ہوتی تھی۔ جارج نے اپنا ہیٹ ذرا سا اوپر سرکایا۔ ”کیا آپ ہی مس مارتھا ہیں؟“ اس نے استفہام کیا اور پھر اپنا تعارف کرایا۔

بڑھیا نے اس میلے کچیلے ملاقاتی کا سر سے پیر تک ناقدانہ جائزہ لیا۔ ”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”میں مارتھا ہوں کہو میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“

جارج کے لبوں پر ایک بے حد نرم اور ملائم مسکراہٹ ابھر گئی۔ ”تو پھر آپ یقیناً جم کی آنٹی ہوں گی۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ ویسی نہیں جیسا میں نے آپ کے بارے میں سنا تھا۔“ اس نے بے حد لگاوٹ سے کہا۔

”مسٹر جارج میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرا بھتیجا جم میرے متعلق کس قسم کے خیالات رکھتا ہے۔“ بڑھیا نے تیز لہجے میں کہا۔ ”لیکن یقین کرو کہ اس کمینے چار سو بیس انتہائی گیرے کے بارے میں غلط نہیں سوچتی۔“

معاملہ اتنا سیدھا نظر نہیں آ رہا تھا کہ جتنا کہ اس نے سوچا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تیر

نشانے پر نہیں بیٹھا۔ اس کی وجاہت اور شیریں مسکراہٹ بڑھیا کو متاثر کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اب اسے دوسری ترکیب آزمانا پڑے گی۔ اس نے سوچا اور اس خیال کے ساتھ ہی کالر کھڑا کر کے دونوں شانے سکیڑ لیے اور سر کو تیز بارش میں بے بسی سے بلند کیا۔

''بہتر ہے کہ اندر آجاؤ' بارش تیز ہے۔''

بڑھیا نے نرمی سے کہا۔

لیکن وہ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ ''مادام میں آپ کو زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں۔'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''دراصل میں جم سے ملنے آیا تھا۔''

بڑھیا اسے کچن میں لے گئی۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تمہیں مایوسی ہوئی۔'' وہ بولی۔ ''وہ یہاں نہیں رہتا اور نہ آئندہ یہاں قدم رکھے گا۔''

''اوہ!'' جارج کو مصنوعی حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا اور اس کے چہرے سے پریشانی برسنے لگی۔ اس نے زور سے اپنی ناک صاف کی اور بولا۔ ''لیکن میں سمجھا نہیں۔ اس نے مجھے نہیں کا بتا دیا تھا۔ مادام بات دراصل یہ ہے کہ وہ میرا مقروض ہے ان دنوں کاروبار مندا جا رہا ہے۔ لہٰذا میں لوگوں سے اپنا پرانا قرض وصول کرنے نکل پڑا ہوں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''مادام یہ چوتھا دروازہ ہے جو میں نے آج کھٹکھٹایا ہے۔ لیکن مجھے ہر دروازے سے مایوس لوٹنا پڑا ہے۔ میں ایک پینی بھی وصول کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔''

بڑھیا اس کی باتوں سے متاثر نظر نہیں آ رہی تھی۔ ''پھر تو تمہیں آئندہ لوگوں کو قرض دینے

ماں باپ کے حقوق

ایک بار ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے باپ کی شکایت کی کہ وہ جب چاہتے ہیں میرا مال لے لیتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کے باپ کو بلوایا اور تحقیق فرمائی۔ اس نے کہا ''خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک زمانہ تھا جب یہ کمزور اور بے بس تھا اور مجھ میں طاقت تھی۔ میں مال دار تھا اور یہ خالی ہاتھ تھا۔ میں نے کبھی اس کو اپنی چیز لینے سے نہیں روکا آج میں کمزور ہوں اور یہ تندرست اور قوی ہے۔ میں خالی ہاتھ ہوں اور یہ مال دار ہے۔ اب یہ اپنا مال مجھ سے بچا بچا کر رکھتا ہے۔''

بوڑھے کی یہ باتیں سن کر رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم رو پڑے اور (بوڑھے کے لڑکے کی طرف مخاطب ہو کر) فرمایا: ''تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔''

ایک موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو نیک اولاد بھی ماں باپ پر محبت بھری ایک نظر ڈالتی ہے اس کے بدلے خدا اس کو ایک حج مقبول کا ثواب بخشتا ہے۔'' لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ''اے خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر کوئی ایک دن میں سو بار اسی طرح رحمت و محبت کی نظر ڈالے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں اگر کوئی سو بار ایسا کرے تب بھی۔'' (مسلم)

انتخاب: سید عابد زیدی ..... پشاور

ہوئے محتاط رہنا پڑے گا۔

"بہر حال یہ بھیگا کوٹ اتار دو ورنہ تمہیں نمونیا ہو جائے گا۔" اس نے ہمدردی سے مشورہ دیا۔

جارج نے جلدی سے کوٹ اتار دیا۔ اب وہ اپنے مقصد میں کچھ کچھ کامیاب ہوتا نظر آرہا تھا۔ اس کے دبلے چہرے پر چھائی ہوئی پیلاہٹ اور اس سے برستی ہوئی بھوک اور بے چارگی بڑھیا کے جذبہ رحم کو ابھارنے میں ناکام نہیں رہی تھی اور اب وہ یقیناً اسے کچھ پکا کر کھلانے والی تھی اور پھر واقعی یوں لگا جیسے بڑھیا نے اس کے خیالات پڑھ لیے ہوں۔ "تم نے کچھ کھایا بھی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ.... بات دراصل یہ ہے کہ....."

جارج ہچکچا کر خاموش ہو گیا اور پھر اپنے چہرے پر مضحکہ خیز بوکھلاہٹ کے تاثرات بکھیر کر اپنی خالی جیب تھپتھپائی۔

"میں غلط نہیں سمجھ رہی تھی۔" وہ بولی "اچھا بیٹھ جاؤ میں تمہارے لیے کچھ تیار کرتی ہوں۔"

"مادام آپ بے حد مہربان ہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔" اس نے دوبارہ زور سے اپنی ناک صاف کی۔ "میں سوچ رہا تھا کہ کام مجھے مل جاتے تو کاروبار کی حالت کچھ بہتر ہو جاتی۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

مادام نے چولہا جلا کر اس پر رکھتے ہوئے فرائی پین میں مکھن کی ایک ٹکیہ ڈالی اور پھر دو انڈے توڑ کر اس میں ڈال دیئے۔ جارج فرائی پین کے انڈوں کو بھوکی نظروں سے تکنے لگا۔ اسے امید تھی کہ بڑھیا تیسرا انڈا بھی ڈالے گی لیکن اسے مایوسی ہوئی۔

"باہر تمہاری وین کھڑی دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تم ڈیکوریشن کے کاروبار سے منسلک ہو۔" بڑھیا نے کہا۔

"آپ کا کہنا سو فیصد درست ہے مادام۔"

مسلمان کا حق

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق ہیں۔

۱۔ جب ملاقات کرے تو سلام کرے۔

۲۔ جب وہ بلائے تو اس کی دعوت رد نہ کرے۔

۳۔ جب وہ مشورہ چاہے تو نیک مشورہ دے۔

۴۔ جب وہ چھینکے تو الحمدللہ کہے۔

۵۔ جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے (یعنی بیمار پرسی کرے)

۶۔ جب وہ مر جائے تو اس کے جنازے میں شرکت کرے۔

(مرسلہ: محمد ایوب..... گجرات)

"بات یہ ہے کہ" اس نے کھانے کی پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اپنے نئے تجارتی تجربے کا قرض ادا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ تاہم اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں اس مکان کی مرمت اور رنگ و روغن کا تھوڑا بہت کام سونپ سکتی ہوں۔ اس مکان کو اس چیز کی ضرورت ہے۔"

جارج نے اپنی پلیٹ سے سر ابھار کر اس کی جانب مصنوعی حیرت سے دیکھا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ میں بسر و چشم آپ کا کام کر دوں گا۔

مجھے گاؤں کی سرائے میں عارضی طور پر ٹھہرنے کی جگہ مل جائے گی۔" وہ بولا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" بڑھیا نے کہا۔ "اس مکان میں ڈھیر سارے کمرے خالی پڑے ہیں تم کام کے اختتام تک یہاں آرام سے قیام کر سکتے ہو۔"

جارج اچھل کر اپنی وین میں جا بیٹھا اور تیزی سے گاؤں کی سرائے کی جانب روانہ ہو گیا۔ سرائے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد وہ ٹم کے ساتھ اس کے بار میں بیٹھا تھا اور دونوں کے سامنے میز پر وسکی کے دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔

"تم نے کافی دیر لگا دی۔" ٹم نے کہا۔ "کیا منصوبہ کامیاب رہا۔"

"کامیاب ہی سمجھو۔ میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میری فطری اداکاری کے آگے بڑے بڑے ظالم کا دل موم ہو جاتا ہے۔"

اس واقعے کے ایک ہفتے کے بعد وہ مکان رنگ و روغن کے بعد بالکل نیا معلوم ہونے لگا تھا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا لیکن جارج اب تک ٹن کے اس اہم ترین بکس کے دیدار سے محروم تھا۔ "بڑھیا اس بکس کا دیدار کرانے کی بھی پابند نہیں۔" اس نے دل میں سوچا مگر اسے ایک ترکیب سوجھی۔ وہ بڑھیا کے پاس گیا۔

"مادام مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔" اس نے بے حد لجاجت سے کہا۔

"ہاں کہو کیا بات ہے؟" بڑھیا فوراً متوجہ ہوئی۔

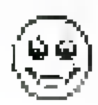
"مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو کل مجھے معاوضہ ادا کر دیں۔ کام تقریباً ختم ہو چکا ہے۔"

بڑھیا خاموشی سے اٹھی اور بالائی منزل پر واقع اپنی خواب گاہ کی جانب روانہ ہو گئی۔

وہ تیزی سے لپکا اور سیڑھی کی سیڑھی طے کر کے ایک مخصوص مقام سے اس کی خواب گاہ میں جھانکنے لگا۔ بڑھیا نے خواب گاہ میں پہنچ کر دیوار میں موجود ایک خفیہ خانہ کھولا اور دوسرے ہی لمحے جارج نے اسے اندر سے ٹن کا ایک بکس نکالتے دیکھ لیا۔

اگلی صبح وہاں جارج تھا اور نہ ہی وہ ٹن کا بکس۔ دونوں غائب تھے۔ اس کے دوسرے روز بڑھیا نے کسی کی آمد پر دروازہ کھولا۔ آنے والا گاؤں کے سرائے کا مالک تھا۔ اس نے مسکرا کر نوٹوں سے بھرا ہوا ٹن کا ایک بکس بڑھیا کے حوالے کر دیا۔ "یہ ترکیب کامیاب رہی۔" وہ بولا۔ "لیکن مجھے اس کی بے حد حفاظت کرنی پڑی۔ اب یہ مکان بالکل نیا معلوم ہوتا ہے۔"

"بے شک نیا معلوم ہوتا ہے۔" بڑھیا نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اور تم ہی بتاؤ ٹن کے اس بکس میں رکھے ہوئے اخبار کے تراشوں کے عوض اتنی مشقت کا کام کیا برا ہے؟"



غیر متوقعہ

آغاز الدین

ایک پولیس افسر کی کتھا' اس کی منگیتر کو پولیس سے نفرت تھی پھر یکایک ان کے درمیان ایک سفاک مجرم حائل ہوگیا۔

ایران سے درآمد' ایک فارسی کہانی کا ترجمہ

رضا کو اچھی طرح علم تھا کہ ایسا ضرور ہوگا لیکن یہ بات اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھی کہ ایسا ہو رہا تھا... اور اسی باعث اس کے جسم و روح دونوں زخمی ہو رہے تھے۔ نیلوفر ان تمام رشتوں کو توڑ دینے کے درپے تھی جو پہلی ہی ملاقات میں استوار ہوئے تھے۔ خوشیوں اور مسرتوں کے رشتے... وہ تمہیں واضح سے بتا دینا چاہتی تھی ان تمام منصوبوں کو ناکام بنانے پر تلی ہوئی تھی جو خود اس نے رضا کے شانے پر سر رکھ کر مستقبل کے لیے بنائے تھے۔ وہ ہر خواب کو جھوٹا ثابت کرنے پر آمادہ تھی۔

خیابان سعدی کے اس خوبصورت کیفے میں... جہاں وہ مستقبل کے خواب دیکھتے تھے اب ایک دوسرے کے لیے اجنبی بننے والے تھے۔

کیفے کا خوبصورت ماحول سحر انگیز مشرقی دھن کی مدھم مدھم سرگوشیاں اور ہلکی روشنی کے باعث بہت رومانٹک لگ رہا تھا۔ ہال میں ان کے علاوہ صرف دو اور افراد تھے۔ ایک تو کاؤنٹر مین' دوسرا کوئی گاہک... جو تین میزیں چھوڑ کر چوتھی میز پر سر جھکائے اخبار پڑھ رہا تھا اور اس کی میز پر گرم گرم کافی کی پیالی رکھی ہوئی تھی۔

"سب بے کار ہے رضا... سب کچھ فضول ہے۔" نیلوفر نے اپنی بڑی بڑی کالی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار پھر کہا۔ اس کے ریشمیں کالے بال شانوں پر پھیل رہے تھے شہد رنگ چہرے پر حزن و ملال کی پرچھائیاں تھیں اور نازک ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"کیا تم سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہو؟" رضا نے بہت دھیمے لہجے میں سوال کیا لیکن اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

"ہاں... میں سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں کہ سب ختم ہو گیا ہے۔" نیلوفر نے اپنے اضطراب اور دکھ کو چھپانے کے لیے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ "میں جانتی ہوں تمہارا تعلق کس طرح کے محکمے سے ہے۔" نیلوفر کی آنکھیں چھلک رہی تھیں کہ اس نے یہ جملے کتنے کرب کے ساتھ ادا کیے ہیں۔

وہ بالکل پگلی لڑکی تھی۔ اس نے زندگی کی اکیس بہاریں دیکھی تھیں۔ اس کا کردار رضا کو اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ دوسری لڑکیوں کی طرح بھولی دیدہ اور فلرٹ کرنے کی شوقین نہیں تھی۔ لباس کے انتخاب میں عادات اور روایات کو ہمیشہ پیش نظر رکھتی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت اور سادہ تھی کہ رضا نے اسے پہلی ہی ملاقات میں اپنا بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن اس وقت حالات بہت مختلف اور تکلیف دہ تھے۔ نیلوفر کی طرح رضا بھی اپنے فیصلے پر قائم تھا۔ لہٰذا اس نے اس کے ملیح چہرے سے

نظریں ہٹا لیں کیونکہ جب بھی وہ اس کی طرف دیکھتا تھا تو فیصلہ تبدیل کرنے پر غور کرنے لگتا تھا۔

"میں بھی اپنے فیصلے پر قائم ہوں نیلوفر! میں پولیس کی ملازمت نہیں چھوڑ سکتا۔" اس نے پیالیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں... میں جانتی ہوں۔" نیلوفر کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

"میں جانتی ہوں... پولیس والے کتنے پتھر دل ہوتے ہیں۔"

"اور بہت نیک بھی ہوتے ہیں۔ اس پہلو کو فراموش مت کرو۔" اس نے اپنے لہجے کو نرم رکھنے کی کوشش کی تھی مگر اس میں ناکام رہا تھا۔

"اس وقت تم وردی میں نہیں ہو تب بھی سختی تمہارے لہجے سے عیاں ہے۔"

"وہ دن بھی ضرور آئے گا جب میں وردی سے مستثنیٰ ہو جاؤں گا، میں بہت بڑا افسر بن جاؤں گا۔ سادہ لباس والے اسکواڈ میں میری تقرری اب زیادہ دنوں کی بات نہیں۔" رضا نے جواب دیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ کوئی جواب نہیں ہوا۔

"لیکن اس سے بھی بات نہیں بنے گی رضا۔" نیلوفر کی سیاہ آنکھوں میں وحشت ناک چمک پیدا ہوئی۔ "تم پھر بھی پولیس والے رہو گے، لوگوں کو پریشان کرتے رہو گے، تو خواب لوگوں کو گھروں سے گرفتار کرنا تمہارا فرض ہوگا... اور بس"

رضا کندھے اچکا کر رہ گیا۔ نیلوفر کی یہ دلیل اب پرانی ہو چکی تھی۔ اور ایسی ہی باتوں نے ان کی محبت کے شفاف آئینے پر پردے ڈال دیے تھے۔ وہ اس دلیل کا کوئی توڑ بھی تلاش نہیں کر سکا تھا۔ گزشتہ ایک ماہ سے نیلوفر کا بھی اصرار تھا کہ رضا پولیس کی ملازمت چھوڑ کر اس کے والد کے کاروبار میں پارٹنر کی حیثیت سے شامل ہو جائے لیکن رضا انکار کرتا رہا تھا۔ انکار کی پہلی وجہ تو انا تھی اور دوسری پولیس کی ملازمت سے خلوص اور شوق... اسی انکار و اصرار نے دونوں کے درمیان تلخیوں کو جنم دیا تھا اور آج وہ اس سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ اب تک کی گفتگو میں کسی نے بھی معقولیت کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ دونوں ہی انتہا پسندی پر قائم تھے۔ کوئی جھکنے پر تیار نہ تھا... حالانکہ دونوں ہی نرم خو اور محبت کے مارے تھے۔ نیلوفر کے لیے پولیس والے ظالم اور بے رحم تھے جبکہ رضا پولیس کو برائیوں کا قاتل سمجھتا تھا۔

اگرچہ رضا کو نیلوفر کی کہانی معلوم تھی لیکن وہ اس کے اس تجربے سے متفق نہیں تھا کہ رحم دل آدمی بھی پولیس میں شامل ہو کر بے رحم اور بدعنوان بن جاتا ہے۔

نیلوفر کو پولیس سے جو نفرت تھی اس کے پس منظر میں ایک المناک واقعہ تھا۔

برسوں پہلے نیلوفر کے بہت ہی پیارے چچا نے بدنامی کے خوف سے پولیس کار میں خودکشی کر لی تھی۔ عباس آفندی نامی اس تاجر کو ٹیکس کی چوری کے معمولی الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ عباس آفندی نے عدالت میں پیشی کی ذلت سے بچنے کے لیے عین اس وقت خود کو گولی ماری تھی جب پولیس والے اسے اپنی کار میں پولیس اسٹیشن لے جا رہے تھے۔

نیلوفر اس وقت آٹھ سال کی تھی اور پھر وہ اسی المناک قصے کو سنتے سنتے جوان ہوئی اور پولیس سے نفرت اس کی رگ رگ میں سرایت کر گئی۔ رضا

کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب نیلوفر نے اسے پہلی مرتبہ پولیس کی وردی میں دیکھا تھا تو اس کی آنکھوں میں کیسی وحشت ناچنے لگی تھی۔ اس نے بمشکل کہا تھا۔ ”تم اس وردی میں احمق لگ رہے ہو رضا۔“

”تمہارا کام لوگوں کو پریشان اور خوف زدہ کرنا ہے رضا......“ نیلوفر نے کافی کی پیالی کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”تم جاہلوں کی طرح سوچتی ہو۔“ اس نے قدرے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”بعض اوقات بالکل بے وقوفوں کی طرح باتیں کرتی ہو۔“

وہ اپنی جگہ کانپ کر رہ گئی اس کے گال شعلہ رنگ ہو گئے اور آنکھوں میں برہمی جھانکنے لگی...... ”مجھ سے اس طرح مت جھڑکو۔ جس طرح بازاری عورتوں سے بات کی جاتی ہے۔ میں تمہاری داشتہ نہیں ہوں۔“ اس مرتبہ اس کی آواز قدرے اونچی ہو گئی تھی۔

رضا نے چونک کر اس شخص کی طرف دیکھا جو چوتھی میز پر اخبار پڑھنے میں مصروف تھا لیکن رضا کی پیشہ ورانہ تربیت نے اسے یہ اندازہ لگانے میں مدد دی کہ اجنبی اخبار کے مطالعے کی آڑ میں ان کی باتیں سن رہا ہے۔ اس میں اجنبی کا کوئی قصور بھی نہ تھا' وہ دونوں یقیناً سرگوشیوں کے بجائے معمول کے مطابق لہجے میں باتیں کر رہے تھے لہٰذا اجنبی کی توجہ مرکوز ہونے میں انہی کا قصور تھا۔

رضا نے اپنے غصے اور برہمی کو چھپانے کے لیے سگریٹ سلگائی۔ وہ غیر معمولی حد تک وجیہہ تھا اور اس کی کوتاہ قامتی بھی اس وجاہت کو چھپانے میں ناکام رہی تھی۔ وہ تیس سال کا تھا لیکن قد و قامت اور چہرے کی وجہ سے اس کی عمر چھبیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی' اس کی آنکھوں میں عزم و حوصلے کی چمک تھی۔

”سنو نیلو۔“ اس نے سرگوشی کی۔ ”ایک بار یہ فرض کر لو...... کہ پولیس کا فرض عوام کو تحفظ فراہم کرنا ہے تو ......“

”میں جانتی ہوں کہ پولیس عوام کو کس طرح تحفظ فراہم کرتی ہے۔“ نیلوفر کے لہجے میں تلخی' کرب اور نفرت تھی۔ وہ اپنے سامنے لگے ہوئے قد آدم آئینے کی طرف دیکھنے لگی۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ پولیس کی کوتاہیوں کو کچھ دیر کے لیے فراموش کر دو کیونکہ صرف پولیس ہی طاقت کی علامت نہیں' اور بھی بہت سی قوتیں ہماری دنیا میں سرگرم ہوتی ہیں۔“

”میں کسی ایسی کوتاہی کو فراموش نہیں کر سکتی جس کے باعث میرے خاندان کو برسوں تک کرب کی منزلوں سے گزرنا پڑا۔“

”وہ بعض اوقات انسان کو اپنی آنکھ کا شہتیر بھی تلاش کرنا چاہیے۔“ رضا نے ڈنمبکس کی چوری کے واقعے کا ذکر کیے بغیر کہا۔ ”اگر کسی نے خودکشی کی تو اس میں پولیس کا قصور نہیں...... اگر قصور ہے تو صرف اتنا کہ متعلقہ افسر نے تلاشی نہیں لی اور ریوالور جیب میں رہنے دیا ورنہ عدالت دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتی۔ عدالت میں پیش ہو کر اپنی صفائی پیش کرنا ذلت نہیں۔“

نیلوفر نے ایک لمحے تک اسے بغور دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شکوے تھے' شکایتیں تھیں کہ وہ اس پر ذاتی طنز کر رہا ہے لیکن پھر اس نے ایک لمبی سانس لے کر جوابی حملہ کیا۔ ”یہ تو بتاؤ کہ تمہیں اس ملازمت سے اتنا عشق کیوں ہے؟“

"کیونکہ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ پولیس ظلم کے خلاف ایک قوت ہے۔ میں ظلم اور برائی سے نفرت کرتا ہوں۔ اور میں ان برائیوں کے خلاف جدوجہد کرنا چاہتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے رضا نے نیلو کے افسردہ چہرے سے نظریں ہٹا لیں جو لاشعوری طور پر ایک بار پھر اجنبی پر مرتکز ہو گئیں۔ رضا کو ایسا لگا کہ اجنبی کسی خاص مقصد سے یہ باتیں سننے کی کوشش کر رہا ہے...... اسے اجنبی پر شک ہونے لگا اور وہ پیشہ ورانہ عادت سے مجبور ہو کر اجنبی کے بارے میں غور کرنے لگا جو اس کے خیال میں کسی عام گاہک سے زیادہ بے چین نظر آ رہا تھا۔ اس کی انگلیاں اخبار کو دبوچے ہوئے تھیں۔ وہ بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ اور اس کی کوشش یہی تھی کہ چہرہ اخبار کی آڑ میں چھپا رہے۔

"شاندار رضا' تم شاید نیکی اور بدی کی طاقتوں کو پہچاننے پر قدرت رکھتے ہو۔"

"کیا مطلب؟" رضا نے سپاٹ لہجے میں پوچھا' کیونکہ اب وہ نیلوفر میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی چھٹی حس کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں مختلف اور خطرناک ملزموں کی تصویریں کلبلا رہی تھیں۔

وہ اجنبی کا پورا چہرہ تو ابھی تک نہیں دیکھ سکا تھا...... لیکن آغاز میں جو ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی اس پر غور کر کے رضا اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس نے اس مضبوط جبڑے والے سانولے شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے...... اب مسئلہ صرف یہ تھا کہ وہ اس کا پورا چہرہ کس طرح دیکھے' صرف اسی طرح وہ اسے پہچان سکتا تھا۔

رضا نے پہلو میں ریوالور کی موجودگی محسوس کرتا چاہی لیکن ناکام رہا۔ وہ نیلوفر سے ملاقات کے لیے آتے وقت ہمیشہ غیر مسلح رہتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس وقت بھی نہتا تھا۔

"تم پولیس میں رہ کر برائی کے خلاف جنگ نہیں کر سکتے رضا۔" نیلوفر نے ایک بار پھر طعنہ دیا۔ "چھوٹے چھوٹے جرم کرنے والے لوگ برائی کی تعریف میں نہیں آتے اور شیطانوں تک تمہاری پہنچ نہیں ہوتی۔"

"ہم بڑوں پر بھی ہاتھ ڈالتے ہیں۔"

"ممکن ہے تم ایسے بڑوں کی بات کر رہے ہو جن کو معاشرہ حزب اختلاف کا لیڈر کہتا ہے۔" وہ اب سیاسی دلائل دے رہی تھی۔

"چھوڑو نیلوفر تم کبھی نہیں سمجھ سکو گی۔"

"ہاں...... چھوڑو بھی...... ہم دونوں میں سے کوئی بھی کبھی نہیں سمجھ سکے گا......" نیلوفر کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگنے لگیں۔ رضا کا دل پرنم آنکھیں دیکھ کر کٹنے لگا' اس نے آگے جھک کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ نیلوفر نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر رضا نے گرفت اور مضبوط کر لی۔ وہ اسے گھورنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اب خفگی نہیں بلکہ آنسو تھے پھر نیلوفر نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تو رضا نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نیلوفر کو اس کے ہاتھوں کے لمس سے کوئی راحت نہیں مل رہی ہے۔

"نیل!" اس نے بڑے پیار سے کہا۔ "اس وقت تم بہت تلخ ہو رہی ہو میرے بارے میں کچھ بھی فیصلہ کرنا۔"

"میرے تلخ ہونے کی بھی معقول وجہ ہے۔"

"میں جانتا ہوں لیکن ان کی خودکشی میں پولیس کا کوئی قصور نہیں تھا۔"

چند لمحوں تک نیلوفر نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن پھر وہ بہت دھیمی آواز میں فرش کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''رضا! میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی...... بہت چاہا کہ اس المیے کو فراموش کردوں کہ وہ واقعہ میرے دل و دماغ میں کسی جراثیم کی طرح پلتا اور بڑھتا رہا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس المیے سے میرے پاپا کتنی جلدی بوڑھے ہوگئے تھے میری امی کو چچا سے بڑی محبت تھی' وہ انہیں اپنا بھائی کہتی تھیں' وہ اسی صدمے سے مرگئیں' پاپا نے پولیس کو پیشکش کی تھی...... کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر انکم ٹیکس کے سارے واجبات ادا کردیں گے لیکن پولیس والوں نے کہا کہ وہ انتظار نہیں کرسکتے اور انہیں صرف یہ حکم ملا ہے کہ عباس آفندی کو گرفتار کرلیا جائے۔''

''میں سمجھتا ہوں نیلوفر' بعض اوقات محکمہ جاتی ضابطے خواہشات کی راہ میں حائل ہوجاتے ہیں۔''

''اور میرے انہی منفی خیالات کے باعث ہم دونوں ایک ہوکر بھی خوش نہیں رہ سکتے رضا۔''

''اب تم معقولیت سے بات کررہی ہو نیلی۔'' رضا نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''تم سمجھتی ہو کہ تمہارا رویہ منفی ہے اور یہی میرے لیے نیک فال ہے' مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک روز تم میرے پیشے کے بارے میں بھی اپنے ان خیالات کو تبدیل کرلوگی۔''

''نہیں...... میں...... میں ان خیالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرسکتی۔ یہ تو خون کے ساتھ گردش کررہے ہیں۔''

نیلوفر کے لہجے میں اتنا یقین تھا کہ رضا سن سا ہوگیا۔ جدائی اور دکھ کی سرد ترین چبھن ہڈیوں تک میں محسوس ہونے لگی۔ اس کا ذہن منجمد ہونے لگا لیکن پھر اچانک ہی ذہن میں جھماکے ہونے لگے۔ ذہن پر جمی ہوئی برف پگھلنے لگی اور اس اچانک تبدیلی کی وجہ چوتھی میز والا اجنبی تھا' اس نے ایک ہی لمحے کے لیے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا تھا' اس کا چہرہ دیکھتے ہی رضا کو ایسا لگا جیسے کسی نے ڈائنامائٹ سے ذہن کے بند گوشوں کے مقفل دروازے توڑ دیے ہوں۔ وہ اسے پہچان گیا۔ وہ محسن مشہدی تھا...... محسن مشہدی...... قاتل' لٹیرا' جاسوس...... مفرور اشتہاری ملزم' جس کے سر کی قیمت مقرر کی جاچکی تھی۔ رضا کے جسم میں خوف کی ایک سرد ترین لہر اترتی چلی گئی۔ نبض تیز اور دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں اور نظروں میں وہ ان گنت پوسٹر گھوم گئے جن پر محسن مشہدی کی تصویریں اور اس کا حلیہ ہوتا تھا۔

رضا کا دایاں ہاتھ ایک بار پھر اپنے پہلو کو ٹٹولنے لگا لیکن وہاں نہ تو ہولسٹر تھا اور نہ ریوالور...... اس کے عضلات تن گئے...... اب سوال صرف یہ تھا کہ کیا محسن مشہدی کو بے شک ہوگیا ہے کہ اس نے اسے پہچان لیا ہے؟ وہ محسن مشہدی سے اچھی طرح واقف تھا...... ظالم محسن نے اب تک ان گنت قتل کیے تھے اور یہ سب ہی کو معلوم تھا کہ جس نے بھی اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی وہ اس دنیا سے گزر گیا۔

رضا نے منصوبہ بندی کرنے کے لیے کیفے کے ہال کا جائزہ لیا لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نہ تھی۔ جو اس کی مدد کرسکتی' کاؤنٹر مین ادھ کھلی آنکھوں سے کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا...... اس سے رضا کو کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ ہال میں اور کوئی نہ تھا اور اس وقت کسی کے آنے کی بھی توقع

تھی۔ باہر سڑک پر کاریں پوری رفتار سے دوڑ رہی تھیں۔

"یہ کون ہے رضا؟" نیلوفر نے سرگوشی کی۔ یہ الفاظ بے ضرر تھے لیکن جب رضا نے جواب دینے کے لیے نیلوفر کی طرف دیکھا تو اسے اس کی آنکھوں میں خوف اور خدشات نظر آئے۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا کہ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نے کیوں جنم لیا جن سے نیلوفر جیسی معصوم اور سادہ لوح لڑکی بھی خطرے کا احساس کرنے لگی۔ "کون؟" رضا نے وقت گزاری کے لیے بے پروائی سے پوچھا۔

"وہی..... جو میرے عقب میں چوتھی میز پر بیٹھا ہے۔ تم اسے بار بار دیکھ رہے ہو۔ مجھے قد آدم آئینے میں سب کچھ نظر آ رہا ہے۔" نیلوفر نے پہلی مرتبہ ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا۔

"محسن مشہدی۔" رضا نے لمبی سی سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن تم اس کو نہیں جانتیں۔"

"ہاں..... لیکن تم جس طرح اسے دیکھتے رہے ہو اس سے میں بہت کچھ سمجھ سکتی ہوں۔"

"میرا ایک دیرینہ دوست ہے۔"

"دوستوں سے جا کر ملا جاتا ہے' ان کی نگرانی نہیں کی جاتی اور ان سے باتیں چھپانے کے لیے اس طرح سرگوشیاں نہیں کی جاتیں۔"

"دوستی دشمنی میں بھی بدل سکتی ہے' اس نے ایک خوبصورت لڑکی مجھ سے چھین لی تھی۔" رضا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن نیلوفر مطمئن نہیں ہوئی۔ وہ ذہن میں کوئی واضح منصوبہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دوران میں یہ بات ضروری تھی کہ وہ نیلو سے باتیں کرتا رہے اور کسی نہ کسی طرح محسن مشہدی کو بے بس کر کے ہیڈ کوارٹر لے جائے۔ یہ بات کہنے کو تو بہت آسان تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ محسن مشہدی پر ہاتھ ڈالنے کا مطلب تھا تصادم ہوگا جس میں فائرنگ بھی شامل ہوگی موجودہ صورت حال میں فائرنگ یک طرفہ ہی ہوگی' مشہدی کو باؤلا کتا بھی کہا جاتا تھا۔ اور لوگ کہتے تھے کہ وہ راہ میں آنے والے ہر شخص کو خون میں غلطاں کر دیتا ہے۔

مشہدی بیٹھا رہا۔ اس کے صرف دو مطلب ہو سکتے تھے۔ پہلا تو یہ کہ اسے اس بات کا شک نہیں ہوا ہے کہ اسے پہچانا جا چکا ہے اور وہ جوڑے کے رخصت ہونے کا انتظار کر رہا ہے تاکہ خود بھی اپنی راہ لے یا پھر یہ کہ وہ بھی رضا کو پہچان کر اپنا منصوبہ بنا رہا ہے۔

رضا نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے چوتھی میز کی طرف دیکھا۔ مشہدی اخبار پر بدستور جھکا ہوا تھا۔

رضا کے لیے صرف ایک راستہ کھلا ہوا تھا کہ وہ کوئی قدم اٹھانے سے قبل نیلوفر کو باہر بھیج دے۔ اس طرح نیلوفر مدد کر سکتی تھی کہ باہر پبلک فون بوتھ تھا' وہ وہاں سے ہیڈ کوارٹر فون کر کے کمک طلب کر سکتی تھی۔ اس نے اس نکتے پر غور کیا اور اسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

"رضا! مجھے سچ سچ بتا دو کہ یہ کون ہے اور تم اتنے مضطرب کیوں ہو.....؟" نیلوفر نے اس کے پیکٹ سے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتی تھی لیکن اس وقت اس نے بالکل اسی کے انداز میں سگریٹ سلگایا اور ماچس کی تیلی پھونک مار کر بجھا دی۔

"یہ پولیس کا درد سر ہے نیلی۔" اس نے

سرگوشی کی۔ ''اور تمہیں پولیس کے کام میں کوئی دلچسپی نہیں۔''

''مجھے اعتماد میں لیے بغیر تم کچھ نہیں کر سکتے۔'' نیلوفر نے دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں کے لیے کوئی متبادل راستہ نہیں۔ صرف ایک ہی راستہ ہے کیونکہ میں بھی یہاں موجود ہوں۔''

رضا کو اس جملے سے ناقابل بیان مسرت ہوئی۔ وہ یہ سوچ ہی کر خوشی سے جھوم اٹھا کہ نیلوفر اس کے پیشہ ورانہ مسئلے میں دلچسپی لے رہی ہے۔ محسن مشہدی کوئی چھوٹا موٹا مجرم نہیں تھا' وہ شارک کی طرح بڑی اور ظالم مچھلی تھا اور اسے قانون کی رسیوں میں جکڑ کر رضا' نیلوفر پر یہ ثابت کر سکتا تھا کہ پولیس کا کام قاتلوں' ڈاکوؤں اور جاسوسوں کو بھی گرفتار کرنا ہے۔

''مجھے مشہدی کے بارے میں کچھ بتاؤ رضا؟'' نیلو نے سرگوشی کرتے ہوئے پیالیوں کی ترتیب بدل دی۔ شاید وہ بھی مصروف رہنا چاہتی تھی۔

''بس یہ سمجھ لو کہ محسن مشہدی قاتل ہونے کے علاوہ ملک کا دشمن بھی ہے۔ اس نے نہ صرف بینک لوٹے ہیں بلکہ ہمارے قومی راز بھی ایک سرمایہ دار ملک کو فراہم کیے ہیں جس کی وجہ سے ہماری سلامتی کئی کئی بار خطرے میں پڑ چکی ہے۔''

نیلو کی حسین آنکھیں پھیل سی گئیں۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نے جنم لیا لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔

''اس پر چندہ افراد کے قتل کا الزام ہے۔'' رضا سرگوشی میں کہتا رہا۔ ''چار اعلیٰ سرکاری افسروں کو اس نے اغوا کر کے ان پر بہیمانہ تشدد کے ذریعے انتہائی اہم ترین قومی راز حاصل کیے تھے اور تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اب یہ ایک عالمی کانفرنس کے مندوبین کو اغوا کرنے کے لیے یہاں آیا ہے تاکہ انہیں یرغمال بنا کر خلیج کے ممالک سے ان کی رہائی کے عوض رقم بٹور سکے۔''

رضا نے اپنا سگریٹ نیلوفر کی سگریٹ سے سلگاتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی۔ ''لیکن دو ماہ قبل اس نے ایک فاش غلطی کی تھی۔ اس سے پہلے ہمیں اس کا حلیہ نہیں معلوم تھا لیکن دو ماہ قبل جب اس نے ایک شہر میں بینک پر ڈاکا ڈالا تو وہاں کے ایک ملازم نے زخمی ہونے کے باوجود اپنے کیمرے سے اس کی تصویر اتار لی۔ ملازم بعد میں مر گیا لیکن وہ قوم و وطن کے لیے اس تصویر کی شکل میں تحفہ چھوڑ گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔

نیلوفر نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بہت سنجیدہ تھیں۔ ''اب تم کیا کرو گے......؟'' اس نے ایش ٹرے سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔

''اسے گرفتار کر لوں گا۔''

''مگر تم تو نہتے ہو۔'' نیلو کے لہجے میں بے چینی اور خوف نمایاں تھا۔

''انسانی عقل کسی بھی جدید ہتھیار سے زیادہ موثر ہوتی ہے نیلو۔''

نیلوفر کے اس مضطرب لہجے سے رضا کو ایک نئی طاقت ملی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اختلافات کے باوجود وہ اسے چاہتی ہے تاہم چند لمحے قبل ہونے والی بحث کی تلخی اب بھی ذہن میں تھی۔

''تم میرا ایک کام کر سکتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھ سے ایسے سوال مت کیا کرو رضا۔''

''شکریہ...... تب پھر باہر جا کر ہیڈ کوارٹر فون

کر دو...... وہاں کرنل احمد ہوں گے انہیں یہاں کے حالات سے مطلع کر دینا۔"

رضا نے مشہدی کی طرف دیکھا جو ساکت بیٹھا تھا اور پھر نیلوفر پر آنکھیں مرتکز کر دیں' وہ بھی بے حس و بے حرکت بیٹھی تھی۔

"سامنے والے بوتھ سے فون مت کرنا ورنہ ہمارا دوست تمہیں دیکھ لے گا۔" رضا نے ہدایت کی۔

"نہیں۔" نیلوفر نے سرسراتی ہوئی سرگوشی میں جواب دیا۔ "میں نہیں جاؤں گی میں تمہیں تنہا چھوڑ کر فرار نہیں ہو سکتی رضا۔"

"پلیز نیلی۔ ایسا ہی کرو جیسا میں کہہ رہا ہوں۔ مجھے بھی...... بعد از مرگ تمغے حاصل کرنے کا کوئی شوق نہیں' میں اپنی زندگی سے اسی طرح پیار کرتا ہوں جیسے تم سے پیار ہے۔"

وہ چند لمحوں تک اسے اس طرح گھورتی رہی جیسے رضا کے اندر چھپی ہوئی کوئی خاص صلاحیت تلاش کر رہی ہو۔ اسے یقین تھا کہ رضا میں کوئی اہم ترین چیز پوشیدہ ہے۔ "اور تم...... تم پولیس کے اس کام کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگانے کا خطرہ مول لے رہے ہو۔"

"ہاں...... اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مجھے قاتلوں اور جاسوسوں سے کوئی محبت نہیں۔"

"اوہ...... رضا" نیلوفر نے اس کے ہاتھ تھام لیے' اس کی آنکھوں میں اس مرتبہ خوف اور دہشت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔

"وقت تیزی سے گزر رہا ہے نیلی! اب تم چلی جاؤ۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھانا...... تاکہ اسے تم پر شک نہ ہو جائے' اس طرح چلنا جیسے تمہیں کسی کی کوئی پروا نہیں۔"

نیلو نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنے بیگ سے لپ اسٹک اور دستی آئینہ نکالا' ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہ جمائی' آئینے میں دیکھا اور دھیرے سے بولی۔ "ٹھیک ہے نا......؟"

"ہاں...... لیکن باتیں کرتی رہو۔"

نیلو نے بلاوز سے سگریٹ کی راکھ کے ذرے جھاڑے اور پھر اس کی طرف جھکتی ہوئی بولی۔

"اس کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔"

"اوہ...... مشہدی کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ جب یہ کسی کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو سیٹی بجانے لگتا ہے۔ بینک کے مقتول ملازم نے اس کی سیٹی سن کر ہی تصویر کھینچی تھی۔"

"میرے خدا! ایسے لوگ کتنے ظالم ہوتے ہیں۔"

"ہاں...... اور میں ایسے ہی لوگوں سے ملک کو پاک کرنے کے لیے پولیس میں شامل ہوا ہوں۔"

یہ سن کر وہ سرخ ہو گئی۔ ایسا لگا جیسے سیلابی پانی کو روکنے والے دروازے کھل جائیں گے پھر اس نے نظریں جھکا کر اپنا بیگ سنبھالا۔ "کوئی حماقت نہ کرنا رضا...... میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گی۔"

"ایک منٹ رکو...... وہ بھی اٹھ رہا ہے۔" رضا نے مضطرب ہو کر سرگوشی کی۔ اس کے لہجے میں بے چینی تھی اسے محسوس کرتے ہوئے نیلو نے بیگ پھر میز پر رکھ دیا۔

رضا کا چہرہ کسی سخت پتھر کی طرح ہو گیا۔ اس نے اپنی دائیں ٹانگ میز سے نکال کر کرسی کے باہر نکالی اور اپنے بازوؤں پر جھک گیا۔ اس طرح وہ کسی بھی حملے کا جواب دینے کے لیے پھرتی سے

اٹھ سکتا تھا۔

نیلوفر نے پہلے کبھی رضا کو اس کیفیت میں نہیں دیکھا تھا۔ رضا کی آنکھوں میں بے چینی تھی جسے دیکھ کر نیلوفر مشہدی کی طرف سے محسوس ہونے والا خوف بھول گئی۔ اسے ایسا لگا..... کہ رضا ناقابل تسخیر ہے مشہدی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

''کیا اسے شک ہوگیا ہے؟'' نیلوفر نے پوچھا۔

''پتہ نہیں لیکن اسے ہماری گفتگو کے آغاز ہی میں یہ علم ہوگیا تھا کہ میں پولیس سے تعلق رکھتا ہوں کیونکہ اس وقت ہم بلند لہجے میں بات کررہے تھے۔'' رضا نے کن انکھیوں سے مشہدی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اب تم یہیں ٹھہرو گی' یہ باہر جائے گا..... اور میں اس کا تعاقب کرکے باہر ہی نمٹنے کی کوشش کروں گا' اگر فائرنگ کی آواز سنائی دے تو کچن کے راستے عقبی گلی میں نکل جانا۔''

''مگر میں..... میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔''

''ہرگز نہیں..... اب ذرا برہمی سے مجھ سے گفتگو کرو۔ آواز اونچی رہے' وہ اسی طرف آرہا ہے۔''

نیلوفر محض ایک لمحے کو ہچکچائی لیکن پھر اس کے چہرے پر طیش کے آثار ابھر آئے..... ''تم..... تم نے میری توہین کی ہے رضا.....'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''تم نے مجھے گالی دی ہے۔''

''تم نے خود ہی ایسی حرکت کی تھی۔'' رضا نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''تمہاری بے وفائی کے جواب میں' میں تمہارے پیر تو چاٹنے سے رہا۔''

محسن مشہدی کے قدموں کی چاپ اب قریب سنائی دے رہی تھی۔ رضا نے کسی بھی عام آدمی کے ردعمل کا اظہار کرنے کے لیے پلٹ کر دیکھا لیکن اسی لمحے مشہدی نے قریب آکر اس کی پیٹھ کے ساتھ کوئی چیز لگادی۔ ''ہلنا مت آفیسر۔'' اس نے حکم دیا..... کوئی بھی غلط حرکت کی تو لڑکی ماری جائے گی۔''

مشہدی کے دائیں ہاتھ میں کالے رنگ کا پستول تھا جس کی زد میں رضا ہی نہیں نیلوفر بھی تھی۔

رضا کو یقین ہوگیا کہ اس کی کسی حرکت نے مشہدی کو یہ احساس دلادیا تھا کہ وہ اسے گرفتار کرنے کے چکر میں ہے۔

وہ رضا کی توقعات کے برعکس دراز قد تھا۔ اس کے شانے چوڑے تھے اور جبڑے پر کسی پرانے زخم کا نشان تھا۔ آنکھیں کسی بھی سفاک قاتل کی طرح سپاٹ اور بے تاثر تھیں۔

اور وہ ہلکے ہلکے سروں میں سیٹی بجا رہا تھا۔

''ہم..... ہم نے تمہیں کیا نقصان پہنچایا ہے؟'' رضا نے اپنی حکمت عملی میں فوراً تبدیلی کردی۔

محسن مشہدی نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کاؤنٹر مین کو حکم دیا کہ وہ باہر آکر فرش پر لیٹ جائے' وہ بے چارہ کانپتا ہوا کاؤنٹر سے نکلا اور فرش پر اوندھا لیٹ گیا۔ ''تم نے ذرا سی بھی حرکت کی تو تمہارے بیوی بچے زندگی بھر محتاج رہیں گے۔'' قاتل نے کاؤنٹر مین کو دھمکی دی جواب بھی کانپ رہا تھا۔

مشہدی نے نیلوفر کی طرف دیکھا جو زرد ہو رہی تھی۔

رضا کا خون کھول اٹھا لیکن وہ نہتا تھا لہٰذا اس

نے جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی حماقت نہ کی۔

بچت کا راستہ صرف یہ تھا کہ مشہدی کو باتوں میں لگا کر اسے لبلبی دبانے سے روکا جائے۔

"کھڑے ہو جاؤ....." قاتل نے غرا کر حکم دیا۔ "پہلے تم کھڑے ہو پھر لڑکی کھڑی ہوگی۔"

"مگر تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟" رضا نے پوچھا۔

"باہر....." مشہدی نے سفاکانہ انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "دیکھنا یہ ہے کہ باہر تمہارے ساتھی تو نہیں ہیں؟"

رضا پر تفکر انداز میں کچھ سوچتا ہوا بیٹھا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ مشہدی جیسے ملزم کو موقع نہیں دیتے لیکن ہر ملزم کی کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے اسی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ باہر یقیناً کچھ لوگ موجود ہوں گے لیکن وہ بھی اسی کی طرح نہتے ملیں گے اور اگر کسی نے جرات کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تو مشہدی اسے فوراً گولی مار دے گا۔

"کھڑے ہو جاؤ۔" وہ پھر غرایا۔ "جلدی کرو۔"

رضا بہت آہستہ آہستہ اٹھا اس کا ذہن مختلف ترکیبوں پر عمل کرنے کے لیے منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ باہر نکلتے ہی مشہدی انہیں گولی مار دے گا۔ اب رضا کو اپنی نہیں نیلوفر کی فکر تھی۔

"تم غلطی پر ہو صدرالدین" رضا نے ایک نئی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہیں گرفتار نہیں کرایا تھا۔"

"صدرالدین؟" مشہدی کی کالی آنکھوں میں عجیب سی الجھن پیدا ہوگئی اور بھنویں آپس میں مل گئیں۔

"ہاں..... میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ تم میرے علاقے میں نقب زنی کے ارادے سے موجود ہو۔"

"اوہ....." مشہدی کچھ سوچنے لگا۔

"مجھے معلوم ہے کہ گزشتہ ہفتے تم نے خیابان شیرازی کے چوک میں مجھ پر گولی بھی چلائی تھی لیکن مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ ماضی کو بھول جاؤ میں بھی بھول جاؤں گا۔ میں یہاں ڈیوٹی پر نہیں ہوں اپنی منگیتر کے ساتھ آیا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ مسکرانے لگا۔ نیلوفر اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن وہ ذہین بھی تھی لہٰذا سمجھ گئی کہ رضا یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ وہ مشہدی کو نہیں پہچانتا۔

مشہدی واقعی کچھ سوچنے لگا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ ایسا لگا جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے اس نے اپنے ہونٹ اس طرح سکیڑے جیسے سیٹی بجانے والا ہو لیکن پھر ارادہ ترک کرتے ہوئے زبان ہونٹوں پر پھیری اس کی زبان بھی کسی سانپ کی زبان کی طرح پتلی اور گول تھی لیکن اسی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں نفرت عود کر آئی۔ "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم پولیس والے ہو۔" وہ غرانے لگا۔ "میں تمہیں چھوڑ کر کوئی خطرہ مول نہیں لوں گا۔"

"ٹھیک ہے..... جیسی تمہاری مرضی۔" رضا نے مایوسی سے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا منصوبہ اور نئی حکمت عملی بھی ناکام ہو گئی تھی۔

"چلو..... آگے بڑھو۔" مشہدی نے حکم دیا اور رضا اس کی تعمیل میں میز کے دوسری طرف سے اس طرف بڑھا کہ اچانک مشہدی کے عقب میں پہنچ

جائے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ ترکیب بھی ناکام ہوگئی تو بڑا مسئلہ پیدا ہوجائے گا۔

"ہوشیاری کا مظاہرہ مت کرو۔" مشہدی نے اس کے پہلو میں پستول کی نال گاڑتے ہوئے کہا۔ "اس طرف سے آؤ۔"

رضا نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اپنے منصوبے کے ناکام ہونے کا ماتم کیا۔ وہ مشہدی سے محض چند انچ دور کھڑا ہوگیا۔ اس نے پستول کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی.... بلکہ آنکھیں مشہدی پر مرتکز رکھیں' ان آنکھوں کو دیکھ کر رضا کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ چمکیلے پتھروں کو دیکھ رہا ہو' ان آنکھوں میں کچھ بھی نہ تھا۔

تبھی مشہدی دھیمے سروں میں سیٹی بجانے لگا۔

رضا کو یقین ہوگیا کہ اب بہت کم وقت رہ گیا۔ اسے علم ہوگیا کہ مشہدی کی سیٹی اسے موت کا حکم سنا رہی ہے۔

"صدرالدین' میں تمہارا بہت برا حشر کروں گا۔" دھوکا دینے کے لیے رضا نے اپنے پرانے منصوبے کی ڈوری پھر تھام لی۔

"تم صدرالدین کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کرڈالو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" مشہدی نے پستول کی نال اٹھاتے ہوئے بے رحمی سے جواب دیا۔ اب اس کی آنکھیں کسی سرور کے عالم میں چمک رہی تھیں۔

رضا کے اعصاب تڑخنے لگے۔ وہ جانتا تھا کہ اب کچھ کرگزرنے کا آخری موقع ہے۔ پستول کی نال کچھ زیادہ ہی بلند ہوگئی تھی۔ لہٰذا وہ مشہدی کو دھکا دے کر اس کے پیروں پر لات مار سکتا تھا۔ اس صورت میں گولی نہ لگنے کے کسی حد تک امکانات تھے اور صرف یہی آخری موقع تھا۔

اس نے اپنی سانس روک کر جسم کو آنے والی آزمائش کے لیے تیار کرلیا۔

لیکن اسی لمحے مشہدی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ شاید وہ ذہن کو بھی پڑھ لیتا تھا۔

سیٹی کی آواز اونچی ہوگئی۔

رضا کا منصوبہ ایک بار پھر ناکام ہوگیا کیونکہ مشہدی نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر خود کو اس کی پہنچ سے دور کرلیا تھا۔

رضا کے چہرے پر پسینے کی بوندیں جھلملانے لگیں۔

موت اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

مشہدی کی آنکھوں میں زہریلی چمک تھی اور پستول کی لبلبی پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھنے والا تھا۔

اسی لمحے ہال میں نیلوفر کی چیخ گونج اٹھی۔ "بچاؤ...... بچاؤ...... مشہدی...... مشہدی۔"

نیلوفر کی تیز پکار میں نہ جانے کتنی دہشت پوشیدہ تھی کہ مشہدی اپنے فوری نشانے کو بھول کر ایک ہی لمحے کے لیے نیلوفر کی طرف پلٹا۔ پستول کا رخ بھی دوسری طرف ہوگیا اور رضا نے ابھی یا کبھی نہیں کے اصول پر عمل کرتے ہوئے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کیا اور مشہدی پر حملہ کردیا۔

اس کا زوردار مکا عین اس وقت مشہدی کی دائیں کلائی پر پڑا جب وہ لبلبی دبا رہا تھا۔ ہال میں فائر کی زوردار آواز گونجی مگر گولی بھٹک کر دیوار میں گھس گئی' اسی لمحے رضا نے اپنا گھٹنا مشہدی کے پیٹ پر دے مارا۔ اور قاتل دہرا ہوتا چلا گیا...... وہ شدید تکلیف میں تھا۔ رضا نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کراٹے کا زوردار ہاتھ اس کے سر پر مارا...... وہ تڑپنے لگا' ایک زوردار تھپڑ گدی پر پڑا تو وہ ڈگمگانے لگا۔ رضا اسے سانس لینے کی

مہلت دینے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا' لہٰذا اس نے گرے ہوئے پستول کو ٹھوکر سے ایک طرف کرتے ہوئے مشہدی پر لاتوں اور تھپڑوں کی بارش کردی۔

مشہدی کی آنکھیں دھندلانے لگیں پھر وہ مزید برداشت نہ کرسکا اور فرش پر گر گیا۔ اس کے گرتے ہی رضا نے پستول اٹھالیا' اب وہ نیلوفر کی طرف دیکھ سکتا تھا جو اپنی سڈول بانہیں وا کیے اس کی طرف دوڑی آرہی تھی۔

''رضا...... میرے رضا۔'' اس نے اپنی بانہوں کے حصار میں رضا کو چھپالیا۔ اس کا سر پولیس والے کے سینے پر ٹک گیا۔

''رضا...... ڈارلنگ...... تم...... ٹھیک ہوناں؟''

''ہاں...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے نیلو کے ریشمی بالوں پر گال رکھتے ہوئے کہا۔

ان سے چند قدم دور فرش پر لیٹا ہوا کاؤنٹر مین اب بھی کانپ رہا تھا۔ ''ہیڈ کوارٹر فون کرو احمق۔'' رضا نے اسے حکم دیا۔ ''میرا تعلق پولیس سے ہے۔''

''بب...... بہتر آقا۔'' کاؤنٹر مین بڑی مشکل سے اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ اس کی ٹانگیں تنکوں کی طرح کانپ رہی تھیں۔

رضا نے نیلوفر کی آنکھوں میں جھانکا جو اب بھی اس کے بازوؤں میں تھی۔

وہ پژمردہ انداز میں مسکرانے لگی۔ ''میں بے وقوف نہیں ہوں رضا...... اب میں کچھ بھی نہیں کرسکتی۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''میں نے کبھی کسی پر جبر نہیں کیا نیلو۔'' رضا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اور میں تمہیں بھی مجبور نہیں کروں گا۔ تم پولیس سے نفرت کرتی ہو تو میں......''

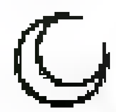
''نہیں...... نہیں......'' وہ بسورنے لگی۔ ''میں تو اب کچھ بھی نہیں کرسکتی رضا۔ میں پولیس افسر کی بیوی بننا چاہتی ہوں۔''

''کک...... کیا......؟'' وہ اچھل پڑا۔ ''کیا تم سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہو؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔''

''سمجھ جاؤ گے۔'' نیلو نے مسکراتے ہوئے اس کے سینے میں منہ چھپالیا۔ ''مجھے بھی حقیقت کو سمجھنے میں کافی دیر لگ گئی لیکن اب میں پولیس افسر کی بیوی بننا چاہتی ہوں۔''

''خدایا......'' رضا نے ایک طویل سانس لے کر اپنے ہونٹ اس کی ریشمی زلفوں پر رکھ دیے۔

وہ بہت خوش تھا۔ اسے آج دنیا جہان کی نعمتیں مل رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ محسن مشہدی کو گرفتار کرانے کے صلے میں اسے جہاں ترقی ملے گی...... وہیں نیلوفر بھی مل جائے گی اور اسے یہ بھی علم تھا کہ نیلوفر ہی اس کا سب سے بڑا انعام ہوگی۔



قسط نمبر 8

آتش زیرپا

سید بدر سعید

وہ طلسم کی گرد سے اٹھنے والا ایک طوفان تھا' جس نے ظلم کا پنجہ مروڑ دیا' جس کے سبب وہ قانون کا بھی مجرم ٹھہرا۔

حالات کی بے رحم کروٹ اسے جرم و گناہ کی سفاک دنیا میں دھکیل کر لے گئی' اس کے سینے میں آتش فشاں دہکتے تھے اور پوروں میں انگارے سلگتے تھے جس کے سبب اسے ایک پل کو چین نہ تھا۔ مجرم اس کی سفاکی سے لرزتے تھے جرم کے بڑے بڑے چراغ اس نے چٹکی میں بجھادیئے تھے۔ قانون کے لمبے ہاتھ اس نے قانون کی ہی گردن میں باندھ دیئے تھے اس کا نام بڑے بڑوں کا پتا پانی کردیتا تھا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا اس سفاک شخص کے سینے میں ایک نرم و گداز دل دھڑکتا ہے' ایک نازک سی لڑکی اس کی کل کائنات ہے

پھر ایک دشمن جاں نے شب خون مارا اور اس کی کائنات اجاڑ دی۔

اس کی وحشت دو چند ہوگئی' وہ آتش زیرپا قاتل کی تلاش میں قریہ قریہ بھٹک رہا تھا۔

پھر ایک جوہر شناس نے اس کی وحشت کو لگام دے کر مثبت سمت میں موڑ دیا۔

سطر سطر ہنگامے' لفظ لفظ تجسس' تیز تیز چلتی سنسنی خیز سلسلے وار کہانی

ڈاکٹروں کے نزدیک شاید کسی مریض کا مرجانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ انہیں روز جانے کتنے لوگوں کو آئی ایم سوری کہنا ہوتا ہے۔ ایک ہی طرح سے ایک ہی انداز سے اور ایک ہی جگہ پر۔ وہ آئی ایم سوری کہتے ہیں اور پھر لاش کو چھوڑ کر اپنے بچوں کو کہیں گھمانے لے جاتے ہیں۔ شاید دنیا بھر میں ڈاکٹر مرنے والے کے اپنوں کو یہی ایک جملہ سناتے ہیں۔ نہ تسلی کا کوئی لفظ، نہ امید کی کوئی کرن، شاید انہیں ان مرنے والوں پر افسوس بھی نہیں ہوتا لیکن مرنے کی اطلاع دینے کے لیے بہت کچھ کہنا ہوتا ہے نا۔ شاید اسی لیے مجھے افسوس ہے کہہ دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر آگے بڑھ چکا تھا اور میرے پاؤں تلے زمین نکلتی جارہی تھی۔ میرا محسن میرا دوست میرا بھائی گل ریز خان مرچکا تھا۔

مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ گل ریز خان کا چہرہ دیکھ سکوں۔ کبھی کبھی ہم حقیقت کا علم ہونے کے باوجود اس سے کنی کتراتے ہیں۔ یہی میرے ساتھ ہورہا تھا۔ ڈاکٹر گل ریز خان کی موت کا اعلان کرچکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ گل ریز خان کس حیثیت کا مالک ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پورا اسپتال گل ریز خان کے وفاداروں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ آپریشن تھیٹر کے باہر اسلحہ برداروں کی موجودگی اسے بتانے کو کافی تھی کہ گل ریز خان کی زندگی کتنی اہم ہے۔ اس نے خون کی ایک آواز لگائی تھی تو بلڈ بینک میں گل ریز خان کے نام پر خون دینے والوں کی لائنیں لگ گئی تھیں۔

ڈاکٹر یہ سب جانتا تھا وہ سرجن تھا اس نے جانے کتنے لوگوں کو بچایا تھا اور جانے کتنے لوگ اس کے سامنے دم توڑ چکے تھے۔ وہ آپریشن تھیٹر سے باہر نکلا تو اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے واضح طور پر چمک رہے تھے۔ اس نے گل ریز خان کو بچانے کی پوری کوشش کی ہوگی۔ اس نے آپریشن تھیٹر میں یہ بھی سوچا ہوگا کہ اگر آج اس زخمی کو کچھ ہوگیا تو باہر کھڑے اسلحہ بردار آپریشن کرنے والے عملے کو بھی ذمہ دار ٹھہرا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں سرجن اور اس کے ساتھیوں کی موت یقینی تھی۔ گل ریز خان کے ساتھ

سرجن کی سانسوں کی ڈوری بھی بندھی تھی۔ اس کے باوجود گل ریز خان دم توڑ چکا تھا۔

گل ریز خان کی موت اس بات کا واضح پیغام تھا کہ زندگی اور موت انسانی ہاتھ میں نہیں ہے۔ انسان بس ایک مہرے کی طرح کام کرتا ہے کب کیا ہو جائے۔ کب کوئی چال چلی جائے اس کا علم انسان کو نہیں ہوتا۔ یہ جس کے کام ہیں وہی کرتا ہے بڑے بڑے سلطان دنیا فتح کرنے نکلے اور اسباب کی وجہ سے مر گئے۔ گل ریز خان بھی ڈاکٹروں کی تمام تر کوشش، خون دینے والوں کی لمبی لائن، دشمنوں محافظوں اور بھاری دعاؤں کے باوجود مر گیا۔

انسان بھلا کب کسی کو بچا پاتے ہیں؟ یہ زندگی اور موت کے کھیل تو اس کے ہاتھ میں ہیں جو ان پر قادر ہے انسان تو محض ایک مہرے کے طور پر کام کرتا ہے اور پھر سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ سے کوئی مرا ہے یا اس نے کسی کو موت کے منہ میں پہنچا دیا ہے۔ ایسے لمحوں میں وہ یہ تو سوچتا ہی نہیں کہ قتل کوئی اور اسی طرح مہرہ بن کرا سے بھی موت کے منہ میں پہنچا دے گا تب اس قاتل کے ذہن میں بھی یہی بات ہوتی کہ وہ کسی کو بھی قتل کر کے زندگی کی قید سے آزاد کر سکتا ہے۔ وہ بہت طاقتور ہے اور پھر کوئی نیا قاتل یہی سوچتے ہوئے اسے بھی اگلے جہاں پہنچا دے گا۔ خدا نے قاتل اور مقتول کو کولہو کے بیل کی طرح ایک دائرے تک محدود کر رکھا ہے۔ جو قتل کرتا ہے اسے اگلے پھیرے میں مقتول بھی بننا پڑتا ہے۔ جو طاقت کے بل پر اکڑتا ہے اسے یہی موقع کسی اور کو بھی دینا پڑتا ہے۔

آج نامعلوم دشمنوں نے گل ریز خان اور اس کے وفاداروں کو قتل کر دیا تھا۔ گل ریز خان کی موت کی خبر ان تک بھی پہنچ گئی تھی۔ انہوں نے آج جشن منانا تھا۔ آج انہوں نے یہی سوچا تھا کہ وہ بہت طاقتور ہیں انہوں نے گل ریز خان اور اس کے وفاداروں کو قتل کر دیا ہے۔ وہ جسے چاہیں قتل کر سکتے ہیں آج کا دن گل ریز خان کے قاتلوں کا دن تھا آج انہیں بڑھکیں لگانے کی کھلی چھوٹ تھی۔ یہ ان کا جشن تھا انہوں نے گل ریز خان جیسے جری پٹھان کو مار گرایا تھا۔

اگلی باری گل ریز خان کے قاتلوں کی تھی۔ آج وہ قاتل تھے لیکن اب انہیں مقتول بننا تھا۔ انہیں بھی جلد ہی اس جہاں جانا تھا جہاں گل ریز خان گیا تھا اب کمالے جٹ کو قاتل بننا تھا۔ جی ہاں، مجھے اپنے دوست گل ریز خان کا بدلہ لینا تھا۔ یہ فیصلہ میں نے اسی وقت کر لیا تھا جب ڈاکٹر سر جھکائے آئی ایم سوری کہہ رہا تھا۔ جس لمحے ڈاکٹر کا سر جھکا تھا اسی لمحہ کمالے جٹ کا سر اٹھا تھا۔ گل ریز خان کے قتل کا بدلہ مجھ پر قرض تھا۔ یہ ایک پٹھان کا پنجابی پر قرض تھا جسے ہر صورت اتارنا ہی تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ گل ریز خان اور مجھ پر حملہ کرنے والے کون تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ اب وہ پاتال میں بھی جا چھپیں کمالا جٹ انہیں ڈھونڈ نکالے گا۔ میرے اندر بدلے کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

گل ریز خان کی لاش آپریشن تھیٹر سے منتقل کی جا رہی تھی۔ سالار خان میرے پاس آیا اور گلے لگ کر رونے لگا۔ اسے شاید سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کسی کے گلے لگ کر اپنا دل ہلکا کرے۔ گل ریز خان صرف اس کا سردار یا مالک ہی نہیں تھا آج سالار خان کا باپ مر گیا تھا۔ اس کی کیفیت ایسی ہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ مجھ سے گلے ملتے ہی جیسے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ جسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سالار خان کی دہشت تھی لوگ جانتے تھے کہ اب تک وہ جانے کتنے لوگوں کو قتل کر چکا ہے۔ اس نے گل ریز خان کی حفاظت کرتے ہوئے جانے کتنے دشمنوں کو قتل کیا تھا اور جانے کتنی بار وہ موت کے منہ میں گیا اور پھر لوٹ آیا تھا۔ آج وہی سالار خان تمام تر رکھ رکھاؤ، رعب اور دبدبہ بھول کر میرے گلے لگا بچوں کی طرح سسک رہا تھا۔ میں اس کی پیٹھ تھپکنے لگا میں چاہتا تھا کہ وہ کھل کر رو لے اس نے اب سارے انتظامات دیکھنے تھے۔ اگر وہ روتا نہ تو پھر قیامت اٹھاتا۔ قیامت تو اب بھی اٹھنی تھی لیکن اس سے پہلے ہمیں گل ریز خان کی آخری رسومات ادا کرنی تھیں۔ سالار خان آہستہ آہستہ سنبھلنے لگا۔ اس نے الگ ہوتے

ہوئے مضبوط لہجے کہا۔

"میں اپنے خان کا بدلہ لوں گا۔ ان قاتلوں کی نسلوں کو بھی ختم کر دوں گا۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا۔

"سالار خان اس انتقام کو اپنے اندر پالتے رہو یہ آگ سرد نہ ہونے دینا ہم گل ریز خان کا بدلہ لیں گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

سالار خان کی آنکھوں میں ممنونیت کا احساس ابھرا میں نے مزید کہا۔

"اب سارے معاملات تمہی کو دیکھنے ہیں۔ حالات اپنے کنٹرول میں لو اور صورت حال کو سنبھالو ہم جلد ہی خان کی موت کا بدلہ لینے نکلیں گے لیکن اس سے قبل کچھ اور معاملات بھی دیکھنے ہیں۔"

سالار خان میرا اشارہ سمجھ گیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ہسپتال کی انتظامیہ کی طرف چلا گیا۔ اب اسے گل ریز خان کی لاش وصول کرنے سے لے کر جنازے تک کے بھی معاملات دیکھنے تھے۔ میرے سینے سے لگ کر رونے سے اس کا دل ہلکا ہو گیا تھا۔ اب اس نے انتقام تو لینا تھا لیکن اس سے پہلے جو فرائض ادا کرنے تھے ان کی جانب بھی متوجہ ہو گیا تھا گل ریز خان کی موت کی خبر سن کر میری طرح وہ بھی بکھر گیا تھا لیکن اب اسے رستہ نظر آ گیا تھا اس نے کیا کرنا تھا اور کب کونسا قدم اٹھانا تھا یہ سب واضح ہو رہا تھا۔

گلریز کی موت کی خبر نے مجھے بھی بکھیر دیا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے جسم کا کوئی اہم حصہ کٹ کر الگ ہو گیا تھا سالار خان گلے لگا تو جیسے اس کے ساتھ ساتھ میں بھی سنبھل گیا۔ بنا کچھ کہے ہم ایک دوسرے کے گلے لگے اپنا اپنا بوجھ ہلکا کر گئے تھے۔ میں صرف سالار خان کو ہی نہیں کہہ رہا تھا کہ ہم گل ریز خان کا انتقام لیں گے بلکہ میں دراصل اپنے آپ کو بتا رہا تھا کہ مجھے ہر صورت یہ انتقام لینا ہے۔ یہ میرا خود سے وعدہ تھا۔ گل ریز خان کے قاتل نامعلوم تھے۔ وہ آندھی کی طرح اچانک آئے اور سب کچھ اجاڑ کر طوفان کی طرح واپس چلے گئے۔ یہ درست تھا کہ اب اس طوفان کی طاقت کم بھی اس کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ ہم نے ان کا بھاری نقصان کیا تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ ایک گل ریز خان کی موت ان کے سب بندوں کی ہلاکت پر بھاری تھی۔ ہمارا لیڈر مارا گیا تھا میرا محسن اور بھائی مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ میں قبائلی علاقوں میں اپنا انتقام لینے کے لیے گل ریز خان کے سہارے ہی آیا تھا۔ یہاں میرا کوئی بھی نہ تھا لیکن گل ریز خان نے سب کچھ دیا بھائی، خاندان، قبیلہ، عزت، سپورٹ، اسلحہ، لوگ کیا کچھ نہیں تھا میرے پاس، یہ سب گلریز کے دم سے تھا اور اب شاید کچھ بھی نہ رہا تھا۔ مجھ سے گلریز ہی نہیں سب کچھ چھن گیا تھا۔ میں ایک بار پھر تنہا ہو گیا تھا مجھے ہر صورت گلریز کا انتقام لینا تھا۔ اس کا انتقام اس کے قبیلے سے زیادہ مجھ پر فرض تھا کیونکہ وہ میرے لیے قتل ہوا تھا۔

گل ریز خان کی لاش گھر لے جانے کے بجائے ایمبولینس میں رکھی گئی تو میں بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ایمبولینس ایک جھٹکے سے چل پڑی۔ میں جانے کس کیفیت میں گل ریز خان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ذہن پر جیسے فلیش بیک چل پڑا۔

گل ریز خان اور میں نے لاہور کے ایک مشہور کالج میں ایک ساتھ فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا تھا۔ مجھے میٹرک کے بعد آزادی کا احساس ہو رہا تھا جبکہ گل ریز خان کو اپنے وطن کی یاد ستا رہی تھی۔ وہ اپنے قبیلے کو اپنا وطن ہی کہتا تھا اتفاق سے ہم دونوں ہوسٹل میں روم میٹ بن گئے۔ کالج کے ہوسٹل میں ایک کمرے میں دو طالب علم رہتے تھے ایک کمرہ میرے اور گل ریز خان کے حصہ میں آیا۔

وہ قبائلی سردار کا بیٹا تھا عام طور پر قبائلی سردار بہت پڑھے لکھے نہیں ہوتے لیکن گل ریز خان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے۔ وہ لاہور اپنے والد کی اسی خواہش پر آیا تھا۔ اس کے والد نے اپنے ہی قوانین و نظریات اپنا رکھے تھے۔ گل ریز کو اپنے گھر کے پاس کسی کالج میں داخلہ بھی مل سکتا تھا لیکن اس کے والد کا خیال تھا

کہ اسے سرداری کی پگ سر پر رکھنے سے پہلے اپنا مقام بنانا چاہیے اور سخت مشقت کا عادی ہو جانا چاہیے۔ اسی مقصد کے لیے انہوں نے گل ریز خان کو لاہور پڑھنے کے لیے بھیج دیا تھا تا کہ ایک تو اسے دوسرے صوبے کے رسم و رواج اور ترقی کا علم ہو سکے وہ اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتے تھے لیکن اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھنے کے بھی خلاف تھے۔ گل ریز خان اور میں دو سال روم میٹ رہے۔ ہماری شرارتیں دکھ سکھ بھی سانجھے تھے ہم نے ایک ساتھ فلمیں دیکھیں اور دو سال ایک کمرے میں گزار دیے۔ ہمارے درمیان کوئی راز، راز نہ تھا۔ کالج میں ہماری دوستی مثالی تھی۔ گل ریز خان دو سال میرے ساتھ لاہور رہا لیکن اس کے باوجود اس پر لاہور کا رنگ نہ چڑھ سکا۔ اس کی قبائلی روایات، دوستی اور دشمنی کے اصول بھی اس کے ہمراہ رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب مجھے معلوم ہوا کہ میرے دشمن قبائلی علاقوں میں ہیں تو میں نے گل ریز خان سے رابطہ کیا۔ اس نے اگلی بات سنے بنا مجھے آنے کو کہا اور پھر میرا بھرپور ساتھ دیا۔

گل ریز خان کی شادی بہت کم عمر میں ہوئی تھی۔ اسے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ ہوسٹل میں وہ اکثر چھٹیوں میں گھر جانے کا پروگرام بناتا تو اپنی شریک حیات کے لیے ڈھیروں شاپنگ کر کے جاتا تھا وہ بھی ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر بن کر وہ اپنے علاقے میں ایک اسپتال بنائے گا جہاں قبیلے کے لوگوں کا بہترین علاج ہو گا۔ بدقسمتی سے میری طرح گل ریز خان بھی ڈاکٹر نہ بن سکا۔ اس کے ایف ایس سی میں بہت اچھے نمبر آئے تھے۔ لاہور کے بہترین میڈیکل کالج کے میرٹ پر وہ پورا اترتا تھا لیکن انہی دنوں اس کے والد ایک قبائلی جھڑپ کے دوران مخالفین کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ گل ریز خان خبر ملتے ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے گھر چلا گیا لیکن اس سے قبل ہی اس کے والد اس دنیا سے جا چکے تھے۔ وہ جاں بحق تو اسی وقت ہو گئے تھے جب ان کے سر پر برسٹ لگا تھا لیکن واپس آنے تک یہ خبر گل ریز سے چھپائی گئی تھی۔ اسے صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ اس کے والد زخمی ہو گئے ہیں۔

گل ریز خان اپنے علاقے میں پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے والد قتل ہو چکے ہیں۔ اس نے جانے کس کیفیت میں اپنے باپ کا آخری دیدار کیا۔ جنازے کو کندھا دیا اور گھر آ کر ڈھے گیا۔ گل ریز خان کے لیے شاید سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس کا کوئی بھائی یا چچا نہیں تھا۔ وہ تنہا اور لاوارث ہو گیا تھا لیکن قبیلے کے بڑوں نے اس کے والد کے جنازے کے اگلے ہی دن سرداری کی پگ اس کے سر پر رکھ دی گل ریز خان پھر لوٹ کر لاہور نہیں آیا۔ قبیلے کی سرداری پھولوں کی سیج نہ تھی۔ اسے اپنے والد کی ساکھ بھی برقرار رکھنا تھی اور ان کے قاتلوں سے انتقام بھی لینا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ قبائلی جرگوں میں شرکت بھی ضروری تھی۔ وہ اپنے علاقے کے معاملات سمجھتا سمجھتا ایک مکمل سردار بن چکا تھا۔ اس نے اپنے والد کی روایات کو کامیابی سے آگے بڑھایا۔ وہ مہمان نوازی ہی نہیں بلکہ دردِ دل رکھنے والا بھی تھا۔ اس کے ارد گرد اس کے وفاداروں کی فوج اکٹھی ہونے لگی اور وہ طاقت اختیار کرتا چلا گیا۔ اس نے جلد ہی اپنے باپ کے قاتلوں کو دنیا کی قید سے آزاد کر دیا تھا۔

گل ریز خان کا یہ روپ ایک مکمل قبائلی سردار کا روپ تھا۔ وہ اس گل ریز خان سے کافی مختلف ہو گیا تھا جو میرے ساتھ ہوسٹل میں رہتا تھا لیکن اس کے باوجود میرے لیے وہ میرا دوست اور دراز زبان ہی تھی۔ وہ اپنے مخالفین کو عبرت کا نشان بنا دیتا تھا تو دوسری طرف ان کے بچوں اور خواتین کے اخراجات کی ذمہ داری بھی خود اٹھا لیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ لڑائی مردوں کے درمیان ہوتی ہے۔ عورتوں اور بچوں کی عزت سانجھی ہوتی ہے۔ ان کا ہمارے جھگڑوں سے بھلا کیا تعلق ہے۔ اس لیے وہ اپنے مخالفین کے بچوں اور بیویوں کو کافی عزت و احترام دیتا تھا۔ ایسی ہی متعدد عادات اسے نہ صرف دوسروں سے ممتاز رکھتی تھیں بلکہ عام طبقہ اسے اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگا تھا اس کے لوگ اس پر جان قربان کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود یہ سچ تھا کہ جس گولی پر اس کا نام لکھا تھا اسے اس کا کوئی وفادار

نہیں روک پایا۔ اس کے وفاداروں نے جانیں تو قربان کر دیں لیکن اس کے باوجود وہ گل ریز خان کو نہ بچا سکے۔ ایمبولینس ایک جھٹکے سے گل ریز خان کے گھر کے باہر رکی تو میں ماضی سے حال میں آ گیا۔

گل ریز خان کی لاش آنے سے پہلے ہی گھر کے باہر لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ سالار خان نے ایمبولینس کا دروازہ کھولا تو میں گل ریز خان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اسی حالت میں بیٹھا تھا۔ سالار خان کے کہنے پر اس کا ہاتھ چھوڑا اور گل ریز خان کی لاش ایمبولینس سے اتار کر چارپائی پہ ڈال دی گئی۔ میں گل ریز خان پر حملے کے بعد جیسے ہمت ہار بیٹھا تھا لیکن جانے کیا ہوا کہ جیسے ہی گل ریز کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھاما تب سے میری کیفیت بدلنے لگی تھی۔

کمالا جٹ اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اب مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اگر میں ہمت ہار بیٹھا تو میرے دوست کا بدلہ کوئی نہیں لے پائے گا۔ میں نے سالار خان کو بلایا اور اس سے گل ریز خان کی آخری رسومات کے بارے میں پوچھنے لگا۔ سالار خان نے بھی شاید میری بدلتی کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے مجھے وہی حیثیت دی جو گل ریز خان کی تھی یہ بات مجھ سے بالاتر تھی لیکن فی الوقت میں نے اس بارے میں کوئی بات نہ کی۔ گل ریز خان کا ایک ہی بیٹا تھا لیکن وہ اس قدر چھوٹا تھا کہ باپ کے غم کے سوا اسے دیگر معاملات میں شریک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

گل ریز خان کی تعزیت کے لیے آنے والوں کو میں ہی مل رہا تھا۔ سالار خان مجھے عمائدین کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا اور ان کی حیثیت اور مرتبے سے آگاہ کر رہا تھا۔ گل ریز خان کے گھر کی طرف سے میں ہی ان سے مل رہا تھا۔ اسی طرح سالار خان بھی ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کر رہا تھا۔ اگر کوئی اہم معاملہ یا بات ہوتی تو میں زنان خانے میں پیغام بھجوا دیتا لیکن مجھے احساس تھا کہ گل ریز خان کی بیوہ ابھی اس حالت میں نہیں کہ کوئی فیصلہ کر سکے اس لیے میں نے زیادہ تر فیصلے خود ہی کرتا تھے۔ میں یہ ذمہ داری سچے دل سے نبھا رہا تھا۔ خون کا رشتہ نہ تھی لیکن گل ریز خان میرے لیے بھائیوں سے بڑھ کر تھا۔ جب گل ریز خان کا جنازہ اٹھایا گیا تو میں نے سارے راستے چارپائی کا پایہ ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ گل ریز خان کے قتل کے بعد دس دن یونہی سوگ میں گزر گئے۔

دسویں دن قبیلے کے بڑے اکٹھے ہوئے۔

گل ریز خان کے حجرے میں سب کے لیے قہوے کا انتظام کیا گیا تھا۔ روایات کے مطابق اب گل ریز خان کے جانشین کا اعلان ہونا تھا۔ اس کا بیٹا بہت چھوٹا تھا لیکن گل ریز کا نہ تو کوئی چچازاد بھائی تھا اور نہ ہی کوئی سگا بھائی تھا۔ اگر جرگہ اس کے بیٹے کو نااہل سمجھتا تو اسے جانشین مقرر کر دیتا کہ اصل وارث تو بہرحال وہی تھا لیکن اس کی کم عمری کی وجہ سے اس کے اہل ہونے تک تمام معاملات کسی اور کو بھی سونپے جا سکتے تھے۔ بہرحال یہ قبیلے کے بڑوں نے اپنی روایات اور حالات کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کرنا تھا۔ میرا اس سے اتنا ہی تعلق تھا جتنا کسی بھی خاموش تماشائی کا ہو سکتا تھا۔ البتہ میری کوشش تھی کہ انتظامات میں کسی قسم کی کمی نہ ہونے پائے۔ سالار خان سمیت دیگر وفادار جرگے کے انتظامات دیکھ رہے تھے میں انہیں ملازم نہیں کہتا وہ جانباز اور وفادار ہی تھے۔ انہی کے بھائی بندوں نے گل ریز خان کے لیے جانیں دی تھیں۔

عمائدین اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو میں گل ریز خان کے بیٹے کو ساتھ لیے حجرے میں جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ مجھے سالار خان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آ رہی تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر میری جانب دیکھ رہا تھا۔ مجھے صورت حال میں عجیب سا ڈرامائی احساس ہو رہا تھا۔ محفل میں ایک بے چینی سی پھیلی ہوئی تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ اس کے باوجود میں وہاں بیٹھ کر صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میرا رواں رواں دعا کر رہا تھا کہ جرگہ کسی اور کے بجائے گل ریز خان کے بیٹے کو ہی اس کی جگہ سونپ دے اگر کسی اور کا نام ہو تو وہ محض انتظامی معاملات سنبھالنے تک

محدود ہو اور اس کے لیے اسے گل ریز خان کی بیوہ سے تحریری اجازت لینی پڑے۔ یہ گل ریز خان کی بیوہ اور اس کے بیٹے کے مستقبل کے لیے بہت ضروری تھا۔ یہ بھی سچ تھا کہ یہ میرے دل کی خواہش تھی لیکن جرگہ میرے دل کا پابند نہیں تھا۔ میری حیثیت اس قدر کمزور تھی کہ کوئی بھی اٹھ کر اعتراض کر سکتا تھا کہ قبیلے کے اندرونی معاملات کے لیے بیٹھے جرگے میں غیر مقامی اور غیر قبائلی شخص کیوں بیٹھا ہے؟ اگر کوئی یہ اعتراض کر دیتا تو مجھے جرگہ سے اٹھ کر جانا پڑتا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں یہاں محض خاموش تماشائی کا سا کردار ادا کروں البتہ اگر مجھے لگا کہ گل ریز خان کے بیٹے کے ساتھ ناانصافی ہونے لگی تو پھر میں ایزما ڈخل اندازی کرتا۔ اس وقت سے پہلے تک مجھے اپنا منہ بند رکھنا تھا تاکہ اپنے آپ کو اس جرگے میں موجود رہنے کا اہل ثابت کر سکوں۔

جرگہ کی کارروائی شروع ہوئی تو پہلے گل ریز خان کی بہادری اور دیانت کے قصیدے پڑھے گئے۔ بلاشبہ وہ ان اوصاف کا مالک بھی تھا۔ کچھ بزرگوں نے اس کی شجاعت کی داستانیں بھی سنائیں اس کے بعد محفل اپنے مخصوص ڈھب پر آ گئی۔ جرگہ کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوئی تو حجرے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ جرگہ کی جانب سے یہ انکشاف کیا گیا کہ قتل سے کچھ عرصہ قبل ہی گل ریز خان نے اپنا وصیت نامہ تحریر کیا تھا۔ یہ دستاویز اس کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تھیں۔ گل ریز خان کی وصیت کا انکشاف ہونے کے بعد جرگہ کے فیصلہ کی اہمیت پہلے جیسی نہ رہی گل ریز خان نے اس سلسلے میں خود اپنے فیصلے سنا دیے تھے۔ اس نے اپنے وصیت نامہ میں جو کچھ بھی لکھا تھا وہ اس کا ذاتی فیصلہ تھا جس سے کسی ہنگامی صورت حال کے بنا ہی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

گل ریز خان کے مبینہ وصیت نامہ کی بازگشت سنائی دی تو متعدد اراکین بھی تجسس میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں بھی اس جانب مائل ہو گیا۔ مجھے بھی تجسس تھا کہ آخر گل ریز خان نے کیا وصیت کی ہوگی۔ اس کی وصیت سے متعدد معاملات حل ہو سکتے ہیں تو دوسری جانب اس وصیت سے مزید جھگڑے جنم لے سکتے تھے۔ یہ جائیداد اور سرداری کا جھگڑا تھا اور گل ریز خان کا بیٹا ابھی اس قابل نہ تھا کہ اپنے ساتھ ہونے والی کسی زیادتی یا بے ایمانی پر کوئی قدم اٹھا سکے۔ جرگہ نے گل ریز خان کا وصیت نامہ پڑھنا شروع کیا تو میں جیسے اپنی جگہ ساکن ہو کر رہ گیا۔ وصیت نامہ سننے کے بعد میری کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ گل ریز خان نے اپنے وصیت نامے میں مجھے اپنا جانشین قرار دیا تھا۔ اس نے میرے دونوں ناموں کی وضاحت کر دی تھی۔ قبائلی علاقوں میں میرا نام حارث تھا گل ریز خان نے بعض وجوہات کی بنا پر مجھے اسی نام سے متعارف کروایا تھا لیکن اس نے اپنے وصیت نامہ میں واضح طور پر لکھا تھا کہ "حارث کا اصل نام کمال جٹ ہے لیکن میری ہدایات پر اس طرح عمل کیا جائے کہ کمال جٹ میری جگہ آ جائے میرے تمام ساتھیوں پر فرض ہے کہ نا صرف اس سے وفاداری نبھائیں بلکہ اس کی کسی بھی لڑائی کی صورت میں بھرپور ساتھ دیں۔ اسی طرح متعدد ہدایات اور احکامات لکھے گئے تھے۔ یہ وصیت نامہ گل ریز خان کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اس لیے اس میں کسی شبہ کی گنجائش نظر نہیں آ رہی تھی۔ جرگہ کی جانب سے وصیت نامہ سنائے جانے کے بعد سب خاموشی سے میری جانب دیکھنے لگے۔

بات واضح ہو چکی تھی گل ریز خان اپنی جگہ مجھے مقرر کر گیا تھا۔ یہ ایک فیصلہ تھا جو میری سمجھ سے باہر تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ کوئی یہ سوال بھی نہیں اٹھا سکتا تھا کہ جرگہ کے کسی شخص نے جعلی وصیت نامہ سنایا ہے۔ اس کی وجہ بھی کہ میرا تعلق سرے سے ہی اس قبیلے سے تھا ہی نہیں۔ اس لیے میں نہ تو کسی لابی کا حصہ تھا اور نہ ہی ان میں سے کسی کا قریبی تھا۔ ابھی اس پر بات شروع نہ ہوئی تھی حجرے میں ایک ایسی خاموشی تھی جو بولنے سے چند لمحے پہلے ہوتی ہے یوں لگ رہا تھا کہ ابھی کچھ بولنے سے پہلے الفاظ تول رہے تھے۔ اچانک گل ریز خان کا بیٹا میرے

پاس سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سبھی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ چھوٹا تو تھا لیکن اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ اسے معاملے کی نوعیت کا علم نہ ہوگا۔ اس کے یوں اچانک کھڑے ہونے سے لگا کہ شاید وہ اس فیصلے سے بغاوت کا اعلان کردے۔ میں نے تاسف سے اس کی جانب دیکھا اگر وہ مجھے ویسے بھی کہہ دیتا تو میرا فیصلہ اس کے حق میں ہوتا۔ یہ جانشینی اس کا حق تھا۔ میں نے لمحوں میں فیصلہ کرلیا کہ اگر اس نے کوئی اعتراض اٹھایا تو میں اس کے حق میں کھڑا ہوں گا۔ گل ریز خان کے بیٹے نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور جرگہ کے بڑوں کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا یہ زنان خانہ سے آیا ہے۔ انہوں نے کہا تھا جب وصیت پڑھ کر سنائی جائے تو اسے بھی پڑھ لیا جائے۔ ایک شخص نے وہ لفافہ پکڑ کر اسی شخص کی جانب سے بڑھا دیا جس نے وصیت نامہ پڑھ کر سنایا تھا۔ اس نے چند عمائدین کی جانب دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں چند اشارے ہوئے اور اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے لفافہ کھول کر اس میں سے ایک کاغذ برآمد کرلیا۔ کاغذ پر لکھی تحریر بھی اسی طرح پڑھ کر سنائی جانے لگی۔ جیسے گل ریز خان کا وصیت نامہ پڑھا گیا تھا۔ یہ گل ریز خان کی بیوہ کا خط تھا اس سے اندازہ ہوا کہ وہ دکھ اور غم کے ان لمحات میں بھی صورت حال پر نظر رکھے ہوئے تھیں۔ ان کے وفادار کسی نہ کسی طرح زنان خانہ تک صورت حال پہنچا رہے تھے۔ یقیناً یہ کام ملازمائیں کر رہی تھیں۔ یا پھر گل ریز خان کے وفاداروں میں سے کسی کی بیوی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ گل ریز خان کی بیوہ نے اپنے خط میں جرگہ کے عمائدین کے احترام میں چند جملے تحریر کرنے کے بعد وصیت نامہ پر ہی بات کی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ گل ریز خان کا وصیت نامہ اصلی ہے اور اس نے اس کے مندرجات سے زنان خانہ کو بھی آگاہ کیا تھا۔

اس کی بیوہ کے مطابق اس کی وجوہات اور دیگر صورت حال ان کے علم میں تھیں۔ اس لیے ان کی خواہش ہے کہ ان کے شوہر کے وصیت نامے پر من و عن عمل کیا جائے۔

انہوں نے جرگہ کے عمائدین کو یہ بھی یقین دلایا تھا کہ زنان خانہ سے اور گل ریز خان کے بیٹے کی جانب سے اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی جائے گی۔ گل ریز خان کی بیوی کے اس خط نے وصیت نامہ پر گویا مہر لگادی۔ جو لوگ سوچ رہے تھے کہ اس حوالے سے یہ اعتراض کردیں کہ باہر کا شخص گل ریز خان جیسے قبائل کا وارث نہیں بن سکتا وہ بھی اب چپ کر بیٹھ گئے۔ جرگہ نے کچھ دیر آپس میں صلاح مشورے کیے اور پھر گل ریز خان کی وصیت پر من و عن عمل کرنے کا اعلان کیا۔ سرداری کی پگ میرے سر پر رکھ دی گئی اور گل ریز خان کا اسلحہ میری ملکیت میں دے دیا گیا۔ اسلحہ دینا ایک علامتی رسم تھی ورنہ درحقیقت گل ریز خان کا سبھی کچھ اب میرا ہو چکا تھا۔ جرگہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا تو سالار خان نے آگے بڑھ کر اعلان کیا کہ گل ریز خان کی خواہش تھی کہ اس کی وصیت پر عمل ہو تو حجرے میں آنے والوں کو بہترین کھانا کھلایا جائے۔ اس لیے کھانا تیار کروایا جا رہا تھا جو جلد ہی عمائدین کے آگے چنا جائے گا۔ سالار خان کے اعلان کے بعد وہ لوگ دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ گئے جو اٹھ کر جانا چاہتے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ملازمین نے دنبے کا بھنا ہوا گوشت دیگر لوازمات کے ساتھ دسترخوان پر رکھنا شروع کردیا۔ پرتکلف ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ سب اپنے اپنے خیالات میں گم تھے۔ یہ وصیت نامہ سبھی کے لیے حیرت کا باعث تھا۔ کچھ لوگ دبی دبی آواز میں اپنے تحفظات کا اظہار بھی کررہے تھے۔ لیکن بظاہر سبھی اس فیصلے پر اپنا اطمینان ظاہر کررہے تھے۔ باقیوں کو تو چھوڑیں خود میں گل ریز خان کے اس فیصلے پر حیرت زدہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں یہاں اپنا انتقام لینے آیا تھا۔ میری کائنات کو قتل کرنے والا ظالم درندہ ان علاقوں میں کہیں تھا اور میں اسی کے تعاقب میں تھا۔ تعاقب کرنے والے بھلا کب ٹھہرتے ہیں۔ وہ تو مسلسل سفر میں رہتے ہیں۔ یہ مسلسل سفر ہی تو تعاقب کرنے والوں کی کامیابی کی ضمانت بنتا ہے۔ گل ریز خان اس حقیقت سے واقف تھا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ انتقام لینے کے بعد مجھے واپس چلے جانا تھا۔ میں

قبائلی نہیں تھا۔ یہاں کی روایات میرے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکتی تھیں۔ اس لیے مجھے ہر صورت واپس جانا تھا۔ گل ریز خان نے ایک ایسی زنجیر میرے پاؤں میں ڈال دی تھی جو اب مجھے یہاں کا غلام بنانے والی تھی۔ میرے لیے یہ فیصلہ کافی عجیب و غریب تھا۔ اس نے مجھے الجھن کا شکار کر دیا تھا آخر اس فیصلے کے پیچھے گل ریز خان کی کیا حکمت تھی۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سر جھٹکا اور عمائدین کے پروٹوکول کی جانب متوجہ ہو گیا۔ بہر حال یہ سچ تھا کہ اب گل ریز خان مجھ پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال گیا تھا جسے ہر صورت نبھانا تھا۔ میں نے چند لمحے صورت حال کا جائزہ لیا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ میرے اس طرح کھڑے ہونے سے سبھی میری جانب متوجہ ہو گئے۔ اب میں گل ریز خان کی جگہ کھڑا تھا اور میری حیثیت وہی ہوتی تھی جو گل ریز خان کو حاصل تھی۔ میں نے ایک پل کے لیے سب کی جانب دیکھا سبھی میری جانب دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔

"میں اس عزت پہ آپ سب کا شکر گزار ہوں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مجھے یہاں کے مکمل قوانین اور روایات کا علم نہیں۔ آپ سب لوگ میری رہنمائی کے لیے موجود ہیں۔ مجھے امید ہے آپ میری رہنمائی کریں گے لیکن ایک گستاخی کی اجازت چاہتا ہوں۔

میں نے جیسے ہی گستاخی کا کہا سبھی چونک گئے کچھ کے چہرے پر غصے کے اثرات نظر آنے لگے جبکہ کچھ اس بات پر خوشی محسوس کرنے لگے کہ اب معاملات بگڑ جائیں گے۔ میں سبھی کے تاثرات محسوس کر رہا تھا چہروں پہ آنے والا وقتی رنگ ہی ہمیں دوست دشمن کی پہچان کرا دیتا ہے کبھی لمحوں میں یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ کس پر اندھا اعتماد کرنا ہے اور کس سے محتاط رہنا ہے۔ چہروں پر آنے والا وقتی رنگ ہی ہمیں انسان کی اصلیت سے آگاہ کر دیتا ہے۔ میں بھی حجرے میں بیٹھے افراد کے چہروں پر آنے والا رنگ دیکھ رہا تھا۔ لمحوں میں یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ مجھے کس پر اعتبار کرنا ہے اور کس کے شر سے خود کو محفوظ رکھنا ہے۔

یہاں دوست کے روپ میں کوئی سانپ بھی بیٹھے تھے۔ جنہیں جب بھی موقع ملتا انہوں نے مجھے ڈس لینا تھا۔ میرا تجربہ ہے کہ سانپ کا ڈسا تو پانی مانگ لیتا ہے لیکن انسان کے ڈسے کو اکثر پانی مانگنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ اسے تو علم ہی تب ہوتا ہے جب حسد اور نفرت کا زہر پھیل کر اپنا کام کر چکا ہو۔ کبھی کبھی تو یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ ڈس کون گیا ہے۔

میں نے سبھی کے چہروں کو دیکھا اور گل ریز خان کے بیٹے کو ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

"میں یہ گستاخی کرنا چاہتا ہوں کہ گل ریز خان کا اسلحہ اپنے پاس رکھوں لیکن سرداری کی دستار گل ریز خان کے بیٹے کے سر پر رکھ دوں۔ یہ اسی کی امانت ہے اور اسی کے پاس رہے گی۔ البتہ جب تک صورت حال اس کے کنٹرول میں نہیں آ جاتی تب تک میں ریز خان کا انتقام لینے کے ساتھ ساتھ دیگر معاملات نمٹاتا رہوں گا۔"

میری بات سن کر کئی تنے ہوئے چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور کچھ کا اطمینان رخصت ہو گیا ان کی توقع کے مطابق کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ میرے اعلان کے ساتھ ہی حجرے میں ہر سمت سے داد و تحسین کے نعرے لگنے لگے۔ عمائدین کو یہ خوشی تھی کہ میں نے گل ریز خان کی وصیت پر بھی عمل کیا اور قبیلے کی سرداری بھی قبیلے سے باہر نہیں جانے دی۔ میں نے گل ریز خان کے بیٹے کو ہی اس کا حق دیا تھا۔ وہ مسائل جن کا سوچ کر عمائدین پریشان ہو رہے تھے میں نے انہیں لمحوں میں نمٹا دیا تھا۔ اس سے میری ایمانداری ثابت ہو گئی تھی۔ سب کو علم ہو گیا کہ میرے دل میں کھوٹ نہیں ہے اور نہ میرا اس منصب پر ہمیشہ کے لیے کام کرنے کا ارادہ ہے۔ یہ بات جرگے کے عمائدین کو بہت پسند آئی۔ اب رائے عامہ بھی میرے حق میں نظر آنے لگی۔ اس سے پہلے ماحول میں تناؤ کی سی کیفیت موجود تھی۔ اب میں ان کا اپنا تھا اب یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ گل ریز خان نے کمال جست کو منتخب کر کے اپنے بیٹے اور خاندان کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں دے دیا تھا۔ ابھی حجرے میں

ایسے لوگ موجود تھے جن کے چہروں پر چھائی مسکراہٹ کے پردے کے پیچھے زہریلے ناگ کلبلا رہے تھے۔ یہ وہ تھے جن کا خیال تھا کہ اس معاملے میں ان کا انتخاب کیا جاسکتا تھا۔ انہوں نے ہی طوفان اٹھایا تھا لیکن گل ریز خان کی بیوہ کے خط کے بعد ان کے پاس کوئی جواز بچا ہی نہ تھا۔ اب انہوں نے جو بھی کرنا تھا پیٹھ پیچھے ہی کرنا تھا۔

بہرحال مجھے موقع کی نزاکت کا احساس تھا اس لیے انجان بنا ان سے بھی مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ حجرہ خالی ہونا شروع ہوگیا۔ لوگ واپس لوٹنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہاں سالار خان سمیت چند وفادار رہ گئے۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا تھا اور گل ریز خان کا بیٹا میرا ہاتھ تھامے جانے کن خیالوں میں گم تھا۔ اس کی عمر کم ضرور تھی لیکن بہرحال وہ یہ شعور رکھتا تھا کہ وہ اپنے باپ کو کھو چکا ہے۔ میں نے ایک وفادار کو اشارہ کیا اور وہ گل ریز خان کے بیٹے کا ہاتھ تھام کر اسے زنان خانہ کی جانب لے گیا۔ باقی وفادار بھی ایک ایک کر کے حجرے سے باہر چلے گئے۔ شاید انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ میں اس وقت تنہائی چاہتا ہوں۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے رونما ہوا تھا کہ مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ میں تنہا بیٹھ کر سوچنا چاہتا تھا کہ کاتب تقدیر میرے ارد گرد کون سی کہانی بن رہا ہے۔ آخر گل ریز نے میرے پاؤں میں یہ زنجیر کیوں ڈالی۔ وہ تو میرے مشن سے واقف تھا۔

میں یہی سب سوچ رہا تھا کہ سالار خان کسی کام سے حجرے میں چلا آیا۔ اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ سالار خان کی معانی خیز نظریں میری آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ کیا سالار خان کو اس وصیت کا پہلے سے پتا تھا؟ سیکنڈ کے ہزارویں لمحے میں یہ سوال میرے ذہن میں ابھرا اور میں نے واپس جاتے سالار خان کو آواز دے کر روک دیا۔

سالار خان پلٹ کر میری جانب آیا اور سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"سالار خان بیٹھ جاؤ۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ وہ خود سے الجھتے ہوئے میرے پاس بیٹھ گیا۔ میں کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سالار خان میں بات گھما پھرا کر کرنے کا عادی نہیں ہوں اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپاؤ گے نہیں۔"

سالار خان نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے بات آگے بڑھائی۔

"تم پہلے سے جانتے تھے کہ گل ریز خان نے وصیت میں کیا لکھا ہوا ہے؟"

میرے سوال پر سالار خان چند لمحے تذبذب کا شکار نظر آیا۔ پھر جیسے کسی فیصلے تک پہنچ گیا۔

"جی میں جانتا تھا۔" اس نے اعتراف کرلیا۔ "خان صاحب نے خود بتایا تھا مجھے۔"

"پھر تو اس کی وجہ بھی جانتے ہوگے کہ گل ریز خان نے کیا سوچ کر یہ فیصلہ کیا تھا؟ وہ میری زندگی اور مقصد سے بخوبی واقف تھا۔ پھر بھی اس کا یہ فیصلہ مجھے عجیب لگ رہا ہے۔"

سالار خان چند لمحے میری جانب عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

"خان صاحب نے آپ پر جان قربان کردی۔ وہ آپ کو بچانے گئے تھے لیکن خود شہید ہوگئے۔ خدا جانے آپ سے ان کا ایسا کیا تعلق تھا کہ ان کا کوئی سگا بھائی ہوتا تو شاید اس کے لیے بھی اتنا نہ کرتے۔ ان کی دشمنی بھی بہت تھی لیکن ہمارے یہاں تو سب کی ہی دشمنی ہوتی ہے۔ خان کی شہادت کا تو ہم نے سوچا تک نہ تھا لیکن ایک دن وہ کہنے لگے پنجاب سے میرا بھائی آیا ہوا ہے یہاں اس کا کوئی بھی اپنا نہیں لیکن غیرت مند ہے اس لیے تنہا ہی لڑنے آپہنچا ہے۔ اسے صرف میرا شیلٹر میسر ہے۔ اس لیے میں رہوں یا نہ رہوں تم نے اسے میری جگہ سمجھنا ہے۔ اس کے مجھ پر بہت احسان ہیں۔"

سالار خان بولتا چلا جا رہا تھا اور میں خاموشی سے سنتا جا

رہا تھا۔ اس نے ایک ایسی کہانی کے ورق الٹنے شروع کر دیے تھے جو میرے علم میں نہ تھی۔ گل ریز خان مجھ سے اتنا پیار کرتا تھا مجھے اس کا اندازہ تھا لیکن وہ اس دوستی میں کس حد تک چلا جائے گا اس کا علم مجھے ہرگز نہ تھا۔

سالار خان دم لینے کو رکا اور پھر کہنے لگا۔

"خان چاہتا تھا کہ آپ ہر صورت اپنا انتقام لو۔ اس مقصد کے لیے وہ کھل کر آپ کے پیچھے کھڑا تھا لیکن اس نے ایسی وصیت بھی لکھ دی تھی کہ اگر اسے کچھ ہو جائے تو آپ کو وہ تمام اختیارات، مراعات اور پشت پناہی مل جائے جو اس کے دم سے تھی۔ اس صورت میں آپ اس علاقہ میں رہتے ہوئے اپنے دشمن سے بدلہ لے سکتے تھے۔ سچ کہوں تو ہمارے خان نے آپ کی خاطر اپنے اکلوتے بیٹے کا مستقبل داؤ پر لگا دیا۔ اب آپ کے پاس وہ سب کچھ ہے جو خان کا تھا لیکن ان کا بیٹا اس وقت تک اپنی وراثت سے محروم رہے گا جب تک آپ خود نہیں دیں گے۔ خان نے آپ کو نگران نہیں بنایا بلکہ براہ راست مالک بنا دیا تھا۔"

سالار خان کی باتیں میری برداشت سے باہر تھیں۔ میرا دوست عظیم تھا وہ عظمت کی بلندیوں پر تھا دوستی کی ایسی مثالیں صرف ناولوں اور کہانیوں میں ملتی ہیں لیکن میرے ساتھ حقیقت میں یہ سب ہو رہا تھا میں نے سالار خان کی جانب دیکھا اور کہا۔

"سالار خان میرا تم سے وعدہ ہے کہ یہ حق جس کا ہے اسی کو ملے گا۔ یہ سب گل ریز خان کے بیٹے کا ہے مجھے صرف اپنا اور گل ریز خان کا انتقام لینا ہے اس کے بعد میں واپس چلا جاؤں گا۔ یہ بات طے ہے کہ مجھے یا تو کسی مقابلے میں مرنا ہے یا پھر غازی بن کر لوٹ جانا ہے۔ مسافر عشق کا ہو یا انتقام کا قیام اس کی قسمت میں نہیں ہوتا۔ اسے حرکت میں رہنا ہی ہوتا ہے۔ یہی حرکت اسے زندہ رکھتی ہے اس لیے جب تک میرا انتقام پورا نہیں ہو جاتا تب تک مجھے بھی اپنے دشمنوں کا پیچھا کرتے رہنا ہے۔"

سالار خان خاموشی سے سر ہلاتا رہا اور پھر اجازت لے کر چلا گیا۔ ایک ماہ یونہی گزر گیا۔ مجھ پر بے انتہا ذمہ داریاں آ پڑی تھیں۔ بہت سے معاملات اب مجھے ہی دیکھنے تھے۔ گل ریز خان کے کاروبار کا حساب کتاب، زمینوں کی آمدن اور ان تمام افراد کی فہرست جنہیں وہ ہر ماہ بہت خاموشی سے امداد دیا کرتا تھا۔ ان تمام معاملات کو ترتیب میں لانا اور سمجھنا اتنا آسان نہ تھا سچ پوچھیں تو اس کے جانے کے بعد احساس ہو رہا تھا کہ وہ کس قدر عظیم تھا۔ شاید درویش ایسے ہی ہوتے ہیں بظاہر چھپے ہوئے دنیا داروں کی طرح لیکن اسی دنیاداری کے پردے میں خدمت خلق میں مصروف۔ وہ نہ کوئی حساب رکھتے ہیں کہ کس کو کتنا دیا اور نہ ہی کوئی فہرست بناتے ہیں۔ میں گل ریز کی طرح درویش نہ تھا وہ اپنی مرضی کا مالک تھا۔ جسے جتنا چاہتا اتنا ہی نواز دیتا۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا مجھ پر ذمہ داریوں کا بوجھ تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال زندہ تھا کہ یہ سب میرا نہیں ہے۔ یہ ایک امانت تھی جو مجھے حق دار تک پہنچانی تھی۔ اس لیے مجھے امداد کی بھی فہرست بنانی تھی۔ کتنی رقم کس مد میں خرچ ہوئی ہے اس کا مکمل ریکارڈ رکھنا تھا۔ جس طرح گل ریز خان مجھے اپنا وارث بنا گیا تھا اس کی رو سے میں کسی کو حساب دینے کا پابند نہ تھا۔ اگر کبھی یہ سب گل ریز کے بیٹے کو سونپ دیتا تو بھی وہ مجھ سے یہ پوچھنے کا مجاز نہ تھا کہ میں نے گل ریز خان کی دولت کہاں خرچ کی۔ یہ جرگہ کا قانون تھا اور اس قانون کو اس جگہ پاکستان کا کوئی ادارہ چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔ نہ یہاں پولیس پر مارتی تھی اور نہ عدالت تک کوئی جاتا تھا یہاں سب کچھ جرگہ ہی تھا اور یہی جرگہ میرے حق میں فیصلہ سنا چکا تھا۔ اب میں اس ساری دولت کا مالک تھا لیکن اس جرگہ سے بڑی ایک اور عدالت تھی وہاں میرا ضمیر جج کی صورت بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ میں اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکتا تھا اس لیے میں چاہتا تھا کہ جب یہ سارا انتظام اور معاملات گل ریز خان کے بیٹے کے سپرد کروں تو میرے پاس ایک ایک پائی کا حساب ہو۔ میں یہ سارے کھاتے اس کے حوالے کر کے جانا چاہتا تھا۔ اس لیے اب اس سارے بکھرے ہوئے نظام کو کاغذوں پر

سمیٹنے میں مصروف تھا۔ میرا ایمان ہے کہ ہم جب کھاتوں میں گڑبڑ کرتے ہیں تو اسے پکڑنا مشکل ہوتا ہے۔ دنیاوی کھاتوں میں شاید جلد پکڑ نہ ہو لیکن آسمان پر کھلنے والے کھاتوں میں پل بھر کے اندر پکڑ ہو جاتی ہے۔ یہ پکڑ ہارٹ اٹیک، بلڈ پریشر، جوڑوں کے درد اور کینسر کی صورت ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ کچھ بیماریاں امیروں اور طاقتوروں سے ہی منسوب ہیں۔ دنیا کو اپنا غلام سمجھنے والوں کو جب خدا ان کی اوقات بتاتا ہے تو پھر تمام تر آسائشات ہونے کے باوجود ان پر پابندی لگا دیتا ہے۔ پھر ڈاکٹر بتاتا ہے کہ آپ کے پاس دولت تو ہے لیکن آپ کھانا صرف پھیکا اور پرہیزی کھا سکتے ہیں۔ میں نے کبھی بڑی بستی اور جنگل میں رہنے والوں کو پرہیزی کھانا کھاتے نہیں دیکھا۔ انہیں مٹی سے الرجی نہیں ہوتی، وہ ناقص خوراک کھا کر بھی بیمار نہیں ہوتے اس کے برعکس اسی فیصد سے زائد امیروں کو پرہیزی کھانے اور ادویات کھاتے ہی دیکھا ہے۔ تھوڑی سی مٹی اڑے تو انہیں الرجی ہو جاتی ہے۔ یہ واضح پیغام ہے لیکن صرف سمجھنے والوں کے لیے۔ یہ پیغام کمالے جٹ کو جہاں والا سے ہی مل گیا تھا مجھے معلوم تھا کہ اگر گل ریز خان کے بیٹے کی وراثت میں غبن کیا یا کھاتوں میں ہیر پھیر کی تو اوپر آسمانوں پر پڑے میرے کھاتے میں بھی ہیر پھیر کر دی جائے گی۔ اس لیے میں نے سبھی کام چھوڑ کر سب سے پہلے گل ریز خان کے تمام معاملات ترتیب میں لانے شروع کر دیے اور انہیں ریکارڈ میں رکھنا شروع کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے جانے کے بعد گل ریز خان کا بیٹا ان کھاتوں اور ریکارڈ کی مدد سے تمام معاملات خود سنبھالنے کے قابل ہو جائے۔ اسی طرح اس کی بیوہ بھی انہیں دیکھ کر تمام معاملات کی نگرانی کر سکے اور ماں بیٹا وہ سارے معاملات چلا سکیں۔ اگر یہ معاملات ان کی نگرانی میں نہ رہے اور کسی دوسرے پر ہی چھوڑ دیے گئے تو ممکن ہے سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے۔ مجھے رہ رہ کر یہ احساس ستاتا تھا کہ گل ریز خان میری وجہ سے مارا گیا۔ اس کے بیٹے کو دیکھ کر یہ احساس اور بھی شدید ہو جاتا تھا۔ اس نے وصیت کی صورت مجھ پر جو احسان کیا اور میرے یہاں رہ کر انتقام لینے کی جو سبیل نکالی اس نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ میں یہ احسان اس کے بیٹے کو قابل بنا کر ہی اتار سکتا تھا۔ گل ریز خان میرے لیے جو کچھ کر سکتا تھا وہ کر گیا تھا۔ اب میرا وقت تھا۔ مجھے بتانا تھا کہ پنجاب کا کمالا جٹ اپنے محسن کے لیے کیا کر سکتا ہے۔

میں شب و روز گل ریز خان مرحوم کے معاملات میں الجھا ہوا تھا اس دوران عجیب سی دھن سوار تھی۔ نہ دن کا ہوش تھا اور نہ ہی رات کی پروا تھی۔ بس یہی فکر تھی کہ کہیں مجھ سے کسی معاملے میں کوتاہی نہ ہو جائے۔ شاید احساس ذمہ داری ہماری طاقت کو بڑھا دیتا ہے۔ یہی کام اگر میرے ذاتی ہوتے تو شاید میں اس قدر جنون کے عالم میں نہ کرتا لیکن اب یہ ذمہ داری اور فرض بن چکے تھے۔ ایک دن اچانک سالار خان نے کوئی بات کرتے کرتے بتایا کہ قبیلے کے عمائدین جرگہ بلانا چاہتے ہیں۔ یہ کوئی انہونی بات نہ تھی۔ یہاں پولیس اور تھانوں کا رواج تھا بلکہ پولیس سے مدد طلب کرنے والے کو نفرت سے دیکھا جاتا تھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے معاملات کے لیے بھی جرگہ ہی بلایا جاتا تھا۔ اس لیے میں نے سرسری سے انداز میں پوچھ لیا کہ کس بارے میں جرگہ بیٹھے گا۔ سالار خان کہنے لگا۔

"ملک صاحب! آپ نے گل ریز خان مرحوم کی سب چیزیں اپنے ہاتھ میں لے لی ہیں لیکن ایک جانب سے بے پروا ہو گئے ہیں جرگہ اسی سلسلے میں بیٹھے گا۔"

سالار خان کی بات سن کر میں چونک گیا۔ جہاں تک میرا خیال تھا میں اتنے عرصہ میں نا صرف تمام معاملات سنبھال چکا تھا بلکہ انہیں ایک سسٹم میں بھی لے آیا تھا۔ اب ایسا کیا تھا جس جانب سے کوتاہی ہوئی تھی میں تو پاؤندہ قبیلے کے سردار خوشحال خان کو بھی پیغام بھجوا چکا تھا کہ گل ریز خان کے سوگ میں ثابت اور دارا کے درمیان ہونے والا مقابلہ ملتوی کروا دیا جائے۔ اب گل ریز خان کی جگہ میں یہ مقابلہ کھیلوں گا۔ میں جانتا تھا کہ بظاہر یہ ثابت کے ساتھ زیادتی تھی لیکن مجھے یہ بھی اطمینان تھا کہ مقابلہ

ملتوی ہونے کا فائدہ بھی ثابت کو ہی ہوتا۔ اسے میں نے جو داؤ سکھائے تھے وہ اب تک ان میں مزید پختہ ہو چکا تھا۔ میرا وجدان کہتا تھا کہ گل ریز خان کے قتل کے پیچھے دارا ہی ملوث تھا۔ اب میں اسے سبق سکھانا چاہتا تھا مقابلہ ملتوی کروانا میرے اسی پلان کا حصہ تھا۔ اس میں خوش آئند بات یہ تھی کہ سردار شامل خان نے جوابی پیغام میں مقابلہ ملتوی کرانے کی ہامی بھر لی تھی۔

میں نے تو ہر چیز کو اس کی باریکیوں سمیت سمجھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب لگ بھگ چار ماہ گزر جانے کے بعد تو مجھے ہر معاملہ اپنی فنگر ٹپس پر یاد تھا لیکن سالار خان کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ میں نے بے چینی سے اس کی جانب دیکھا اور پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے جرگہ کی نظر میں ایسا کونسا معاملہ ہے جو میرے علم میں ہی نہیں ہے اور میں بے پروائی بھی برت رہا ہوں۔ سالار خان نے نظریں جھکاتے ہوئے جو کچھ کہا اسے سن کر مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی نے میرے سر پر بم پھوڑ دیا ہو۔ جرگہ کو جس کی فکر تھی وہ کوئی بے جان چیز نہیں تھی بلکہ ایک سانس لیتا، جیتا جاگتا وجود تھا۔ جرگہ گل ریز خان کی بیوہ کا فیصلہ کرنے آ رہا تھا۔ وہ اسی حویلی میں تھی جہاں اسے گل ریز خان نے رکھا تھا۔ اس کے پاس ملازمائیں موجود تھیں۔ جو اس کی خدمت پر مامور تھیں۔ میں نے اپنا مستقل قیام حجرے میں کر لیا تھا اس کے باوجود جانے جرگہ کیا فیصلہ کرنے آ رہا تھا بہرحال ایک ہفتے بعد جرگہ نے اسی حجرے میں بیٹھنا تھا۔

جس دن جرگہ تھا اس دن صبح سے ہی مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ خدا جانے جرگہ کیا فیصلہ سنائے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر جرگہ کی جانب سے گل ریز خان کی بیوہ یا بچے کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی یا زبردستی ہوئی تو میں اس کے خلاف بھرپور مزاحمت کروں گا۔ چاہے سبھی میرے خلاف ہو جائیں لیکن میں کسی بھی صورت ان کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دوں گا۔ مقررہ وقت پر قبیلے کے بزرگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ وہ حجرے میں آتے چلے گئے اور میرے پاس ہی بیٹھتے چلے گئے۔ ان کی تواضع قہوہ سے کی گئی جبکہ قبائلی روایات کے تحت حجرے میں داخلے سے قبل سالار خان ان سے ہتھیار لے کر ایک جگہ رکھتا رہا۔ اب وہ کمالے جٹ کے مہمان تھے۔ اس حجرے کی روایت تھی کہ یہاں آنے والے سبھی افراد گل ریز خان کی مہمان نوازی میں ہی سمجھے جاتے تھے۔ اب یہی روایت میں نبھا رہا تھا۔

جرگہ اپنے روایتی انداز میں شروع ہوا تو حجرے میں خاموشی چھا گئی۔ صرف ایک شخص بول رہا تھا جبکہ باقی سب خاموش اور پوری توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔ اس نے صورت حال کا پس منظر بیان کیا اور پھر سب کو بتایا کہ دراصل جرگہ کیوں بلایا گیا ہے اس کے بعد سب نے اپنی اپنی رائے دینی شروع کر دی۔ اس کے بعد جرگہ کے سربراہ نے حتمی فیصلہ کرتے ہوئے کہا کہ "گل ریز خان کی شہادت کا ہم سب کو دکھ ہے لیکن قبیلے کی روایات پر عمل کرتے ہوئے کچھ معاملات حل کرنا بہت ضروری تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ گل ریز خان نے چند سال قبل ہی شادی کی تھی۔ اب اس کے اس دنیا سے چلے جانے کے باوجود اس کی بیوہ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اب گل ریز خان کو گزرے چار ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ اس کی بیوہ آزاد ہے۔ دوسری جانب گل ریز خان کا موجودہ وارث اور جانشین کمال جٹ ہے۔ جس کا بظاہر قبیلے کے سردار گل ریز خان کے خاندان سے کوئی خونی تعلق نہیں ہے۔"

اپنا ذکر سن کر میں نے بے چینی سے پہلو بدلا لیکن کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ میں مکمل صورت حال واضح ہونے تک کسی قسم کی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ مجھے یہ حیرت ضرور ہوئی کہ آخر اس موقع پر میرا ذکر کیوں کیا جا رہا ہے۔

جرگہ کے سربراہ نے اپنی گفتگو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "کمال جٹ نے ان چند ماہ میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ گل ریز خان کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ اس نے بالکل درست بندے کا انتخاب کیا تھا۔ بلاشبہ کمال جٹ اس کا اہل ہے۔ اس لیے جرگہ کمال جٹ کو یہ ذمہ داریاں جاری رکھنے کا کہتا ہے۔ دوسری جانب یہ بھی سچ ہے کہ کمال جٹ اور گل ریز

خان کی بیوہ کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ کمال جٹ کو بھی اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے حویلی میں جانا پڑے گا کیونکہ دراصل اب کمال جٹ ہی اس کا مالک ہے۔ ایسی صورت میں قبیلے کے عزت دار لوگ یہ پسند نہیں کر سکتے کہ دو غیر محرم ایک ساتھ رہیں۔ جہاں دو تنہا ہوں وہاں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ حویلی میں ملازمائیں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود بات شریعت اور غیرت کی ہے۔ اگر یہ روایت چل نکلی تو پھر جٹ کی بہن بیٹیاں خراب ہوں گی۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کمال جٹ اور گل ریز خان کی بیوہ کا آپس میں نکاح پڑھوا دیا جائے ایک تو اس لڑکی کو تحفظ مل جائے گا دوسرا گل ریز خان کے تمام معاملات کا وارث ہونے اور اس کی بیوہ سے کوئی محرم رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے کمال جٹ کا ہی حق ہے کہ وہ اس کی بیوہ کو بھی اپنی زوجیت میں لے سکے۔“

جرگہ کا سربراہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا لیکن میں اپنے حواس کھوتا چلا جا رہا تھا یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی زہر میں بجھے تیر میرے دل میں اتار رہا ہے اور ابلتا ہوا سیسہ میرے کانوں میں ڈالا جا رہا ہے۔ میرا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ بھابی سے تو کسی نے پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ بس ان کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا گیا تھا۔ دیکھا جائے تو مجھ سے بھی نہیں پوچھا گیا تھا مجھے بھی بس حکم نامہ ہی سنایا گیا تھا عجیب جرگہ تھا جو دو زندگیوں کے فیصلے ان سے پوچھے بنا کرتا چلا جا رہا تھا اور ان سے پوچھنا تک گوارا نہیں کر رہا تھا۔ پوچھنا تو دور کی بات ہے مجھ سے تو رائے تک طلب نہ کی گئی تھی۔ شاید جرگوں میں ایسا ہی ہوتا تھا۔ قانون کی طرح یہاں بھی پہلے سے طے شدہ روایات کے بنڈل اور خود ساختہ قوانین کی بوسیدہ کی پوٹلی رکھی ہوئی تھی۔ جرگہ کو انہی کی روشنی میں فیصلہ سنانا تھا۔ شاید دنیا کی سبھی عدالتوں میں دل، جذبات اور احساسات کے بجائے پرانی روایات اور پرانے اصولوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ منصف، احساسات سے عاری ہوتے ہیں یا انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ سزا صرف ایک شخص کو نہیں ملتی۔ ہم قتل کے جرم میں پھانسی دیتے ہیں یہ مقتول کے ساتھ انصاف ہے کہ اسے قتل کرنے والے کو بھی قتل ہی کیا جائے لیکن یہ پھانسی صرف قاتل کو ہی نہیں دی جاتی بلکہ قاتل کے چھوٹے چھوٹے بچوں اور جوان بیوی کو بھی اس کے ساتھ ہی لٹکا دیا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قاتل ایک ہی بار پھندے سے لٹک کر دنیا کی فکر سے آزاد ہو جاتا ہے جبکہ اس کے بچے اور جوان بیوی ہر روز پھندے پر جھولتے ہیں اور اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ اگر منصف کے پاس احساس ہوتا اور وسعت نظری ہوتی تو یقیناً وہ قاتل کو پھانسی کی سزا سناتے وقت اس کی بیوی بچوں کے لیے ایسے انتظامات بھی کرنے کا حکم دیتے جن کی وجہ سے انہیں زمانے کی ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں۔ ہم قاتل سے زیادہ اس کے بیوی بچوں کو سزا سناتے ہیں اور پھر اپنی انصاف پروری کا ڈھول پیٹتے رہتے ہیں آج یہ جرگہ بھی پرانی روایات کے تحت ایک ایسا فیصلہ سنا رہا تھا کہ اگر اس پر عمل ہو جاتا تو میں خود سے نظریں نہ ملا پاتا۔ گل ریز خان کی روح مجھ سے سوال کرتی کہ تم کیا کر رہے ہو؟ کیا تم اسی مقصد کے لیے یہاں آئے تھے؟

ابھی جرگہ اپنے خود ساختہ فیصلے پر مہر ثبت کرنے ہی لگا تھا کہ میں کھڑا ہو گیا۔ سب نے میری جانب دیکھا۔ یہ بغاوت کی علامت تھا اور روایات کے خلاف بھی تھا جرگہ اپنا فیصلہ سنا چکا تھا۔ اب کسی کو بولنے یا انکار کرنے کی اجازت نہ تھی۔ میں نے کھڑے ہوتے ہی کہا۔

”میں آپ کی انصاف پروری کی وجہ سے کھڑا ہوا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کوئی ایسا فیصلہ نہیں کریں گے جو انصاف کے اصولوں کے خلاف ہو۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ یہ فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے بولنے کا موقع دیا جائے۔“

عمائدین میں سے چند ایک نے میری تائید کرتے ہوئے مجھے اپنی بات جاری رکھنے کو کہا۔ یہ اس بات کی علامت تھا کہ میری ابتدائی تمہید نے اپنا اثر دکھایا تھا۔ میں نے انصاف کی بات کر کے جرگہ کی اہم رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اب وہ یہ طعنہ نہیں سننا چاہتے تھے کہ انہوں نے

انصاف سے کام نہیں لیا۔ انہیں یہ یقین تھا کہ میری تمام تر دلیلوں کے بعد بھی فیصلہ وہی ہوگا جو وہ سنا چکے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے پاس اس کے حق میں ہزار نا قابل تردید دلائل تھے۔ گل ریز خان کی بیوہ اور میرا غیر محرم ہوکر ایک جگہ رہنا ہی سب سے بڑی دلیل تھی۔ یہ تو طے تھا کہ قبائلی روایات سے انحراف ممکن نہ تھا۔ اس لیے انہیں مکمل اطمینان تھا کہ یہ فیصلہ نہیں بدل سکتا۔

میں نے اپنی بات آگے بڑھائی اور کہا۔

”آپ جو فیصلہ سنا رہے ہیں اس کی حکمت اور دور رس اثرات سے انکار نہیں۔ آپ فساد اور شر کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کی تردید نہیں کررہا لیکن ہمارے پنجاب کی بھی کچھ روایات ہیں۔ ہم جسے جو رشتہ دیں پھر مرتے دم تک اسے نبھاتے ہیں۔ گل ریز خان کی بیوہ اور میرے درمیان بھی ایک رشتہ قائم ہوچکا ہے۔“ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ حجرے میں کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ عمائدین ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ کچھ چہروں پر میرے لیے نفرت اور غصے کی کیفیت ظاہر ہورہی تھی جبکہ کچھ کے تیور ایسے تھے کہ جیسے ابھی مجھے سنگسار کرنے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ میں دم لینے کو رکا اور پھر کہنا شروع کردیا۔

”یہ ایک پاکیزہ رشتہ ہے۔ گل ریز خان میرے لیے بھائیوں سے بڑھ کر تھا اور اس کی بیوہ میری بہن ہے۔ ہم منہ بولے رشتوں پر جان تک قربان کردیا کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ رشتے سگے رشتوں سے بڑھ کر حرمت والے ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو بہن بھائی کا ایک چھت تلے رہنا منظور نہیں تو میں بیس اس حجرے میں ہی رہوں گا اور حویلی میں داخل نہیں ہوگا لیکن میری درخواست ہے کہ ایک بھائی اور بہن کے درمیان نکاح نہ کروائیں۔ میں فیصلہ آپ پر ہی چھوڑتا ہوں لیکن اپنی درخواست آپ تک پہنچانا ضروری سمجھتا تھا اگر یہ گستاخی ہے تو آپ جو سزا دیں گے وہ بھی مجھے قبول ہوگی۔“

گل ریز خان کی جگہ آکر میں خاصا طاقت ور اور با اثر ہوچکا تھا اس کے باوجود جرگے کے سامنے میری عاجزی اور سادہ لہجہ عمائدین کے دلوں میں میرے لیے نرم گوشہ پیدا کرچکا تھا۔ دوسری جانب گل ریز خان کی بیوہ کو بہن کہنے سے بھی اچھا تاثر پیدا ہوا۔ یہاں کئی ایسے لوگ بھی تھے جو صوبائی عصبیت کی وجہ سے یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے ایک طاقت ور سردار کی بیوہ مال غنیمت کی طرح پنجاب کے جٹ کے قبضے میں چلی جائے۔ ان لوگوں نے میری حمایت میں بڑھ چڑھ کر بولنا شروع کردیا۔ ان کا زیادہ زور اس بات پر تھا کہ کمال جٹ نے گل ریز خان کی بیوہ کو بہن کہہ کر اپنی پاک نیت کا ثبوت فراہم کردیا ہے۔ اگر دل میں کھوٹ ہوتو کسی اجنبی لڑکی کو بھی بہن نہیں کہا جاتا۔ اب جرگہ کو کمال جٹ کا مان اور اس کے رشتے کی حرمت برقرار رکھنی چاہیے۔ انہیں بہن بھائی ہی سمجھنا چاہیے۔

جرگہ کے اکابرین نے کچھ دیر آپس میں صلاح مشورے کیے اور پھر اپنا فیصلہ سناتے ہوئے میرے حق میں فیصلہ سنادیا۔ انہوں نے مجھے حویلی میں اسی طرح رہنے کی اجازت دے دی جس طرح کوئی بھی بھائی اپنی بہن کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ میرا اس طرح غیرت مندی کا ثبوت دینا اور اپنے دوست کی بیوہ کو زوجیت میں نہ لینا میری گل ریز خان سے دوستی اور خلوص کا سچا جذبہ تھا جسے عمائدین نے بھی محسوس کیا۔ اب وہ میری تعریفیں کررہے تھے۔ اپنے حوالے سے مجھے دو جرگوں میں بیٹھنا پڑا اور دونوں بار میں معتبر ٹھہرا۔ مجھے پسندیدگی کی سند مل چکی تھی۔

سب لوگ حجرے سے چلے گئے تو سالار خان میرے پاس آ بیٹھا۔ اس نے میرے ہاتھ تھامے اور انہیں چومتے ہوئے آنکھوں سے لگالیا۔

”سالار خان یہ کیا کررہے ہو؟“ میں نے ہاتھ واپس کھینچتے ہوئے سوال کیا۔

سالار خان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ عجیب وحشت کی سی حالت میں تھا لیکن اس کے لہجے سے عقیدت کا رنگ جھلک رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور کہا۔

”آپ عظیم ہو۔ آپ نے ہمارے خان کی حرمت کو

احترام بخشا ہے۔ اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا لیکن آپ نے خان کی حرمت کو عزت بخشی ہے۔ آج آپ نے سالار خان کو اپنا ذاتی غلام بنا لیا ہے۔ خان عمر میں کم لیکن پھر بھی میرے لیے باپ جیسا تھا۔ سالار خان آپ کو اس احسان کا بدلہ اپنی جان قربان کرکے چکائے گا۔"

میں سالار خان کی دلی کیفیت سمجھ رہا تھا اس لیے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

"سالار خان میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔ گل ریز خان میرا دوست اور بھائی ہی نہیں محسن بھی تھا۔ میں اس کی عزت کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے مجھے یہ بات بھی جرگہ کو بتانی ہی تھی کہ جو فیصلہ وہ سنانے جارہے ہیں اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔

سالار خان کی حالت کے پیش نظر میں نے اسے آرام کرنے بھیج دیا تاکہ وہ اس جذباتی کیفیت سے باہر نکل سکے۔ جب تک ان ہی کیفیات میں گھرا رہتا تب تک اس سے اپنا کام نہیں ہوتا تھا۔

میں جرگہ کے فیصلے کے بعد حجرے سے حویلی میں منتقل ہو گیا۔ میرا زیادہ وقت اب بھی حجرے میں ہی گزرتا تھا۔ جو کہ حویلی کے سامنے ہی ایک گھر کی صورت میں بنا ہوا تھا لیکن اب یہ آسانی تھی کہ حویلی میں آنے جانے کی وجہ سے مجھے براہ راست وہاں کے مسائل اور ضروریات کا علم رہتا تھا۔

گل ریز خان کی بیوہ کا نام مہک خان تھا۔ بھابی پختون روایات کے برعکس گل ریز خان کی رازداں تھیں اور وہ انہیں تمام معاملات سے آگاہ رکھتا تھا۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اپنی خانگی زندگی میں ایک اچھا شوہر تھا اور اس کے نزدیک میاں بیوی کے درمیان اعتماد اور بھروسے کا رشتہ ہی اصل رشتہ ہوتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو کبھی عملی زندگی میں نہیں لائے گا لیکن اس کے باوجود وہ اسے تمام معاملات اور دن بھر کی مصروفیات سے آگاہ رکھتا تھا۔

شریک حیات کے لیے یہی بہت ہوتا ہے کہ اس کا شوہر اسے اپنی زندگی کے تمام معاملات میں شریک رکھتا ہے اور ان سے مشورے بھی کرتا ہے وہ کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتی کہ حقیقت کیا ہے۔ شریک حیات کو یوں اپنے معاملات میں شریک کرنا اپنے پن کا احساس دلاتا ہے۔ گل ریز خان اس لحاظ سے آئیڈیل شوہر تھا۔ اس کے خانگی معاملات احسن انداز میں چل رہے تھے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مہک بھابی کو بیوہ ہونے کے بعد بہت سے معاملات کا علم تھا اور ان کے پس منظر سے بھی آگاہ تھیں۔ میرے جلسے میں ان کی گواہی اس کی بڑی دلیل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اب میں نے بھی ان سے اکثر معاملات میں مشورہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ مجھے پوری تفصیل سے آگاہ کرنے کے بعد مشورہ دیتیں جو اکثر کامیاب ہی رہتا۔

مہک بھابی کو جرگہ کی کارروائی اور میرے اعلان سمیت سب رپورٹس مل چکی تھیں۔ میری جانب سے انہیں بہن کہنے کے واقعے نے ان کے دل میں میری عزت مزید بڑھا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں حویلی منتقل ہوا تو انہوں نے مجھ سے پردہ کرنے کے بجائے یہ کہہ دیا کہ ایک بہن اپنے بھائی سے پردہ نہیں کر سکتی۔ اس سے جہاں میرا مان بڑھ گیا وہیں میں اس مشکل سے بھی نکل گیا کہ میں حویلی میں کیسے داخل ہو سکتا ہوں جہاں کے مکین مجھ سے پردہ کرتے ہیں۔ مہک بھابی نے یہ فیصلہ کر کے مجھے ان مشکلات سے بھی باہر نکال دیا تھا۔ ہم حقیقی معنوں میں بہن بھائی ہی تھے۔

حویلی میں جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں ایک اور اہم معاملے کو نظر انداز کیے ہوئے تھا۔ سچ کہوں تو گل ریز خان والے حادثے نے مجھے کسی اور جانب سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ میں جیفا تھا کہ میں اپنے ساتھ آئمہ اور اس کے بھائی عثمان کو بھی رہا کروا کر لایا تھا۔ اس لڑکی کو بھی میں نے بہن کہا تھا۔ جب گل ریز خان اور مجھ پر حملہ ہوا تو یہ دونوں بھی اسی گاڑی میں تھے۔ گل ریز خان کو گولی لگنے اور مسلسل فائرنگ نے ان کے اعصاب شل کر دیے تھے۔ جب ہماری گاڑی اسپتال پہنچی تو تب تک یہ دونوں

بہن بھائی بے ہوش ہی تھے۔ مجھے لگا تھا کہ شاید انہیں بھی کوئی گولی لگ گئی ہے۔ اس کے بعد گل ریز خان کی موت اور دیگر معاملات کی وجہ سے میری توجہ اس جانب نہیں ہوئی۔ شاید میرے لاشعور میں تھا کہ یا تو یہ دونوں بھی جاں بحق ہوگئے ہیں یا پھر اپنے شہر پہنچ چکے ہوں گے۔

اب حویلی آیا تو وہیں آئمہ اور عثمان کو دیکھ کر مجھے ندامت کے شدید ترین احساس نے گھیر لیا۔ میں نے آئمہ سے معذرت کی تو اس نے پھیکی سی ہنسی سے اسے ٹال دیا اور کہا کہ اسے صورت حال کا علم ہے۔ جہاں اتنے دن وہ اذیت میں رہی وہیں چند روز مزید گزر جائیں تو کیا حرج ہے۔ مہک بھابی نے اس کی حالت کے پیش نظر اس کی اس کے گھر والوں سے بات کروادی تھی اور خود بھی بات کر کے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ اب آئمہ اور اس کا بھائی محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ آئمہ کو لانے کے دوران ان کے شوہر دشمنوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے ہیں۔ اس لیے بعض معاملات کی وجہ سے آئمہ کو یہاں کچھ عرصہ لگ جائے گا لیکن اب وہ محفوظ ہے۔ انہوں نے عقل مندی یہ کی کہ اس کے گھر والوں کو مکمل تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا اور نہ ہی یہ بتایا کہ وہ کس جگہ کس کی تحویل میں ہے۔

یہ پاک افغان سرحدی علاقہ ہی تھا۔ یہاں افغان سم چلتی تھی اور ان کے سگنل بھی آسکتے تھے۔ مہک بھابی نے افغان سم کارڈ سے فون کیا تھا جس کی وجہ سے وہاں افغانستان کا نمبر گیا تھا۔ دوسری طرف ان علاقوں کی صورت حال ایسی تھی کہ نہ تو آئمہ کے گھر والے کسی قسم کی مہم جوئی کر سکتے تھے اور نہ ہی پولیس کا ان علاقوں میں اثر و رسوخ تھا۔ اس لیے اس کے گھر والے کسی مناسب وقت کا انتظار ہی کر سکتے تھے۔ البتہ اب انہیں یہ اطمینان تھا کہ ان کے بچے محفوظ ہاتھوں میں ہیں اور جلد ہی ان سے آملیں گے۔

میں نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ ابھی مجھے کئی محاذ چھیڑنے تھے۔ میرے دشمن اسی علاقے میں کہیں تھے اور میں ان کے پیچھے ہی یہاں آیا تھا۔ ان سے کسی بھی وقت مڈ بھیڑ ہوسکتی تھی۔ اسی طرح مجھے گل ریز خان کے دشمنوں سے بھی سلسلہ آگے بڑھانا تھا۔ اس کے کئی دشمن تھے جو اب گل ریز خان کی جائیداد کی طرح میرے حصے میں آچکے تھے۔ اسی طرح گل ریز خان کے قاتلوں کو بھی کیفر کردار تک پہنچانا تھا۔ ممکن تھا یہ سب محاذ ایک ساتھ کھل جاتے۔ ایسی صورت میں نہ تو میری زندگی کی ضمانت تھی اور نہ ہی اس بات کی کوئی ضمانت تھی کہ اس دوران آئمہ اور اس کا بھائی اپنے گھر پہنچ پائیں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر بیک وقت کئی محاذ کھل جاتے تو کمالے جٹ کو اپنی عادت کے مطابق آگے رہ کر لڑنا تھا۔ لہٰذا یہ ممکن نہ ہوتا کہ میں آئمہ کو اپنی نگرانی میں اس کے گھر روانہ کر پاتا۔

حویلی منتقل ہونے کے اگلے ہی ہفتے میں نے آئمہ کو بلایا اور اسے نوید سنائی کہ اسی ہفتے وہ اپنے گھر والوں سے مل سکے گی۔ اس لیے ضروری تیاریاں کرلے۔ اسے بحفاظت لاہور اس کے گھر پہنچا دیا جائے گا۔ اسے چند لمحوں تک جیسے میری بات کا یقین ہی نہ آیا۔ کیا ہم واقعی اپنے گھر پہنچ جائیں گے؟ اس کے لہجے سے بے یقینی جھلک رہی تھی۔

مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"آپ پر ہی تو اعتبار ہے اب تک آپ مجھے بچاتے آئے ہیں ورنہ کوئی اور ہوتا تو جانے کب کا جان چھڑا چکا ہوتا۔ آپ تو گولیاں چلاتے ہوئے بھی ہمارا خیال رکھ رہے تھے۔"

لڑائی کے منظر یاد کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔ وہ شہر میں پلی بڑھی معصوم سی بچی تھی۔ جس نے اس سے پہلے ایسے مناظر صرف فلموں میں دیکھے ہوں گے۔ اب وہ خود ایک زندہ فلم کا حصہ بن چکی تھی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے گھر واپسی کی تیاریاں کرنے کا کہا۔

میرا ارادہ تھا کہ آئمہ کو اسی طرح رخصت کروں جیسا کہ کوئی بھائی اپنی بہن کو کرتا ہے۔ اس کے لیے مجھے دو چار دن درکار تھے۔ میں نے ان دونوں میں سالار خان کو اس بارے میں ہدایات دیں اور آئمہ کے لیے یہاں کے روایتی

لباس اور زیورات خریدے۔ اسی طرح عثمان کے لیے بھی خریداری کی۔ تین روز بعد آئمہ کی روانگی تھی۔ جس دن اسے یہاں سے واپس جانا تھا اس دن کی عجیب سی کیفیت تھی۔ متعدد خدشات اور انجانا خوف اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ اسی طرح وہ مہک بھابی سے کافی مانوس ہو چکی تھی۔ وقت روانگی وہ ان سے لپٹ کر رونے لگی۔ انہوں نے اسے تسلی دی اور گھر لوٹنے پر سیار کباد دی۔ میں ایک طرف کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا آئمہ نے جس لینڈ کروزر میں سفر کرنا تھا اس میں وہ تمام تحفے رکھ دیے گئے تھے جو کمالے جنت نے اپنی بہن اور بھائی کے لیے خریدے تھے اسی طرح اس کی گاڑی کے ساتھ جدید اسلحے سے لیس محافظوں کی دو جیپیں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک جیپ نے اس کی گاڑی کے آگے رہنا تھا جبکہ دوسری نے پیچھے آنا تھا۔ موجودہ حالات کے پیش نظر یہ سب بہت ضروری تھا۔ آئمہ مہک بھابی سے فارغ ہوئی تو سسکتی ہوئی میرے سینے سے آ لگی۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ایک بھائی کے لیے بہن کے جذبات سمجھنے کے لیے الفاظ کی ضرورت ہوتی بھی نہیں ہے۔ بھائی بنا کہے سمجھ جاتے ہیں کہ بہن کیا کہہ رہی ہے۔ خدا نے بہن کے آنسوؤں میں وہ تاثیر رکھی ہے جو بھائی کو اس کے دل کے بھید بتا دیتی ہے۔ میں نے شفقت سے آئمہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

”پگلی رونے کا وقت تو گزر گیا ہے۔ اب تو گھر جانے کا وقت ہے۔ پہنچ کر مجھے فون کر دینا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کہنے لگی۔

”بھائی آپ جب واپس آؤ گے تو مجھ سے ملنے آؤ گے نا۔ مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے؟“

میں نے اس کے سر پر ایک چپت لگاتے ہوئے ماحول کی اداسی ختم کرنے کی کوشش کی اور کہا۔

”ہاں میں ضرور آؤں گا اور تمہاری شادی میں تو مجھے ہر حال میں آنا ہی ہے۔ اس کے بعد ہم حویلی سے نکلنے لگے تو میں نے اسے کچھ نصیحتیں کرنا شروع کر دیں۔ اسے بتایا کہ اس کے اور عثمان کے لیے جو تحائف لیے تھے وہ گاڑی میں ہی ہیں اور اس کی حفاظت کے لیے مسلح محافظوں کی دو جیپیں بھی ساتھ سفر کریں گی۔ میں نے کچھ رقم بھی اس کے پرس میں رکھ دی تاکہ دوران سفر ضرورت پڑے تو اس کو تنگی نہ ہو۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے میری جانب دیکھا اور پھر خاموش ہو گئی۔ میں نے اسے آخر میں ایک بار پھر یاد دلایا کہ اب اسے عثمان کا خاص خیال رکھنا ہے۔ اس بے چارے کے ساتھ جو ظلم ہوا تھا وہ اس کی شخصیت مسخ کر سکتا تھا۔ اس لیے چند ماہ اس کے اسکول اور سوسائٹی پر خاص نظر رکھنے کی ضرورت تھی تاکہ وہ غلط ہاتھوں میں نہ جا سکے۔ آئمہ میری باتیں غور سے سن رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی۔ درمیان میں اس نے ایک دو سوال کر کے رہنمائی بھی لی۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد دونوں بہن بھائی اس وقت تک ہاتھ ہلاتے رہے جب تک میں انہیں نظر آتا رہا۔ ان کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد میں واپس حویلی چلا آیا۔ ایک اہم فرض ادا کرنے کے بعد اطمینان کی جو لہر جسم میں سرایت کرتی ہے اب مجھے اس کیفیت کا سامنا تھا۔ میں اپنی ذات میں ایک بار پھر سرخرو ہو چکا تھا آئمہ کو اس کے گھر روانہ کرنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے سر سے کوئی بھاری بوجھ ہٹ گیا ہو۔ اس بچی کے ساتھ بہت ظلم ہوا تھا شاید درندوں کو احساس نہیں ہوتا کہ بیٹیوں کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ اس دکھ کا احساس صرف بیٹی والے کو ہی ہو سکتا ہے لیکن درندوں میں احساس ہوتا تو انہیں درندہ کون کہتا؟

آئمہ کو بھیجنے کے بعد میں نے بعض معاملات میں مہک بھابی سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں حویلی میں گیا تو ان کے سامنے جا بیٹھا۔ وہ میرا انداز دیکھتے ہی سمجھ گئیں کہ میں کوئی بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے خاموشی سے میری جانب دیکھنے لگیں۔ میں نے کچھ دیر غور کیا کہ کیا مجھے اس موقع پر یہ موضوع چھیڑنا چاہیے یا نہیں پھر اس فیصلے پر پہنچا کہ یہ باتیں کبھی نہ کبھی تو ہونی ہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور یہ ذکر چھیڑے اور پھر زبانوں کو لگام نہ دی جا سکے۔ انہیں خود ان معاملات پر کسی حتمی نتیجے یا

فیصلے تک پہنچ جانا چاہیے۔ اس لیے میں نے جی کڑا کر کے مہک بھابی سے کہا۔

"بھابی! میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں یہ بہت ضروری ہے کہ بعض اہم معاملات پر ہماری کوئی متفقہ رائے قائم ہو جائے اور ہم کسی فیصلے تک پہنچ جائیں۔"

مہک بھابی نے مجھے الجھن آمیز نظروں سے دیکھا اور کہنے لگیں۔

"گل ریز خان تم پر بہت اعتماد کرتے تھے تم نے جو بات کرنی ہے یقیناً اس میں کوئی بہتری کی نیت ہی ہوگی۔ اس لیے بے فکر ہو کر اپنی بات کرو۔" حوصلہ افزائی ملتے ہی میں نے کہا۔

"بھابی آپ میرے لیے بہن جیسی ہی ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہم لوگوں کی زبانیں نہیں کھینچ سکتے۔ ہم اس حویلی میں اکٹھے رہتے ہیں۔ میں یہ یقین دلاتا ہوں کہ جب تک میں موجود ہوں تب تک کوئی اس حویلی کی جانب میلی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ میں آپ کی حرمت کا محافظ ہوں لیکن بہر حال ہم فطرت اور سچائی سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ آپ کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے اور پوری جوانی آپ کے سامنے پڑی ہے۔ اصولی طور پر آپ کو اپنی اگلی زندگی کا سوچنا چاہیے۔"

مہک بھابی نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو میں نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔

"پہلے میری بات مکمل ہونے دیں آپ کا ردعمل بھی فطری ہے لیکن بہر حال آپ کو کسی نہ کسی سے شادی کرنی ہی ہوگی۔ اس بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے اور آپ کے ذہن میں کیا ہے؟"

"یہ زندگی یوں بسر نہیں کی جا سکتی۔ میں آج مارا جاؤں یا کل واپس چلا جاؤں کچھ پتا نہیں ہے۔ آپ کا میکہ مضبوط سہی لیکن اب آپ کی تنہائی آپ کے لیے مسائل کا باعث بنے گی۔ میں اپنی طرف سے یقین دلاتا ہوں کہ گل ریز خان کی تمام جائیداد آپ کی اور میرے بھتیجے شہریز خان کی ہے۔ میں یہ سب آپ کو سونپ کر جاؤں گا۔ میرے کمرے میں تمام کھاتے اور رجسٹر موجود ہیں جن میں ایک ایک پائی کا حساب ہے۔ میں نے آئمہ کو جو تحائف دیے ہیں وہ میری ذاتی رقم سے خریدے گئے ہیں۔ پھر بھی جاتے وقت حساب کتاب میں آپ کو کوئی کمی محسوس ہو تو میں وہ پوری کر دوں گا۔ بھابی یہ سب آپ کا ہے لیکن اس کے باوجود یہ دولت آپ کے لیے مشکلات کھڑی کر دے آپ کو کسی کے ساتھ شادی کرنی ہی پڑے گی۔ شہریز خان کے اچھے مستقبل کے لیے بھی اور اپنی جانب اٹھتی نظروں اور سازشوں کے خاتمے کے لیے بھی اگر آپ کے ذہن میں کوئی ہو تو میں خود اس سے بات کرنے پر تیار ہوں۔ میں ایک بھائی کی حیثیت سے یہ فرض نبھانا چاہتا ہوں۔"

مہک بھابی نے میری بات خاموشی سے سنی لیکن آخری جملہ سن کر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ کچھ دیر یونہی سسکتی رہیں۔ میں بے بسی کے عالم میں ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس ردعمل کی توقع تو تھی لیکن میں انہیں دکھ نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ انہوں نے جلد ہی اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا اور کہنے لگیں۔

"ہو سکتا ہے تمہاری باتیں درست ہوں مجھے تمہارے خلوص اور نیت پر شک نہیں اور تم میرے لیے بھائیوں سے بڑھ کر ہو لیکن میں صرف خان جی کی ہی ہوں۔ وہ اس دنیا میں نہیں لیکن شہریز خان ہمارے مضبوط رشتے کی علامت ہے۔ میں کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی اور نہ ہی تم مجھے اب دوبارہ ایسی بات کہو گے۔ خدا گواہ ہے مجھے دولت اور جائیداد سے سروکار نہیں ہے۔ تم یہ سب لے جانا چاہو تو بے شک لے جاتا ہمارے لیے بس اتنا ہی کافی ہے جس سے میرا بیٹا کسی کا محتاج نہ رہے اور جوان ہو کر کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر سکے میں اسے لے کر کہیں دور چلی جاؤں گی۔ جہاں نہ تو یہاں کی دشمنیاں اس کے پیچھے آسکیں اور نہ وہاں روایات کے جال میں جکڑا جائے اور آتشیں ہتھیاروں کو ہی زندگی سمجھ لے۔ میں اسے محفوظ رکھنا چاہتی ہوں۔"

میں خاموشی سے سن رہا تھا۔ مہک بھابی بولتی چلی جا رہی تھیں آج وہ اپنے دل کی کیفیات عیاں کر رہی تھیں۔

گل ریز خان کی محبت اور اس کی موت نے انہیں اس سارے نظام سے متنفر کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ یہیں پیدا ہوئی تھیں اور اب تک اسی نظام کا حصہ رہی تھیں۔ اب شوہر کے قتل کے بعد وہ اپنے بیٹے کو اس قبائلی روایات کے جال سے بچا کر کہیں دور لے جانا چاہتی تھیں۔ یہاں رہتا تو ان کا بیٹا ایک طاقت ور سردار اور بااثر شخص بنتا لیکن وہ اسے سردار نہیں بنانا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی اجنبی شہر میں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرے اور سکون کی زندگی گزارے۔ شاید طاقت، اختیار اور شہرت بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہوتی۔ وہ اس عذاب سے گزر چکی تھیں۔ اپنی تمام تر اچھائیوں اور نیک نامی کے باوجود ان کا سہاگ اسی طاقت کے نظام کی نذر ہو گیا تھا اور وہ عین عالم شباب میں بیوہ ہو چکی تھیں۔ اب انہیں اس نظام میں اپنے بیٹے کا بھی ایسا ہی انجام نظر آ رہا تھا۔ مہک بھابی کی گفتگو جاری تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ گل ریز خان کی جگہ کسی کو نہیں دے سکتیں اور نہ اس کے بعد کسی اور کو یہ حق دے سکتی ہیں کہ وہ ان کے نام سے گل ریز کا نام ہٹا کر اپنا نام لگا سکے۔ ان کے اٹل لہجے کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین سا ہو گیا کہ وہ زندگی بھر ہر طرح کی مشکلات تو برداشت کرتی رہیں گی لیکن اب دوبارہ شادی نہیں کریں گی۔ اب انہیں اس حوالے سے کوئی مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ زیادہ تنگ کرنے کا ردعمل انتہائی بھیانک بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے مہک بھابی کو یقین دلایا کہ اب انہیں کوئی شادی پر مجبور نہیں کرے گا۔ میں ان کے ساتھ ہوں میں سمجھ سکتا تھا کہ گل ریز خان سے بچھڑنے کا غم کتنا بڑا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب ان کی شادی اسی وقت ہو گی جب وہ خود اس پر آمادہ ہوں۔ میں کسی کو زبردستی ان کی زندگی کا فیصلہ نہیں کرنے دوں گا۔ اسی طرح اگر گل ریز خان کا بیٹا یہاں محفوظ نہ ہوا تو میں ان دونوں کو پنجاب لے جاؤں گا۔

میں اپنے محسن اور دوست کی بیوی اور بچے کو ساری عمر اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں میرے لیے بہن ہی تھیں۔ اب اپنی بہن کے لیے جو مناسب سمجھتا وہی فیصلہ کرنے کا حق رکھتا تھا۔ یہ بات میں نے مہک بھابی کو بھی صاف کہہ دی تھی اور انہوں نے ایک بہن کی طرح ہی مجھے یہ حق سونپ دیا تھا۔ البتہ یہ واضح کر دیا تھا کہ ان کی شادی کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا۔ میں نے ان کی یہ بات تسلیم کر لی۔

گل ریز خان کے تمام معاملات اور لین دین اب ایک نظام کے تحت آ چکا تھا۔ یہ سب کھاتوں اور رجسٹروں میں لکھا جاتا تھا۔ ایک منیجر کم منشی کی یہی ذمہ داری تھی کہ وہ تمام حساب کتاب نوٹ کرتا جائے اور اسے متعلقہ کھاتے میں لکھتا جائے۔ شام کو وہ اپنا ریکارڈ مجھے دکھاتا تھا اور میں تسلی کرنے کے بعد انہیں اپنے پاس موجود کھاتوں میں بھی درج کر لیتا تھا۔ اس طرح ہر طرح کی آمدن اور خرچ کا ریکارڈ دو جگہ پر لکھا جاتا تھا کسی قسم کے غبن یا غلطی کی صورت میں دونوں رجسٹروں کو ملا کر اصل صورت حال تک پہنچا جا سکتا تھا۔

یہ حساب کتاب تاریخ کے مطابق لکھے جاتے تھے۔ اس لیے کسی بھی دن کی آمدن اور اخراجات کو الگ سے بھی تلاش کیا جا سکتا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین سا ہوتا چلا گیا کہ اب گل ریز خان کی جائیداد اور کاروبار میں غبن ہونا اتنا آسان نہیں تھا اور مہک بھابی یا شمریز خان بھی چند ہی گھنٹوں میں ان کھاتوں کو سمجھنے کے اہل ہو سکتے تھے اور اس کی مدد سے چند ہی روز میں سارے معاملات سمجھ سکتے تھے۔

شروع شروع میں یہ سارا نظام بناتے ہوئے مجھے پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ گل ریز خان کا سارا نظام ہی بکھرا پڑا تھا جسے سمیٹنا آسان کام نہ تھا۔ مجھے اس دوران کھانے پینے کا بھی ہوش نہ تھا۔ مجھ پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔ سچ کہوں تو اسی جنون نے مجھ سے یہ کام کروا لیا تھا۔ جنون ایک ایسی طاقت ہے جسے چیلنج کرنے والے کو ہمیشہ شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شاید یہی انسان کی مخفی قوتوں کا نام ہے۔ عالم جنون میں سرزد ہونے والی غلطی

بھی معجزہ بن جاتی ہے۔ اس سے جانے کتنوں کا بھلا ہو جاتا ہے اور عالم جنون میں منہ سے نکلے الفاظ بھی عرش پر جا کر سر پٹخنا شروع کر دیتے ہیں۔

میں جنون کی اس منزل پر نہیں تھا لیکن جنون کی ابتدائی منزل بھی کہاں کسی سے کم ہوتی ہے اس جنون نے ہی تو کمالے جٹ سے ایسے کھاتے تیار کروا لیے تھے جس کے لیے اسی فیلڈ میں اعلیٰ ڈگری ہولڈر ہونا شرط سمجھی جاتی ہے۔

میں اس کام میں ماہر نہیں تھا لیکن حفاظت اور امانت کا احساس مجھے چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ اب یہ کھاتے بن گئے تو مجھے اطمینان ہوا مجھ پر ڈالی گئی ایک بڑی ذمہ داری پوری ہو رہی تھی۔

میں نے آہستہ آہستہ مہک بھابی کو ان کھاتوں کا بنیادی ڈھانچہ سمجھانا شروع کر دیا۔ روزانہ، ہفتہ وار، ماہانہ، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ بنیادوں پر آمدن اور اخراجات معلوم کرنے کا طریقہ کار بھی سمجھا دیا۔ آہستہ آہستہ انہیں یہ حساب کتاب سمجھ آنے لگا اور وہ اسے اسی ڈھانچے پر مزید اندراج کے قابل ہو گئیں۔ اب یہ کہا جا سکتا تھا کہ گل ریز خان کی بیوہ کو نہ صرف تمام معاملات سے آگہی ہو چکی تھی بلکہ وہ انہیں اپنے ہاتھ میں لے کر احسن انداز میں چلانے کی اہل بھی ہو چکی تھیں۔

اب میں کسی بھی وقت مارا جاتا تو بھی میرے محسن کی بیوہ اور بیٹے سے کوئی نہ تو جھوٹ بول کر ان کا حق چھین سکتا تھا اور نہ وہ اپنے معاملات چلانے کے لیے کسی منشی یا ملازم کی محتاج تھیں۔ یہ میری بہت بڑی کامیابی تھی۔ اب دوبارہ وہی کمالا جٹ انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا جسے دشمن کا خون بہا کر سکون ملتا تھا۔ جس کی زندگی کا مقصد صرف اپنے دشمنوں سے انتقام لینا تھا اور جسے اپنی زندگی کی اتنی پروا بھی جتنا کہ کسی شخص کو پاؤں تلے آنے والی چیونٹی کی ہوتی ہے۔

میں قبائلی علاقہ میں آیا تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ یہاں جان ہتھیلی پر ہی رکھنی ہے۔ ویسے ہتھیار اٹھانے سے لے کر اب تک میرا ذاتی تجربہ یہی ہے کہ لڑائی میں زندہ وہی رہتا ہے جو جان ہتھیلی پر رکھ لیتا ہے۔ جو لوگ جان بچانے کی فکر میں رہتے ہیں وہی سب سے پہلے مارے جاتے ہیں۔ یہ جنگ کی تلخ حقیقت ہے یہاں جان بچانے والوں کی جان پہلے جاتی ہے جو مرنے آتے ہیں وہ فتح کا تاج سر پر سجائے لوٹ جاتے ہیں۔ جنگ بہادروں کی قدر کرتی ہے اور بزدلوں سے نفرت کرتی ہے۔

گل ریز خان کے مرنے کے بعد میں بزدل ہو گیا۔ جرگہ نے مجھے ایک ذمہ داری سونپ دی تھی جو میرے قدموں کی زنجیر بن گئی تھی میں اپنے محسن کے اہل و عیال کا محافظ بن گیا تھا۔ محافظ جتنے بھی جری ہوں آگے بڑھ کر نہیں لڑتے۔ انہیں ایک دائرے تک محدود رہنا ہوتا ہے۔ وہ لڑاکے نہیں بلکہ صرف محافظ ہوتے ہیں۔ ان کا کام نہ جنگ جیتنا ہوتا ہے اور نہ آگے بڑھ کر دشمن کا سر قلم کرنے کی اجازت ملتی ہے۔ انہیں صرف حفاظت کرنی ہوتی ہے۔ اسی لیے حفاظت کرنے والے کئی زنجیروں میں جکڑے ہوتے ہیں۔

میں اس جنگ میں لڑاکے کے طور پر اترا تھا لیکن جرگہ اور گل ریز خان کی وصیت نے مجھے لڑاکے سے محافظ میں تبدیل کر دیا تھا۔ اب کمالا جٹ دوبارہ محافظ سے لڑاکا بن رہا تھا۔ اب گل ریز خان کی بیوہ نہ صرف کاروباری معاملات دیکھ سکتی تھی بلکہ اپنی حفاظت بھی کر سکتی تھی۔ وہ درجنوں محافظ رکھ سکتی تھی اور اسے معلوم ہو سکتا تھا کہ ان محافظوں کی تنخواہ کس مد میں آنے والی رقم سے ادا کی جا سکتی تھی۔ اب میں آزاد ہو چکا تھا۔ اب مارا بھی جاتا تو غم نہ تھا۔

اب مجھے اپنا انتقام لینا تھا۔ اب گل ریز خان کی روح میری جانب دیکھ رہی تھی۔ یہ فیصلے کی گھڑی تھی۔ مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ میں یہ دشمنی ختم کر دوں یا پھر بھیانک انتقام لے کر دنیا کو ایک نئی مثال دوں۔ میں نے جلد ہی فیصلہ کر لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ پھر میں نے زیادہ دیر نہیں لگائی اور سالار خان کو بلا لیا۔ اس نے آتے ہی میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ میرے بلانے پر خود سے سوال نہیں کرتا تھا

بلکہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھ کر خاموشی سے کھڑا ہو جاتا تھا۔ اس کی یہ ادا مجھے ہی نہیں گل ریز خان کو بھی بہت پسند تھی۔ میں نے سالار خان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سالار خان کیا تمہیں یاد ہے کہ گل ریز خان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

سالار خان نے حیرت سے میری جانب دیکھا اور کہا۔

"یہ بات کون بھول سکتا ہے۔"

"کیا تمہیں یہ بھی یاد ہے کہ اسپتال میں گل ریز خان کی لاش کے پاس کھڑے ہو کر میں نے تم سے کہا تھا کہ میں گل ریز خان کے قتل کا بدلہ لوں گا۔ میں نے اگلا سوال کیا تو سالار خان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تصدیق کر دی۔

اس کی تصدیق کے بعد میں نے کہا۔

"سالار خان تب تم نے گل ریز خان کا انتقام لینے کی ہامی بھری تھی۔ آج میں تمہیں اس وعدے سے آزاد کرتا ہوں۔ تم چاہو تو ایک طرف ہو جاؤ۔ میں تمہیں اس انتقام کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔"

سالار خان میری بات سن کر جیسے تڑپ اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے لپکنے لگے وہ بولا تو اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

"ملک صاحب اپنے خان کا بدلہ لینے سے اگر یہ سالار خان ایک قدم بھی پیچھے ہٹا تو اپنے باپ کی اولاد نہیں ہوگا۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

اس کا لہجہ مجھ پر واضح کر گیا کہ وہ اس جنگ میں میرے ساتھ کھڑا ہوگا۔ میں نے سخت لہجے میں اسے کہا۔

"سالار تو پھر سن لو، میں گل ریز خان کا انتقام لینے لگا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کے قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا اور کون اس سازش میں ملوث تھا میری آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں اور سالار خان مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔



لمحے کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں پکڑا جا چکا ہوں۔ ہیرا منڈی سے فرار نا کام ہو چکا تھا یہاں میرا کوئی ایسا واقف نہ تھا جو یوں روکنے کی ہمت کرتا۔ میں لاہور میں رہا تھا لیکن اس بازار سے میرا کبھی بھی کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میرے دوستوں میں سے کوئی اس بازار کی جانب نہیں آتا تھا۔ ہماری اور ہی مصروفیات ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے اس قسم کی خرافات سے بچے رہتے تھے۔ گاؤں کا کوئی شخص ہوتا یا کوئی واقف ہوتا تو وہ بھی کبھی یوں میرے کندھے پر ہاتھ نہ رکھتا۔

یہ بازار شہر کا عام بازار نہیں تھا جہاں کہیں کوئی واقف کار مل جائے تو ہم آواز دے کر روک لیتے ہیں، بھاگ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں یہ بازار حسن تھا۔ خرید و فروخت یہاں بھی ہوتی تھی یہاں آنے والوں کی جیبیں اس بازار میں بھی کاٹی جاتی تھیں۔ اچھا مال دکھا کر خراب مال دینا اس بازار کی بھی روایت تھی دھوکہ اور فریب بھی اس بازار میں ہوتا تھا۔ قسمیں کھا کر اپنے مال کی تعریف اس بازار میں بھی کی جاتی تھی۔ شہر کے دیگر بازاروں کی روایات اور عادات یہاں بھی نظر آتی تھیں۔

یہاں فرق صرف اتنا ہے کہ بازاروں میں بے جان اشیا کی خرید و فروخت ہوتی ہے وہاں بکنے والی جنس احساسات سے عاری ہوتی ہے۔ اس بازار میں بھی جنس ہی بکتی ہے۔ یہاں زندہ جسموں میں مردہ روحیں بھی بیچی جاتی ہیں۔ بس اتنا فرق ہے کہ عام بازار میں اشیا بکتی ہیں جبکہ اس بازار میں زندہ انسان بیچے جاتے ہیں۔

میرے خیال میں بیچنے کا لفظ درست نہیں یہ واحد بازار ہے جہاں کچھ نہیں بکتا۔ یہاں صرف چند گھنٹوں کے لیے کرایہ پر اشیا دی جاتی ہیں۔ یہ الگ بات کہ اس بازار میں اشیا سے مراد زندہ اور جیتے جاگتے لوگ ہیں۔ انسانوں اور جسموں کا سودا کرنے والے اس بازار کے باسی انسانوں کو غلام بنانے کا فن جانتے ہیں۔ میں نے چند ہی دنوں میں یہاں بڑے بڑے بیوپاریوں کو

"سلام" کرتے دیکھا تھا۔

یہ وہ بازار ہے جہاں شناسا ایک دوسرے کو دیکھ کر منہ چھپا لیا کرتے ہیں۔ یہاں نظر آنا بھی بدنامی کے زمرے میں آتا ہے۔ اس لیے بھی یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی شناسا مجھے یہاں دیکھ کر فرط محبت میں میری جانب چلا آتا۔ مجھے روکنے والے کا تعلق یقیناً شبنم بائی کے کوٹھے سے تھا شاید اس نے مجھ پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس بوسیدہ سے کوٹھے میں جا بجا خفیہ کیمروں کا انتظام ہو شبنم بائی یقیناً بڑے بڑے سرمایہ داروں سے تعلقات رکھتی تھی اس لیے یہ تو ممکن تھا کہ وہ اپنے کوٹھے میں جا بجا خفیہ کیمروں کا انتظام کروا کر رکھتی۔ اس سے ایک طرف تو اس کے کوٹھے میں ہونے والی سرگرمیوں کا علم ہوتا رہے اور دوسری جانب وہ اپنے ہاں آنے والوں کو بھی بعد میں اپنے مقاصد کے لیے لائن پر لا سکتی تھی۔

عین ممکن تھا جب میں چھپ چھپ کر اس کوٹھے سے فرار ہو رہا تھا تو وہاں موجود تمام طوائفیں میری اس حرکت پر مسکرا رہی ہوں کہ کمالا جٹ کیمروں کی موجودگی میں اتنا پاگل ہو گیا ہے کہ چھپ کر یہاں سے فرار ہو رہا ہے اور یہ بھی اسے دیکھ رہے ہیں۔ بہرحال یہ کام تو کرنا ہی تھا۔ مجھے یہاں سے ہر صورت فرار ہونا تھا لیکن اب میں پر کھولنے سے پہلے ہی دوبارہ پنجرے میں پہنچ گیا تھا۔

میری اڑان شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ کسی نے بازو تھام کر زمین پر کھینچ لیا تھا۔ میں نے مڑ کر اس شخص کو دیکھنا چاہا جس نے میری منزل کھوٹی کر دی۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اس کا تعلق شبنم بائی کے کوٹھے سے ضرور تھا لیکن بہرحال وہ میرے لیے برا نہیں سوچ سکتا تھا میں نے اسے گلے لگا لیا۔

وہ شاہد ملتانی تھا وہی شاہد ملتانی جو مجھے شبنم بائی کے کوٹھے پر چھوڑ گیا تھا اور میرے علاج معالجے کے لیے رقم خرچ کر رہا تھا۔ اس نے میری زندگی بچائی تھی۔ اس لحاظ سے وہ میرا محسن تھا۔ میں بے ساختہ اس سے لپٹ گیا۔ اس نے بھی مجھے گلے سے لگا لیا۔ ہم الگ ہوئے تو میرے ہاتھ میں دبے لفافے کو دیکھ کر اس کی جانب اشارہ کیا اور کہنے لگا۔

"یہ کیا چوروں کی طرح بھاگ رہے تھے؟ کسی نے کچھ کہا ہے یا کوئی اور وجہ ہے؟"

میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے لفافے کو دیکھا تو ایک لمحے کے لیے شرمندگی کا احساس ہوا۔ مجھے کم از کم بائی کو یہ تو بتا دینا چاہیے تھا کہ میں یہ جگہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جانے والوں کو بھلا کب کوئی روک پایا ہے۔ بائی کمالے جٹ کو روک نہیں سکتی تھی البتہ یہ ضرور تھا کہ وہاں جھگڑا ہو جاتا لیکن یوں چوری چھپے نکل آنا بھی تو اخلاقی طور درست نہیں تھا۔ مجھے خود ہی ہنسی آ گئی۔ میں ہیرا منڈی میں کھڑا اخلاقیات پر سوچ رہا تھا۔

شاہد ملتانی غور سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"یوں لگتا ہے جیسے خود سے باتیں کرنا سیکھ گئے ہو۔ آؤ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" اس نے میرا ہاتھ تھاما اور ہم وہیں پاس ہی لسی والی دکان پر جا بیٹھے شاہد ملتانی نے دو گلاس لسی کا آرڈر دے دیا۔ اس دکان کی پیڑے والی لسی بہت مشہور ہے۔ عام شہری پیڑے والی لسی کا پورا گلاس شاید ہی پی سکیں۔ دیہاتی لوگ البتہ شوق سے پیتے ہیں یہ ایک گلاس کسی عام شخص کے لیے صبح کے ناشتے اور دوپہر کے کھانے کے برابر ہے۔

راشد ملتانی نے مجھے جہاں والا میں ہونے والے پولیس مقابلے کی روداد سنانی شروع کر دی۔ اس کے مطابق پولیس بس دکھاوے کے لیے تھی۔ اصل مقابلہ اشتہاریوں سے ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ مقابلے پر آنے والے بھی بدمعاش ہی تھے اور انہیں پچھلے ملوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس لڑائی کے اگلے دن ایک بڑے اشتہاری کی موت کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ شاہد ملتانی نے یہ خبر پڑھی جس کے مطابق وہ اشتہاری پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ یہ مقابلہ اسی تھانہ کی حدود میں ہوا تھا۔ جہاں اس دن ہم پولیس اور پچھلے ملوں کے غنڈوں کے ساتھ لڑ

رہے تھے۔

شاہد ملتانی کو پورا یقین تھا کہ وہ اشتہاری ہمارے ساتھ لڑتے ہوئے ہی مارا گیا تھا۔ پولیس نے اس کی لاش اپنی ترقی کے لیے استعمال کر لی تھی۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ اس نے اس کے بعد اس علاقے میں اپنے ذرائع سے معلومات لی تھیں۔ وہ اشتہاری نہ تو گرفتار ہوا تھا اور نہ ہی اس دن پولیس کی ہمارے سوا کسی سے جھڑپ ہوئی تھی۔

اس اشتہاری کا شاہد ملتانی سے بھی لین دین رہا تھا لیکن وہ شاہد ملتانی کے گروپ میں نہیں تھا اور نہ اس دن وہ ہمارے ساتھ تھا۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ وہ بیکھے مل ملوں کی طرف سے لڑنے آیا تھا۔ شاہد ملتانی کا کہنا تھا کہ وہ جس پائے کا اشتہاری تھا اس حساب سے اس کی موت بیکھے ملوں کا بہت بڑا نقصان ہے۔ وہ صرف لڑنے کے لیے نہیں تھا بلکہ اس نے بہت سے معاملات سنبھالے ہوئے تھے اور اکثر جگہ پر اس کا صرف نام ہی چلتا تھا۔

اگر وہ بیکھے ملوں کے لیے کام کرتا تھا تو اس کا مطلب ہے بیکھے ملوں غیر قانونی دھندوں میں سے آدھے ٹھپ ہو چکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے سامنے کوئی سر اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے لیکن اس کے مرنے کے بعد بہت سے لوگ سر اٹھا ئیں گے اور بہت سے معاملات چوپٹ ہو جائیں گے۔

جرائم پیشہ افراد کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ ان کے غیر قانونی کاروبار اعتبار کی بنیاد پر ہی ہوتے ہیں۔ یہاں نہ تو اسٹامپ پیپر لکھے جاتے ہیں اور نہ ہی معاہدوں پر دستخط کیے جاتے ہیں۔ ان کے طے شدہ خاموش معاہدے ہوتے ہیں جن کی پابندی لازم ہوتی ہے۔ شاہد ملتانی کے بقول وہ اس اشتہاری کی وجہ سے اس پٹی میں پاؤں نہیں پھیلا رہا تھا جہاں جتنا وہ آ گیا تھا۔ اس علاقے کے دو نمبر دھندے اسی اشتہاری کی سرپرستی میں ہوتے تھے۔

اس وقت شاہد ملتانی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ بیکھے ملوں کے لیے کام کر رہا ہے۔ اب اس کے مرنے کے بعد ملتانی کا راستہ صاف تھا اور اس نے وہاں اپنے بندوں کو پھیلا دیا تھا جو وہاں پاؤں جما رہے تھے۔ بیکھے مل کے غنڈوں سے لڑائی کے دوران شاہد ملتانی کا بھی نقصان ہوا تھا۔ اس کے بھی اہم ساتھی مارے گئے تھے۔ تہ خانہ سے باہر نکلتے وقت ہمیں یہی پتا تھا کہ پولیس نے گھیراؤ کر لیا ہے لیکن باہر جدید ہتھیاروں سے ہونے والی لڑائی نے یہ واضح کر دیا تھا کہ پولیس کا بس نام یا ٹھپہ استعمال ہوا ہے۔ اصل لڑائی کسی اور سے ہی اور وہ بیکھے مل تھا۔

اس جھڑپ کے بعد شاہد ملتانی نے بیکھے مل کو اپنے ذاتی دشمنوں میں شامل کر لیا تھا۔ اپنے خاص اشتہاری کی موت سے بیکھے ملوں کو جو تو جھٹکا لگا اس سے شاہد ملتانی فائدہ اٹھا رہا تھا۔ وہ اس علاقے کے بدمعاشوں میں اپنی دھاک بٹھا رہا تھا۔ جرائم کی دنیا میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا اور چھوٹے موٹے بدمعاش اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے کہ اگر شاہد ملتانی ان سے دھندے کی بات کرے اور وہاں اس کی ٹکر کا کوئی موجود نہ ہو تو پھر شاہد کو نہ کرنا ممکن نہیں۔ اس سے دشمنی مول لے کر کون اپنی زندگی کے دن کم کرنا پسند کرتا۔

اب بیکھے مل کی بجائے اس علاقے کے دو نمبر دھندوں میں شاہد ملتانی کے لوگ قدم جماتے جا رہے تھے۔ ہیروئن، اسلحہ، چرس، شراب غرض کبھی کاموں میں بیکھے ملوں کی ساکھ خراب ہوتی جا رہی تھی اور شاہد ملتانی کے نام کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ میرے لیے یہ خوشی کی خبر تھی۔ بیکھے مل کو جتنا بھی نقصان ہوتا کم تھا۔ میں تصور میں اسے اپنے بال نوچتے دیکھ رہا تھا۔

اس کی بدمعاشی اور سر اٹھانے کی اصل وجہ یہی تھی کہ اس نے اشتہاری مجرم پال لیے تھے اور غیر قانونی دھندوں میں ملوث ہو چکا تھا۔ زمینداری، جاگیر اور دیگر کام صرف دکھاوا تھا۔ اب اس کا اصل کاروبار یہی تھا جس پر شاہد ملتانی تیزی سے اپنا قبضہ جماتا جا رہا تھا۔ اگر بیکھے مل کا یہ کاروبار مکمل طور پر تباہ ہو جاتا تو وہ ہمیں کاندھا جاتا۔

گاؤں میں اب وہ ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ اس کی اس غیر قانونی طاقت اور پولیس کی سرپرستی ہی اس کی اصل طاقت تھی۔ جس کی وجہ سے لوگ خوفزدہ رہتے تھے اور کوئی

اس کے سامنے سر نہیں اٹھاتا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ شاہد ملتانی اس پر عمل کرے گا لیکن میں ایک آخری کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا۔ میں نے شاہد ملتانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر میں کسی خواہش کا اظہار کروں تو کیا میری مدد کرو گے؟"

"ہاں کہو کیا بات ہے۔" اس نے عام سے انداز میں کہا۔

میں نے چند لمحے مزید اپنے خیال پر غور کیا لیکن اس کی حوصلہ افزا نظروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ملتانی میری خواہش ہے کہ جمال والا اور اس کے ارد گرد جہاں جہاں غیر قانونی دھندہ ہوں ہو اور بکھے طوں کو نقصان ہو وہاں یہ دھندا میرے نام سے کیا جائے۔ بکھے طوں کو ہر نقصان پر میرا نام سنائی دے۔ مجھے اس دھندے سے کچھ لینا دینا نہیں نہ میں اس میں کسی بھی طرح کا حصہ دار ہوں لیکن پھر بھی یہ ایک درخواست ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس دھندے میں نام ہی سب کچھ ہے تمہارا نام چلے گا تو اس علاقے میں تمہاری مزید دھاک بیٹھ جائے گی۔ اس لیے یہ ایک مشکل فیصلہ ہوگا لیکن یہ سب سوچنے کے باوجود میں نے فیصلہ کیا کہ میں تم سے یہ درخواست ضرور کروں گا۔ اسے ماننا یا نہ ماننا تمہارا اختیار ہے۔"

میرے خاموش ہوتے ہی بکھے طل مسکرایا اور کہنے لگا۔

"کمال ہے میں نے تمہیں اپنا بھائی کہا ہے تو میں اسے نبھانا بھی جانتا ہوں۔ اس دھندے میں میرا نام گیا تو کوئی اور اس خالی جگہ کو پر کرنے کے لیے چلا آئے گا۔ میرا نام ہی بہت سے اشتہاریوں کو یہاں ٹانگ اڑانے سے روکے ہوئے گا۔

اس نے میری جانب یوں دیکھا جیسے یہ تسلی چاہتا ہوں کہ میں اس کی بات سمجھ رہا ہوں یا نہیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو کہنے لگا۔

"اس حقیقت کے باوجود میں تمہاری خواہش رد نہیں کر سکتا۔ یہ انتقام کا جذبہ ہی تمہیں طاقتور بنائے گا۔ میں یہ انتظام کر دیتا ہوں کہ یہ بات سب کو معلوم ہو جائے کہ اس دھندے کے پیچھے شاہد ملتانی ہی ہے لیکن اس پٹی میں شاہد ملتانی کا کام کمال احمد سنبھال رہا ہے۔ تمہیں اپنا یار ظاہر کر دیتا ہوں اور آج سے یہ علاقہ تمہارا ہے تم یہاں میرے دھندے کو چلا رہے ہو۔"

"یہاں ہر کام کی ذمہ داری تم پر ڈالی جائے گی اور جب جب بکھے طل کو نقصان ہوگا تب تک تمہارا نام ہی سامنے آئے گا۔ البتہ تمہارے پیچھے میرا نام ہوگا جس کی وجہ سے باقی بدمعاش تمہیں نہیں چھیڑیں گے۔ میرے لوگ اپنا کام کرتے رہیں گے۔"

شاہد ملتانی دم لینے کو رکا تو میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا تم واقعی یہ سارا سیٹ اپ میرے نام سے چلاؤ گے؟ مجھے تو شاید کوئی جانتا بھی نہیں ہے۔ ایک دم سے ایک نیا نام اس قدر بڑے علاقے کو چلانے لگے تو کیا مشکلات نہیں آئیں گی۔"

شاہد ملتانی نے میری جانب یوں دیکھا جیسے استاد کسی نادان بچے کو دیکھتا ہے پھر کہنے لگا۔

"اس دھندے میں میرا نام ہی کافی ہے۔ میں دس سال کے بچے کو کسی سیٹ اپ کا ہیڈ بنا دوں تو یہ چھوٹے موٹے بدمعاش اسے بھی استاد مان لیں گے۔ ویسے بھی تمہارا صرف نام آئے گا۔ کام کی نگرانی میں خود کر رہا ہوں گا اور میرے لوگ ہی کام کریں گے۔ اس لیے تمہیں اس بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں اب سمجھ گیا اگر ایسے ہوگا تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

شاہد ملتانی کہنے لگا۔

"اصل مسئلہ تو یہیں سے شروع ہوگا۔ تمہارا نام چلے گا تو مقدمات بھی تمہارے نام پر درج ہوں گے۔ پولیس کے پورے محکمے میں تمہارے نام کی گونج سنائی دے گی۔ وہ سور پاگلوں کی طرح تمہیں ڈھونڈیں گے اور اگر تم ان کے ہاتھ لگ گئے تو تم سے کوئی یہ نہیں پوچھے گا کہ تم ان دھندوں

میں ملوث تھے یا نہیں تھے۔ وہ تمہیں سیدھا اندر کر دیں گے یا پھر کسی جعلی پولیس مقابلے میں مار دیں گے۔ اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے بیگھے ملوں کو تو تمہارے زخم لگتے رہیں گے لیکن جب تمہاری پکڑ آئے گی تو تم ہزار بار واویلا کرو کوئی تمہاری بے گناہی کا یقین نہیں کرے گا۔ عین ممکن ہے تمہارے سر کی قیمت رکھ دی جائے اور تم اشتہاری قرار پا جاؤ۔ یہاں کئی اشتہاری ایسے ہیں جنہوں نے اشتہاری ہونے سے پہلے چڑیا کا بچہ بھی نہیں مارا تھا۔"

شاہد ملتانی کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ سچ کہہ رہا تھا میں دنیا سے کٹ کر اشتہاری مجرموں کے ساتھ رہنے پر مجبور ہونے والا تھا۔ دماغ اس کی بات مان رہا تھا اور پیچھے ہٹنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ دوسری جانب دل کا کہنا تھا کہ دماغ کی نہ مانوں۔ اگر پولیس مجھے اشتہاری قرار دلوا دے گی سر پہ انعام رکھ دیا جائے گا میرے خلاف جھوٹے پرچے کاٹے جائیں گے تو سوال یہ ہے کہ اب کونسا ایسا نہیں ہے میرے خلاف جانے کتنے جھوٹے اور کتنے سنگین مقدمات درج ہو چکے تھے پورے ضلع کی پولیس پاگلوں کی طرح مجھے ڈھونڈ رہی تھی۔ میں اب بھی قانون کی نظر میں خطرناک مجرم ہی تھا۔

میں گرفتار ہوتا تو شاید بیگھے مل کے پالتو کتے سرکاری فرض بھول کر مجھے گولی مار دیتے اگر وہ نہ مارتے تو بھی مجھے گرفتار کرنے والے اس ڈر سے میرا جعلی پولیس مقابلہ کر دیتے کہ موجودہ نظام میں بدمعاشوں کے لیے رہائی حاصل کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اگر مجھ جیسا خطرناک مجرم رہا ہو جائے تو اسے گرفتار کرنے والے ایماندار پولیس اہلکار پر زندگی تنگ ہو جاتی ہے۔ اگر میں نے ناکردہ گناہوں کی پاداش میں یہ سزائیں پانی ہی ہیں تو پھر ایک جرم کیا اور ہزار جرم کیا؟

شاہد ملتانی خاموشی سے میری بدلتی ہوئی کیفیت کا جائزہ لے رہا تھا۔ بالآخر میں نے حتمی فیصلہ کیا اور مضبوط لہجے میں کہا۔

"ملتانی! اگر اس معاشرے کے "عزت دار" لوگ مجھے مجرم بنانے پر تلے ہوئے ہیں اور یہاں کے محافظ مجھے خود شکاری کتوں کے حوالے کرنے پر آمادہ ہیں تو پھر ایک جرم ہو یا ہزار جرم ہوں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا میں تیار ہوں۔ اب مجھے بیگھے مل کے تڑپنے کا منظر دیکھنا ہے۔ میں چاہتا ہوں اسے ہر زخم لگنے پر میرا نام سنائی دے۔ وہ مجھے پاگل کتوں کی طرح ڈھونڈے اور میری طرف سے اسے چرکے لگتے رہیں۔ ملتانی میں اس اندھے کنویں میں کودنے کو تیار ہوں۔"

شاہد ملتانی سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"چلو یہ مسئلہ تو حل ہو گیا آج سے اس ساری پٹی میں تم میرے دھندے کی نگرانی کرو گے۔ باقی فیصلہ تم خود کر لینا۔ تمہیں صرف اپنا نام چاہیے تو بھی ٹھیک ہے اگر تم اس دھندے میں آنا چاہتے ہو تو یہ بھی تمہارے لیے بہت اچھا اسٹارٹ ہے۔ تمہارا پولیس ریکارڈ چند ہی دنوں میں بہت اوپر چلا گیا ہے۔ اب تک جتنی بھی خبریں ہوئی ہیں ان میں میرا نام کہیں نہیں آیا۔ ہر جگہ تمہارا ہی نام لیا گیا ہے کچھ بیگھے ملوں نے بھی تمہیں پھنسانے کے لیے باتیں پھیلا دی ہیں۔ اس کا یہ پراپیگنڈا بھی تمہارے کام آئے گا۔ تم دھندا شروع کرتے وقت ہی بجے بنائے سیٹ اپ کے نگراں کے طور پر سامنے آؤ گے اور میں تمہاری پشت پر کھڑا ہوں گا تم براہ راست ادھر کے بھی معاملات سنبھال لو۔"

میں نے کہا۔

"میں نے ابھی اس بارے میں کچھ نہیں سوچا عین ممکن ہے یہ نہ ہو سکے اور میں براہ راست جرائم کی دنیا میں نہ آؤں لیکن اگر مجھے لگا کہ یہ سب ناگزیر ہے تو میں تمہاری بات مان لوں گا۔ میں اس دھندے میں آؤں یا نہ آؤں لیکن تمہیں یہ یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں کبھی دھوکا نہیں دوں گا۔"

شاہد ملتانی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا۔

"کمالے میں آج اگر زندہ ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں بہت بہادر ہوں۔ ہماری دنیا میں بڑے بڑے

تمیں مار خان لمحوں میں مار دیے جاتے ہیں۔ کوئی ان کا جنازہ پڑھنے بھی نہیں آتا۔ پولیس نہ مارے تو دشمن مار دیتے ہیں۔ دشمن نہ مارے تو محسن مار دیتے ہیں شاہد ملتانی کو مار کر اس کی جگہ لینے والا چاہے اتنا بہادر نہ ہو لیکن شاہد ملتانی کی جگہ آنے کے بعد سب اسے اتنا ہی احترام دیں گے جتنا کہ مجھے دیتے ہیں۔ اس کا بھی اتنا ہی خوف ہوگا جتنا میرا ہے۔ وہ بھی میری طرح سارے دھندے سنبھال لے گا۔ اس دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم کو یہاں بھی ایک ان دیکھی کرسی ہوتی ہے۔ شاہد ملتانی سے نہ تو کوئی ڈرتا ہے اور نہ ہی کوئی شاہد ملتانی کو سلام کرنے آتا ہے۔ یہ سب کرسی سے ڈرتے ہیں اور اسی کی پوجا کرتے ہیں۔ جو دنیا تم چھوڑ کر آئے ہو وہاں اس طاقت کو کرسی کہتے ہیں یہاں ہماری زبان میں اسے ڈنڈا کہتے ہیں۔ یہ ڈنڈا جس کے ہاتھ میں ہو اصل طاقت اسی کی ہوتی ہے۔"

شاہد ملتانی باقاعدہ لیکچر دینے لگا تھا لیکن اس کا ایک ایک لفظ دل پر اثر کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس سے سچا اس شہر میں کوئی نہ ہو۔ تلخ ہی سہی لیکن سچ بہر حال اثر انداز ہونے کی طاقت رکھتا ہے۔ ہم اس سے وقتی طور پر جان چھڑا لیں تو بھی سچ ہماری جان نہیں چھوڑتا۔ وہ کہیں نہ کہیں ذہن کے کسی گوشے سے چپکا رہتا ہے اور کسی نہ کسی لمحے سر اٹھا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ شاہد ملتانی ناپ تھری اشتہاریوں میں شمار ہوتا تھا لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ حقائق کیا ہیں۔ وہ طاقت کے نشے میں حقائق سے منہ موڑ رہا تھا بلکہ مجھے بھی باور کرا رہا تھا کہ اصل صورت حال کیا ہے۔

شاہد ملتانی کی گفتگو جاری تھی وہ کہنے لگا۔

"میں اپنی بہادری، دلیری یا بے خوفی کی وجہ سے زندہ نہیں ہوں۔ اس سطح تک پہنچنے کے بعد ان کی اہمیت اتنی نہیں رہتی۔ میرے پاس ڈاکوؤں کا پورا لشکر ہے، جدید ہتھیار ہیں، کئی سیاست دان میری سرپرستی کے محتاج ہیں۔ ان کے کئی کام میری وجہ سے ہوتے ہیں اور وہ میرے لیے کئی کام کرتے ہیں۔ پولیس کے اعلیٰ عہدیدار بھی میرے نام سے کانپتے ہیں۔ میرا پورا انتظام چل رہا ہے۔ اب میں چاہوں تو دور بیٹھ کر فون پر بھی اپنے معاملات دیکھ سکتا ہوں۔ میرے ڈیرے پر میری اجازت کے بنا چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ مجھے اگر مارنا ہے تو میرا کوئی اپنا یہ کام کر سکتا ہے۔ کوئی پولیس کے ساتھ مل کر رات نیند کی حالت میں گولی مار کر مجھے اوپر پہنچا سکتا ہے۔ میرے ساتھ چلنے والوں میں سے کوئی صرف ایک ایس ایم ایس کر کے میری گاڑی کا نمبر اور روٹ بتا سکتا ہے۔ میرے اہم ساتھیوں میں سے کوئی میری جگہ لینے کے لیے مجھے زہر دے سکتا ہے۔ مجھے مارنا ہو تو سو راستے ہیں مجھے گھیرنا ہو تو ہزار ہتھکنڈے ہیں لیکن میں جانتا ہوں ایسا نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہے ایسا کیوں نہیں ہوگا؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کر دیا۔

"میں نہیں جانتا۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

شاہد ملتانی تھوڑا آگے جھک آیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔

"میں انسان کو پرکھنے کا فن جانتا ہوں۔ مجھے چہرہ شناسی آتی ہے مجھے بندے کو جانچنے کا ہنر آتا ہے۔ کون کس نیت سے آیا ہے یہ مجھ پر واضح ہو جاتا ہے۔ میری چھٹی حس کافی تیز ہے۔ میں نے اس دشت کے سفر میں صرف بندوں کو پڑھنا سیکھا ہے کتاب تو زمانے نے میرے ہاتھ سے چھین لی تھی۔" اس کے لہجے میں یاسیت در آئی۔ وہ لمحے کے لیے سانس لینے کو رکا اور پھر کہنے لگا۔

"کمالے میں بندے پڑھتا ہوں اور پھر ان میں سے جو 'اقوال زریں' ہوں انہیں اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ میرا کوئی ساتھی غداری نہیں کر سکتا۔ یہ جان دے دیتے ہیں لیکن مجھے نقصان پہنچانے یا میرے خلاف ہونے والی کسی سازش کا حصہ بننے پر تیار نہیں ہوتے۔ جہاں تمہاری بات ہے اگر تم میں غداری یا مطلب پرستی کے جراثیم ہوتے تو میں تمہیں وہیں کھیتوں میں لڑائی کے دوران ہی گولی مار دیتا۔ میں کھوٹے سکے ساتھ رکھنے کا عادی نہیں ہوں۔ تمہاری آنکھوں میں وفاداری صاف نظر آتی ہے۔ اسی

لیے تمہیں اس میدان جنگ سے اٹھا کر یہاں لایا اور تمہاری حفاظت کا انتظام کیا تھا۔" وہ بولتا جا رہا تھا کہنے لگا۔

"کمالے تم ہیرے ہو ہماری دنیا میں آ گئے اور تربیت لے لی تو پھر سمجھو جلد ہی تمہارے نام کا ڈنکا بجنے لگے گا۔ مجھے تمہاری پروفائل ہسٹری معلوم ہے۔ تم بہت تھوڑے عرصہ میں بڑے تجربات سے گزرے ہو۔ تمہاری خصوصیت اور تمہارے تجربات یہ بتاتے ہیں کہ تم کندان بن سکتے ہو۔ میں ادھر کا سیٹ اپ صرف اس لیے تمہارے حوالے نہیں کر رہا کہ تم نے کہہ دیا ہے۔ ہماری دنیا میں صرف جذبات ہی نہیں چلتے یہاں اور بھی معاملات دیکھنے پڑتے ہیں۔

میں جانچ چکا ہوں کہ تم اس قابل ہو کہ اگر میرا سیٹ اپ چلاؤ تو کامیاب ہو جاؤ گے اور مجھے نقصان نہیں ہوگا۔ تمہاری طرف سے مجھے دھوکا کا خطرہ بھی نہیں ہوگا۔ لہٰذا میں دیگر معاملات کو بھی دیکھ سکوں گا۔"

خلاف معمول شاہد ملتانی طویل گفتگو کر رہا تھا۔ شاید وہ لاشعوری طور پر مجھے اپنے سیٹ اپ کا حصہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس کی مردم شناسی اور معاملہ فہمی سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ مردم شناس نہ ہوتا تو اب تک اس کی لاش کے ساتھ تصویریں بنا کر کوئی پولیس افسر مزید ترقی پا چکا ہوتا یا پھر اس کا کوئی ساتھی اسے مار کر خود ڈان بن چکا ہوتا۔

میں نے شاہد ملتانی کے ساتھ وقت گزارا تھا ہم کچھ دن ایک ساتھ رہے تھے میں نے اس کے ساتھیوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ان میں واقعی کوئی غدار نہیں تھا اس کے ساتھی اس پر جان دیتے تھے۔ وہ اس کی خاطر کسی کی جان بھی لے سکتے تھے اور اپنی جان دے بھی سکتے تھے۔ پولیس اور پچھلے دل کے ساتھ ہونے والی جھڑپوں میں بھی میں نے دیکھا تھا کہ اس کے ساتھی موقع سے فرار نہیں ہوئے اور نہ اس نے اپنے ساتھیوں کی آڑ میں بھاگ نکلنے کی کوشش کی تھی۔ وہ سب بہادری سے لڑے تھے۔

وہاں سے نکلنے کا فیصلہ ان کے لیڈر یعنی شاہد ملتانی نے کیا تھا اس کے بعد وہ نکلنے کی کوشش کرنے لگے لیکن اس کوشش کے دوران بھی وہ منظم تھے۔ انہوں نے ایسا ہرگز نہیں کیا تھا کہ اپنے لیڈر کو چھوڑ کر بھاگ جاتے وہ ایک دوسرے کو کور فائر دیتے ہوئے وہاں سے نکل رہے تھے۔

یہ وہ گروہ تھا جس میں سب مجرم ہی شامل تھے لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان ایسا تعلق موجود تھا کہ یہ اپنے ساتھی کی لاش اٹھانے کے لیے جان کی بازی لگا دیتے تھے۔ یہ لوگ اپنے ساتھی کی لاش تک پولیس کے ہاتھ نہیں لگنے دیتے تھے۔ اس پس منظر کو دیکھیں تو شاہد ملتانی کی بات درست محسوس ہوتی تھی کہ اس کے اردگرد صرف جاں نثار اور وفادار ہی ہیں۔ ان میں سے کوئی غداری نہیں کر سکتا۔

شاید وہ غدار کو اسی وقت گولی مار دیتا تھا جب اس پر یہ بھید کھلتا تھا کہ اس کی صف میں کوئی غدار ابھر آ رہا ہے۔ چاہے اس نے ابھی غداری نہ کی ہو اسے کسی ثبوت کی ضرورت ہی نہیں تھی اس کے لیے صرف شک ہونا ہی کافی تھا۔ پولیس اور ڈاکو دونوں ہی شک کی بنیاد پر فیصلہ کن اقدام اٹھانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ پولیس کے کام کی ابتدا ہی شک سے ہوتی ہے لیکن ڈاکو کا معاملہ اور ہوتا ہے اس کی انتہا شک پر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ شک کی بنیاد پر ہی پکڑا اور مارا جاتا ہے اور شک کو ہی نظر انداز کرنے پر اپنی قبر خود کھود ڈالتا ہے۔ شاہد ملتانی تو موت کے گھوڑے پر سفر کر رہا تھا۔ وہ اس گھوڑے کو اپنے قابو میں نہ رکھتا تو یہی گھوڑا اسے قبر کے اندر تک چھوڑ کے آ جاتا۔

میں نے شاہد ملتانی پر صورت حال پر واضح کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد وہ مجھے چھوڑ دیتا اور مجھ سے بے پروا ہو جاتا تب بھی مجھے کوئی فکر نہ تھی۔ اس کا ساتھ چھوٹ جانے سے میرے لیے مزید مشکلات پیدا ہو جاتی تھیں لیکن وہ سچ کہہ رہا تھا میں اسے دھوکے میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے میرا ساتھ دیا تھا۔ وہ مجھے کھیتوں سے زخمی حالت میں اٹھا کر یہاں نہ لاتا تو اب تک میری لاش بھی گل سڑ چکی ہوتی۔ اس کا یہ مجھ پر احسان تھا میں اسے کسی صورت دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے شاہد ملتانی کی طرف دیکھا وہ خاموشی سے لسی پی رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”ملتانی تم نے میری زندگی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ یہ میری زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ میں اپنا انتقام لینے نکلا ہوں۔ میں جرائم کی دنیا میں ہرگز نہیں آؤں گا۔ مجھے بس اپنے دشمنوں کا خاتمہ کرنا ہے اور انہیں عبرت کا نشان بنانا ہے۔ اس کے بعد میں اس شہر سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ ایک نئی زندگی کا آغاز کروں گا۔ وہاں کوئی نہیں جانتا ہوگا کہ میرا ماضی کیا ہے اور تقدیر مجھے کس طرف لے آئی تھی۔ اگر میں نے تمہارے سیٹ اپ میں قدم رکھا تو یہ میرے پاؤں پکڑ لے گا۔ پھر اس سے نکلنا آسان نہیں رہے گا۔ تم چاہو تو ابھی سے ہاتھ اٹھا سکتے ہو۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں ہوگا۔ میں یہاں سے نکلوں گا اور دنیا کے بازار کے ہجوم میں گم ہو جاؤں گا۔ پھر کمال ذہنیت خود کو اس قابل بنائے گا کہ اپنے دشمنوں سے بدلا لے سکے۔“

شاہد ملتانی نے میری جانب دیکھا۔ لسی کا گلاس میز پر رکھا اور منہ صاف کرنے کے بعد کہنے لگا۔

”کالے تیری یہی ادا مجھے پسند ہے ابھی تم بچے ہو تمہیں اندازہ نہیں کہ تم اس ملک میں کہیں بھی چلے جاؤ پولیس تمہارا پیچھا کرتی رہے گی اب تم شریفوں والی زندگی نہیں گزار سکتے۔ تم قانون کے کھاتوں میں قاتل، ڈکیت اور پولیس مقابلوں کے ماہر کے طور پر لکھے گئے ہو۔ اب تمہارا نام نہیں مٹ سکتا۔ تم چاہو تو ابھی مجھے ہاں مت کہو لیکن جلد ہی تمہیں احساس ہو جائے گا تم اس دنیا میں نہ آتے تو کہیں کے نہ ہوتے جب ایسا ہوگا تو پھر تم مجھے بتا دینا۔ میرا سیٹ اپ تمہارے لیے موجود رہے گا۔“

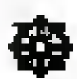
ابھی شاہد ملتانی بات کر ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ اس نے اسکرین کی جانب دیکھا اور کال ریسیو کی۔ دوسری جانب خدا جانے ایسا کیا کہا گیا کہ ملتانی کے منہ سے گالیوں کا فوارہ ابل پڑا۔ اس نے موبائل بند کیا اور تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا ملتانی نے تیزی سے مجھے کہا کہ اسے کسی جگہ فورا جانا ہے اس لیے مجھ سے وہ بعد میں بات کرے گا۔ دکان سے باہر آ کر اس نے کہا۔

”کمالے میں تم سے ملنے آؤں گا اور تمہارا ساتھ دوں گا۔ تم کہیں جانے کا خیال دل سے نکال دو۔ مجھے پتا ہے تم شبنم بائی کے کوٹھے سے فرار ہو رہے تھے۔ اب تم واپس وہیں جاؤ، میں دو چار دن میں آ کر کہیں اور انتظام کر دوں گا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ تیزی سے ایک جانب چلا گیا۔

شاہد ملتانی کے جاتے ہی میں واپس شبنم بائی کے کوٹھے کی جانب چل پڑا۔ میری حالت ایک قیدی کی سی تھی جسے فرار کے بعد دوبارہ جیل بھیج دیا گیا ہو اب شاہد ملتانی کے آنے تک مجھے وہیں رہنا تھا۔ میں کوٹھے تک پہنچا تو وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ میں جلدی سے اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔ میری کوشش تھی کہ کسی کی نظر میں آئے بنا اپنے کمرے تک پہنچ جاؤں۔

کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے سر پر پہاڑ پھینک دیا ہو۔ نیلما میرے بستر پر لیٹی تھی۔ اس کے لیٹنے کا انداز ایسا تھا کہ مجھے کسی انہونی کا احساس ہوا۔ میں تیزی سے اس کی جانب بڑھا اور پھر ٹھٹک گیا۔ وہ مر چکی تھی۔ کسی نے اس کی گردن تیز دھار آلے سے کاٹ دی تھی۔ بستر اور زمین اس کے خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ یہ خون اب میرے کپڑوں اور جوتوں پر بھی لگ چکا تھا۔ اسی دوران مجھے پیچھے سے کسی کی چیخ سنائی دی۔ میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ نیلما قتل ہو چکی تھی اور اس کا خون میرے کپڑوں پر لگا ہوا تھا۔ سامنے زیورات اور رقم والا ٹرنک کھلا پڑا تھا اور میرے ہاتھ میں جو لفافہ تھا اس میں اسی ٹرنک سے چرائی گئی رقم موجود تھی۔ تقدیر جانے مجھ سے کیا بھیانک کھیل کھیلنے جا رہی تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)



پہلی غلطی

خان شفیق

ہر انقلاب ہمیشہ خراج لیتا ہے' وہ اگر شہریوں کو آزادی' جمہوریت اور خوشحالی دیتا ہے تو ان سے بہت کچھ چھین بھی لیتا ہے' ہمارے ہاں بھی اس خطے میں دو انقلاب آچکے ہیں ایک ۱۹۴۷ء میں جب برصغیر تقسیم ہوا دوسرا جب ۱۹۷۱ء میں جب پاکستان دولخت ہوا' ان انقلابوں نے جہاں لوگوں کو بہت کچھ دیا وہاں اُن سے ان کے بہت سے اپنے بھی چھین لیے' یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بہت سے لوگوں نے خود ایک وقت کی روٹی کے لیے اپنی بیٹیاں تک فروخت کردی تھیں۔ خان شفیق اس لہو لہو آزادی کے عینی شاہد ہیں۔ یہ کہانی صرف کہانی نہیں بلکہ احساس دلوں کے لیے ایک چیخ' ایک ایسا زخم ہے جو روح کی گہرائیوں کو ہر وقت کچوکے لگاتا رہتا ہے۔

حساس دل قارئین کے لیے ایک حقیقت ایک افسانہ

ملا عابد سے میری ملاقات میری آوارہ گردی کے دوران ہوئی یہ وہ وقت تھا جب میرے لیے زمین سخت تھی اور آسمان دور اپنی آوارہ گردی میں شتر بے مہار کی مانند حیدرآباد میں ادھر ادھر بھٹکتا پھر رہا تھا' کچھ تھوڑے بہت پیسے میرے پاس تھے فی الحال غریب نواز نامی سرائے میں بسیرا کرلیا تھا اور تلاش میں تھا کہ کوئی مستقل جگہ' چھوٹا سا ٹھکانا مل جائے تو کہیں کوئی کام پکڑلوں' اسی خیال میں سولجر بازار کی طرف نکل گیا' ایک لانڈری پر نظر پڑی جس کے برابر میں پان بیڑی' سگریٹ کی دکان تھی' وہاں ایک ادھیڑ عمر شخص' یا جس کو شاید وقت نے ادھیڑ عمر کا بنا دیا تھا' بڑی تیزی سے کپڑوں پر استری کررہا تھا' دراز قامت' چہرے پر خشخشی داڑھی' ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ' اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں نہ ختم ہونے والا انتظار' بہر حال وہ انسان دوست نظر آرہا تھا' پاسنگ شو کی سگریٹ کبھی ہونٹوں میں دبا لیتا اور کبھی قریب رکھی ہوئی ایش ٹرے کے کھانچے میں ٹکا دیتا' میں پان کی دکان کے قریب کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا اور دیکھتا رہا۔

"کیا دیکھ رہے ہو برخوردار؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"دیکھ رہا ہوں آپ کتنی تیزی سے استری کررہے ہیں۔"

"سیکھنا چاہتے ہو سیکھ لو۔" اس کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔

"آپ سکھا دیں گے۔" میں نے پرشوق انداز میں کہا تو وہ غور سے مجھے دیکھنے لگا پھر پوچھا۔ "کہاں سے آئے ہو یہاں کہاں رہتے ہو؟" یہ سن کر میرا دل بھر آیا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"تاریخ اپنے آپ کو مختلف انداز میں دہراتی ہے۔" اس نے ایک ایسا جملہ کہا جو بات چیت سے ہٹ کر تھا اور میں اس کا منہ دیکھنے لگا۔

"جملہ برخوردار بے ربط نہیں' مجھے کچھ یاد آگیا تھا۔" وہ میری حیرانی دیکھ کر میرے دل کا راز پا گیا۔

"ہاں تو تم نے بتایا نہیں کہاں سے آئے ہو اور یہاں کہاں رہتے ہو؟"

"کراچی سے آیا ہوں فی الحال ایک سرائے میں رہ رہا ہوں۔"

"آنسو پونچھ لو یہ شکست کی علامت ہیں۔" اس کے

لہجے میں تحکم تھا اور مجھے محسوس ہوا وہ خاصا پڑھا لکھا تھا۔

"کوئی رہنے کا ٹھکانا نہیں میری یہ چھوٹی سی دکان ہے تختوں کی دو چھتی ہے تم بھی وہاں سو جایا کرو کام سکھا دوں گا اس دوران جو میں کھاؤں گا تم بھی کھا لینا جب کام کرنے لگو کھانے کے پیسے دے دیا کرنا۔ منظور۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔

یہ وہ وقت تھا جب ملک کو تقسیم ہوئے صرف تین سال گزر رہے تھے۔ قافلے آ رہے تھے۔ قافلے جا رہے تھے مشرقی پنجاب کی زمین خون سے لالہ زار ہو چکی تھی۔ کتنے اپنے تھے جو چھوڑ کر چلے گئے بے بسی نا داری کا رقص جاری تھا لیکن ایک جذبہ جاگر ہو گیا تھا اور وہ ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ کچھ نہیں تھا نخوت کی دولت تھی ملا عابد کے ساتھ وقت گزرنے لگا اس کے غم اس کی زندگی کی تلخیوں نے اسے بذلہ سنج اور حس مزاح کا مالک بنا دیا تھا یہ بھی انسانی زندگی کا ایک پہلو ہے وہ صبح آٹھ سے شام پانچ بجے تک بڑی پابندی سے کام کرتا رہتا ہنستا رہتا اور دوسروں کو ہنساتا رہتا اس کی زبان سے اکثر بے ساختہ ایک جملہ ادا ہو جاتا اولے سے پہلے کے بچنے کی ایسی کی تیسی اس جملے کا کیا مطلب تھا یہ میں نے کبھی نہ پوچھا لیکن اکثر مجھے محسوس ہوا جیسے اس کی زندگی کی کسی تلخ یاد نے اسے گھیر لیا ہو اور وہ اسے ذہن سے جھٹک کر تیزی سے استری کرنے لگتا شام پانچ بجے کے بعد وہ بھرپور تفریح کرتا اپنے دوستوں کے ساتھ جن میں سے اکثر پریس مین تھے شیش محل ہوٹل کی طرف نکل جاتا جس کے ساتھ ہی بازار حسن تھا جہاں راتیں جاگتی تھیں اور دن سوتے تھے۔

"چائے کڑک ہاں بہت تلخ" وہ ویٹر سے کہہ کر سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر دھواں دھواں دھار فضا میں جو ہوٹل میں چھائی ہوئی تھی منتشر کر دیتا کہیں سے کسی غمگین گانے کی صدا بلند ہوتی۔

"انسانی زندگی موسیقی کی اداس لہروں میں کھو جاتی ہے۔" اس نے سگریٹ کا ایک اور طویل کش لے کر کہا یہ جملہ کوئی غیر پڑھا لکھا شخص ادا نہیں کر سکتا تھا کبھی کبھی ملا عابد کی ذات میں چھپا ہوا انسان بول پڑتا ایسے جملے کبھی کبھار ہی اس کی زبان سے ادا ہوتے۔

"ملا آؤ اب ان چلتی دکانوں کی طرف چلتے ہیں" اس کے ایک ساتھی نے پرشوق لہجے میں کہا اور اس کی آنکھوں میں ایک چمک عود کر آئی تھی۔

"کیسی چلتی زندہ لاشوں کی دکانیں۔" اس نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ پھر ان سب کا رخ ان گلیوں کی طرف ہو گیا جہاں کے چھوٹے چھوٹے کمروں کے دروازوں پر یہ زندہ لاشیں دعوت نظارہ دے رہی تھیں لیکن میں نے دیکھا ملا کی نگاہوں میں ہوس کی کوئی چمک نہیں تھی مجھے یہ محسوس ہوا جیسے وہ کچھ تلاش کر رہا ہو دو ایک نوجوانوں نے جو کچھ کرنا تھا وہ کیا پھر اس دن کے بعد میں ان کے ساتھ نہیں گیا میں فرشتہ نہیں تھا اور نہ ہی مجھے اپنی صفائی مطلوب ہے بس میری نسلیت نے مجھے اجازت نہیں دی۔

ملا عابد کام کے دوران کبھی کبھی ایک جملہ اور ادا کرتا جس نے ابتداء میں مجھے چونکا دیا لیکن بعد میں بہت حد تک اس جملے کا راز پا گیا۔

ایک دن دھوپ نہیں آئی وہ فراغت سے بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔

"یہ دھوپ اکثر دھوپ لانے میں ایک دن کا ناغہ ضرور کر دیتے ہیں۔" اس نے بیزار سے کہا۔

"عابد بھائی وہ جملہ جو اکثر آپ کہہ دیتے ہیں آخر اس کا......"

"ہاں وہ جملہ" ملا عابد نے میری بات کاٹ دی۔

"سننا چاہتے ہو چلو وقت گزارنے کا موضوع تو ملا یہ

ان دنوں کی بات ہے جب میں نے ایف اے کا امتحان پاس کرلیا تھا اور پوسٹ آفس میں میری ملازمت ہوگئی تھی اور اس ملک کی تخلیق کے لیے سیاسی جدوجہد بڑھتی جارہی تھی لیکن ابھی کئی مرحلے باقی تھے۔

''عابد بھائی میں نے جلد ہی اس بات کا اندازہ لگالیا تھا کہ اس ماحول اور پیشے کو آپ نے اپنایا ہے آپ اس ماحول کے عادی نہیں۔'' میں نے درمیان میں دخل دیا۔

''ماحول اور پیشہ جب انقلاب آتا ہے ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہتی' بہرحال ملازمت کو ایک سال ہی ہوا تھا کہ مجھے شادی کے بندھن میں باندھ دیا گیا' تسنیم عباس میری شریک حیات' ایک وہی بچی' سیدھی سادھی اٹھارہ سالہ لڑکی' خدمت گزار اور شوہر پرست' زندگی ایک بے تلے روایتی راستے پر گامزن ہوگئی' ہم دونوں خوش تھے' ہم دونوں مطمئن تھے لیکن یہ خوشی اطمینان چند روزہ ثابت ہوا' پھر نعرے بلند ہونا شروع ہوگئے اور شعلے رقص کرنے لگے آسمان دھواں دھواں ہوگیا' میری والدہ اور میرے والد اپنے آبائی گاؤں سے آتے ہوئے قتل کردیئے گئے اور ایک روز جب یہ ملک وجود میں آگیا' میں تسنیم عباس کو لے کر کسمپرسی کے عالم میں بھاگ نکلا' اور جس انداز میں ہم نے سرحد پار کی یہ ایک دوسری طویل داستان ہے' جب یہاں آیا ایک بے بسی کا عالم تھا' معلوم ہوا قائد آباد جہاں آج قائداعظم کا مقبرہ ہے جھونپڑیاں پڑ رہی ہیں' لیکن بانس اور چٹائیاں' یہاں تو پیٹ کی روٹی کا سوال تھا۔

''فکر کی ضرورت نہیں' سن رہے ہو۔'' تسنیم عباس نے کہا۔

''کیوں فکر کی ضرورت نہیں؟'' اور تسنیم نے کچھ زیورات میرے آگے ڈال دیئے۔

''یہ...... یہ......؟'' میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''یہ میرے نہیں' سرحد پار کرنے کے بعد جب میں ضرورت کے تحت ایک طرف تھوڑی جھاڑیوں کے قریب گئی ایک پوٹلی مجھے ملی۔ اس میں ایک زنجیر چار چوڑیاں اور ایک چھپا کلی تھی' وہ میں نے حفاظت سے رکھ لی' یہ سن کر میری آنکھوں میں روشنی آگئی۔

''اب سب کچھ ہوجائے گا۔ جھونپڑی بھی بن جائے گی کچھ برتن بھی آجائیں گے اور کچھ پیسے بھی ہمارے پاس ہوجائیں گے۔'' میں نے سکون کا سانس لے کر کہا۔ بہرحال یہ زیورات چھ سو ساٹھ روپے کے بکے' اس وقت سونا ایک سو پانچ روپے تولہ تھا۔ میں نے جھونپڑی ڈال لی' کوکہ یہ زندگی کا پہلا تجربہ تھا' بہرحال کوئی ذلت کی بات بھی نہیں تھی' ہر طرف جھونپڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ رفتہ رفتہ جو کچھ پیسے تھے وہ خرچ ہوگئے' میں نوکری کے لیے مارا مارا پھرتا رہا' قسمت تھی کہیں ملازمت نہ ملی' جو حکومت کے ملازم تھے انہیں چار چار' پانچ پانچ ماہ ہوگئے تھے تنخواہیں نہیں ملی تھیں' ہر طرف ایک انتشار تھا'

> **وزن**
>
> دو ہیرو کچی بیٹھے آپس میں باتیں کررہے تھے۔ ایک بولا۔
>
> ''میں نے کل سمندر سے ڈھائی ٹن وزنی مچھلی پکڑی۔
>
> دوسرا بولا۔ ''میں نے کل سمندر میں ڈور ڈالی تو جلتی ہوئی لالٹین نکلی۔''
>
> پہلا بولا۔ ''نہیں تو جھوٹ کہتا ہے۔''
>
> دوسرا بولا۔ ''تو اپنی مچھلی کا وزن کم کردے میں اپنی لالٹین بجھادوں گا۔''
>
> **احمد علی...... ملیر کراچی**

پریشانیاں تھیں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ملک بس چند دن کی کہانی ہے۔ ایک روز ملازمت کی تلاش میں سولجر بازار کی طرف نکل گیا سوچا کسی دکان پر ہی کام مل جائے گا اسی عالم میں ایک جگہ سے گزر رہا تھا کہ ایک چھوٹی سی دکان میں ایک شخص کو استری کرتے ہوئے دیکھا میں وہاں رک گیا۔ نہ جانے میرے دل میں کیا خیال آیا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو بھائی؟'' کوئلے کی استری لوہے کے موڑھے پر رکھتے ہوئے اور میرا جائزہ لیتے ہوئے اس نے کہا۔

''کیا یہ دکان آپ کی ہے یا۔۔۔۔؟''

''ہاں' یہ چھوٹی سی لانڈری میری ہی ہے۔''

''آپ کے پاس کچھ کام مل جائے گا۔''

''کام! کیا تم کپڑوں پر استری کر لیتے ہو؟''

''نہیں' میرا مطلب یہ کہ لکھائی پڑھائی کا کام۔''

''یہاں ایسا کیا کام ہے' جو کپڑے دھلنے آتے ہیں ان کی رسیدیں میں خود لکھ لیتا ہوں' اتنا کہہ کر وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لینے لگا۔

''اور دکان میں آجاؤ کرسی تو نہیں' یہ اسٹول ہے لکڑی کا آزادی کی سوغات میں سے ایک تحفہ۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ میں چند دن میں استری کرنا سیکھ لوں گا' صرف ایک روپیہ روز ہی آپ مجھے دے دیا کریں' وہ پھر میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا' مشفق میرا جملہ بات چیت کے دوران موضوع سے ہٹ کر نہیں تھا' میں نے یہی کہا تھا تاریخ مختلف انداز میں خود کو دہراتی ہے' تم ایسے ہی حالات میں حیدرآباد کے سولجر بازار میں مجھ سے ملے جیسے میں کبھی کراچی کے سولجر بازار میں استاد فیض سے ملا تھا' یار ایک کام تو کر ایک چینک تو زرین خان کے ہوٹل پر بول آ۔''

ملا عابد نے پیکٹ سے تیسری سگریٹ نکالی۔

''فرصت میں یہ سگریٹ کچھ زیادہ ہی پی جاتی ہے۔ اور اس پیکٹ کی تصویر دیکھ رہے ہو جیسے کوئی ڈھنڈ وکسی کو بے وقوف بنا کر عیاری سے مسکرا رہی ہو اور یہ انگریز قوم اپنی عیاری میں عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔'' میں چائے ہوٹل پر بول آیا۔

''ہاں تو عابد بھائی پھر کیا ہوا؟'' میں نے کہا۔

''یار چائے تو پی لینے دے۔''

''زندگی کی کہانی اور اس کا انجام تلخیوں کے سوا اور کیا ہے۔'' وہ دکان میں لگی ہوئی قائداعظم کی تصویر کو دیکھنے لگا۔

''مجھے یاد ہے جب میرے شہر کے اسٹیشن سے فرنٹیئر میل میں یہ ہمارے رہنما بیٹھ کر گزر رہے تھے تو ایک ہجوم جوش جذبے کے عالم میں ان کے استقبال کے لیے پہنچ گیا تھا' اور اب یہ ایک تصویر ہیں' یہ قبروں کی شکل میں پرسکوت مٹی کے ڈھیر' اور یہ پرسکون تصویریں اور ان کے گرد دھندلاتی ہوئی یادیں مشفق زندگی کا انجام بہت اداس' مایوس اور تلخ ہے۔'' انہوں نے پھر ایک سگریٹ نکالی اسے ماچس کا شعلہ دکھایا اور ایک لمبا کش لے کر دھواں دکان کی فضا میں پھیلا دیا۔

''عابد بھائی داستان ادھوری رہ گئی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں داستان' کیا تم شادی شدہ ہو اور کہاں رہ رہے ہو؟'' استاد فیض نے مجھ سے پوچھا تھا' جس طرح میں نے تم سے پوچھا۔

''ہاں شادی شدہ اور قائد آباد میں جھونپڑی ڈالی ہے۔''

''ٹھیک ہے بیٹھ جاؤ' یہ بتاؤ ناشتہ کیا؟'' میں خاموش رہا۔

"اے بج بج۔" اس نے بار والے کو آواز دی۔

"ہاں کیا بولتی استاد۔" بار والے نے پوچھا۔

"اے بولتی نہیں بولتا' کب سدھرو گے تم۔"

"بولو بولو' مسخری مت کرو۔"

"ایک چینک' ایک پراٹھا۔"

"وہ میں......"

"میں سمجھ گیا' پیسے لے جانا اور گھر کا چولہا روشن کرانا' استاد فیض نے اپنی کرنجی آنکھوں سے مجھے دیکھا' وہ درمیانے قد کا مضبوط جسم کا مالک تھا' گول چہرے پر اکادکا چیچک کے داغ تھے۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"عابد حسین۔" میں نے جواب دیا۔

"دیکھو عابد کل سے دکان پر آ جاؤ' چولہا تمہارا جلتا رہے گا' کام کچھ ایسا زیادہ مشکل نہیں لگن سے کرو گے تو پندرہ دن میں کام پر قابو پالو گے۔" ناشتے کے بعد میں جانے لگا استاد فیض نے پانچ روپے کا نوٹ میری طرف بڑھا دیا' شرماؤ نہیں اب اگر اس تقسیم نے ہمیں یہاں لا کھڑا کیا ہے تو وقت کے اس چیلنج کو ہم قبول کرتے ہیں اور جب انقلاب آتا ہے تو یہ سب کچھ تو ہوتا ہی ہے گھبرانا نہیں اور ہمت سے کام لینا' استاد فیض مجھے تسلی دینے لگے اور اس وقت وہ مخلص تھے۔"

ملا عابد اتنا کہہ کر کچھ دیر کے لیے رک گئے اور شاید خلا میں یادوں کی پرچھائیوں میں جھانکنے لگے۔

"انسان حالات کے مقرر کیے ہوئے راستوں پر چلنے کے لیے مجبور ہے مشفق' پھر ایسا ہوا کہ میں کام کرنے لگا اور صرف دس دن کے اندر اندر کام سیکھ گیا' اب کام میں تیزی لانے کی ضرورت تھی' استاد فیض زیادہ سے زیادہ مجھ سے کام لے رہے تھے رواج کوئلے کی استریوں کا تھا' بھاری کوئلے کی استریاں' جن کی حرارت پر قابو پانا بس یہی ایک گر تھا' وقت گزرنے لگا زندگی میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔

"ماہر ہو گئے ہو پریس کرنے میں' کیا کہیں گے ماہر کو انگریزی میں۔"

"پرفیکٹ یا ایکسپرٹ۔"

"یار یہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ' آدھے الفاظ انگریزی کے بولتے ہیں اور آدھے اردو کے۔"

"غلامی اور وہ بھی ڈیڑھ دو سو سال کی غلامی' دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔"

"یار عابد تم نے یہ نہیں بتایا پڑھا کہاں تک ہے تم نے؟"

"میٹرک!" میں نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں استاد بدک نہ جائیں۔ بہر حال مشفق یہ پیشہ تو میری تقدیر بن چکا تھا۔" ملا عابد نے ایک گہرا سانس لیا شاید آنسو اس کی چھوٹی چھوٹی غم زدہ اداس آنکھوں میں ابھرے تھے اور جنہیں وہ پی گئے تھے۔

"خدا کیوں یکسانیت کے ساتھ انسان کو زندگی گزارنے نہیں دیتا' انفرادی اور اجتماعی تبدیلیاں اسے جھنجوڑتی رہتی ہیں' مشفق اب میں کمانے لگا تھا' تسنیم عباس بھی مطمئن تھی۔ ایک روز استاد نے کہا۔" عابد یار کسی روز اپنا گھر تو دکھا دو۔"

"گھر! وہ تو ایک جھونپڑی ہے' بس دن کا سایہ اور رات کا بسیرا۔"

"یہ جھونپڑیاں زیادہ دن تک جھونپڑیاں نہیں رہیں گی' ہم جھونپڑیوں سے اٹھ کر ہی آئے ہیں۔ انہیں بھی جھونپڑیاں نہیں رہنے دیں گے۔" استاد نے کہا۔

"میں استاد آپ کی دعوت کروں گا۔"

"ارے بھئی ان تکلفات کو چھوڑو' کیوں اپنے آپ کو زیر بار کرنا چاہتے ہو۔"

"یہ تو ہماری روایت ہے اور روایات کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔" میں نے کہا' اور جواب میں استاد کے

ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ آ گئی۔ بہر حال وہ دن بھی آ گیا جب میں نے استاد کو گھر مدعو کر لیا' ہاں وہ دن ... " ملا عابد خلا میں جھانکنے لگے' گزرے ہوئے واقعات کی تصویریں ہمارے ذہنوں میں نقش ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور خلا کے پھیلاؤ میں ہم ان پر چھائیوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔ اس شام تسنیم نے بریانی' قورمہ اور شاہی ٹکڑے تیار کیے تھے اور چپاتیاں تو وہ ہاتھی کے کان جیسی تیار کرتی تھی۔

"کیا میں استاد کے سامنے آ جاؤں؟"

"تو کیا ہوا استاد ہمارے محسن ہیں۔"

"ایسا ہوا تو نہیں آج تک۔" تسنیم نے کہا یہ وہ دور تھا جب خواتین نے پردے کے خلاف خاموش بغاوت نہیں شروع کی تھی۔

"تسنیم اس جھونپڑی میں پردہ کیسے برقرار رہ سکے گا ہاں اپنے آپ کو احتیاط سے لپیٹے رکھنا' استاد نے کھانے کی بہت تعریف کی۔

"عابد ہر کھانا لاجواب تھا اور چپاتیاں ان کی میں کیا تعریف کروں' جانے سے پہلے دس دس کے دو نوٹ تسنیم کو دینا چاہے۔

"استاد یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔" میں نے احتجاج کیا۔

"عابد اس بات میں تو تمہیں دخل نہیں دینا چاہیے یہ جیٹھ اور بھاوج کا معاملہ ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں' آخر پہلی بار آیا ہوں' کچھ میرا بھی فرض ہے۔" مشفق میں یہ سن کر خاموش رہا' بہر حال وقتاً فوقتاً استاد نے آنا شروع کر دیا' ایک رات استاد آئے کاغذ کی تھیلی میں پاؤ ڈیڑھ پاؤ مونگ پھلیاں تھیں' سردی ٹھیک ٹھاک ہو رہی تھی۔ "بھئی میرے آنے پر آپ لوگوں کو اعتراض تو نہیں' جب سے میری شریک حیات دنیا سے رخصت ہوئیں میرے لیے دنیا ویران ہو گئی' کبھی کبھی تو بہت یاد آتی ہیں' دل گھبرایا تمہاری طرف نکل آیا۔"

"استاد پھر کیا ہوا مجھے تو خوشی ہوئی' میں نے مشفق یہ بات رسماً کہی ورنہ حقیقت یہ تھی اس وقت استاد کا آنا مجھے اچھا نہیں لگا تھا' تسنیم لحاف اوڑھے پڑی

ذرا مسکرایئے

ایک سکھ نے تین سوئمنگ پول بنوائے گرم پانی کا' ٹھنڈے پانی کا اور ایک خالی۔
دوسرے سکھ نے گرم پانی اور ٹھنڈے پانی والے سوئمنگ پول بنوانے کی وجہ دریافت کی تو وہ بولا۔
"جب سردی لگے گی تو گرم میں نہاؤں گا اور جب گرمی لگے گی تو ٹھنڈے میں۔" دوسرے سکھ نے پھر پوچھا۔
"مگر یہ خالی سوئمنگ پول کس لیے ہے؟"
وہ بولا۔
"یار! کبھی کبھی نہانے کو دل نہیں بھی چاہتا۔"
تنویر...... لاہور

تھی' لو بھئی یہ گرم گرم مونگ پھلیاں' یہ تو سرد راتوں کا کھاجا ہے۔ تسنیم بھی سنبھل کر بیٹھ گئی۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر جب توپ سے بارہ والا شو ختم ہوا تو استاد چلے گئے۔" میں کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو" تسنیم نے پوچھا۔

"استری کا کام ہے دن بھر استری کر کے تھک جاتا ہوں۔"

"ہاں یہ تو ہے مجھے استاد کی کرنجی آنکھوں سے بڑا خوف آتا ہے۔" تسنیم نے کہا پھر ہم دونوں سو گئے اب صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ استاد نے دکان تقریباً مجھ پر

ہی چھوڑ دی تھی، دکان میں تھا ہی کیا دو استریاں، دو لکڑی کے اسٹول، دو میزوں کے ساتھ استریاں رکھنے کے لیے دو لوہے کے سوئڈ تھے اور جو کپڑے تیار ہو جاتے ان کے لیے چیڑ کے تختوں کے ریک، ایک پانی کا گھڑا اور ایک گلاس، دو ایلومونیم کے کٹورے کپڑوں پر پانی چھڑکنے کے لیے ایک میز پر استاد کام کرتے تھے اور ایک پر میں، کام کا بوجھ اب مجھ پر ہی تھا، زیادہ تر استاد غائب ہی رہتے تھے، ایک دن دوپہر کو استری کرتے کرتے میرے سر میں سخت درد اٹھا، استاد موجود نہیں تھے، میں دکان بند کر کے گھر روانہ ہو گیا، جیسے ہی اندر داخل ہوا دیکھا استاد فیض اور تسنیم ایک ہی پیالے میں چمچے سے دودھ چاول کھا رہے تھے۔

"اچھے وقت پر آئے ہو عابد ہم دونوں بہن بھائی بننے کی رسم ادا کر رہے تھے۔" استاد فیض کے چہرے پر ذرا بھی گھبراہٹ نہیں تھی۔

"معذرت چاہتا ہوں استاد، سر میں سخت درد اٹھا اور میں دکان بند کر کے چلا آیا۔" میں نے کہا مشفق میرا دماغ دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر گم صم ہو کر رہ گیا تھا، میرے پیروں سے زمین نکل گئی تھی اور درد کا وجود ناپید، میں نے دیکھا تسنیم سہمی ہوئی تھی اور گردن جھکائے کچھ سوچ رہی تھی، میں نے اس سے کچھ نہیں کہا اور اندر جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ بیوی کے لیے شوہر کی خاموشی بہت بڑی اذیت ہوتی ہے، میں سولجر بازار کا ماہر پریس مین تھا، میمن اور آغا خانیوں کی لانڈریوں کے مالکوں نے اچھے پیسوں پر ملازمت کی پیش کش بھی کی تھی لیکن میرے دل میں صرف ایک احساس تھا، استاد فیض نے بے سروسامانی میں میرا ہاتھ پکڑا تھا، لیکن تجربہ یہ ہوا اگر تم بچھو کو بچھو نہیں سمجھو گے، نہیں کچلو گے وہ ڈنک مارنے سے باز نہیں آئے گا، لیکن اب میں نے فیصلہ کر لیا تھا، میں استاد فیض کا ساتھ چھوڑ دوں گا۔ تین روز تک خاموشی رہی، تسنیم اور میرے درمیان کوئی بات، چیت نہیں ہوئی۔ دو تین بار استاد فیض آئے بس واجبی سی بات چیت ہوئی پھر وہ چلے گئے، تیسرے روز میرا ذہن بدلا، بس تسنیم کے لیے اتنی اذیت کافی تھی، میں نے پھولوں کے ہار اور گجرے لیے، حلوہ سوہن اسے بہت پسند تھا، وہ خریدا اور یہ سوچتا ہوا گھر کی طرف چلا کہ اس کو مناؤں گا۔" ملا عابد کچھ دیر کے لیے ٹھہر گئے، اور ان کی آنکھوں میں پھر نمی عود کر آئی، میں سمجھ رہا تھا وہ خاموش کیوں ہو گئے تھے۔

"ہاں تو میں ان جھونپڑیوں قطاروں سے گزرتا ہوا جہاں سے کھانے پکانے کی خوشبوئیں آ رہی تھیں میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنی جھونپڑی کی طرف چلا، نا جانے دل کی دھڑکن کیوں تیز ہو گئی، دروازے پر آیا تو تارا لگا ہوا تھا، جو کنڈی کا کام دیتا تھا، اندر بھیانک تاریکی تھی، صحن میں ٹوٹی ہوئی چارپائی پڑی ہوئی محسوس ہوئی، کہاں گئی تسنیم لالٹین کیوں نہیں جلائی میں نے سوچا اور پھر تار ہٹا کر اندر گیا۔ تسنیم، تسنیم کہاں ہو تم؟ کوئی جواب نہیں آیا، میں جھونپڑی کے کمرے میں گیا، ماچس جلائی، لالٹین ایک جانب لٹکی ہوئی تھی، اسے روشن کیا، اندر سامان بے ترتیب تھا، وہ پلنگ بچھا ہوا تھا جہاں ہم سوتے تھے، میں سب کچھ سمجھ گیا وہ چلی گئی تھی۔ کیا کیفیت تھی کیا حال تھا، وہ گجرے وہ پھولوں کے ہار، وہ حلوہ سوہن، وہ خوشی کا احساس، وہ تسنیم کو منانے کی آرزو، پلک جھپکتے میں سب کچھ خاک ہو گیا، میں چارپائی میں دھنستا چلا گیا، کب مجھے نیند آئی مجھے معلوم نہ تھا، صبح اٹھا، بوجھل ذہن اور دل کے ساتھ مجھے یقین تھا استاد اب دکان پر نہیں آئیں گے، اور پھر دکان میں تھا ہی کیا، میں نے دکان مالک کے حوالے کر دی، وہ کرائے پر تھی، فیصلہ کر لیا تھا کراچی

کو خیر باد کہہ دوں گا' اور پھر میں حیدرآباد آ گیا' اتفاق سے یہ دکان خالی مل گئی' سونے کا ٹھکانہ بھی ہے میونسپل ڈسپنسری کے پاس لیٹرین بھی بنے ہوئے ہیں' یہاں ایک ماحول بن گیا۔

"عابد بھائی! آپ بازار حسن کیوں جاتے ہیں' میں جانتا ہوں آپ کے دل میں کوئی برائی نہیں ہوتی۔"

"ہاں' میں وہاں کیوں جاتا رہا' جب انسان بکھر جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اکٹھا کرنے کے لیے بڑے بودے سہارے تلاش کرتا ہے' اپنے ان نوجوان ساتھیوں کے ساتھ بس یونہی وقت گزارنے کے لیے جاتا رہا اور اب بھی یہ لوگ اصرار کرتے ہیں تو ساتھ چلا جاتا ہوں' ایک رات اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلا گیا' یہ لوگ تو ادھر ادھر منتشر ہو گئے میں ایک جگہ تنہا رہ گیا' اچانک ایک چہرے پر نظر پڑی اور میرا ذہن گھوم کر رہ گیا۔ ذرا اور قریب ہوا' چہرہ اور واضح ہو گیا' کچھ اور قریب چلا گیا' اب اس نے مجھے دیکھا اور سہم کر رہ گئی۔

"عابد تم......؟"

"ہاں میں عابد' یہ سب کیا دیکھ رہا ہوں' یہ سب کیا ہو گیا؟"

"یہ نہیں کیا ہو گیا' کیوں ہو گیا؟"

"لیکن تم یہاں؟"

"مجھے استاد فیض نے خیر پور میں بیچ دیا اور خریدنے والے نے یہاں پہنچا دیا۔"

"لیکن یہ سب کچھ۔"

"عابد اگر تم میری پہلی غلطی معاف کر دیتے' میں سنبھل جاتی' تمہاری خاموشی میرے لیے بہت بڑی سزا تھی۔"

"میں تسنیم اب بھی تمہیں قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"نہیں عابد' اب شیشے میں بال آ گیا ہے' اب تم جاؤ' ہمارے نگراں ہمیں دیکھ رہے ہوں گے۔"

"ہاں اب میں ایک اجنبی ہوں اور میں دل پر ایک بوجھ لیے واپس چلا آیا' اور اس طرح میرے نوجوان دوست' استاد فیض چڑے کی استری لے گئے اور لوہے کی استری دے گئے' یہ بھی کبھار چپکے لگاتی ہے' برداشت کر لیتا ہوں' کما کر بھی تو دیتی ہے' ملا عابد نے پیکٹ سے سگریٹ نکالی اور ایک طویل کش اسے سلگا کر لیا اور دھواں فضا میں پھیلا دیا' پھر کہا۔

"اس وقت حالی کا ایک شعر یاد آ گیا مشفق۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا اور ملا عابد کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"لو سنو"

اس کے جاتے ہی کیا ہو گئی گھر کی صورت
اب نہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

خاموشی اور گہری خاموشی' میں نے آسمان کی جانب دیکھا' جہاں بادلوں کے بے شمار سفید ٹکڑے کچھ اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے کسی چراگاہ میں بھیڑیں چر رہی ہوں' زمین کا یہ گول ٹکڑا جو اپنے محور اور مدار پر متحرک ہے' بے انداز داستانوں کا اسٹیج ہے جہاں ایک تمثیل بھی تو ایسی نہیں جسے آنسوؤں کی روشنائی سے تحریر نہ کیا گیا ہو' میں نے ملا عابد کے چہرے پر نگاہ ڈالی وہ یادوں کے ہجوم میں کھویا ہوا تھا۔



آسیب کا رشتہ

خلیل جبار

دنیا میں انسانوں کے علاوہ بھی کئی مخلوقات ہیں اور اپنے اپنے طور پر زندگی گزار رہی ہیں۔ قدرت نے ان کے ہمارے درمیان ایک پردہ اور توازن بنا کر رکھا ہے اسی لیے سب اپنے طور طریقوں پر رواں دواں ہیں لیکن جب کبھی یہ توازن ہماری کسی غلطی سے بگڑتا ہے تو وہ مخلوق ہمارے سامنے آجاتی ہے اور ہم اشرف المخلوق ہونے کے باوجود خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔
ایک میاں بیوی کی روداد' ان کے درمیان ایک بھٹکی ہوئی روح آگئی تھی۔

زارا کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا اس کا شوہر خالد بیڈ پر نہیں ہے یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا جب سے اس کی شادی ہوئی تھی وہ نوٹ کر رہی تھی اکثر وہ رات میں کچھ وقت کے لیے بستر سے اٹھ کر چلا جاتا تھا اور اس کی واپسی گھنٹے دو گھنٹے بعد ہوتی تھی۔

زارا کی شادی کو چھ ماہ سے کچھ زیادہ ہی ہوئے تھے خالد کے اس عمل سے زارا کو الجھن ہونے لگی تھی کہ ایسا کون سا کام ہے وہ جو رات کی تنہائی میں کرتا ہے جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کئی بار اس نے خالد سے معلوم بھی کیا تھا پر اس نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا جس پر زارا کو شک ہونے لگا تھا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے کہیں اس کا کسی لڑکی سے چکر وغیرہ نہ ہو۔

کیونکہ آج کل لڑکے لڑکیاں موبائل پر بات چیت کرنے کے لیے رات کی تاریکی سہارا لیتے ہیں مگر خالد کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ اگر اس کا چکر کسی اور لڑکی سے چل بھی رہا تھا تو اسے ختم کر دینا چاہیے تھا یا پھر اس سے تعلق رکھنا ہی تھا تو پھر اس سے شادی کر لیتا مجھ سے شادی کا ڈھونگ کیوں رچایا۔

اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ خالد ایسا دل پھینک قسم کا شوہر نکلے گا۔ اس میں ایسی کیا کمی ہے جو اس کا شوہر دوسری عورتوں سے تعلق قائم رکھنا چاہتا ہے ابھی انہیں ایک طویل زندگی اکٹھے گزارنی ہے اگر دوسری عورتیں اس کے شوہر کی زندگی میں آتی رہیں تو پھر کس طرح وہ اچھی زندگی گزار سکیں گے۔

وہ غصے میں بھری بستر سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ خالد اس وقت کہاں ہوگا اس لیے وہ چھت پر پہنچ گئی چھت پر ایک چھوٹا کمرہ بنا ہوا تھا اس کمرے میں خالد اکثر جا کر لیٹ جاتا تھا زارا دبے پاؤں اس کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ زارا نے دروازے سے کان لگا دیے گو کہ آواز میں صاف سنائی نہیں دے رہی تھیں لیکن صاف اندازہ ہو گیا تھا کہ خالد کسی لڑکی سے باتیں کر رہا ہے خالد کا کسی لڑکی سے رات گئے اس پہر بات کرنا شکوک و شبہات کو جنم دے رہا تھا زارا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا وہ غصے سے بری طرح سے کانپ رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے دروازے کو زور سے دھکا دیا دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا دروازے کو لاک نہیں کیا گیا تھا کمرے کے اندر خالد ضرور بیٹھا تھا لیکن کسی لڑکی کا نام و نشان نہیں تھا وہ اپنے شوہر کو اکیلا دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی تھی ابھی ابھی اس نے لڑکی کی آواز صاف سنی تھی۔ خالد کے ہاتھ میں موبائل بھی نہیں تھا جو وہ سمجھتی کہ موبائل کے اسپیکر کی آواز ہے کمرے میں لڑکی کی آواز گونج رہی ہو۔ خالد بھی حیرت سے زارا کو دیکھ رہا تھا۔

"زارا کیا بات ہے خیریت ہے نا؟" اس نے

پوچھا۔

”مجھے کمرے سے کسی لڑکی کے بات کرنے کی آواز آ رہی تھی۔“

”لڑکی کی آواز۔“ خالد چونکا۔ ”لیکن اس کمرے میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔“

”یہ بات میرے لیے بھی پریشان کن۔ کمرے میں لڑکی نہیں ہے پھر بھی لڑکی کی آواز سنائی دی تھی۔“ زارا نے کہا۔

”آؤ نیچے چلتے ہیں۔“ خالد نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

زارا کمرے میں بھرپور نگاہ دوڑاتی ہوئی خالد کے پیچھے چل دی وہ حیران و پریشان تھی کہ آخر کمرے میں لڑکی تھی تو کہاں چلی گئی۔ بستر پر لیٹتے ہوئے بھی اس لڑکی کے متعلق سوچ رہی تھی۔

”زارا کہاں گم ہو گئیں۔“ خالد نے پوچھا۔

”کچھ نہیں میں۔ وہ۔ لڑکی!“

”لگتا ہے تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے ذہن پر زیادہ زور مت ڈالو اور سو جاؤ۔“

”میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ لڑکی کی آواز تھی۔“

”ہاں ہو سکتا ہے وہ لڑکی کی آواز ہو اور کسی دوسرے گھر سے آ رہی ہو۔“ خالد نے کہا۔

”کسی دوسرے گھر سے۔“

”جیسے میرا دل گرمی سے گھبرایا اور میں اوپر چلا گیا ایسے ہی کسی کو نیند نہ آ رہی ہو اور اس نے ٹی وی کھول لیا ہو اور ٹی وی سے مرد اور عورت کی آواز آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہوتی۔“

”ہاں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“ زارا نے اپنے دل کو مطمئن کرنے کو یہ بات کہی۔

ابھی وہ خالد سے کچھ اور باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن خالد کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے۔ وہ اس کے سونے کا انتظار کیے بغیر ہی سو گیا تھا۔ خالد کے سو جانے پر زارا کوشش کرنے لگی کہ اسے فوراً جانے پر نیند آنے کا نام نہیں لے رہی تھی وہ کروٹیں بدل رہی تھی پھر نا جانے کیسے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس کے بیدار ہونے سے پہلے ہی خالد کی آنکھ کھل چکی تھی۔ اس لیے وہ نہا دھو کر ناشتہ کرنے کو تیار ہو چکا تھا۔ زارا نے جلدی جلدی ناشتہ تیار کرنا شروع کر دیا رات کا واقعہ ابھی تک اس کے ذہن میں تھا خالد ناشتہ کر کے ڈیوٹی پر چلا گیا۔ دوپہر کا کھانا تیار کر کے جب وہ کچھ دیر کے لیے بیڈ پر لیٹی اس وقت بھی رات کا واقعہ یاد آ گیا۔ وہ رات کے واقعہ کو جتنا بھلانا چاہتی تھی اتنا ہی یاد آ رہا تھا پھر نجانے اسے کیا ہوا وہ بے اختیار اٹھی اور چھت پر چلی گئی اس کے قدم کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کمرے کے پاس پہنچ کر زارا نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا اچانک اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی جو بڑے آرام سے چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلنے پر اس نے زارا کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکی بڑی ہی حسین تھی۔ نقش و نگار بھی بہت اچھے تھے ایسی خوب صورت لڑکی زارا نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ ابھی وہ اس لڑکی سے کچھ پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ وہ لڑکی چارپائی سے اٹھی اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ زارا نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا لیکن اب چھت پر کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے بدن میں کپکپی سی طاری ہو گئی اور وہ بے اختیار گھبرا کر نیچے کو دوڑی۔ وہ جیسے ہی نیچے آئی۔ دروازے کی کنڈی زور سے بجی۔ زارا نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔ خالد دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے آیا تھا۔ وہ اسے گھبرایا ہوا دیکھ کر چونکا۔

”کیا بات ہے زارا اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“

”وہ..... وہ..... کمرے میں لڑکی......!“

”کمرے میں لڑکی؟“ وہ چونکا۔

”ہاں خالد میں نے اپنی آنکھوں سے چھت والے کمرے میں ایک لڑکی کو چارپائی پر لیٹے ہوئے دیکھا پھر وہ اچانک اٹھی اور کمرے سے باہر نکل اور

غائب ہوگئی۔ میں گھبرا کر نیچے دوڑی چلی آئی۔" زارا نے بتایا۔

اس کی بات سن کر خالد کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ چور نگاہوں سے کبھی زارا کو کبھی زینے کو دیکھنے لگتا تھا۔

"خالد یہ کیا چکر ہے مجھے بتاؤ۔"

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"میری وجہ سے؟" وہ چونکی۔

"ہاں نہ تم اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتی اور نہ وہ تم پر ظاہر ہوتی۔ سوچو تم اس گھر میں چھ ماہ سے رہ رہی ہو کبھی وہ تمہیں نظر آئی لیکن رات سے تم اس کے بارے میں جاننے کو بے چین ہو اس لیے غصے میں اس نے تم پر خود کو ظاہر کر دیا ہے۔" خالد نے غصے سے کہا۔

"وہ کون ہے اور اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"تم یہ جان کر کیا کرو گی۔"

"خالد میں تمہاری بیوی ہوں اور اس کے بارے میں جاننے کا حق رکھتی ہوں۔" زارا نے کہا۔

"اتنا تو تم جان چکی ہو کہ وہ انسان نہیں ہے بے چین روح ہے ابھی میں جلدی میں ہوں ڈیوٹی پر پہنچنا ہے اس کے بارے میں رات کو بتاؤں گا۔" خالد نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" زارا نے خالد کے لیے کھانا نکالتے ہوئے کہا۔

خالد کھانا کھا کر ڈیوٹی پر چلا گیا بے چین روح کے بارے میں معلومات جاننے کے لیے زارا بے چین ہو چکی تھی۔ زارا، سرفراز کالونی کی رہنے والی تھی۔ خالد کا گھر ان کے محلے سے تین گلیاں چھوڑ کر تھا۔ وہ جب بھی پریٹ آباد ڈیوٹی پر جا رہا ہوتا تھا زارا اسکول پڑھانے کو نکلی ہوتی تھی وہ ایک مقامی اسکول میں پڑھاتی تھی وہ اکثر پاس ہی اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر جاتے ہوئے دونوں کی ایک دوسرے سے نظریں ضرور ٹکراتی تھیں۔

دونوں کی نظروں میں ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی موجود ہوتی تھی ایک دن خالد کے گھر والے زارا کے رشتے کے لیے بات چیت کرنے آئے۔ چونکہ دونوں خاندان ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے اس لیے بات پکی ہو کر شادی پر ختم ہوگئی۔ خالد جس گھر میں رہتا تھا وہ گھر ان کی شادی ہونے پر چھوٹا پڑنے لگا تھا۔ اس لیے خالد نے پریٹ آباد میں ہی ایک مکان کرایہ پر لے لیا اس سے فائدہ یہ ہوا کہ اسے اب ڈیوٹی کے لیے گھر سے جلدی نہیں نکلنا پڑتا تھا اور کھانے کے وقت گھر آ کر کھانا کھا لیتا تھا مکان کا کرایہ مناسب ہونے کے سبب انہیں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ رات کو جب زارا اور خالد بستر پر لیٹے اس نے پھر اس بے چین روح کا تذکرہ چھیڑ دیا خالد کے پاس اب کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس کے بارے میں زارا کو بتا دے۔

"زارا یہ کئی سال پہلے کی بات ہے میں بے روزگار تھا اور بہتر روزگار کی تلاش میں تھا حیدرآباد جیسے شہر میں روزگار ملنا بہت مشکل کام ہے میں بھی روزگار کے لیے دھکے کھا رہا تھا میرے کئی دوست پریٹ آباد میں رہتے تھے۔ ان سے ملاقات کے لیے اکثر میرا پریٹ آباد آنا ہوتا تھا پریٹ آباد میں پاورلومز کی صنعت سے ہزاروں لوگ وابستہ ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ پاورلومز پر زیادہ تر کھادی کپڑا تیار ہوتا ہے ایک نوجوان بیک وقت کئی کئی مشینوں کو دیکھ سکتا ہے۔ اس کام میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ کام کرنے والوں کو دو شفٹوں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ ایک شفٹ صبح سے شام اور دوسری رات سے صبح سات بجے تک ہوتی ہے۔ پریٹ آباد پاورلومز کی وجہ سے رات میں بھی دن کا سماں ہوتا ہے ہر مزدور کو ایک ہفتے دن میں تو دوسرے ہفتے رات میں ڈیوٹی کرنا پڑتی ہے۔ رات میں کام کرنے سے انسان کی صحت پر بہت فرق پڑتا ہے اکثر لوگوں کی بینائی وقت سے پہلے ہی کمزور

ہو جاتی ہے۔

پاور لومز کے مالکان کو مزدوروں کی تلاش نہیں کرنی پڑتی۔ زیادہ تر لوگوں نے کارخانے اپنے گھر کے نیچے کی منزل پر قائم کر رکھے ہیں۔ محلے میں کھیلنے والے بچے شوق ہی شوق میں پندرہ دن یا ایک ماہ کے اندر مشین چلانا سیکھ لیتے ہیں اور پھر روزگار نہ ملنے پر کسی بھی کارخانے والے سے بات کر کے یہ کام شروع کر دیتے ہیں۔ میں اپنے دوستوں کی مدد کرنے کی غرض سے کچھ وقت کے لیے مشین پر کھڑا ہو جاتا تھا جس کی بنا پر یہ کام مجھے آ گیا تھا روزگار نہ ملنے پر میں نے یہی کام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میرے دوستوں نے اس ارادے پر میرا حوصلہ بڑھایا اور اس طرح میں پاور لومز کی صنعت میں مزدور کی حیثیت سے شامل ہو گیا۔ کام مجھے اس لیے زیادہ اچھا لگا تھا کہ مجھے خود کوئی کام نہیں کرنا پڑتا سارا کام مشین کرتی تھی۔ میری حیثیت ایک نگران کی سی تھی جب اکتاہٹ ہوتی مشین کو بند کیا۔ کچھ دیر کو باہر نکل گئے۔ چائے پانی پی کر جیسے ہی طبیعت بہتر ہوئی واپس آ کر مشین اسٹارٹ کر دی اس کام میں یہ قید نہیں کہ ساری زندگی وہیں کام کرتے رہو۔ جہاں سے زیادہ پیسوں کی پیشکش ہوئی وہیں چلے گئے۔

میں شادی سے قبل کئی کارخانے تبدیل کر چکا تھا۔ کارخانے تبدیل کرنے کی وجہ صرف زیادہ اجرت تھی اس دن مجھے مولانا محی الدین کے کھاتے پر کام کرتے ہوئے دوسری رات تھی چائے کی طلب پر میں مشین بند کر کے چائے پینے چلا گیا۔ ہوٹل پر مجھ سے پہلے ہی میرا دوست امیر الدین ناز بیٹھا ہوا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ تم نے نثار کے کھاتے سے کام چھوڑ دیا ہے۔"

"ہاں میں نے کام چھوڑ دیا ہے۔"

"کیوں؟" وہ چونکا۔

"مولانا محی الدین اس سے زیادہ پیسے دیں گے۔"

"کیا واقعی تم محی الدین کے کھاتے پر کام کر رہے ہو۔" امیر الدین ناز بری طرح سے چونکا۔

"کیوں اس میں ایسے چونکنے والی کونسی بات ہے۔"

"بات یہ ہے جبھی میں چونکا ہوں اس کے پاس زیادہ تر لوگ کام کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ جو کام کی ہامی بھر بھی لیں تو رات ڈیوٹی آنے پر خود ہی کام چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟" مجھے تجسس ہوا۔

"سنا ہے وہاں آسیب ہے رات میں جو کام کرنے آتا ہے اسے پراسرار آوازیں آتی ہیں اب تم خود سوچو کہ رات کے دو بجے جب تمہیں کسی کے بولنے کی آواز سنائی دے اور وہ نظر بھی نہ آئے ایسے میں تمہاری کیا حالت ہو گی۔" امیر الدین ناز نے کہا۔

"تمہیں بے وقوف بنانے کو میرے سوا اور کوئی نہیں ملا۔" میں نے چائے کی چسکی لی۔

"خالد تم میری بات کا یقین کرو، میں سچ کہہ رہا ہوں تم دیکھ لینا جب رات میں کسی عورت کی آواز آئے گی اور وہ تمہیں اے میرے صنم کہہ کر پکارے گی پھر میں دیکھوں گا کہ تم کتنے بہادر ہو۔" امیر الدین ناز نے کہا۔

"امیر الدین میں ایسی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔ یہ کام کرتے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں۔ ابھی تک مجھی کسی بھوت یا چڑیل سے واسطہ نہیں پڑا پھر میں کیسے مان لوں کہ مولانا محی الدین کے کھاتے میں آسیب ہے۔" میں نے کہا۔

"نہ مان کر تم نقصان میں رہو گے میرا مشورہ ہے کہ تم محی الدین سے بات کر کے صرف دن کی ڈیوٹی لے لو۔ اسے ویسے بھی رات میں کام کرنے کی عادت ہے۔" امیر الدین ناز نے کہا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے وہاں سے ہٹوا کر تم نے

وہاں کام کرنے کا پروگرام بنالیا ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

"خالد بھائی میں جب اس کام میں آیا تھا میرے استاد اعجاز حسین نے کہا تھا کہ بیٹا تم اس کام میں تو آ ؤ یہ کام تمہاری آنکھیں کمزور اور صحت خراب کردے گا دیکھ لو میں وقت سے پہلے بوڑھا نظر آنے لگا ہوں۔" امیر الدین ناز نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ میں آسیب کو بھگاتا ہوں یا آسیب مجھے وہاں سے بھگاتا ہے۔" میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

میں جب مشینوں پر دوبارہ آ کر کھڑا ہوا مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی مجھ سے مخاطب ہے اور کچھ کہہ رہا ہے میں نے چاروں طرف دیکھا وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ کسی کو نہ پا کر میں نے اسے اپنا وہم سمجھا اور کپڑے کی طرف دھیان دینے لگا کہ مشین پر کپڑا صحیح تیار ہو رہا ہے یا کہیں کوئی خرابی تو نہیں ہے۔

بے خیالی میں میری نظر آواز کی سمت دیوار پر چلی گئی۔ اچانک دیوار کے اندر سے ایک خوب صورت لڑکی ظاہر ہوئی۔ میں نے اپنی آنکھیں مسل کر دیکھا مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ بھلا دیوار کے اندر سے بھی کوئی لڑکی نکل سکتی ہے وہ لڑکی سخت گھبرائی ہوئی تھی وہ آتے ہی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا جسم بالکل روئی کے گالے کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ میں سخت بوکھلا گیا ابھی اسے اپنے سینے سے الگ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک نوجوان دیوار کے اندر سے ظاہر ہوا اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر تھا وہ تیزی سے میری طرف آیا اور اس نے وہ خنجر لڑکی کے سینے میں اتار دیا وہ زور سے چیخی اور تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے دی۔ میں حیران و پریشان یہ منظر دیکھ رہا تھا وہ لڑکا جیسے دیوار کے اندر سے آیا تھا ویسے ہی غائب ہو گیا لڑکی بھی خود بخود غائب ہو گئی مجھے حیرت اس پر زیادہ ہوئی کہ لڑکی نے میرے ہاتھوں میں دم دیا تھا لیکن وہاں ایک قطرہ خون تک موجود نہ تھا حتیٰ کہ میرے کپڑے بھی بالکل صاف تھے کہ جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ مجھ پر کپکپی کی سی طاری ہو گئی اور بے اختیار میں نے مشین بند کی اور کارخانے کو تالا لگا کر گھر چلا آیا۔ امیر الدین ناز کی بات سچ ثابت ہو گئی تھی واقعی کارخانے میں آسیب تھا۔ تب ہی لوگ رات میں کام کرنے سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ اس علاقے میں مولانا محی الدین سب سے زیادہ اجرت دینے میں مشہور تھا۔ پھر بھی لوگ اس کے پاس کام کرنے سے کتراتے تھے۔

رات کو میں کام کرنے سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے چابی دینے مولانا محی الدین کے پاس گیا تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

"بس ڈر گئے ارے بھئی ایسا کچھ نہیں ہے بس لوگ مجھ سے جیلس ہوتے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ میں ترقی کروں اس لیے ایسی باتیں پھیلائی ہوئی ہیں رات کے وقت کام کرنے والوں کو لوگوں کی باتیں سچ محسوس ہوتی ہیں اس لیے کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ نظر آتا ہے اگر آسیب ہونے کی صورت میں اسے تو مجھے نقصان پہنچانا چاہیے تھا دیکھ لو مجھے آج تک کوئی نقصان پہنچا ہے؟"

"لیکن رات مجھے آسیب نظر آیا ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر وہ آسیب ہوتا تو وہ ضرور تمہیں نقصان پہنچاتا۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا اس کا مطلب ہے وہ تمہاری نظروں کا دھوکا ہے میری بات مانو لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرو اور اپنا کام کرتے رہو اور جس دن تم محسوس کرو کہ آسیب نے نقصان پہنچایا ہے بے شک کام چھوڑ کر چلے جانا میں تمہیں نہیں روکوں گا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کروں مجھے سوچتا دیکھ کر وہ بولا۔

''خالد بیٹے دیکھو یہ دنیا بہت وسیع ہے اس دنیا میں ہم ہی نہیں اللہ تعالیٰ کی کتنی مخلوق آباد ہیں جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے جنات کہاں نہیں ہیں یہ مخلوق ہر جگہ ہے جب ہم اسے نہیں ستائیں گے وہ بھی ہمیں نہیں ستائے گی۔'' مولانا محی الدین نے کہا۔

مجھے مولانا محی الدین کی یہ بات دل کو لگی کہ جب ہم اسے نہیں ستائیں گے پھر وہ ہم کو کیوں ستائیں گی۔ میں کام چھوڑنے کی بات کرنے آیا تھا اور کام کی ہامی بھر کر دوبارہ سے تیار ہو گیا۔ رات کو کام کرتے ہوئے مجھے کسی قسم کی آواز سنائی نہیں دی پوری رات کام میں مصروف رہا دوسری رات میں کھڑا مشینوں کو دیکھ رہا تھا میری نظر بے اختیار گھڑی پر چلی گئی۔ رات کے دو بج رہے تھے کہ اچانک آواز آئی۔

''بابو مشین چلا، بابو مشین چلا۔''

میں نے حیرت سے مشینوں کو دیکھا مشینیں چل رہی تھیں۔ پھر بھی مجھے مشین چلانے کو کہا جا رہا ہے کئی بار یہ آواز آنے پر مجھے بڑا غصہ آیا کہ کیا آسیب کو نظر نہیں آ رہا کہ مشین چل رہی ہے جو پراسرار آوازیں مجھے مخاطب ہو کر مشین چلانے کو کہہ رہی ہیں۔ میری نظر بے اختیار کارخانے کے دروازے پر چلی گئی کوئی شخص دروازے پر چھپا کھڑا تھا ہوا کے چلنے سے قمیص کا کچھ حصہ اڑتے ہوئے دکھائی دے رہا تھا میں خاموشی سے دروازے پر آیا۔

''بابو مشین!'' امیر الدین کو مجھے دیکھ کر چپ لگ گئی۔

''امیر الدین کے بچے یہ تو ہے۔'' میں غصے سے بولا۔

''میں دیکھنا چاہ رہا تھا کہ تم کتنے بہادر ہو میری آواز سن کر ڈرتے ہو یا نہیں؟''

''میں تمہاری آواز سن کر نہیں ڈرا اب کیا حکم ہے۔'' میں نے کہا۔

''ارے بھئی میں کیا تمہیں حکم دوں گا دراصل تمہارے ساتھ چائے پینے کا موڈ ہو رہا تھا اس لیے چائے لے کر آیا ہوں۔'' امیر الدین ناز نے چائے کی کیتلی اور کپ دکھائے۔ ''یہ تم نے بہت اچھا کام کیا اس وقت واقعی چائے پینے کا موڈ ہو رہا ہے۔'' چائے دیکھ کر میرے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''اور سناؤ کارخانے کے آسیب سے ملاقات ہوئی۔'' امیر الدین ناز نے چائے کپ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہو چکی ہے۔'' میں نے چائے کا کپ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''کک.... کیا..... واقعی؟'' امیر الدین گھبرا سا گیا۔

''ہاں بھئی میری ملاقات ہو چکی ہے ایک نوجوان لڑکا ہے اور دوسری بہت ہی خوب صورت لڑکی ہے جسے دیکھتے ہی آدمی کا دل آ جائے۔'' میں نے کہا۔

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔'' وہ بے یقینی سے بولا۔

''کیوں مجھے جھوٹ بول کر کیا ملے گا۔''

''میرا مطلب ہے کہ تمہیں ان سے بالکل خوف نہیں آیا لوگ ان کو دیکھ لینے کے بعد کام چھوڑ دیتے ہیں۔''

''وہ آسیب بہت شریف ہیں مجھے بالکل تنگ نہیں کرتے اس لیے میں نے یہاں سے کام نہیں چھوڑا۔''

''تمہاری ہمت ہے کہ ابھی تک یہاں کام کر رہے ہو مجھ جیسا شخص آسیب دیکھ لینے پر دوبارہ پلٹ کر بھی ادھر کا رخ نہ کرتا۔'' امیر الدین ناز نے چائے کی چسکی لی۔

تھوڑی دیر وہ میرے پاس بیٹھ کر چلا گیا۔ صبح ہو جانے پر میں بھی گھر چلا آیا تیسری رات اپنے کام میں مصروف تھا کہ ایک مشین پر کوئی بیٹھا نظر آیا میں جیسے ہی اس مشین کے پاس گیا میری حیرت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں مشین چل رہی تھی دھاگوں کے اوپر وہی دوشیزہ بیٹھی ہوئی تھی مجھے اپنی جانب آتا

دیکھ کر وہ مسکرائی۔

"کون ہو تم؟" میرے منہ سے بے اختیار یہ جملہ نکلا۔

"میں لڑکی ہوں۔" وہ بولی۔

"یہ مجھے بھی نظر آرہا ہے لیکن تم کیا چاہتی ہو۔"

"میں تمہیں چاہتی ہوں۔" وہ بولی۔

"مجھے جانتی ہو؟"

"چاہنے کے لیے جاننا ضروری نہیں ہوتا۔ بس دل آنے کی بات ہوتی ہے میرا دل تم پر آ گیا ہے۔"

"میں انسان ہوں تم آسیب ... !"

"مجھے آسیب بھی ایک انسان نے ہی بنایا ہے میرے بھائی کے ہاتھوں پہلے میں مری تھی پھر ایک کار ایکسیڈنٹ کے حادثے میں میرا پیار میری جان دلاور ہلاک ہوگیا۔ اسے مر کر سکون میسر آ گیا مگر میری روح کو سکون نصیب نہ ہوسکا میں جس رات اس جگہ قتل ہوئی ہوں اس دن سے تڑپ رہی ہوں پر جب تمہیں دیکھا مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرا دلاور پھر سے اس دنیا میں آ گیا ہے میری روح کو سکون دینے کی خاطر اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی تم جہاں بھی جاؤ گے مجھے وہیں پاؤ گے۔" وہ بولی۔

"تمہارے بھائی نے تمہیں قتل کیوں کیا؟"

"میرے بھائی کو دلاور پسند نہیں تھا میرے گھر والے بھی نہیں چاہتے تھے کہ میری شادی دلاور سے ہو۔ ایک رات میں جب گھر سے فرار ہو کر دلاور کے ساتھ بھاگ کر پسند کی شادی کرنا چاہ رہی تھی میرے ہاتھ میں ایک پوٹلی بھی تھی دلاور نے یہاں پہنچنے کا کہا تھا اس وقت یہاں خالی میدان تھا میرے بھائی کاشف کی آنکھ کھل گئی اور میرے پیچھے یہاں تک پہنچ گیا۔ دلاور بھی پہنچ گیا تھا میں بھاگتے ہوئے جیسے ہی دلاور کی بانہوں میں پہنچی میرے بھائی نے خنجر سے حملہ کرکے مجھے ہلاک کردیا وہ دلاور کو بھی ہلاک کرنا چاہتا تھا لیکن وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا مگر اس کی قسمت اچھی نہیں تھی۔

بھائی نے اس واقعہ کے بعد گڑھا کھود کر مجھے دفن کیا تھا اس لیے میری روح یہاں بھٹک رہی ہے میں نے آج تک کسی کو نقصان نہیں پہنچایا پھر بھی لوگ مجھ سے نجانے کیوں ڈرتے ہیں مجھے دیکھ لیں تو کام چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔" وہ بولی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"میری ماں نے میرا نام شہزادی رکھا تھا اور اس شہزادی کا یہ حشر ہوا ہے۔" وہ بولی۔

اس دن سے میری اور شہزادی کی دوستی ہوگئی۔ رات کی ڈیوٹی میں اس سے روزانہ ملاقات ہوتی تھی وہ بے ضرر تھی۔ اس نے کبھی مجھے نقصان نہیں پہنچایا تھا اس لیے میں نے کارخانے کو نہیں چھوڑا۔ علاقے کے لوگ بھی حیران تھے کہ میں کام چھوڑ کر کیوں نہیں بھاگا۔ مجھ سے پہلے جو بھی کاریگر آتا تھا وہ چند دن میں بھاگ جاتا تھا۔ مولانا محی الدین کاریگروں کو زیادہ اجرت اس لیے دیتے تھے کہ وہ کسی طرح لالچ میں آکر کام کرتا رہے کام چھوڑ کر بھاگے نہیں ہر انسان اتنا بہادر نہیں ہوتا کہ وہ آسیب کا علم ہوجانے پر کام پر ڈٹا رہے۔ میرا خیال تھا کہ میری شادی ہونے پر شہزادی میرا پیچھا چھوڑ دے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہم دونوں ایک ساتھ رہیں ایک طرح سے وہ تمہیں اپنی سوتن تصور کرتی ہے اور مجھ سے ضد کرتی ہے کہ تمہیں طلاق دے دوں پہلے وہ کارخانے تک ہی محدود تھی لیکن اب وہ سائے کی طرح ہر جگہ میرے ساتھ رہتی ہے حتیٰ کہ جب دن کی ڈیوٹی ہوتی ہے اور رات میں گھر آکر سوتا ہوں رات میں سوتے سے مجھے جگا کر اوپر چھت پر لے جاتی ہے اور مجھ سے باتیں کرتی رہتی ہے دو گھنٹے باتیں کرکے چلی جاتی ہے اس کا زیادہ زور اس بات پر ہوتا ہے کہ میں نے شادی کر کے اچھا نہیں کیا میرے ہوتے ہوئے تم نے شادی کیوں کی میں اسے سمجھاتا ہوں کہ تم ایک روح ہو جبکہ

مجھے ایک گوشت پوست کے ساتھی کی ضرورت ہے۔ اتنی بڑی زندگی تنہا تو نہیں گزار سکتا لیکن میری باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتیں۔'' یہ کہتے ہوئے خالد خاموش ہو گیا۔

خالد کی باتیں سن کر زارا کی تشویش میں اور اضافہ ہو گیا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس موقع پر کیا کرے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ جب کوئی آسیب کسی پر عاشق ہو جائے تو وہ پھر آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اس کے شوہر خالد کا بھی وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اس معاملے میں کسی عامل سے رہنمائی حاصل کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا وہ دونوں شہزادی سے متعلق باتیں کرتے ہوئے سو گئے۔

صبح ہونے پر خالد کام پر چلا گیا زارا گھر میں اکیلی تھی وہ گھر کا کام کر کے آرام کی نیت سے جیسے ہی چارپائی پر لیٹی اچانک وہ لڑکی کمرے میں آ گئی اسے دیکھ کر زارا گھبرا گئی۔

''تو کیا منصوبے تیار کر رہی ہے مجھے سب خبر ہے لیکن اتنا سوچ لے کہ خالد اگر میرا نہ ہو سکا تو تیرا بھی نہیں رہے گا تو نے اگر اس سے میرا پیچھا چھڑانے کے لیے کسی عامل سے رجوع کیا میں اسی دن خالد کا خاتمہ کر دوں گی تجھے بیوہ ہونے کا شوق ہے تو پھر بھلے کسی بھی عامل سے رجوع کر لینا۔'' وہ بولی۔

''تم میرے شوہر کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتی ویسے بھی تم ایک روح ہو جبکہ ہمیں ابھی دنیا میں زندگی گزارنی ہے۔'' زارا نے کہا۔

''مجھ پر کس نے رحم کھایا تھا جو میں تم پر رحم کھاؤں میں کسی صورت میں خالد کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتی اگر تجھے کسی مرد کے سہارے زندگی گزارنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر اپنے لیے کوئی اور مرد ڈھونڈ لے میں کسی بھی صورت خالد کو تمہارا نہیں بننے دوں گی۔ وہ میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔ مجھ سے جدا کرنے کی صورت میں خالد بھی زندہ نہیں رہے گا۔'' وہ بولی۔

زارا ابھی اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ وہ لڑکی غائب ہو گئی جاتے جاتے وہ ایسی دھمکی دے گئی تھی کہ اب اسے ایک انجانا سا خوف آنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اس لڑکی سے چھٹکارا پانے کے لیے کسی عامل سے رجوع کرنا ضروری تھا ایسے میں وہ لڑکی اپنی دی ہوئی دھمکی پر عمل بھی کر سکتی تھی اور وہ خالد کو کسی بھی صورت میں کھونا نہیں چاہتی تھی اپنی سوچوں میں نجانے کب اسے نیند آ گئی آنکھ اس وقت کھلی جب دروازے پر دستک ہوئی دروازہ کھولنے پر اس کے سامنے خالد کھڑا تھا۔

''کب سے میں دروازہ بجا رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

''مجھے نیند آ گئی تھی۔'' زارا نے بتایا۔

''کھانے کے لیے کچھ تیار بھی کیا ہے۔''

''ہاں دوپہر کے لیے کھانا تیار کر کے ہی سوئی تھی۔'' زارا نے کہا۔

خالد کے لیے اس نے کھانا نکال کر رکھ دیا کھانا کھاتے ہوئے خالد نے محسوس کیا کہ زارا چپ چپ سی ہے۔

''کیا بات ہے آج بہت خاموش ہو طبیعت ٹھیک ہے نا؟''

''میری طبیعت کو کیا ہونا ہے بالکل ٹھیک ہوں اس روح نے مجھے دھمکی دی ہے کہ کسی عامل سے رجوع کرنے پر وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے بس اس بارے میں سوچ رہی ہوں۔''

''ہاں مجھے اس بات کا احساس ہے جب وہ مجھے دھمکی دے سکتی ہے تو پھر وہ تمہیں بھی دھمکی دے سکتی ہے۔'' خالد نے کہا۔

''کیا اس نے تمہیں بھی دھمکی دی ہے؟'' زارا نے پوچھا۔

''ہاں مجھے تم سے پہلے دھمکی دے چکی ہے۔'' خالد نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''پھر تم نے کیا سوچا ہے؟''

"فی الحال میں کوئی انتہائی اہم قدم اٹھانا نہیں چاہتا بس کچھ وقت گزرنے دو پھر دیکھتے ہیں۔"

"میں بھی نہیں۔" زارا نے کہا۔

"ہمارے لیے یہ مناسب نہیں کہ فوری قدم اٹھا کر کوئی مصیبت گلے مول لیں اس لیے کچھ انتظار کرو ہوسکتا ہے کہ وقت ہمارے موافق آجائے اور ہم اس پوزیشن میں آجائیں کہ خود بخود اس روح سے چھٹکارا مل جائے۔"

"ایسی خبیث روح سے خود بخود کہاں چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ہمارے کچھ کیے بغیر اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔"

"ہمیں بہت سوچ سمجھ کر ایک، ایک قدم اٹھانا ہوگا اس لیے اس معاملے کو فی الحال حالات پر چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ جو کرے گا وہ بہت ہوگا۔" خالد نے کہا۔

وہ کھانا کھا کر چلا گیا مگر زارا سوچتی رہ گئی کہ اس کا شوہر اس روح سے جلدی جان کیوں چھڑانا نہیں چاہتا۔ اس روح سے جان چھڑانے کے لیے جلد یا دیر سے انتہائی قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔

چند دن خیریت سے گزر گئے لڑکی کی روح نے ان دونوں کو پریشان نہیں کیا پھر ایک دن جب خالد گھر آیا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

"کیا بات ہے تم آج بہت پریشان ہو۔" زارا نے کہا۔

"ہاں واقعی پریشانی کی بات ہے۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے تمہیں ایک ہفتے کے اندر اندر طلاق نہیں دی تو وہ مجھے نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

"کیا۔" زارا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"بہت ہی ضدی لڑکی ہے جبھی وہ اپنے بھائی کے ہاتھوں ہلاک ہوئی تھی۔

"پھر تم نے کیا سوچا ہے۔"

"سوچنا کیا ہے جب سے اس نے دھمکی دی ہے میرا دماغ کام نہیں کررہا ہے سوچ سوچ کر دماغ پھٹا جارہا ہے۔" خالد نے کہا۔

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"تم حوصلہ رکھو اللہ تعالیٰ جو کرے گا وہ ہمارے حق میں ہوگا۔" خالد نے کہا۔

وہ انتہائی قدم اٹھانا چاہ رہا تھا مگر اب پانی سر سے گزر چکا تھا اسے جو کرنا تھا فوری کرنا تھا ایک دن وہ ایک مشہور عامل نثار احمد کے پاس جانے کے لیے گھر سے نکلا وہ بھی عامل نثار کے آستانے سے کچھ دور تھا کہ ایک موٹر سائیکل سوار نے اسے زوردار ٹکر ماردی وہ دور جا گرا۔ ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ موٹر سائیکل والا تیزی سے فرار ہوگیا یہ اتفاق ہی تھا کہ وہاں خالد کا دوست اعجاز حسین موجود تھا۔ اس نے فوراً خالد کو اپنی موٹر سائیکل پر سول اسپتال لے گیا۔ خالد کو زیادہ شدید چوٹیں نہیں آئی تھیں پھر بھی اسے گھر میں دس سے پندرہ دن آرام کرنا ضروری ہوگیا تھا خالد کے جسم کے مختلف حصوں پر پٹیاں دیکھ کر زارا پریشان ہوگئی۔

"یہ..... یہ..... کیا ہوگیا ہے؟"

"ارے کچھ نہیں ہے بھئی ذرا سی چوٹیں آئی ہیں۔" خالد نے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی یہ کیسے ہوا؟"

"موٹر سائیکل والا بہت جلدی میں تھا مجھے مار کر چلا گیا۔" وہ بولا۔ خالد عامل کے پاس جانے والی بات بتا کر زارا کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے وہ عامل کی بات گول کر گیا۔

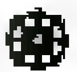
"تم عامل نثار کے پاس جانے کا کہہ رہے تھے۔" زارا نے یاد دلایا۔

"ارے بھئی چلا جاؤں گا تم فکر نہ کرو۔"

"یاد سے چلے جانا۔"

"اس حالت میں بھلا کیسے جاسکتا ہوں ایک دو

دن آرام کرلوں پھر چلا جاؤں گا۔"
زارا شوہر کی بات سن کر خاموش ہوگئی۔
شام کا وقت تھا مغرب ہونے میں کچھ وقت باقی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی زارا چونکی اس وقت کون آ گیا دروازے پر ایک ملنگ بابا کھڑا تھا۔
"بھوکے کو کھانا کھلاؤ گی بچی۔" وہ بولا۔
"ہاں..... بابا..... یہاں صحن میں کھانا لے کر آتی ہوں۔" زارا نے صحن میں ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
ملنگ بابا صحن میں بیٹھ گیا اس کے ہاتھ میں جو ڈنڈا تھا۔ وہ اس نے اپنے برابر میں رکھ لیا۔ زارا نے کھانا نکال کر ملنگ بابا کے آگے رکھ دیا۔ بابا نے روٹی کا نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا اور پھر اس نے خلا میں کچھ دیکھنے کی کوشش کی پھر دوسرا نوالہ بھی منہ میں رکھتے ہوئے خلا میں گھورا اچانک ان کی آنکھیں لال سرخ ہوگئیں وہ بول کچھ نہیں رہے تھے کچھ دیر گزرنے پر وہ کھانا کھا چکے تھے وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور جلالی لہجے میں فضا میں دیکھتے ہوئے بولے۔
"جا چلی جا بھاگ جا، جلا کر بھسم کردوں گا۔" زارا حیرت سے ملنگ بابا کو دیکھ رہی تھی۔
"تو مجھے جانتی ہے نا میں پلید روحوں کو جلا کر بھسم کر دیتا ہوں۔ تیرا بھی یہی حشر ہوگا چلی جا چھوڑ دے ان کا پیچھا۔"
کچھ دیر گزرنے پر ملنگ بابا کا غصہ ختم ہوگیا اور وہ نارمل حالت میں آ گئے۔
"بابا تم کس سے بات کر رہے تھے۔" زارا نے پوچھا۔
"اس خبیث روح سے بات کر رہا تھا جو تمہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہے یہ اتفاق ہے کہ میں اس طرف نکل آیا اس گھر میں داخل ہوتے ہی اس سے سامنا ہوگیا یہ خبیث اس سے قبل بھی کئی لوگوں کو پریشان کر چکی ہے اور میں نے انہیں اس سے چھٹکارا دلایا تھا اب اس خبیث روح نے اس گھر میں ڈیرے ڈال لیے ہیں یہ تم دونوں کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے لیکن میرے ہوتے ہوئے اب تمہارا بال بیکا بھی نہیں کرسکتی۔" ملنگ بابا نے کہا۔
"بابا یہ روح ہمیں دھمکیاں دے رہی ہے کہ ہمارے کسی عامل سے رجوع کرنے پر جانی نقصان پہنچا سکتی ہے۔" زارا نے بتایا۔
"خبیث روح نقصان پہنچانے کے علاوہ کر بھی کیا سکتی ہے تم بے فکر ہو جاؤ اب یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ اگر اس نے تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اس کا مجھے علم ہو جائے گا اور میں آ کر اسے جلا کر بھسم کردوں گا۔" ملنگ بابا نے کہا۔
ملنگ بابا کھانا کھا کر چلا گیا اس کے جانے کے بعد وہ روح پھر ایک ہفتے تک نظر نہ آئی۔ جس کا خالد نے زارا سے اظہار کیا۔ زارا نے ملنگ بابا کے گھر میں آنے اور بات چیت کے بارے میں بتایا خالد حیرت میں پڑ گیا کہ اتنی آسانی سے کس طرح سے اس روح سے نجات مل گئی۔ یہ حقیقت ہی تھی کہ وہ روح ان دونوں کا پیچھا چھوڑ کر کہیں دور جا چکی تھی۔ اس خوف سے کہ کہیں ملنگ بابا حقیقت میں جلا کر بھسم نہ کردے۔
کئی ماہ گزرنے پر بھی وہ روح ان دونوں کے سامنے ظاہر نہیں ہوئی تھی اور وہ دونوں میاں بیوی بھی خوش تھے کہ ان کی روح سے جان چھوٹ گئی مولانا محی الدین کے کارخانے میں آسیب کا قصہ ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ مولانا محی الدین بھی خوش ہے کہ خالد کے قدم اس کے کارخانے کے لیے مبارک ثابت ہوئے ہیں جو اس کے کارخانے سے آسیب کا قصہ تھا لوگ اب بھولنے لگے ہیں۔





آلشبہ مخدوم

اللہ تعالیٰ نے زندگی کا اک نظام بنایا ہے' انسان اس کے تحت زندگی گزاریں لیکن کبھی کبھار کچھ لوگ اس سسٹم میں خود کو کولہو کا بیل سمجھنے لگتے ہیں اور اس نظام فطرت سے ہٹ کر کل کے بارے میں آج سوچنے کی کوشش کرتے ہیں' یہ سوچے بغیر کہ آگاہی عذاب بھی بن سکتی ہے۔

ایک شخص کا احوال' وہ آگاہی کے عذاب میں مبتلا ہوگیا تھا' روایت سے ہٹ کر ایک پرمغز کہانی' ایک منفرد ذائقہ

صبح کی دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ خوشگوار موسم کی نرم نرم ہوا چل رہی تھی۔ پارک سبزے اور مختلف رنگوں کے پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ جوگنگ ٹریک پر کافی سارے لوگ تھے جن کوئی آہستہ اور کوئی تیز بھاگ رہا تھا۔ ان میں زوار خان جاگنگ کر رہا تھا۔ وہ شہر کا معروف بزنس مین تھا۔ صحت مند جسم' نمکین شو اور گورا رنگ تھا۔ وہ بردبار اور سنجیدہ شخصیت والا تھا' جس میں حد تک دولت کی خوبو آ گئی تھی۔ جس سے کافی حد تک وہ مغرور بھی ہو گیا تھا۔ وہ نوجوانی کی منزل سے آگے نکل گیا تھا اور جوانی کی سنجیدگی اوڑھ چکا تھا۔ وہ مہنگے اور بہترین ٹریک سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور جاگنگ ٹریک پر تیزی سے بھاگتا ہوا ایک دم آہستہ ہوا اور ایک بینچ کے پاس جا پہنچا۔

زوار خان بینچ کے پاس مختلف طرح کی ورزش کر رہا تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر دیکھ کر ایک دم سے بےزار ہو گیا۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''ہیلو۔''

''زوار خان صاحب کہاں ہیں آپ؟'' دوسری طرف سے ناصر علی نے پوچھا' جو کافی دنوں سے اس کے ساتھ میل جول بڑھائے ہوئے تھا۔

''میں ادھر ہی ہوں یار، جہاں روزانہ ہوتا ہوں۔''

''میں بھی ادھر پارک ہی میں ہوں۔ لیکن آپ نظر نہیں آ رہے ہیں۔'' ناصر علی نے ہنستے ہوئے پوچھا

''اب آپ پتہ نہیں کہاں پر ہیں۔'' اس نے کہا لیکن لہجے کا طنز نہ چھپا سکا۔

''چلیں میں آپ کو تلاش کر لیتا ہوں۔ آپ بتائیں کہاں ہیں' میں تو ادھر کینٹین کے پاس ہوں۔ کہیں تو آپ کے جوس بھی لے آؤں۔'' ناصر علی نے تیزی سے پوچھا تو بولا۔

''نہیں...... نہیں، آپ نے نہیں آنا۔ میں آتا ہوں تھوڑی دیر بعد آپ انتظار کریں۔''

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور پھر سے ورزش کرنے لگا۔ اس کے ذہن میں یہی تھا کہ ناصر علی کو اس سے کیا کام ہو سکتا ہے۔

کینٹین کے پاس ناصر علی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر انتظار والی کیفیت اور بےزاری چھائی ہوئی تھی۔ لیکن جونہی اس کی نگاہ زوار خان پڑی' اس کے چہرے پر بشاشت آ گئی۔ جانی ہے۔ وہ تقریباً بچھ جانے والے انداز میں اس کا استقبال ملا جبکہ زوار خان کا رویہ یوں تھا جیسے اس سے مل کر احسان کر رہا ہو۔

"میں کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔" ناصر علی نے یہ کہہ کر ہاتھ آگے بڑھایا تو زوار خان ڈھیلا سا ہاتھ بڑھا کر بولا۔

"آپ کو پتہ ہے ناصر صاحب۔! اس وقت بزنس کی باتیں کرنا۔ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ یہی تو تھوڑا سا وقت ہوتا ہے سکون لینے کا۔ اس میں بھی بزنس کی باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

"میں بھی تو آپ کے سکون کی بات کرنا چاہ رہا ہوں۔ دراصل دفتر میں آپ اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ تفصیل سے بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔" ناصر علی نے اپنی بات میں زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں خیر یہ تو ہے۔ دفتر میں تو سارا دن یوں گذر جاتا ہے کہ پھر ہوش تک نہیں رہتی۔ خیر آپ بتائیں آپ سکون کی کیا بات کر رہے تھے۔"

"سکون کی بھی اور ساتھ میں بزنس کی بھی۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا

اچھا کیا ہے وہ بات؟" زوار خان نے دلچسپی سے پوچھا تو ناصر علی نے کہا

"بات یہ ہے شاید آپ کے علم میں بھی ہو ہماری روہی کی جو ہاتھ سے بنی ہوئی مصنوعات ہیں بڑے شہروں میں حتیٰ دوسرے ممالک میں ڈیکوریشن کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہیں۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔ یہاں سے بہت سستی مل جاتی ہیں اور پھر آگے بہت مہنگے داموں فروخت ہوتی ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا

"بالکل میری ایک این جی او سے بات چل رہی ہے۔ وہ روہی کی مصنوعات کو ایکسپورٹ کریں گے۔ اسی طرح روہی میں چند لوگوں سے بات ہوئی ہے جو انتہائی سستے داموں مال تیار کروا دیں گے۔ یعنی چند روپے کی چیز سو روپے میں بیچیں گے۔ بزنس ہو تو ایسا ہو۔" ناصر علی نے بتایا تو زوار خان نے پوچھا "آپ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"بزنس۔!" یہ کہہ کر ناصر علی نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور لمحہ بھر بعد بولا "دیکھیں، میں اکیلا اتنا بڑا کام نہیں کر سکتا آپ اگر اس بزنس میں شامل ہو جائیں گے تو پھر سب کچھ آسانی سے ہو جائے گا۔ بزنس میں آپ کا نام ہے۔ آپ کی ساکھ ہے اور سرمایہ اس کی آپ کے پاس کیا کمی ہے۔"

"مطلب کام آپ کریں گے اور سارا سرمایہ میں لگاؤں۔ یہی چاہتے ہیں نا آپ؟"

"آپ میرے ساتھ ایک بار روہی چلیں۔ آپ کی آؤٹنگ بھی ہو جائے گی اور آپ خود اندازہ لگا لیں گے کہ اس بزنس میں کتنا فائدہ ہے۔ آپ بار بار روہی میں تو نہیں جاسکیں گے نا۔ میں سب سنبھال لوں گا۔" اس نے صلاح دی

"میں نے آپ سے کچھ پوچھا تھا۔" وہ بولا

"ظاہر ہے جی، میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے۔ پھر آپ کا تو امپورٹ ایکسپورٹ بھی ہے۔ سرمایہ تو آپ ہی لگائیں گے میں کام کروں گا۔ سارا کام میں کروں گا۔" ناصر علی نے کہا تو زوار خان بولا "چلیں۔ ادیکھ لیتے ہیں ایک عرصہ ہی گذر گیا ہے۔ میں روہی نہیں گیا۔ بڑا دل چاہتا ہے کہ گھوموں پھروں۔ بڑے ملک گھوما ہوں۔ لڑکپن میں شکار کھیلنے جاتے تھے روہی میں، مگر اب تو وقت ہی نہیں ملتا۔"

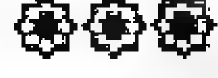
"آپ صرف دو دن نکال لیں میں نے سارا بندوبست کرایا ہوا ہے۔ پروگرام بھی ترتیب دے لیا ہے۔ وہاں بستیوں میں جائیں گے۔ خان سجاول کے پاس بھی چلیں گے۔" ناصر علی نے نے خوش ہوتے ہوئے کہا

"ہاں، وہ میرا بہت اچھا دوست ہے بہت دفعہ کہا اس نے آنے کے لیے لیکن پھر وہی تکلف، مہمان داری، لوازمات بندہ دوسرے کا محتاج ہو کر رہ جاتا ہے۔ بندہ روہی میں جائے تو اس کا اصل حسن دیکھے۔ روہی کا اصل حسن تو اس کا سکون ہے۔" زوار

خان سجانے کہا کھو گیا تھا۔

"ہمارا اصل مقصد تو روہی کی مصنوعات دیکھنا ہے نا۔ پھر آپ جیسا چاہیں گے ہوگا تو ویسے ہی ۔خان سجاول کے مہمان ٹھہرنا ہے تو ٹھیک، نہیں تو نہ سہی۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ دیکھتے ہیں دفتر جا کر ہی پتہ چلے گا کہ میں دو دن نکال بھی سکتا ہوں یا کہ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا تو ناصر علی بھی ساتھ میں اٹھ گیا۔ بھی وہ دونوں باتیں کرتے پارک سے نکلتے چلے گئے۔



زوار خان کی بیوی پروین ذرا سی گھبرائی ہوئی ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑی' میز پر پڑی چیزوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے قریب ملازم کھڑا تھا۔

"یہ جام' انڈے بھی اور یہ توسٹ ..... یہ بھی ٹھیک ہیں۔ بس تم چائے فوراً بنا لانا، اور اگر انہوں نے برا تھا کہا تو ...... بس تم بنا ابھی بنا لاؤ۔ یہ جوس فریش بنایا ہے نا؟"

"بی بی جی۔ مجھے آپ کے ہاں اتنا عرصہ ہو گیا کام کرتے ہوئے کبھی غلطی ہوئی۔ آپ تو روزانہ یونہی پریشان ہو جاتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ صاحب کیا پسند کرتے ہیں۔ میں ہر چیز بنا کر رکھ دیتا ہوں۔" ملازم نے مودب انداز میں کہا۔

"ان کا خیال کرنا میرا فرض ہے۔ کیا مجھے نہیں دیکھنا چاہیے۔ اب دیکھو۔ غلطی ہو گئی ہے نا۔ ٹیبل پر اخبار نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے گھبراتے ہوئے بولی" جلدی سے لاؤ، کہاں ہے اخبار؟"

"بی بی جی! ابھی تک اخبار آیا ہی نہیں ہے۔ جونہی اخبار آیا میں ٹیبل پر رکھ دوں گا۔" ملازم نے سکون سے بتایا تو پروین نے اسی گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا" پتہ کرو، کیوں نہیں آیا۔ تمہیں تو پتہ ہے صاحب جلدی گھبرا جاتے ہیں۔ ابھی میں نے زارا کو بھی تیار کرنا ہے۔ صاحب بھی آتے ہوں گے۔ آج انہیں آفس سے بھی دیر ہو گئی ہے۔"

"آپ زارا بی بی کو تیار کریں۔ میں ادھر ہی ہوں۔ صاحب کو ضرورت پڑی تو میں حاضر ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ یہاں ہر شے موجود ہے۔" ملازم کا وہی اطمینان تھا۔

"اچھا اچھا۔ زیادہ باتیں نہ کر۔ میں ابھی زارا کو دیکھتی ہوں صاحب بھی آنے والے ہوں گے۔" یہ کہہ کر وہ چل دی۔ اتنے میں پھر رکتی ہے اور یاد دلانے والے انداز میں کہا" وہ اخبار....."

"جی بی بی جی۔ میں دیکھتا ہوں۔" ملازم نے ذرا سا جھکتے ہوئے کہا تو پروین اندر کمرے میں چلی گئی۔

جس وہ زارا کو تیار کر کے اندر سے آئی اس وقت زوار خان آفس جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا اور ملازم ایک طرف بڑا مودب کھڑا تھا۔ تبھی اس کی لاڈلی بیٹی زارا نے اپنے پاپا کو دور ہی سے دیکھ کر کہا

"اسلام علیکم پاپا!"

زوار خان اخبار سے نگاہیں ہٹائیں اور پھر خوش ہو کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"وعلیکم اسلام۔ کیسی ہو میری پیاری بیٹی۔"

اس دوران زارا کرسی پر بیٹھتی ہوئے بولی

"میں ٹھیک ہوں پاپا۔"

"چلو جلدی سے ناشتہ کرو۔ سکول سے دیر ہو رہی ہے۔" پروین نے تیزی سے کہا تو زارا ناشتہ کرنے لگی ۔زوار خان اخبار میں مگن چائے پی رہا تھا کہ ملازم نے پوچھا

صاحب!اور کچھ چاہیے؟"

"نہیں تم جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ اپنی بیوی کی جانب متوجہ ہو کر پوچھا" بیگم۔ تم کوئی بات کرنا چاہ رہی تھی مجھ سے۔ کیا بات تھی؟"

"اوہ! آپ آفس سے واپس آ جائیں تو پھر

اطمینان سے بات کریں گے۔ اس وقت تو......" اس نے گھبرائے انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی تو زوار خان نے مسکراتے ہوئے پوچھا

"پھر بھی کہو میں سن رہا ہوں۔"

"وہ میں نے کل ایک سیٹ دیکھا تھا جیولر کے پاس۔ مجھے بہت پسند آیا ہے۔ تھوڑا مہنگا ہے۔ اس لیے میں آپ سے پوچھنا چاہ رہی تھی۔"

"تو خرید لو میرے خیال میں اتنی رقم تمہارے اکاؤنٹ میں پڑی ہوئی ہے۔ جس سے تم یہ سونے کا سیٹ خرید سکتی ہو۔" اس نے لاپروائی سے کہا

"نہیں رقم تو بہت ہے۔ میں بس آپ سے اجازت لینا چاہ رہی تھی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی

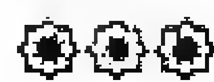
"ٹھیک ہے میں نے دی اجازت اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر زوار خان نے اپنی ریسٹ واچ دیکھی اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ پروین بھی جلدی سے اٹھی او راسے بیگ اٹھا کر دیا۔ وہ قدم بڑھانے لگا تو زارا نے اونچی آواز میں پیار سے کہا

"آئی لو یو پاپا۔"

"او آئی لو یو بیٹی۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے زارا کو پیار سے تھپک کر اپنے ساتھ لگایا اور پھر باہر کی جانب چل دیا۔ پورچ میں گاڑی کے اندر بیٹھنے تک اس کی پیار بھری آواز زوار خان کے کانوں میں گونجتی رہی۔



روہی کے لق و دق صحرا میں وہ بستی زندگی کی علامت معلوم ہو رہی تھی۔ جس کے ایک کچے گھر کے صحن میں ایک جانب بکرے اور بکریاں بندھیں ہوئی تھیں اور دوسری جانب چولھے کے پاس جوان سی تاجاں مائی روٹی بنانے کے لیے آگ جلانے میں مصروف تھی۔ چولھے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس نے آگ جلاتے آہٹ پر باہر والے دروازے کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چودہ برس کے بیٹے سانول کے ہاتھوں میں تھوڑا سا چارہ تھا۔ وہ سیدھا جانوروں کے پاس گیا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا تھوڑا سا چارہ ایک چھوٹے سے بکرے کے آگے بڑے پیار سے رکھ کر اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"کھا...کھا...... مینڈا ڈھولن کھا۔"

بکرا بڑے شوق سے کھانے لگا تو وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ چند لمحے اسے یونہی کھاتا دیکھتے رہنے کے بعد وہ اٹھا اور تاجاں کے پاس پڑی چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ تبھی تاجاں نے ہنستے ہوئے پوچھا

"نہ...تو اس کے کھانے کے لیے تو لے آیا ہے۔ باقی اتنے جانور بے چارے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ان کے لیے تو کچھ لایا کر۔"

"او اماں! اس سے مجھے بہوں پیار ہے۔ اس وچارے کی ماں نہیں ہے نا۔ باقی سارے تو باہر جا کر چر لیتے ہیں۔ اب میں اس کا خیال نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔ مجھے یہ چنگا بھی تو بہوں لگتا ہے نا۔" سانول نے مسکراتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

سانول واقعی بہت معصوم تھا۔ روہی میں رہنے والا صاف دل کا پیارا سا لڑکا تھا۔ تاجاں نے اپنے بیٹے کو پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس میں ایسی کیا خاص بات دیکھ لی ہے۔ تو نیو تجھے بہوں چنگا لگتا ہے؟"

"دیکھ اماں! اس کا رنگ دیکھ۔ اس کے طور طریقے دیکھ۔ جب یہ اجڑ کے ساتھ باہر جاتا ہے نا۔ تو وہاں بہوں شرارتیں کرتا ہے۔ دیکھنا یہ کتنا سوہنا جانور بنے گا۔ پیر سائیں کے میلے پر میں نے مقابلہ جیتنا ہے۔" سانول نے بڑے فخر اور پیار سے کہا

"اچھا چل۔ ہتھ منہ دھو تے دل آ کے روٹی کھا لے۔ میں نے تیرے لیے پکائی ہے۔ تو کھا اور لے جا اجڑ کو۔"

"تو میرے ساتھ نہیں کھائے گی کیا۔ تجھے کتنی

دفعہ کہا ہے کہ اپنی بھی پکا لیا کر۔ اس وقت تو میرے ساتھ بیٹھ کر کھا لیا کر۔ کہتے ہیں رل کر روٹی کھائیں تو برکت ودھ جاتی ہے۔" سانول نے منہ بسورتے ہوئے کہا تو تاجاں تیزی سے بولی

"نہ.... میں نے بڑے کام کرنے ہیں۔ سارے گھر کے کام تو مجھے کرنے پڑتے ہیں۔ تو روٹی کھا اور اجڑ لے جا۔ پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔ اور شام کو جلدی آ جایا کر۔ میں سارا دن اکیلی ہوتی ہوں۔ اس کا تمہیں خیال ہی نہیں آتا۔"

"اچھا..... اچھا ناراض نہ ہو اماں مجھے روٹی دے دو میں جاؤں۔" اس نے ماں کی ناراضگی سے بچنے کی خاطر تیزی سے کہا۔

"منہ ہاتھ تو دھولے۔" ماں نے یاد دلایا تو سانول مسکراتے ہوئے اٹھ گیا۔ تاجاں کی توجہ روٹی بنانے کی جانب ہو گئی۔

اس وقت سانول اپنا ریوڑ گھر سے باہر نکال رہا تھا جب تاجاں اندر سے ایک چھوٹی سی پوٹلی ہاتھ میں لیے باہر نکلی۔ پھر وہ پوٹلی سانول کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

"لے سانول روٹی۔ میں نے ساتھ میں اچار اور گڑ رکھ دیا ہے۔"

"تو میرا کتنا خیال رکھتی ہے اماں۔" سانول نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پر تو میرا خیال نہیں رکھتا۔ شام کو جلدی گھر نہیں آتا۔ تیرے باپ کو گئے ہوئے بھی تین دن ہو گئے ہیں اپنی دھی کے پاس۔ وہ ہوتا ہے نا تو مجھے فکر نہیں ہوتی۔" تاجاں نے اداس ہوتے ہوئے کہا۔

"او اماں! بابا آج نہیں تو کل آ جائیں گے۔ تو فکر نہ کر۔ اپنی سہیلیوں کو بلا لیا کر تیرا دل لگا رہے گا۔" سانول نے ہنستے ہوئے کہا۔

"وہ تو میرو آ جاتی ہے۔ پر تو جلدی آ جانا۔ سارا دن اپنے اس ڈھولن کے ساتھ گیت گاتے رہنا۔"

تاجاں نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا تو سانول نے اس چھوٹے سے بکرے کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو میرا بڑا دل لگاتا ہے۔"

"اچھا اب سارا دن یہیں رہے گا۔ یا اجڑ چرانے جائے گا بھی۔" ماں نے اسے یاد دلایا۔

"جا رہا ہوں ناں۔" یہ کہہ کر اس نے تاجاں کی طرف پیار سے دیکھا۔ تاجاں بھی دروازے کے کواڑ کے ساتھ لگ کر اسے بڑے مامتا سے دیکھنے لگی۔ سانول مختلف آوازیں نکالتا ہوا اجڑ کو لے کر چل دیا۔

سانول اپنا ریوڑ لے مختلف راستوں سے ہوتا ہوا بستی کے باہر نکل گیا۔ اس کا رخ کھلے صحرا کی طرف تھا۔ بستی سے باہر پیر سائیں کا مزار تھا۔ جو کافی اونچا اور بڑا تھا۔ وہ یہاں سے گذرتے ہوئے بابا سائیں سے روزانہ مل کر جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ مزار کے پاس اپنا ریوڑ لے کر پہنچ گیا۔ ریوڑ وہاں کھلے میدان میں چرنے لگا اور سانول اپنے ڈھولن یعنی چھوٹے بکرے کو لے کر مزار کے احاطے کی جانب بڑھا۔

مزار کے احاطے میں کافی سارے لوگ تھے۔ ان میں ایک بزرگ جو جذب کی کیفیت میں بیٹھا ہوا تھا۔ لمبے قد کا سانولے رنگ اور سفید بالوں والا لال بابا کبھی بہت خوبصورت اور وجیہہ رہا ہوگا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ سانول اس بزرگ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ڈھولن اس کے پاس گود میں تھا۔ بزرگ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا

"او آ سانول آ۔ کیا حال ہے تیرا۔ اور تیرے اس ڈھولن کا۔"

"سبھوں چنگا حال ہے۔ میرا بھی اور اس ڈھولن کا بھی۔ بس میں تو سلام کرنے آیا تھا۔" سانول نے مودب انداز میں کہا تو بابا سائیں نے پوچھا۔

"تو روز یہاں آتا ہے۔ یہ تیری سعادت مندی ہے پتر اور سنا۔ تیری اماں ٹھیک ہے۔ گھر بار ٹھیک ہے۔"

"سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ دعائیں ہیں آپ

کی آپ اس ڈھولن کا خیال کریں۔ میں حاضری دے آؤں۔" ساتول نے کہا۔

"ہاں..... ہاں جاؤ۔" بابا سائیں بولا تو ساتول نے ڈھولن کو وہیں چھوڑا اور خود مزار کی جانب بڑھ گیا۔ بابا سائیں ڈھولن کو پیار کرتے ہوئے اس کے جسم پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک دم سے بے چین ہو گیا۔ اسی دوران ایک آدمی بابا سائیں کے پاس آ گیا۔ اس نے بیٹھتے ہی کہا۔

"جی بابا سائیں اب بتائیں کیا فرما رہے تھے روہی کے بارے میں؟"

"میں یہ کہہ رہا تھا بیٹا کہ روہی۔ کا اصل حسن، اس کا سکون ہے۔ خاموشی؛ جس کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ اس خاموشی میں انسان خود اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ وہ باتیں، جو اس پر وارد ہوتی ہیں۔"

"وہ کیسے بابا سائیں۔ یہ روہی کے ماحول کا اثر ہوتا ہے۔" اس آدمی نے تجسس سے پوچھا۔

"بالکل کیوں نہیں۔ ہر حساس انسان پر روہی کے ماحول کا۔ اس کی فضاؤں کا۔ اس کی ہواؤں کا اثر ہوتا ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ روہی میں چلنے والی ہوا میں بھی انسان سے باتیں کرتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ وہ انسان ان ہواؤں کا پیغام سننا جانتا ہو۔" بابا سائیں نے کہا تو آدمی بولا "یہ شرط ہر بندہ تو پوری نہیں کر سکتا نا۔ اب کسی کو کیا معلوم کہ ہواؤں کا پیغام کیسے سنا جاتا ہے۔"

"یہ باتیں دماغ سے نہیں سنی جاتیں۔ بلکہ انہیں دل سے محسوس کیا جاتا ہے۔ اصل میں روہی کو سمجھنے کے لیے اس کے ساتھ دل لگانا پڑتا ہے۔ جیسے بزرگوں نے فرمایا ہے نا کہ عشق کی سمجھ عشق ہی عطا کرتا ہے۔ بالکل ایسے روہی بھی اپنی سمجھ خود دیتی ہے۔ عام آدمی کو تو یہ روہی ویرانہ دکھائی دیتی ہے۔ لیکن خواجہ غلام فرید سائیںؒ نے اس روہی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے۔ اسے تو دیکھو وہ یونہی نہیں کہہ دی گئیں۔ یہ ان کا مشاہدہ ہے جو کلام میں بول رہا ہے۔"

"خواجہ سائیںؒ نے تو روہی کو پر بہار جگہ بتائی ہے۔ ایسی جگہ۔ جہاں عشق ہی عشق ہے۔ حقیقی عشق۔ جو بندے کو اپنے خدا سے ملا دیتا ہے۔" آدمی نے پوچھا تو بابا سائیں نے کہا۔

"بندہ۔ خدا سے ملتا تو چاہیے۔ پھر دیکھو کیا کیا رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔"

اسی دوران ساتول آیا اور اس نے خاموشی سے ڈھولن کو لیا اور مزار کے احاطے سے نکلتا چلا گیا۔



زوار خان اپنے آفس میں فائل پڑھ رہا تھا کہ اچانک اس کے چہرے پر غصہ لہرانے لگا۔ اس نے بیل دی تو اس کے جواب میں آفس بوائے کسی جن کی مانند آ گیا تو زوار خان نے غصے میں آفس بوائے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"او ڈیوایا! جاؤ شاہد صاحب کو تو بھیجو۔"

"جی سر! میں ابھی ساتھ لے کر آتا ہوں۔"

"میں نے شاہد صاحب کو یہاں بھیجنے کے لیے کہا ہے۔ انہیں لے کر آنے کو نہیں کہا۔ تمہیں بات کی سمجھ نہیں آئی۔" زوار خان نے غصے میں بھڑکتے ہوئے کہا تو آفس بوائے تیزی بولا۔

"جی..... جی آ گئی ہے سمجھ۔"

یہ کہتے ہوئے وہ کھسیانا سا ہو کر باہر کی جانب چلا گیا اور زوار خان پھر سے فائل پڑھنے لگا۔ چند لمحوں بعد ایک نوجوان شاہد صاحب اپنی عینک درست کرتے ہوئے اندر آ کر پوچھا۔

"جی سر! آپ نے مجھے یاد کیا۔"

"ہاں بیٹھو۔" زوار خان نے کہا

"شکریہ۔" اس نے مہذب انداز میں کہا اور اپنی ٹائی درست کرتا ہوا سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے آپ پہلے یہ بتائیں آپ لوگ یہاں تنخواہ

کس کام کی لیتے ہیں۔ ٹھیک کام کرنے کی یا غلط کام کر کے مجھے پریشان کرنے کی۔" زوار خان نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"سر! یہ...... یہ...... کیا کہہ رہے ہیں آپ' کچھ سمجھا نہیں۔" وہ ایک دم سے پریشان ہو گیا۔

"اگر آپ کو عقل سمجھ ہوتی تو یہ بات پوچھنے کا موقع ہی نہیں آتا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ اس کام کو بہت اچھی طرح کر لیں گے۔ لیکن نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکا۔" زوار خان کا لہجہ ہنوز وہی تھا۔

"سوری سر! میں اب بھی نہیں سمجھ سکا۔ آخر ایسا کیا ہو گیا جو آپ......" اس نے پوچھا تو زوار خان اس کی طرف فائل بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اس فائل کو دوبارہ دیکھیں۔ اس میں آپ نے کتنی غلطیاں کی ہیں۔ یہ پراجیکٹ کروڑوں کا ہے۔ آپ ایک سوری کہہ کر جان چھڑا لیں گے۔ مجھے کتنا نقصان ہو گا۔ اس کا اندازہ ہے آپ کو؟" زوار خان نے اکتاتے ہوئے کہا تو شاہد نے فائل پکڑتے ہوئے کہا۔

"میں دیکھ لیتا ہوں جی دوبارہ۔ ویسے میں نے یہ پراجیکٹ ویسے ہی بنایا ہے۔ جیسا آپ نے کہا تھا۔" شاہد نے حیرت سے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"کیا خاک بنایا ہے آپ نے۔ ابھی آپ جائیں اسے دیکھیں۔ میں نے کچھ جگہوں پر نشاندہی کر دی ہے۔ پھر آپ آ کر مجھ سے ڈسکس کریں۔ جائیں۔"

"جی ٹھیک ہے۔" وہ اطمینان سے بولا، فائل ہاتھ میں لی اور اٹھ کر باہر کی جانب چل دیا۔ زوار خان نے بہت گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

شاہد دفتر سے باہر آیا تو سیکرٹری زینی نے مسکرا کر شاہد کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"خیریت شاہد صاحب۔! آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ......"

"پتہ نہیں صاحب کو کیا ہو گیا ہوا ہے۔ اچھا بھلا پراجیکٹ بنایا ہے۔ اس میں خامیاں نکال کر فائل مجھے تھما دی ہے۔ لگتا ہے آج خاصے غصے میں ہے۔ تم بھی ذرا احتیاط کرنا۔" اس نے الجھے ہوئے انداز میں کہا تو زینی اسی مسکان سے بولی "میں کر لوں گی احتیاط، اور ان کا غصہ ٹھنڈا بھی ہو جائے گا۔ آپ گھبرائیں مت، سکون سے اپنا کام کریں۔"

"او کے۔" اس نے کاندھے اچکا کر کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ زینی مسکراتے ہوئے اسے دیکھتی رہی پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔

زوار خان پریشان سا بیٹھا انگلیوں سے اپنا ماتھا مسل رہا تھا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ تبھی زینی اندر آ کر بڑی لگاوٹ سے بولی۔

"سر! میں اندر آ جاؤں۔"

زوار خان نے اس کی جانب دیکھا اور پھر چونک کر مسکراتے ہوئے سر کے اشارے کے ساتھ کہا۔

"آؤ...... آؤ...... زینی آؤ بیٹھو۔"

وہ بڑی ادا سے آگے بڑھی اور سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"سر! لگتا ہے کہ آپ پریشان سے ہیں، کیا ہوا؟"

"یہ شاہد۔ میں اس سے بہت اکتا گیا ہوں۔ کام ہی نہیں کرتے یہ لوگ۔ ایک چھوٹا سا کام ان کے ذمے لگایا تھا۔ یہ بھی نہیں ہو رہا ان سے۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا تو زینی ادا سے بولی "اچھا چھوڑیں انہیں۔ میں آپ کے لیے کافی لے کر آتی ہوں تاکہ آپ تھوڑا ریلیکس محسوس کریں۔"

"تم تھوڑی دیر یونہی باتیں کرتی رہو۔ میں ریلیکس ہو جاؤں گا۔ سناؤ، کیا ہو رہا ہے آج کل۔" زوار خان نے پیار بھرے لہجے میں مسکرا کر کہا

"ہونا کیا ہے سر۔ میرے گھر والے میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں ابھی نہیں کرنا چاہتی۔"

وہ اداسی سے بولی تو زوار خان نے تیزی سے پوچھا "کیوں؟ کیا وجہ ہے؟"

"سر! یہاں کتنا اچھا وقت گزرتا ہے۔ آپ ہیں۔ آپ کے ساتھ کام کر کے بہت اچھا لگتا ہے۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے آپ سے۔" اس نے روہانسے والے انداز میں کہا۔

"ویسے تم اپنا کام بہت اچھی طرح کرلی ہو۔ اور آج تم نے ڈریس بھی بہت اچھا پہنا ہوا ہے۔" زوار خان نے اس کا بھرپور نگاہوں سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"سر! تھینک یو۔ یہ آپ ہی کی پسند کا ہے۔ آپ کو شاید یاد نہیں، جب ......" اس نے معصومیت سے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"ارے ہاں یاد آیا۔ ایک دوست کی تجویز ہے۔ روسی کی مصنوعات کے لیے۔ کیا تم میرے ساتھ روسی چلوگی۔ تم بھی اپنی کوئی رائے دینا۔"

زیبی چند لمحے سوچ کر یوں بولی جیسے اس پر احسان کر رہی ہو۔

"جی۔ جیسے آپ چاہیں۔ میں تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد میرے دوست آئیں گے۔ ہم میں اگر طے ہوگیا تو میں بتادوں گا۔" اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو زیبی خمار آلود لہجے میں بولی۔

"جی مجھے بتادیجئے گا۔"

"اچھا اور سناؤ۔ کیا حال ہے کیا ہو رہا ہے۔" زوار خان نے دھیمے لہجے میں پیار سے پوچھا تو زیبی ذرا سا شرماتے ہوئے اٹھ گئی۔ وہ بھی اس کی ادا دیکھ کر کھلکے سے ہنس دیا۔

کچھ ہی دیر بعد زوار خان آفس میں بیٹھا ایک نئی طرح کی فائل پڑھ رہا تھا۔ اس کے سامنے ناصر علی بیٹھا ہوا منتظر تھا کہ وہ اس پر کیا فیصلہ دیتا ہے۔ چند لمحوں بعد زوار خان نے فائل بند کرتے ہوئے طویل سانس لے کر کہا۔

"آپ کی یہ تجویز اچھی تو بہت ہے لیکن اس بزنس کا سارا دارومدار اس پر ہے کہ آپ کو روسی سے مال وقت پر اور سستا ملے۔ دوسری طرف غیر ممالک میں بک بھی جائے۔ تبھی کچھ فائدہ ممکن ہے۔"

"وہی تو۔ آپ صرف ایک چھوٹا سا وزٹ کر لیں روسی کا۔ آپ خود حیران ہوں گے کہ وہاں کے لوگ اپنی مصنوعات فروخت کرنے کے لیے کس قدر بے تاب بیٹھے ہیں۔ غربت ہے نا وہاں پر۔ آپ خود دیکھیں گے نا۔ تو ساری صورت حال سمجھ میں آجائے گی اور مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کو میری تجویز بہت اچھی لگے گی۔" ناصر علی نے دلیل دیتے ہوئے کہا تو زوار خان سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے ناصر صاحب۔ ہم دیکھ لیں گے اور پھر اس پر ہم کوئی فیصلہ کرلیں گے۔"

"میں تو کہتا ہوں کہ آپ صرف ایک دن اور ایک رات نکالیں۔ اگر آپ کو میری اس تجویز میں کوئی دم نظر آئے تو میں وہاں اور دوسرے کئی لوگوں سے آپ کو ملوا دوں گا۔ پھر آپ کی مرضی۔ آپ وہاں جتنا چاہیں وقت گزاریں۔ چاہیں تو اپنے دوست سے بھی مل لیں۔" اس کی رائے پر زوار خان نے پوچھا

"کب چلیں؟"

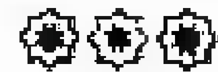
"میری طرف سے تو چاہے آپ ابھی چلیں۔ وہاں روسی میں کون سا کسی ڈیلیگیشن (Deligation) سے ملنا ہے جس کے لیے تیاری کی ضرورت ہے۔" ناصر علی جوش سے کہا تو یہ سن کر وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

"اوکے۔ ہم ابھی کچھ دیر بعد چلتے ہیں۔ کیا آپ تیار ہیں اس کے لیے؟"

"چلیں۔ میں نے کیا تیاری کرنی ہے۔ آپ کے ساتھ بیٹھوں گا اور چل دوں گا۔" وہ تیزی سے بولا

"ہاں۔ تھوڑی آؤٹنگ بھی ہو جائے گی اور آپ کے کہنے کے مطابق بزنس کی بات ہو جائے گی۔" یہ

کہتے ہوئے اس نے انٹر کام پر سیکرٹری کو بلایا
"یہاں آؤ۔"
چند لمحوں بعد سیکرٹری نے آکر کہا
"جی سر۔"
"دیکھو، میں بزنس کے ہی معاملے میں روہی جا رہا ہوں۔ ممکن ہے ایک دو دن لگ جائیں۔ مجھے بتاؤ ان دنوں میں کوئی اہم میٹنگ تو نہیں ہے" زوراخان نے پوچھا
"کل شام کو ہے۔" سیکرٹری نے بتایا
"اچھا! چلو اسے دیکھ لیں گے اور وہ شاہد صاحب سے کہہ دینا کہ کل تک پراجیکٹ تیار ملنا چاہئے۔" اس نے تیزی سے کہا
"جی ٹھیک ہے۔ مزید کچھ۔" سیکرٹری نے پوچھا
"نہیں اب تم جاؤ۔" اس نے سیکرٹری کو اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر روشن ناصر علی کی طرف کر کے بولا۔"میں گھر فون کر دوں۔ پھر وہیں سے ہوتے ہوئے نکل چلتے ہیں۔"
یہ کہہ کر اس نے اپنا سیل فون اٹھالیا۔



تاجاں مائی صحن میں دھری چارپائی پر بیٹھی تھی۔ اس کی پائینتی کی طرف بستی کی ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں بیٹھی کپڑا کاڑھتے ہوئے باتیں بھی کرتی چلی جارہی تھیں۔
"یہاں تمہارے گھر میں تو بہوں سکون ہے۔ میں سارے دن میں اتنا کام نہیں کر سکتی جتنا یہاں تھوڑی دیر میں کرلیا ہے۔" وہ لڑکی رسان سے بولی۔
"لیکن، میرا بہوں دل گھبراتا ہے۔ سانول ہوتا ہے تو دل لگا رہتا ہے۔ اب وہ انجو لے کر چلا جاتا ہے نا۔ وہ ہو تو پھر میں اس سے باتیں کرتی رہتی ہوں آج اس لیے تو تمہیں بلایا ہے۔" تاجاں مائی بولی۔
"تو مجھے روزانہ بلا لیا کر۔ کپڑے کاڑھنے کے لیے ڈھیر پڑا ہوا ہے میرے پاس میں چاہتی ہوں کہ جلدی یہ کام ختم ہو جائے۔" لڑکی نے صلاح دی تو تاجاں مائی نے ہنستے ہوئے کہا۔
"اور جو پیسے آئیں۔ وہ تیری شادی پر کام آئیں، ہے ناں یہی بات۔"
"ہاں۔ تجھے تو پتہ ہے ہم غریب لوگ ہیں۔ محنت ہی کرنی ہے اب یہ ہنر سیکھا ہے تو کچھ فائدہ تو ہونا چاہئے ناں۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔
"چل تو پریشان نہ ہو۔ اللہ سائیں بڑی مدد کرے گا۔ دیکھو! کام تو کرنا پڑتا ہے۔" تاجاں مائی نے اسے سمجھایا تو لڑکی بولی۔
"سانول کا بابا تم سے بہوں پیار کرتا ہے۔ تو نہ بھی کام کرے تو بھی تم آرام سے گزر بسر کر سکتی ہو۔"
"ہاں پیار کرتا ہے۔ آج کل تو اپنی دھی کے پاس گیا ہے لیکن دن رات محنت کرتا رہتا ہے۔ میرا شوہر ہے بہوں چنگا۔" وہ پیار بھرے لہجے میں بولی۔
"شادی سے پہلے سنا تھا کہ سانول کا بابا شہر جا کر کام کرنا چاہتا ہے۔ اب تو ایسا نہیں کہتا۔"
"نہیں۔ اب کیوں کہے گا۔" تاجاں مائی یہ کہہ کر زور سے ہنس دی۔ لڑکی بھی ہنسنے لگی۔ محبت اور خلوص میں بھیگی ہوئی یہ ہنسی جیسے پورے صحرا میں پھیل گئی ہو۔
بستی کے باہر روہی کے صحرا میں جنڈ کے درخت کے نیچے سانول اپنے ڈھولن کو لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ باقی جانور ادھر ادھر چر رہے تھے۔ سانول ڈھولن کو پیار کرتے ہوئے ساتھ میں خواجہ سائیں کی کافی بھی گا رہا تھا۔
"روہی رنگ رنگیلڑی۔ جیڑی یار ملا وے۔"
(یہ رنگوں بھری روہی ہی تو ہے جو یار سے ملا دیتی ہے۔)
اس دوران ڈھولن مچل بھی رہا تھا۔ جب وہ زیادہ ہی مچلنے لگا تو سانول نے پیار سے کہا" اوئے۔ کھتاں چلا ہے تو میرے پاس بیٹھ۔ ہم باتیں کرتے ہیں۔ دیکھ تو زیادہ شرارتیں نہ کیا کر۔ میرے پاس بیٹھ کر باتیں

کیا کر۔ میری اماں نا...... مجھے پتہ ہے وہ تم سے پیار نہیں کرتی۔ پر کوئی بات نہیں، میں جو ہوں۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ تو اس کا غصہ کیا کر۔ بس تو جلدی سے بڑا ہو جا۔ پٹھہ جوان بن جا۔ پھر میں تجھے میلے میں لے کر جاؤں گا۔ ساری روہی میں تو پہلے نمبر پر آئے گا۔ ہمیں انعام ملے گا۔ ٹھیک ہے نا۔“

ساتول کے ہاتھ ذرا سے نرم ہوئے تو اتنے میں ڈھولن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بھاگ نکلا۔ ساتول اس کے پیچھے بھاگا۔

”اوئے...... اوئے کدھر جا رہا ہے؟“

ساتول اس کے پیچھے بھاگ کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا۔ یہی ان کا روزانہ کا کھیل تھا۔ وہ ہنستا ہوا اس کے ساتھ شرارتیں کرتا رہتا تھا۔

سہ پہر کا وقت ہو گیا تھا۔ ساتول اپنا ریوڑ لے کر راہگذر سے ہٹ کر چلا آ رہا تھا۔ ڈھولن بھی بھاگتا پھرتا ساتھ جا رہا تھا۔ ساتول مخصوص آوازیں نکالتا ہوا ریوڑ لے جا رہا تھا۔ اس کے پس منظر میں گاڑی آ رہی تھی۔ ساتول اپنا ریوڑ سنبھالنے لگا۔ گاڑی قریب آ رہی تھی۔ ایک دم ڈھولن بھٹکتا ہوا پکی سڑک کے درمیان چلا گیا۔ ساتول لپک کر اسے پکڑنا چاہتا تھا کہ وہ گاڑی میں جا لگا۔ گاڑی کی بریک چلنے لگی اور ڈھولن کی کراہ بعد میں نکلی۔ ساتول بھاگ کر ڈھولن تک جا پہنچا اور اسے اپنی گود میں لے کر سہلانے لگا۔ زوار خان انتہائی غصے میں گاڑی سے نکلا اور ساتول کے پاس چلا آیا جو آزردہ اور پریشان ڈھولن کو ہوش دلا رہا تھا۔

”اتنی جگہ چھوڑ کر پھر بھی تم لوگ سڑک کے درمیان چلتے ہو۔ پتہ ہے، گاڑی بھی آ رہی ہے۔ پھر بھی اتنی عقل نہیں کہ بندہ راستہ ہی چھوڑ دے۔ ہٹ جائے پرے۔ اسی لیے، اسی لیے یہاں کے لوگ ترقی نہیں کر سکتے۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلتا۔ انہیں کرنا کیا ہے۔ اور کیا نہیں کرنا۔“ زوار خان غصے میں پھنکار رہا تھا جبکہ ساتول نے اس کی سنی ہی نہیں، بس ڈھولن کو دیکھتا رہا جس نے ذرا سی حرکت کی تھی۔ ساتول کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر زوار خان نے جیب سے پرس نکالا اور ایک بڑا نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھاتے حقارت سے کہا۔

”یہ لو۔ اپنے اس جانور کا علاج......“

”نہ سائیں، نہ یہ جانور نہیں۔ میرا ڈھولن ہے ڈھولن۔“ ساتول نے رو دینے والے لہجے میں کہا اور یہ کہتے ہوئے ڈھولن کو گود میں اٹھائے ہوئے چل دیا۔ وہ نوٹ کی جانب متوجہ نہیں ہوا۔ زوار خان ہونق سا وہاں کھڑا رہ گیا اور ساتول اپنے ریوڑ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ تو ناصر علی نے کہا ”چلیں چھوڑیں خان صاحب۔ آئیں چلیں۔“

”آئیں سر! پہلے ہی بہت دیر ہو رہی ہے۔“ زیفی نے کہا تو زوار خان سر جھٹکتے ہوئے واپس ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

زوار خان کی گاڑی ایک بستی میں آ رکی۔ وہاں موجود لوگوں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ سب گاڑی سے نیچے اتر آئے تھے اور وہاں پڑی چارپائیوں کی جانب بڑھے۔ انہیں بڑی عزت سے بٹھاتے ہوئے ایک مقامی آدمی نے کہا۔

”ادھر...... سائیں ادھر آ کر بیٹھو۔“

”آؤ وے سائیں۔“ دوسرا آدمی آگے بڑھا تو ناصر علی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا ”دیکھ لو۔ ہم اپنے وعدے کے مطابق آ گئے ہیں۔ اب جو تم نے ہمیں دکھانا ہے دکھا دو۔“

”سائیں! آپ ابھی آئے ہو۔ کچھ کھاؤ، پیو۔ ول ساری گل کر لیں گے۔ سب کو ادھر بلا لیں گے۔ آپ تھوڑی دیر آرام کرو۔ سب ہو جائے گا۔“

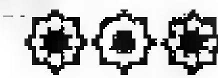
وہ تینوں بیٹھ گئے تو روہی کے آدمی ادھر اُدھر ہو گئے۔ ایک آدمی ان کے پاس بیٹھ گیا۔ زوار خان بڑے گہرے انداز میں سامنے وسیع ریگستان کو دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے۔ ان کے سامنے ایک چارپائی پر روہی کی مصنوعات پڑی ہوئی تھیں، جن میں مختلف کپڑوں کے نمونے۔ اونٹ کی اون کے کمبل۔ چادریں اور چنگیر وغیرہ تھیں۔ اور وہ تینوں انہیں دیکھ رہے تھے۔ تبھی ناصر علی زوار کو چنگیر دکھاتے ہوئے بولا۔

''دیکھیں۔ یہ کتنی خوبصورت ہے۔ اس کا ڈیزائن کتنا دلکش ہے۔ اسے (چنگیر) آپ ڈیکوریشن پیس کے طور پر دیکھیں۔ دیوار پر یہ کیسے لگے گی۔''

زوار اسے تنقیدی نگاہوں سے دیکھنے لگا تو زینی بولی "اچھی ہے۔ اس کے کلر بہت خوبصورت ہیں۔ ڈیزائن بھی بہت اچھا ہے۔''

''یہ اور بھی دیکھیں۔'' ناصر علی نے ایک کمبل اٹھا کر دکھایا۔ تو زوار خان بڑی توجہ سے وہ مصنوعات دیکھتا رہا۔



ساتول اپنے گھر میں انتہائی اداس صورت لیے بیٹھا ہوا تھا اور اس کے پاس تاجاں مائی تھی۔ ان دونوں کے درمیان چارپائی پر ڈھولن پڑا ہوا تھا۔

''چل ساتول پتر! اداس نہ تھی۔ قسمت میں یہ حادثہ تھا۔ ہو گیا۔ اب پریشان ہونے سے یا ایسے اداس ہو جانے سے یہ ٹھیک تھوڑی ہو جائے گا۔''

''تو بھی کمال کرتی ہے اماں۔ میرے ڈھولن کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ اور میں پریشان بھی نہ ہوں۔ تجھے نہیں پتہ۔ اس کی تکلیف مجھے اپنے دل پر محسوس ہو رہی ہے۔'' ساتول نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا تو تاجاں مائی بولی۔

''دیکھ۔ میں نے اس کی ٹانگ باندھ دی ہے۔ اب ٹھیک ہونے میں چند دن تو لگیں گے نا۔ تو اداس ہونے کی بجائے۔ اس کی دیکھ بھال کر۔ تو مزار پر جا سائیں بابا کے پاس۔ ان سے ڈھولن کو دم کروا لا۔ جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔'' تاجاں مائی نے اسے محض دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ اسے بھی معلوم تھا کہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ جڑتے جڑتے جڑے گی۔ اس پر ساتول ایک دم سے اٹھتے ہوئے بولا "ہاں۔ یہ بات تو نے ٹھیک کی ہے۔ وہ ڈھولن کو دم بھی کر دیں گے اور مجھے کوئی دوا بھی دے دیں گے۔ میں جاتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تبھی اس کی ماں نے دکھی لہجے میں کہا۔

''جلدی جا اور پھر واپس بھی جلدی آ جانا۔ میں تمہارے لیے روٹی پکاتی ہوں۔''

''اماں! میں اسے اپنے ساتھ ہی نہ لے جاؤں۔ یہاں تم......'' اس نے تردد سے کہا۔

''ہاں، ہاں لے جاؤ۔ پر جلدی آ جانا۔ میں تمہارا انتظار ہی تو کرتی رہوں۔'' وہ بولی۔

''نہیں پہلے تو روٹی نہ پکانا۔ پہلے تو اجر کو باندھ دے۔ مجھے اگر دیر بھی ہو گئی نا۔ تم انتظار نہ کرنا۔ میں اسے دم کروا کر ہی لاؤں گا۔ پتہ نہیں بابا سائیں مزار پر ہوگا بھی یا نہیں۔'' ساتول نے یہ کہہ کر ڈھولن کو اٹھایا اور باہر کی جانب چلا گیا۔ تاجاں اسے جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔

بابا سائیں مزار کے احاطے میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ساتول اپنے ہاتھوں میں ڈھولن کو لیے بڑا دکھی سا بابا سائیں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اور اس کی جانب اشارہ کر کے رو دینے والے انداز میں بولا

''بابا سائیں یہ ڈھولن۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔''

''اوہ! کیسے ہوا یہ؟'' بابا سائیں نے دکھ سے پوچھا تو ساتول نے تمام روداد تفصیل سے بیان کر کے بولا۔

''پتہ نہیں بابا سائیں۔ اب میرا ڈھولن کب تک ٹھیک ہوگا۔''

''ہو جائے گا۔ اللہ سائیں اسے جلدی ٹھیک کر دے گا۔ تو فکر نہ کر۔ اس کی ٹانگ کو اچھی طرح باندھ

دیا ہے نا۔ میں اس پر لگانے کی دوا دے دیتا ہوں۔" بابا سائیں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا

"جی بابا سائیں۔ یہ ٹھیک ہے۔ آپ دم بھی کر دو نا۔" ساتول نے ضد کرتے ہوئے کہا تو بابا سائیں نے اس کی ضد پوری کرتے ہوئے کہا

"لا ادھر لا۔ میں اس کے دم کر دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر بابا سائیں نے مٹی کے لوٹے میں پانی ڈالا اور پھر ڈھول کو سامنے بٹھا کر دم کرنا شروع کر دیا۔ یہ تسلی ساتول کے لیے دلاسہ تھا۔ چند لمحوں بعد انہوں نے کہا "لے اب اس پر پانی ڈالتے رہنا۔ اللہ سائیں اسے جلدی ٹھیک کر دے گا۔ اب تو جا۔"

"جی بابا سائیں۔"

ساتول یہ کہہ کر اٹھا اور ڈھول کو اٹھا کر چل دیا بابا سائیں اس کی طرف بڑے پیار اور دکھ سے دیکھتا رہا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔

رات چھا گئی تھی۔ صحرا میں تو شام ڈھلتے ہی گہری رات کا گماں ہونے لگتا ہے۔ تاجاں مائی اور ساتول دونوں اپنی اپنی چارپائیوں پر پڑے ہوئے تھے۔ ساتول کے پاس ڈھول پڑا ہوا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا اور دکھی ہو جاتا۔ اپنی آنکھ سے آنسو پونچھتا تو تاجاں مائی اپنے دل پر اس کا دکھ محسوس کرتی۔ وہ جب بھی اس کی طرف دیکھتی اور دکھی سی ہو کر دیکھتی رہ جاتی تھی۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اس نے بڑے لاڈ سے کہا

"چل سو جا پتر اللہ سائیں سب ٹھیک کر دے گا۔"

"مجھے نیند نہیں آ رہی ہے اماں۔" ساتول نے دکھ سے کہا تو تاجاں مائی نے پیار سے کہا "تو شکر کر۔ اس کی ٹانگ پر ہی زخم آیا ہے۔ اگر یہ گاڑی کے نیچے آ جاتا تو"

اس سے بڑے دکھ کا تصور دے کر چھوٹے دکھ کا مداوا کرنا چاہا تو ساتول بولا۔

"ہاں، پھر تم سو جاؤ۔ میں بھی سو رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ تاجاں مائی اس وقت تک اسے دیکھتی رہی جب تک وہ سو نہیں گیا۔



صحرا میں ڈوبتی ہوئی شام ہو یا ابھرتا ہوا سورج دونوں منظر ہی رب تعالیٰ پر قربان ہو جانے کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ زبان سے بے اختیار نکلتا ہے تو حسین ہے اور تو حسن ہی کو پسند کرتا ہے۔ اس وقت بھی سورج ابھرنے کا منظر بڑا دلکش تھا۔

صبح کے وقت تاجاں مائی روٹی باندھ کر صحن میں اداس بیٹھے ہوئے ساتول کے پاس آ گئی۔ چارپائی پر ڈھول پڑا ہوا تھا جس کی ٹانگ بندھی ہوئی تھی۔ اس نے ساتول کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"یہ لے روٹی میں نے باندھ دی ہے۔ اب تم اجڑ لے کر جاؤ۔"

"میرا دل نہیں کرتا اماں۔ ڈھول تو میرے ساتھ جائے گا نہیں۔ اور یہاں اکیلا گھر میں پڑا رہے گا۔"

"اکیلا کہاں ہوگا۔ میں نہیں ہوں اس کے پاس اور پھر ان بے چارے دوسرے جانوروں کا کیا قصور ہے۔ کیا یہ آج بھوکے رہیں گے۔" تاجاں مائی نے سمجھاتے ہوئے کہا تو ایک دم سے سمجھ گیا۔

"نہیں۔ ان بے چاروں کا کیا قصور ہے۔ انہیں تو باہر لے جانا پڑے گا نا۔ پر یہ ڈھول....."

"کہا نا۔ میں ہوں اس کے پاس۔ دیکھو۔ اسے ٹھیک ہونے میں ابھی چند دن لگیں گے۔ اتنے دن اجڑ کا کیا ہوگا۔ سوچو ذرا؟ یہ تو ٹھیک ہوتے ہوتے ہو گا۔" ماں نے پھر سے سمجھایا۔

"ہاں۔ تو اس کا بہت زیادہ خیال رکھنا۔ بابا سائیں نے کہا ہے۔ یہ دم کیا ہوا پانی اس کی ٹانگ پر ڈالتی رہنا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا تو تاجاں نے یقین دلاتے ہوئے کہا

''ہاں، میں ڈالتی رہوں گی۔ سارا دن اسی چارپائی پر اس کے ساتھ بیٹھوں گی۔ میں اس کا بہت زیادہ خیال رکھوں گی۔ اب تم جاؤ۔ ان جانوروں کو لے جاؤ۔''

''ہاں۔ میں جاتا ہوں۔ تم اس کا خیال رکھنا۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھا ڈھولن کو پیار کیا اور جانوروں کی جانب بڑھ کر انہیں کھولنے لگا۔

سانول اپنے ریوڑ کے ساتھ مزار کے پاس آ گیا۔ اس نے ریوڑ کو وہاں چھوڑا اور مزار کی طرف چل دیا۔ مزار کے احاطے میں سامنے بابا سائیں کو بیٹھا ہوا دیکھا تو ان سے جا کر سلام دعا کر کے بیٹھ گیا۔ تبھی بابا سائیں نے پوچھا ''سانول۔ آج تم نے آنے میں بڑی دیر کر دی۔ اجڑ بھی لائے ہو کہ نہیں۔''

''اجڑ لایا ہوں۔ بس آج دل ہی نہیں کر رہا تھا۔ وہ اماں ہے نا۔ اس نے مجھے زور دے کر بھیج دیا ہے۔ کہتی بھی وہ خود ڈھولن کا خیال کرے گی۔'' سانول نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے تجھے ڈھولن سے کچھ زیادہ ہی پیار ہو گیا ہے۔'' بابا سائیں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں سائیں! مجھے اس سے بہوں پیار ہے۔ شودہ جانور جو ہوا۔ نکا سا تو ہے۔ اس پر اس کی ماں بھی نہیں ہے۔ بڑا ترس آتا ہے اس پر۔'' سانول نے بتایا

''سانول میرا بچہ! جو چیز فنا ہو جانے والی ہے نا، اس کے ساتھ اتنا دل نہیں لگاتے۔ جب وہ نہیں رہتی ہے نا۔ تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ دل تو اس سے لگانا چاہئے نا۔ جو ہمیشہ رہنے والی ہے۔'' بابا نے سمجھایا۔

''ہاں سائیں۔ فنا ہو جانے والی چیز کا کیا اعتبار۔ اب اگر ڈھولن اس بندے کی گاڑی کے نیچے آ کر......'' یہ کہتے کہتے وہ ایک دم سے خاموش ہو گیا۔ پھر جلدی سے پوچھا ''پر ان فنا ہو جانے والی چیزوں سے دل کیوں لگ جاتا ہے؟''

''ہاں پتر! یہ بات کی ہے نا تو نے۔ یہ فنا ہو جانے والی چیزیں خوبصورت ہیں نا۔ دل میں کشش ہوتی ہے ان کی۔ پیار ہو جاتا ہے اب غور کرو۔ اور سمجھو۔ جس نے یہ خوبصورت چیزیں بنائی ہیں۔ وہ بنانے والا خود کتنا خوبصورت ہو گا۔ وہ ہمیشہ رہنے والا ہے۔ کیوں نا اس سے پیار کریں۔ پھر وہ بھی تم سے پیار کرے گا۔'' بابا سائیں نے سمجھایا۔

''ہاں اللہ سائیں تو ہم سے پیار کرتا ہے نا۔ یہ ساری چیزیں اس نے ہی تو بنائی ہیں۔'' سانول خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''ہم انسان بھی تو اسی اللہ سائیں کے بنائے ہوتے ہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے کا خیال کریں احساس کریں۔ تو اللہ سائیں خوش ہوتا ہے۔ وہ ہم سے اور زیادہ پیار کرتا ہے۔ ہماری ساری دعائیں قبول کرتا ہے۔'' بابا نے کہا تو سانول نے کہا۔

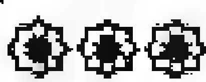
''ہاں۔ بابا سائیں ہاں۔ بس آپ دعا کرنا میرے لیے۔''

''کیوں نہیں پتر۔ میں تمہارے لیے بھی دعا کروں گا اور تیرے ڈھولن کے لیے بھی۔ وہ جلدی بھلا چنگا ہو جائے گا۔ وہ تیرے ساتھ ادھر روہی میں آیا کرے گا۔ تو اس کے ساتھ خوب خوش ہونا۔'' بابا سائیں نے پیار سے اسے دلاسہ دیا تو معصوم سانول خوش ہو گیا۔

''ٹھیک ہے۔ اب میں جاؤں۔ اجڑ لے کر جانا ہے نا مجھے۔''

''ہاں جاؤ۔ اپنا خیال رکھنا۔''

سانول جلدی سے اٹھا اور سلام دعا لے کر چل دیا۔ بابا سائیں مسکراتے ہوئے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔



زوار خان صبح خیز تھا۔ اس لیے جلدی اٹھ گیا۔ پھر شہر جانے کے لیے تیار ہو کر گاڑی کے پاس آ گیا۔ مقامی لوگ بڑے سکون سے تھے۔ زوار خان

قدرے خوشگوار موڈ میں تھا۔ زینی بوریت محسوس کر رہی تھی اور ناصر علی خوشامدی سا ہو رہا تھا۔ تبھی مقامی میزبان نے کہا۔

"سائیں! آپ جا رہے ہیں۔ پھر کب آئیں گے۔"

"بہت جلدی آؤں گا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تو ناصر علی نے کہا۔

"خان صاحب کو آپ سب کی چیزیں بہت پسند آئی ہیں۔"

یہ سن کر وہاں سب خوش ہو گئے۔

"ہاں۔ پسند تو آئی ہیں۔ لیکن آپ ان چیزوں کا ریٹ بہت زیادہ بتا رہے ہیں۔ اگر آپ مناسب کریں تو ہم اتنا مال خریدیں گے۔ آپ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے ہو۔"

"اب اس سے زیادہ مناسب کیا کریں گے۔ آپ دیکھیں اس پر محنت کتنی پڑتی ہے۔ اس محنت کا اتنا معاوضہ نہیں بنتا جتنا ہم نے آپ کو بتا دیا ہے۔" مقامی میزبان نے لجاجت سے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ سوچ لو۔ ناصر صاحب اور زینی آج ادھر ہی ہیں آپ لوگوں کے پاس۔ آپ انہیں دوسری بستیوں میں بھی لے جا کر اپنی چیزیں دکھا دیں۔ یہ آپ کے ساتھ طے کر لیں گے۔ ویسے جو آپ لوگوں نے مہمان نوازی کی۔ اس کا بہت شکریہ۔ خاص طور پر ٹیلوں پر قالین بچھا کر، تکیے لگا کر کھانا کھلایا۔ بڑی موج میں بیٹھ کر گلوکار نے جو روہی کے حوالے سے گیت گائے، بہت اچھا لگا۔ بھی آپ کا پیار ادھار اتار رہیں گے۔"

"آپ آئیں ہمارے پاس۔ ہم روہی والے اسی طرح مہمان نوازی کرتے رہیں گے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ مال ہی خریدنے آئیں۔" مقامی نے بڑے خلوص سے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو زوار خان بولا "بہت مہربانی۔" یہ کہہ کر روئے سخن زینی کی طرف کر کے کہا "میں چلتا ہوں۔ دوپہر تک آپ وزٹ کر لیں۔ تب تک گاڑی آپ لوگوں کو لینے کے لیے آ جائے گی۔ پریشان نہیں ہونا۔"

"ٹھیک ہے سر۔ تو پھر ہم طے کر لیں گے ان سے؟" ناصر کو اپنے مطلب سے غرض تھی۔

"ہاں۔ زینی ہے نا آپ کے ساتھ۔ آپ طے کر لیں اور انہیں آرڈر بھی دے دیں۔ ٹھیک ہے زینی۔" اس نے زینی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ دھیمے سے لہجے میں بولی۔

"جی ٹھیک ہے۔"

زوار خان نے سب سے ہاتھ ملایا اور گاڑی میں بیٹھ کر چل دیا ہے۔

زوار خان روہی کی اس رات کو یاد کرتے ہوئے مزار کے قریب راہگذر تک آ گیا۔ وہ بڑے آرام سے آ رہا تھا کہ مزار کے بالکل قریب آ کر گاڑی اچانک بند ہو گئی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن نہ ہو سکی۔ وہ تین بار کوشش میں گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی تو وہ حیران ہوتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

"اسے ابھی کچھ ہونا تھا۔ اللہ کرے کوئی خاص نقص نہ پڑ گیا ہو۔ یہاں پر تو مکینک بھی نہیں ملے گا۔" زوار خان بڑبڑاتے ہوئے گاڑی سے نیچے آیا۔ بونٹ کھول کر دیکھتا رہا، جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو پھر بونٹ بند کر کے دوبارہ اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن نہیں ہوئی۔ اس نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر گاڑی سے اتر کر مزار کی جانب چل دیا۔

مزار کے احاطے میں بابا سائیں پرندوں کو دانا ڈال رہا تھا۔ وہ مزار کے صحن میں کھڑا تھا اور اس کی ساری توجہ پرندوں کی طرف تھی۔ پریشان سا زوار خان مزار کے احاطے میں آ گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر بابا پر نگاہ ٹکا دی اور پھر لمحہ بھر کے بعد اس کی جانب بڑھ گیا۔ قریب جا کر پوچھا۔

"بابا۔ یہاں کوئی مکینک مل جائے گا۔ جو گاڑی ٹھیک کر لیتا ہو۔"

بابا نے اس کی جانب دیکھا، چند لمحے دیکھتا رہا اور پھر بابا کے چہرے پر سے خوشگواریت چلی گئی۔ زوار خان نے اپنی بات پھر دہرا دی۔

"مکینک کے بارے میں تو پتہ نہیں تمہیں ملے گا بھی یا نہیں۔ لیکن جب دو آدمی پہلی بار ملتے ہیں تو بات کرنے سے پہلے سلام دعا ہوتی ہے۔ اور تم پوچھ رہے ہو یا مجھے حکم دے رہے ہو۔ اس کی مجھے سمجھ نہیں آئی؟" بابا سائیں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"بابا، میں نے پوچھا ہی ہے۔ آپ نے تو اتنی لمبی چوڑی تقریر کر دی..... آپ ہاں یا ناں میں جواب دے دیں۔"

"لیکن کیا میں نے بات غلط کی ہے۔" بابا سائیں نے اسی دھیمے لہجے میں پھر پوچھا

غلط تو نہیں لیکن۔ میں پریشان ہوں۔ میری گاڑی بند ہو گئی ہے اور مجھے شہر جانا ہے۔ آپ اگر کچھ بتانا چاہیں تو بتا دیں۔" زوار خان اپنی غلطی سمجھ کر نادم ہوئے بغیر بولا تو بابا سائیں نے کہا۔

"تو تم پریشان ہو۔ کیا اپنے لیے ہی پریشان ہو یا دوسروں کی پریشانی کا اندازہ بھی لگا سکتے ہو؟"

"بابا! آپ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔" زوار خان نے پوچھا۔

"جب کوئی انسان فقط اپنے لیے سوچتا ہے اور اسے کسی دوسری ذات کے بارے میں احساس نہیں ہوتا تب اسے کسی کی بات سمجھ نہیں آتی۔ وہ صرف اپنی غرض اور مفاد کے بارے میں سوچتا ہے۔ اسے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ دوسرا اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔" بابا سائیں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بابا جی! میں نے آپ سے صرف مکینک کے بارے میں پوچھا ہے۔ اور آپ نے یہاں درس دینا شروع کر دیا ہے۔ آپ کو میری پریشانی کا احساس نہیں ہو رہا شاید۔" زوار خان نخوت سے بولا۔

"مجھے تمہاری پریشانی کا اندازہ ہے۔ وہ اصل پریشانی جس سے بندے کی عقل اور سمجھ ختم ہو کے رہ جاتی ہے اس کا تمہیں احساس نہیں۔ زیادہ سے زیادہ دولت بنانے کی فکر سے اخلاقی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس سے بندہ اندھا ہو کر رہ جاتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے احساس سے عاری ہو کر مشین بن جاتا ہے۔" بابا سائیں نے اسی مسکراہٹ سے کہا۔

"دولت، اخلاقی برائیاں، اندھا احساس یہ کیا کہہ رہے ہیں بابا۔ آپ۔" اس بار زوار خان نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تم میں وہ نگاہ ہی نہیں ہے جو دوسروں کو پہچان سکے۔ ایسا ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو صرف اپنی ذات کے لیے سوچتے ہیں۔ تب دنیا بھی اس کا احساس نہیں کرتی۔ وہ بھی اپنی غرض سے ملتی ہے۔ ہر شے دولت سے نہیں خریدی جا سکتی۔ کسی کا احساس بھی نہیں۔" بابا سائیں نے کہا تو زوار خان بولا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آپ نے اگر کسی مکینک کے بارے میں بتانا ہے تو بتائیں۔"

"تمہیں میری باتوں کی ہوئی سمجھ آئے گی۔ جاؤ یہاں روہی سے نکل کر اپنی دنیا میں چلے جاؤ۔ پھر تمہیں پتہ چلے گا۔ نگاہ کیا ہوتی ہے۔ دوسرے کی ذات کے بارے میں احساس کیا ہوتا ہے۔ ابھی میں تمہیں سمجھانا بھی چاہوں تو نہیں سمجھا سکتا۔ جاؤ۔ اب جاؤ۔"

اس پر زوار خان نے کچھ کہنا چاہا لیکن ایک لمبی سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے ایک نگاہ بابا سائیں کی جانب دیکھا۔ وہ اپنے حال میں مست، اس سے بے پروا، پرندوں کو دانہ ڈال رہا تھا۔ زوار خان تیزی سے مڑا اور واپس چلا گیا۔ وہ مزار کے قریب راہگذر کے پاس گاڑی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے سوچتا

رہا پھر گاڑی میں بیٹھ کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی ۔گاڑی ایک دم اسٹارٹ ہوگئی ۔وہ حیران تو ہوا لیکن پھر مسکراتا ہوا گاڑی لے کر چل دیا۔

دوروہی سے نکل کر شہر کی حدود میں آگیا۔ یہاں تک کہ اپنے گھر کے سامنے آرکا۔ ہارن کے جواب میں چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ وہ گاڑی تیزی سے اندر لے جا کر پورچ میں کھڑی کی۔ وہ صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ اس کی بیگم آگئی۔ وہ بڑی حیرت اور پیار سے بولی۔

"آپ؟ آپ کب آئے؟"

یہ کہتے ہوئے وہ بھی صوفے پر بیٹھ گئی۔ پروین اسے لگاوٹ سے دیکھ رہی تھی لیکن اسی لمحے زوار خان کو آواز سنائی دی۔ "اس منحوس نے تو کہا تھا کہ دو تین دن تک آجائے گا۔ یہ ابھی نازل ہوگیا۔ کیا ہوا اسے؟"

زوار خان نے یہ سن کر پاگلوں کی طرح اپنی بیوی کی جانب دیکھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسا اس کی بیوی کہہ رہی ہے۔ اسی لیے اس نے پوچھا۔

"کیا کہا تم نے؟"

"میں نے کہا جی۔ آپ اتنی جلدی آگئے۔ خیریت تو ہے نا۔ اچھا ہوا آپ آگئے ورنہ آپ کے بنا تو بالکل عجیب سا لگ رہا تھا۔" اس نے محبت آمیز لہجے میں کہا لیکن خاموش ہوتے ہی دوسری آواز آئی۔ "اس کے بغیر گھر میں کتنا سکون تھا۔ اب جھاڑنا شروع کردے گا رعب۔ جیسے ہم اس کے غلام ہیں۔ گدھا کہیں کا۔"

"یہ..... یہ کیا ہو رہا ہے..... یہ کیا اس کے دل کی آواز ہے؟" یہ سوچ کر اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا تو اسے پھر آواز سنائی دی۔

"پتہ نہیں کیا سوچ رہا ہے پاگل۔ رعب تو دیکھو جیسے کسی ریاست کا نواب ہو۔ اور کوئی معرکہ مار کر آیا ہو۔ ہونہہ۔"

"سائیں! آپ جواب نہیں دے رہے ہو۔"

پروین نے لطافت سے پوچھا تب تک زوار خان اس کیفیت کو سمجھ چکا تھا اس لیے دھیرے سے بولا۔

"کیا جواب دوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

"آپ دراصل تھک گئے ہیں۔ آپ آرام کریں۔"

"سارا دن پاگلوں کی طرح لوگوں سے سر مارنا پڑتا ہے۔ کیا خاک سمجھ آئے گی۔ اب پتہ نہیں کہاں روہی کی ریت پھانکتا آیا ہے۔ جا کر بیڈروم میں سو جا۔"

"زارا کہاں ہے؟" زوار خان نے پوچھا۔

"جی وہ اسکول گئی ہے۔"

"اب اس بندے کو بھلا کوئی کیا سمجھائے کم از کم گھڑی تو دیکھ لے۔ ابھی وہ گھنٹے ہوئے اسکول گئی ہے۔ کچھ دیر بعد ہی واپس آئے گی۔ ذرا سی بھی عقل نہیں ہے۔ اس بے وقوف کو۔"

اس پر زوار خان نے اسے گھور کر دیکھا تو پروین کی آواز آئی۔ "یہ مجھے اتنا گھور گھور کے کیوں دیکھ رہا ہے۔ پہلے تو کبھی ایسے نہیں دیکھا۔ کہیں یہ میری وجہ سے تو واپس نہیں آیا۔ پر میں نے..... کیا کیا ہے۔"

"چائے لاؤں آپ کے لیے۔" وہ ملائمت سے بولی

"ہاں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد۔ مجھے ابھی آفس جانا ہے۔ میں تیار ہولوں۔"

"ابھی تو آپ آئے ہیں۔ کچھ دیر آرام کرلیں۔" پروین نے محبت سے کہا۔

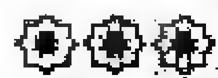
مگر خاموشی سے بولی۔

"شکر ہے گھر میں نہیں رہے گا ورنہ گھر کو ہی جیل بنادے گا۔ جاؤ..... جاؤ..... دفعہ۔"

اس بار تو وہ بالکل ہی گھبرا گیا جیسے اسے خود پر یقین نہ آرہا ہو۔ وہ تیزی سے بولا۔

"نہیں۔ مجھے جانا ہے۔ تم جاؤ۔ میں تھوڑا آرام کروں گا۔ پھر تیار ہو کر آفس جاتا ہوں۔"

پروین وہاں سے ہٹ گئی تو وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سوچنے لگا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میری بیوی کی زبان پر کچھ اور ہے اور دل میں کچھ اور۔ کیا اب میرے ساتھ ایسا ہی ہوگا۔ کیا میں سب کے بارے میں جان لوں گا کہ میرے لیے ان کے دل میں کیا ہے؟ یا اللہ! میں کیا کروں۔ اس نے چند لمحے یہی سوچتے رہنے کے بعد فیصلہ کیا کہ تحمل سے برداشت کروں اور سنو تمہارے بارے میں دوسرے کیا کہتے ہیں۔ فیصلہ کرتے ہی زوار خان پرسکون ہو گیا اور صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔



گھر سے آفس تک آتے ہوئے اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن وہ اس بات کو پوری طرح آزمانا چاہتا تھا۔ جس وقت آفس میں آیا۔ زوار خان دیکھنے میں بہت فریش لگ رہا تھا لیکن چہرے پر ذرا سی افسردگی طاری تھی۔ وہ ماتھے پر ہاتھ رکھے سوچ رہا تھا کہ اتنے میں آفس بوائے نے آ کر پوچھا۔

''جی سر! آپ نے مجھے بلایا۔''

''ہاں۔ وہ نجم صاحب سے کہو ڈرائیور کو وہی بھیج دیں۔ وہاں سے ناصر صاحب اور زینی کو ادھر لے آئیں۔'' اس نے کہا۔

''جی۔ میں ابھی کہہ دیتا ہوں۔'' آفس بوائے نے کہا ساتھ ہی آواز آئی

''زینی! اس کے بغیر دل نہیں لگتا ہوگا نا۔ صاحب کو یہ آفس سونا سونا لگ رہا ہوگا۔ اتنی ویرانی ہوگئی ہے تو پاگل اسے وہاں چھوڑ کے ہی نہ آتا۔''

زوار خان نے چونک کر اسے دیکھا

''کھڑا کیوں ہے۔؟'' زوار خان نے پوچھا

''وہ جی۔ ڈرائیور کو کیا بتاؤں گا کہ وہ زینی بی بی اور ناصر صاحب کدھر ہیں۔''

''او پاگل! ڈرائیور کو کیا پتہ وہ کدھر ہیں خراب ہو رہے ہیں۔''

''اوئے وہ فون پر رابطہ کرے گا۔ کیوں پاگلوں جیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''جی۔''

''ہو گیا پاگل۔ اب سارا دن لڑتا رہے گا۔''

''اب جاؤ کھڑے کیوں ہو۔'' زوار خان دہاڑا

''جی آپ کے لیے چائے لاؤں۔ یا کافی۔''

''تمہارا تماشا دیکھنے کے لیے کھڑا ہوں پاگل۔ جب تم غصے میں آتے ہو تو کتنے برے لگتے ہو۔ اب تجھے کون سمجھائے۔ اچھے کپڑے پہن کر بندے میں عقل نہیں آ جاتی۔''

''اوئے تو..... جا چلا جا' مجھے نہیں ضرورت چائے وغیرہ کی۔''

''جی ٹھیک ہے۔''

''نہ پی۔ مجھے کیا۔ میں نے پی ہی لینی ہے۔''

''اوئے تو جا۔ مر..... جا کر شاہد صاحب کو بھیج۔''

''جی بہتر۔ ابھی بھیجتا ہوں۔''

''اب تو اس پر غصہ اتارے گا۔ بے چارے شریف آدمی پر۔ چل مجھے کیا۔ میں جا کر کہہ دیتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ واپس مڑا اور آفس سے نکل گیا۔ زوار خان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

زوار خان اسی پریشانی میں بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں شاہد نے اندر آ کر کہا۔

''سر میں اندر آ سکتا ہوں۔''

''اندر تو آ ہی گئے ہو۔ اب اجازت کی کیا ضرورت ہے۔'' زوار خان نے جل کر کہا تو شاہد کی آواز آئی۔

''صرف تمہیں چڑانا ہوتا ہے۔ ورنہ مجھے بھی پتہ ہے کہ میں اندر آ گیا ہوں۔ تم ہماری بے عزتی کرو گے۔ تو ہم تمہیں چڑائیں بھی نہیں۔''

اس دوران وہ دروازے سے کرسی تک آ کر بیٹھ

گیا۔

''میں نے آپ کو پراجیکٹ کی فائل دی تھی۔ کیا بنا اس کا۔ کچھ سوچا اس پر؟'' زوار خان نے پوچھا۔

''جی۔ میں نے سوچا۔'' شاہد نے بھاری آواز آئی۔

''اس پر سوچنے والی بات ہی کیا ہے احمق۔ بس تجھے تو اپنے منافع سے غرض ہے۔ کام تو ایسے لیتا ہے جیسے تیرے منافع میں ہم بھی حصہ دار ہیں۔''

زوار خان خون کے گھونٹ پیتے ہوئے بولا۔

''کیا؟ کچھ بتائیں گے آپ؟''

شاہد نے اسے دیکھا۔

''او پاگل اس میں بتانے والی باتیں کیا ہیں۔ اچھا بھلا پراجیکٹ ہے۔ تمہیں سمجھ کیوں نہیں آئی۔''

''آپ بولتے کیوں نہیں۔ کچھ تو بتائیں۔ میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے۔'' زوار خان نے دوبارہ پوچھا۔

''وہ سر! میں نے فائل دیکھی ہے۔ مجھے اس میں کچھ بھی ایسا نہیں لگا۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس پر دوبارہ ڈسکس کرلیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

''تو نواب ہے۔ اور ہم تیرے غلام ہیں۔۔ کیا تنخواہ دے کر تو نے ہمیں خرید لیا ہے۔''

''میں نے چند پوائنٹ لکھے تھے۔ ان کو دیکھ لیں۔ پھر ڈسکس کر لیتے ہیں۔'' زوار خان نے کہا

''ٹھیک ہے سر! میں آج ہی آپ سے ڈسکس کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں دوبارہ فائل دیکھتا ہوں۔''

''تو نے پوائنٹ کیا لکھے ہیں، جھک ماری ہے۔ خود کو بڑا عقل مند خیال کرتا ہے نا۔ تیرا یہی پراجیکٹ تیرے متھے ماروں گا۔ پھر میں دیکھتا ہوں تو کتنا منافع بناتا ہے۔''

''مجھے آپ یہ بتائیں شاہد صاحب۔! آخر آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں۔ میں جو کہتا ہوں، آپ ویسا کیوں نہیں کرتے۔'' زوار خان نے تڑخی سے کہا۔

''آپ باس ہیں سر! آپ جیسا کہتے ہیں۔ ہم نے تو ویسا ہی کرتا ہے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا

''میں تمہیں الو سمجھتا ہوں۔ ایسا الو۔ جسے بس دولت سے غرض ہے۔ ہمارا تو خیال ہے اور نہ احساس۔ تنخواہ کی طرف بھی تو جہ دو نا۔''

''آپ بس جائیں اور۔ بس جائیں۔'' زوار خان کی ہمت پست ہوگئی۔ وہ مزید سننے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

''بس ہوگیا پاگل۔ اب پاگل پن چھٹے گا سارا دن۔''

''جی سر! جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر شاہد اٹھ گیا۔ زوار خان گھبراہٹ میں اٹھ گیا۔ وہ اپنے آپ کو دیکھتا اور کبھی خالی دروازے کو۔ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بے دم سا ہوا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

زوار خان دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھا ہوا سوچتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر انتہائی پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کرسی سے ٹیک لگا کر ان آوازوں کو سوچنا شروع کیا تو اسے دنیا ایک دم سے بری لگنے لگی۔ تبھی وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''کیا اب میرے ساتھ ایسا ہی ہوگا۔ اس طرح تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ کیا میرے ساتھ کوئی بھی مخلص نہیں ہے۔ سب میرے لیے برا سوچتے

> **نقش**
>
> ا۔ ہر قلب انسانی پر اسم ''اللہ'' منقش ہوتا ہے
> مصر کے ممتاز ڈاکٹر اور سرجن ڈاکٹر خلوق نور بانی کے عربی جریدے ''الشرق'' کو انٹرویو دیتے ہوئے انکشاف کیا ہے اور اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لیے تصاویر بھی دکھائی۔
>
> (مرسلہ: برکت اللہ......کراچی)

ہیں۔ کیا میرا سلوک ان سب کے ساتھ بہت برا ہے کیا میرا کوئی بھی نہیں؟ فرحان، وہ تو میرا دوست ہے۔ وہ میرے بارے میں غلط نہیں سوچ سکتا۔ کیا میں اسے بلا کر دیکھوں وہ کیسا ہے؟"

یہ خیال آتے ہی زوار خان فوراً فون کی طرف لپکا نمبر ملائے اور رابطہ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ رابطہ ملتے ہی بولا۔

"فرحان۔ کدھر ہو مصروف ہو۔ مجھے مل یار تمہارے ساتھ ایک ضروری کام ہے چلو۔ شام سے پہلے رابطہ کر لینا۔ مجھے ملو ضرور گھر آ جانا۔ او کے۔"

بات کر کے اس نے فون رکھ دیا اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ کہیں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کیا گھر میں جا کر پھر سے بیوی کے اندر کا زہر اسے معلوم ہو؟ وہ آفس ہی میں بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ ناصر علی اور زینی آ گئے۔ ناصر علی اندر آیا تو اس کے ساتھ ہی زینی بھی آ گئی۔ اس نے انہیں دیکھا اور دوسرے سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"کیسا رہا؟ کچھ طے ہوا ان کے ساتھ۔" زوار خان نے یہ پوچھا تو ناصر علی نے کہا "ہاں۔ ہو گیا۔ وہی طے کیا جو آپ نے کہا تھا۔"

"تجھے کیا پتہ بھوندو۔ میں نے تم سے بھی کم ریٹ لگایا ہے اور اس پر مال خریدوں گا۔ ادھر سے بھی بچت اور تجھ سے بھی مال بناؤں گا۔"

زوار خان کو شاک لگا لیکن وہ سہتے ہوئے بولا

"زینی تمہیں ان کا بنایا ہوا مال پسند آیا؟"

"ہاں۔ اچھا ہے۔ بس اسے بنا سنوار کے بیچنا ہو گا۔" زینی نے اپنی رائے دی۔

"مجھے کیا۔ میں نے تو اپنی تنخواہ لینی ہے۔ نفع نقصان تو تم لوگوں کا ہے نا۔ میں خوامخواہ میں جل ہو رہی ہوں۔ یہ تو فل ٹائم نوکر رکھنے کے چکر میں ہیں۔"

زوار خان نے اس کی طرف دیکھا پھر ناصر سے پوچھا۔

"تو ناصر صاحب! اب آپ کیا کریں گے؟"

اس پر ناصر علی سوچنے لگا۔

"پاگل۔ تو بس رقم نکال۔ پھر دکھاتا ہوں میں تمہیں تماشا۔ یاد کرے گا کہ کسی کے ساتھ بزنس کیا تھا۔ پیسہ تیرا اور کام میرا۔ خود کو بڑا عقل مند سمجھتا ہے سالا۔"

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" زوار خان نے غصے میں کہا۔

"آپ کو بہتر پتہ ہے کہ اب کیا کرنا ہے۔ رقم ملے گی تو کام شروع ہو جائے گا۔"

"دیکھو۔ کتنا بھولا بنتا ہے۔ جیسے پتہ ہی نہیں ہے۔ جان جا رہی ہے رقم دیتے ہوئے۔ تو بس رقم نکال۔"

"مطلب؟ آپ نے جن NGOs سے بات کرنا تھی کر لی۔ اس سامان کی اچھی پیکنگ کروانے کا انتظام کر لیا۔ رقم تو مل جائے گی۔"

"وہ تو تمہیں ہو گیا ہے۔ انہی سے بات کر کے میں نے یہ فائنل کیا تھا۔"

"او پاگل! مجھے پتہ ہے کہ میں نے کیا کرنا ہے۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ کل میں آپ کو کچھ رقم دے دوں گا۔ پھر آپ کام شروع کر لیں۔ ٹھیک ہے؟"

"سیدھا کہو میں جاؤں۔ رقم کے بارے میں مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ تو ایسا ہی کرے گا۔ چل کل تک دیکھ لیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" زوار خان نے کہا۔

"او کے۔" ناصر نے کہا اور ہاتھ بڑھا دیا۔

"چل تو اب لگ گپ شپ اپنی سیکرٹری سے پوچھ اس سے میں وہاں کیسی باتیں کرتا رہا ہوں۔ اس کے بغیر تو تیری جان نکلتی ہے۔"

ناصر علی چلا گیا تو زوار خان نے زینی سے پوچھا

''زینی! تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ پراجیکٹ چلے گا۔''

زینی سوچتے ہوئے بولی تجھ سے کیا پوچھتا ہے پاگل۔ بزنس تم دونوں نے کرنا ہے۔ میری اس میں کیا دلچسپی۔ میں تو جا کر پچھتائی۔ تھکن سے ہڈیاں تک درد کر رہی ہیں۔''

''کیا بات ہے۔ تم نے جواب نہیں دیا؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ آپ بہتر سمجھتے ہیں بزنس کو'' اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا

''اب سر نہ کھاؤ، مجھے گھر جانا ہے۔''

''پھر بھی۔ تمہارا کچھ تو خیال ہوگا؟''

''سر مت کھا پاگل۔ میں پہلے ہی دو دن سے بور ہو رہی ہوں۔ اب مزید بور نہ کر۔''

''میرے خیال میں تو آپ رسک لے رہے ہیں۔ چلے گا تو چلا لیں۔ ٹھیک ہے۔''

''یہ کیا دید سے پھاڑ کے دیکھ رہا ہے۔ سچی بات ہے۔ اگر تو پاس نہ ہوتا اور میں تمہارے پاس ملازمت نہ کر رہی ہوتی نا۔ تو میں تیری شکل بھی نہ دیکھوں۔ پتہ نہیں کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔''

''تمہیں کوئی وہاں سے گفٹ پسند آیا؟''

''نہیں۔ وہاں سے کیا پسند آنا تھا؟ کپڑے تھے۔ لیکن ویسے میں شاپنگ نہیں ہوں۔''

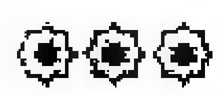
''وہاں کے گفٹ کی تو ایسے بات کر رہا ہے جیسے وہاں بڑی قیمتی چیزیں ملتی ہیں۔ چند چیزیں کیا لے کر دے دی ہیں۔ پتہ نہیں کتنا احسان کر رہا ہے مجھ پر۔''

''اچھا سر! میں چلوں بہت تھکن ہو رہی ہے۔''

زینی نے اپنا پرس سیدھا کرتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہے...... جاؤ۔''

وہ گئی تو زوار خان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر اچانک اٹھا۔ میز سے اپنی چیزیں اٹھا کر باہر کی جانب چلا گیا۔



زوار خان نے پورچ میں گاڑی روکی۔ اتنے میں گھر کا ملازم باہر آ گیا۔ وہ گاڑی میں سے نکلا تو آمنا سامنا ہو گیا۔

''السلام علیکم صاحب۔'' ملازم نے تیزی سے کہا

''وعلیکم السلام۔ کیا حال تیرا؟

میں ٹھیک ہوں جی۔''

''آ گئی مصیبت۔ اب گھر میں سب کی پریڈ کروا دے گا۔''

اس پر زوار خان نے چونک کر نوکر کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ یہ بھی۔ یہ بھی مجھ سے تنگ ہے۔ چلو اس سے مزید گپ کرتے ہیں اس لیے زوار خان نے پوچھا۔

''تو ٹھیک ٹھاک تو ہے نا۔ کوئی مسئلہ تو نہیں۔

ہائیں۔ یہ پاگل ہو چکا ہے۔ پہلے تو کبھی نہیں پوچھا اپنی اکڑ میں رہتا ہے۔''

''نہیں جی ٹھیک ہوں۔''

''کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتاؤ'' زوار نے پوچھا۔

''نہیں جی کوئی مسئلہ نہیں۔''

''یہ ضرور پاگل ہو گیا ہے۔ دماغ پھر گیا ہے اس کا۔ اسے ہو کیا گیا ہے۔ اسے آج میرا خیال کیسے آ گیا۔''

''اگر کوئی چھٹی وغیرہ چاہیے ہو تو مجھے بتا دینا۔''

''جی بتا دوں گا۔''

پکی بات ہے۔ یہ پاگل ہو گیا ہے۔ اس کا تو علاج بھی بہت مشکل ہوگا۔ کوئی ڈھیٹ ڈاکٹر ہی کرے گا اس کا علاج۔''

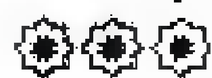
اس کی آواز سن کر زوار خان ہنس دیا۔ پھر یکدم آزردہ ہو گیا۔ شاید وہ اس پر مزید سوچتا یا اس سے بات کرتا اتنے میں باہر ہارن بجا۔

''دیکھو! باہر میرا دوست فرحان ہوگا۔ اسے لان میں بٹھاؤ۔ اور چائے لاؤ۔ میں آتا ہوں۔'' چیخ کر کہے۔''

"جی بہتر۔"

"اچھا او پاگل۔"

زوار خان نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور پھر سر جھٹک کر اندر کی جانب چلا گیا۔



جب تک فرحان لان میں جا کر بیٹھا وہ چینج کر کے آ گیا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے اس کے ساتھ ملا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے زوار خان نے خوشگوار لہجے میں کہا" کدھر غائب رہتے ہو یار۔ ملتے ہی نہیں ہو۔"

"نہیں ہوتا ہوں۔ میں نے کہاں جانا ہے۔"

"تمہیں کیا پتا۔ تم تو دولت بنانے میں لگے ہو تمہیں کسی کی کیا پروا۔ آج بھی تجھے کوئی مطلب ہو گا جب ہی بلایا ہے۔"

زوار خان کو شاک لگا مگر اسے برداشت کر کے خود پر قابو پاتے ہوئے بولا

"کیا کہہ رہے ہو۔ مطلب۔ کئی دنوں سے ملے ہی نہیں ہو۔ نہ کبھی بات ہوئی۔"

"نہیں۔ ادھر ہی ہوں۔ خیریت تھی زوار تم نے مجھے بلایا۔ کیا ضروری بات تھی؟"

"تو اپنا مطلب تھا۔ جان چھوڑ۔ اتنی کہانی ڈالنے کی آخر ضرورت کیا ہے۔"

"بس یار کیا بتاؤں۔ ایسے ہی دل کر رہا تھا۔"

یہ کہہ کر وہ ایک دم سے چپ کر گیا پھر ایک لمبی سانس لے کر سوچا" تمہیں کیا بتاؤں کہ میں کس مصیبت میں ہوں اور تم ہو کہ دوسروں کی طرح نکلے۔"

"لگتا ہے بات بدل دی۔ ورنہ تیرا کوئی نہ کوئی لالچ آ جاتا میرے سامنے۔ کسی سے سفارش کروانی ہوگی۔ مطلب کے بغیر تم کوئی کال بھی نہیں کرتے۔"

زوار خان نے اس کی سوچ سن کر سوچا کہ مجھے کسی کے بارے میں اتنا شاک نہیں لگا تھا۔ لیکن یہ بھی لوگوں کی طرح ہے۔ حسد کرتا ہے۔ دل ٹوٹ گیا یار میرا۔ ساری دنیا میں صرف تمہیں مخلص سمجھا تھا میں نے۔"

اس کی خاموشی پر فرحان نے بڑے خلوص سے پوچھا۔

"پھر بھی کچھ تو کہنا تھا تم نے۔ فون پر تو یوں لگتا تھا جیسے بہت اہم کام ہو۔"

"اب بک بھی دو۔ کیا کہنا ہے۔"

زوار نے اس کی جانب شاکی نگاہوں سے دیکھا اور سر جھٹک کر کہا۔

"کچھ نہیں یار۔ اتنے دن ہو گئے تمہیں دیکھے ہوئے۔ بس تمہیں بلا لیا تھا۔ ویسے تم کہاں آتے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں تھوڑا بزی تھا۔ میں نے سوچا پتہ نہیں کیا بات ہے۔ چلو پھر ملتے ہیں۔" فرحان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں کوئی فارغ ہوں۔ تیرے خیال میں مجھے دنیا میں کوئی کام نہیں ہے۔ یا تیرا غلام ہوں۔ جب چاہے بلا لیا۔ پاگل۔"

"چائے تو پیتے جاؤ۔ کچھ دیر بیٹھو" زوار خان نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا جہاں اس کی سوچ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس پر فرحان بولا" پھر پی لیں گے۔"

"تیری چائے نے جان چھوڑ۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔ زوار خان اسے دیکھتا رہ گیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

زوار خان کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ دنیا میں کوئی بھی انسان اس کا اپنا نہیں تھا۔ سبھی دوغلی سوچ رکھتے ہیں۔

زوار خان انتہائی آزردہ سا اپنے بیڈ روم میں پڑا سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے میرے ساتھ۔ فرحان کو تو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں اسے دوست سے زیادہ بھائی خیال کرتا تھا۔ اتنا زہر ہے اس کے

اندر میرے لیے نہیں، آگ ہے اس کے اندر، حسد کی آگ۔ ہم نے اکٹھے ہی زندگی شروع کی تھی، عملی زندگی۔ اب وہ وہاں تک نہیں پہنچ سکا تو اس میں میرا کیا قصور۔ وہ اتنا حسد کرتا ہے، میں نے کبھی اس کے خلاف نہیں سوچا اور......"

دروازہ کھلا اور اس کی بیوی پروین اندر آ گئی۔ اس کی سوچوں کا سارا تانا بانا بکھر گیا۔ وہ بڑے پیار سے آ کر بیڈ پر بیٹھ کر بہت محبت سے بولی

"آپ کچھ مضطرب سے دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟"

"اب منہ سے پھوٹو گے بھی یا اسی طرح منہ کو سی کے رکھنا ہے۔"

"کچھ نہیں بیگم! اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دو۔" اس نے آزردگی سے کہا۔

"کیوں! کیا ہوا ہے۔ تنہائی کی ضرورت کیوں ہو گئی۔ خدانخواستہ کوئی پریشانی ہے۔"

"اسے کیا پریشانی ہوگی۔ کہیں منافع کم ہو گیا ہو گا۔ دیکھا، دولت کے ڈھیر میں کمی ہوئی ہوگی۔ کہیں زینی کے ساتھ لڑائی تو نہیں ہوگئی۔ مجھے بھی پتہ ہے۔ اس کے ساتھ تنگی کی روی۔ اس کے بچھڑنے کا دکھ ہوگا اسے۔"

وہ ایک دم سے چونک گیا' کیا اسے زینی کے بارے میں بھی پتہ ہے؟ اس لیے وہ منہ بسور کر بولا

"بیگم۔ تم جاؤ۔ اور میرے لیے چائے بنا کر لاؤ۔ میں پینا چاہتا ہوں۔ جاؤ۔"

"دیکھا۔ یہی ہوگا۔ بتانا نہیں چاہتا۔ اب بات بدل کر چائے کا کہہ دیا۔ میں بھی اب اس سے پوچھ کر رہوں گی۔ دیکھتی ہوں کتنا چھپاتا ہے۔"

"ابھی بنا کر لاتی ہوں۔"

پروین یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ اس کے انداز میں تجسس تھا۔ زوار اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ چلی گئی تو یہ پھر سوچوں میں ڈوب گیا۔

"کیا ہے یہ زندگی۔ ہر بندہ میرے لیے زہر رکھتا ہے۔ میرے لیے اس زندگی میں کچھ نہیں ہے۔ کیا کیا میں نے۔ کوئی بھی میرا نہیں۔ میں اس قدر گھٹیا ہوں۔ سب مجھے ہی غلط خیال کرتے ہیں۔ کیا میں ایسی زندگی جی سکتا ہوں۔ جس کے لیے میں ساری زندگی محنت کرتے گزر گئے۔ وہی ذرا سا بھی احسان نہیں مانتے۔ غلطی کیا ہے میری؟ میں کیوں کروں ان کے لیے محنت۔ کیا جینا ہے میری زندگی۔ کچھ نہیں۔ یہ دنیا نرا دھوکا ہے۔ اسے جتنا کماؤ۔ یہ اتنی ہی بے وفا ہے۔ تمہارے اپنے حسد کرتے ہیں۔ دولت سے غرض ہے۔ انسان سے نہیں۔ مجھے مر جانا چاہیے۔ نہیں جینا مجھے۔ میں پھر دیکھوں گا۔ کیا کرتے ہیں یہ میری بیوی، دوست سب۔ مجھے مر جانا چاہیے۔ میں ایسی زندگی نہیں جی سکتا۔ اس نے ایک دم ہی سے فیصلہ کر لیا۔ اسے ساری دنیا ہی فراڈ دکھائی دینے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا دماغ ہی گھوم گیا ہو۔ وہ ایک دم سے بیڈ پر سے اٹھا اور ڈرائینگ روم میں چلا گیا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے چند لمحے ادھر ادھر دیکھا اور باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ وہ دروازہ پار کر ہی رہا تھا کہ اور اپنی بیٹی زارا کی آواز سنائی دی۔

"پاپا!"

اس نے گھوم کر دیکھا، زارا سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ زوار خان اسے دیکھتے ہی ایک دم سے خوف زدہ ہو گیا۔ وہ یہی سوچ کر لرز گیا کہ اس کی بیٹی اس کے بارے میں کیا خیال رکھتی ہوگی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے ہاتھ یوں بڑھائے کہ وہ منہ بولے لیکن اس کے ردعمل میں زارا زور سے بولی۔

"پاپا۔ آئی لو یو۔"

"پاپا' آئی لو یو۔"

زوار خان بری طرح چونک گیا۔ اس نے شاکی نگاہوں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ زارا آگے بڑھ

آ گئی تھی اور بالکل اس کے قریب آ گئی۔

"زارا بیٹی! تم ٹھیک ہو۔"

"ہاں پاپا! میں ٹھیک ہوں۔ آپ کہاں تھے۔ میں نے آپ کو بہت مس کیا۔"

"میں نے آپ کو بہت مس کیا۔"

"اچھا۔ آپ سو جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔" اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا تو زارا نے پوچھا "آپ کہاں جارہے ہیں؟"

"میں، میں، کہاں جا رہا ہوں۔ میں بس جا رہا ہوں۔ تم جاؤ۔"

"بائے بائے پاپا..... آئی لو یو۔"

اس نے یہ سنا اور جلدی سے باہر کی طرف نکل گیا۔

وہ پورچ میں آ کر اپنی گاڑی میں بیٹھا تو اس پر انتہائی وحشت چھائی ہوئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی ایک نگاہ اپنے گھر کی جانب دیکھا۔ زارا دروازے میں کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نگاہیں چار ہوئیں تو اس نے ہاتھ ہلا دیا۔ زوار خان کا جی ایک دم سے بھر گیا۔ اب وہ اپنی بیٹی کو نہیں دیکھ پائے گا' جو اس کے لیے وہی سوچتی ہے جو وہ کہہ رہی ہے۔ وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھا اور تیزی سے گاڑی بڑھا لے گیا۔

وہ گاڑی لیے جا رہا تھا اور اس کے کانوں میں زارا کی آواز رہی تھی۔

"بائے بائے پاپا..... آئی لو یو..... بائے بائے پاپا..... آئی لو یو..... بائے بائے پاپا..... آئی لو یو۔"

زوار خان نے گاڑی سڑک کے کنارے پارک کی اور باہر نکل کر غور کرنے لگا۔ آواز مسلسل آ رہی تھی۔ زوار خان سوچنے لگا۔ یار سب تو ایک جیسے نہیں۔ میری بیٹی تو مجھ سے پیار کرتی ہے۔ اس کے من کی آواز وہی ہے۔ جو اس کی زبان پر ہے۔ وہ من کی سچی ہے میری بیٹی۔ کیا میں اسے اس دنیا میں تنہا

چھوڑ دوں۔ نہیں اور اس عذاب میں بھی تو زندگی نہیں گزاری جا سکتی' غلطی کہاں ہوئی؟ یہ میرے ساتھ..... کیا ہوا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ تبھی اچانک اسے یاد آ گیا' یہ تو کل ہی کا واقعہ تھا۔ وہ چرواہے لڑکے کی طرف نوٹ بڑھا رہا تھا۔ وہ اس پر دباڑا بھی تھا اور زوار کا اس کی طرف حقارت سے دیکھنا۔ کیا یہ کم غلطی ہے۔ اسے مزار پر کھڑے بابا سائیں کی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ ایک دم سے بڑبڑا اٹھا۔

"مجھے وہیں جانا چاہئے جہاں سے مجھے یہ نگاہ ملی ہے۔"

وہ پرجوش ہوتے ہوئے گاڑی میں بیٹھا اور اس کا گیئر لگاتے ہوئے بڑھ گیا۔

❀❀❀

سانول اپنا اجڑ لیے مزار کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اسی وقت زوار کی گاڑی بھی وہیں آ کر رک گئی۔ سانول اس کی جانب دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ زوار خان گاڑی روک کر باہر نکل آیا اور سانول کی طرف بڑھا تو سانول نے کہا۔ "آج مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے۔ آج تو میرا ڈھولن بھی میرے ساتھ نہیں؟"

"میری کوئی غلطی نہیں ہے تو پھر یہ بندو یوں کیوں رک گیا ہے۔"

یہ سنتے ہی زوار خان چونک گیا اور آبدیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"تیری کوئی غلطی نہیں ہے یار۔ بلکہ میری آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ جواب ہٹ گیا ہے۔"

"کیا؟ کون سا پردہ؟"

"یہ بندہ کیا کہہ رہا ہے۔"

"یار! تو کوئی بھی ہے مجھے معاف کر دے۔ یار تو جو مانگ میں تجھے دیتا ہوں' پر تو مجھے معاف کر دے۔"

"میرا ڈھولن ٹھیک کر دے۔"

"کیا یہ میرا ڈھولن ٹھیک کر دے گا۔"

زوار خان نے شرم سے سر جھکا لیا۔ وہ یہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے شرمندہ ہوتے ہوئے بولا

"یار! وہ تو میں ٹھیک نہیں کر سکتا۔ لیکن۔ ا میں اور بہت کچھ کروں گا تیرے لیے تو فکر نہ کر۔ بس تو مجھے معاف کر دے۔"

"میں نے معاف کیا۔"

"ہاں، تجھے معاف کیا۔"

زوار خان خوش ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے یہ انمول خوشی وہ کبھی بھی اپنی ساری دولت دے کر بھی خرید نہیں سکتا تھا۔ تبھی زوار خان نے جھومتے ہوئے پوچھا۔

"اب تو کہاں جا رہا ہے۔ آ۔ ! ذرا مزار تک چلیں۔ بابا سے ملیں۔"

"چلو، جیسے تم چاہو۔" سانول نے کہا تو دونوں مزار کی جانب چل دیئے۔

بابا سائیں احاطے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ان دونوں کو اکٹھے آتے ہوئے دیکھا تو بابا سائیں کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ دونوں چلتے ہوئے بابا سائیں کے پاس آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ تب بابا سائیں نے مسکراتے ہوئے پوچھا

"ہاں پتر! تو اس سانول کو لے کر آیا ہے۔ کیا بات ہے۔ گھبرا گئے ہو یا......"

"میں بہت بڑی غلطی پر تھا۔ میں مان گیا ہوں کہ دولت سے آپ دلوں کو نہیں جیت سکتے۔ دل جیتنے کے لیے بندے کو احساس چاہیے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ نے جو نگاہ مجھے دی ہے۔ خدا کے لیے اسے مجھ سے واپس لے لیں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔" زوار خان نے انتہائی عاجزی سے کہا

"بس یہ دو دن۔ اتنی ہی برداشت ہے تم میں۔ تم تو خود کو بڑا خوشحال سمجھتے تھے۔ ذرا سی نگاہ کیا بدلی تم تو ایک دم سے مرنے پر اتر آئے۔"

"سب کچھ بدل گیا بابا۔ ! میں نہیں جانتا تھا کہ میری سوچ اتنی محدود ہے۔ مگر میں نا امید نہیں ہوا۔ میری بچی۔ اور اس سانول جیسے ابھی لوگ موجود ہیں۔ ابھی اگلی نسل موجود ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔

"اور اسے ہم نے بتانا ہے۔ ہم جو آج بوئیں گے۔ کل وہی کاٹنا ہے۔" بابا سائیں نے کہا۔

"میں نے سانول سے معافی مانگ لی ہے۔ آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔" وہ عاجزی سے بولا۔

"او بیٹا! میں تجھ سے ناراض ہی کب ہوا تھا۔ میں نے تو تجھے ایک موقع دیا تھا۔ تاکہ تو اپنی نگاہ سے دیکھ لے۔ تجھے پتہ چلے۔ یہ دنیا کیا ہے۔"

"جی میں دیکھ چکا۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا تو بابا سائیں نے مغرب کی جانب دیکھا۔ زوار خان کے پس منظر میں سورج ڈوب رہا تھا۔ بابا نے اس جانب اشارہ کر کے کہا۔

"تو پہلے صبح کے وقت یہاں آیا تھا نا۔ اب شام ہو رہی ہے۔ وہ کہتے نا۔ صبح کا بھولا شام کو واپس آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔"

"بڑی مہربانی آپ۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"یہ میری دھرتی ہے بابا۔ یہاں کاروبار نہیں کرتا۔ جھوٹی انا نہیں رکھنی۔ یہاں لوگوں کی خدمت کرنی ہے۔ اس اندھیرے سے پھر سورج نکلنا ہے۔ اور اس روحی جیسی دنیا کو پھر سے آباد کرنا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ مزار سے اترتا چلا گیا۔ سانول اس کے ساتھ تھا۔ زوار خان سمجھ گیا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔

بند روزن

ریاض حسین شاہد

اللہ نے انسان کو ایک قطرے سے پیدا کیا' اسے زندگی کا شعور دیا' ہر مشکل راستے پر کامیابی سے چلنے کی طاقت اور صلاحیت دی مگر بعض لوگ خود زندگی کی بھول بھلیوں میں الجھ کر اپنی سمت کھو دیتے ہیں اور نصیب کا رونا روتے ہیں۔

ایک دوشیزہ کا فسانہ دلچسپ' اس نے خود اپنے ذہن کی کھڑکیاں بند کر رکھی تھیں۔

مناہل نے یوں تو پچھلے چھ ماہ سے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کررکھی تھی۔ کئی جگہوں پر نوکری کے لیے اپلائی بھی کررکھا تھا ایک دو پرائیویٹ کمپنیوں میں انٹرویو بھی دے ڈالے مگر کہیں سے بھی کوئی کامیابی کا جگنو چمکتا نظر نہ آرہا تھا۔ چھ ماہ کی کوششیں ثمرآور ثابت نہ ہو پا رہی تھیں۔ وہ خاصی مایوسی کی حالت میں وقت گزار رہی تھی۔

گھر میں یوں تو کسی چیز کی کمی نہ تھی ابوا یگریکلچر میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ بڑا بھائی یورپ میں اچھی جاب کررہا تھا۔ بڑی بہن شادی کے بعد اپنے گھر کی ہو چلی تھی بس ایک چھوٹا بھائی تھا جو بی اے کررہا تھا۔ مناہل کی والدہ ٹیچر تھیں مگر جب مناہل کا بھائی انگلینڈ میں سیٹل ہوگیا تو بیگم وحید نے جاب چھوڑ دی۔ مناہل کو گھر میں تنہا بیٹھنا مشکل لگتا تھا۔ بس اس کی ایک ہی دوست تھی جس کی پچھلے ماہ شادی ہوگئی تھی۔ ثمرین پرائی ہوئی تو مناہل اور بھی تنہا ہوگئی وقت گزاری کے لیے میگزین پڑھنا، فیس بک پر چیٹنگ کرنا، ثمرین سے گھنٹوں سیل فون پہ گپیں ہانکنا۔ اپنے بھائی کاشی کے ساتھ بائیک یا گاڑی پر گھومنا اس کے مشاغل تو نہ تھے مگر وقت گزاری کے لیے اکثر ساحل سمندر یا کسی پارک کے کیفے ٹیریا کے ان والے حصے میں بیٹھ کر وقت گزارنا پسند کرتی تھی۔ ایک عجیب سی بے کلی اور بے چینی سے وہ وقت بسر کررہی تھی۔

جن دنوں وہ ایم بی اے کا کورس کررہی تھی ان دنوں سہیل نے اس سے دوستی کی تھی پھر وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ مناہل بھی اس کی جانب جھکی ضرور تھی مگر جلد ہی وہ سہیل سے متنفر ہوگئی تھی دراصل اس دن وہ سہیل کی پرزور خواہش پر اس کے ساتھ ساحل سمندر پر گھومنے کے لیے گئی تھی۔ سہیل اس سے بہت محبت بھری باتیں کررہا تھا۔ بلکہ پیار نبھانے کی قسمیں کھا رہا تھا مگر جانے کیوں مناہل ابھی اسے پوری طرح دل میں اتار نہیں پا رہی تھی اور پھر جب وہ دونوں ساحل سمندر پر مچھلی کباب کی شاپ پر کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے مچھلی کباب کھاتے ہوئے باتیں کررہے تھے سہیل کے سیل فون پر بار بار ایک کال آرہی تھی اور سہیل ہر بار اسکرین پر نمبر دیکھتے ہی کال ڈراپ کردیتا اور اس کے چہرے پر ایک ناگوار شکن ابھر کر رہ جاتی۔ جب یکے بعد دیگرے چوتھی بار بھی ایسا ہی ہوا تو مناہل بول اٹھی۔

"تم بار بار کیوں آنے والی کال کو ڈراپ کررہے ہو سہیل، ہوسکتا ہے وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہو"

آپ سے۔ کوئی سیریس نیوز بھی ہو سکتی ہے۔"

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے منابل فضول سا دوست ہے خواہ مخواہ تنگ کرنا اس کی عادت ہے آپ ٹینشن نہ لیں کچھ نہیں ہونے والا۔" سہیل نے منابل کو بہلاتے ہوئے کہا۔

"دوست کوئی بھی ہو فضول نہیں ہوا کرتا سہیل۔ آپ اس سے بات نہیں کرنا چاہ رہے وہ پھر بھی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں اسے آپ سے اس قدر لگاؤ ہے کہ وہ آپ کے بغیر رہ نہیں پاتا اور آپ اسے فضول سا دوست کہہ رہے ہیں۔" منابل بات کر رہی تھی اور سہیل اس کی بات پر کسمسا رہا تھا۔ جیسے اندر کی کوئی خلش اسے چبھن دے رہی ہو اور منابل کی باتیں اس کے ضمیر پر ضرب لگا رہی ہوں۔

"چھوڑو یار تم تو سیریس ہو گئیں۔ کہا ہے نا وہ کوئی ضروری بات نہیں کرنے والا بس ایسے ہی..... آپ یہ لیں نا۔" سہیل نے کباب کا ٹکڑا کانٹے میں چبھو کر منابل کو پیش کرتے ہوئے کہا اور اسی لمحے اس کے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی سہیل کے ماتھے پر گویا تیوری آ گئی۔ اس نے تیزی سے سیل فون پتلون کی جیب سے نکالا اور اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اب کی بار وہ سیل کو ویسے ہی آف کر دے گا اچانک غیر متوقع طور پر منابل نے سہیل سے موبائل اپنی مٹھی میں لیتے ہوئے کہا۔

"پلیز سیل چھوڑیں۔" منابل نے سہیل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کچھ محبت اور ذرا سی خفگی کا تاثر ظاہر کر کے کہا۔

منابل کی اس قطعی غیر متوقع حرکت پر سہیل ٹپٹا سا گیا۔ وہ سیل فون منابل کو دینا بھی نہیں چاہتا تھا اور اس کی خواہش رد بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس نے موبائل پر اپنی گرفت ڈھیلی تو کر دی مگر تب تک کال کی گھنٹی خاموش ہو چکی تھی منابل نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی کی جھلک کو صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ سہیل نے چند ثانیے سیل فون ہتھیلی پر لیے رکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو یہ لو مگر تب تک منابل کا ہاتھ پیچھے جا چکا تھا۔

سہیل نے شانے اچکا کر ہلکا سا گلے کو کھنکار کر جیسے اندر کی بے چینی کو چھپانے کی کوشش کی ہو۔ منابل نے اسی لمحے ٹشو سے ہاتھ پونچھے ہلکا سا لبوں پر ٹشو کو استعمال کیا اور ٹیبل پر رکھا اپنا پرس بغل میں لے لیا۔

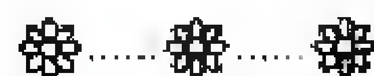
"ٹھہرو نا منابل، کیا ہوا ابھی چائے آ رہی ہے اور یہ کباب تو آپ نے کھائے ہی نہیں۔" سہیل نے اپنی اضطرابی کیفیت کو ایک پھیکی سی ہنسی میں چھپا کر بظاہر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے منابل سے کہا جس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ماحول گمبھیر سا ہو گیا تھا بسا اوقات ذرا سی بات دیرینہ تعلقات کو جب یکلخت توڑتی ہے تو دل پر گزرنے والی کیفیات چھپانے سے بھی چھپ نہیں سکیں۔ منابل اٹھ کر چل دی اور سہیل بل ادا کر کے تھکے تھکے قدموں سے اس کے تعاقب میں آنے لگا۔

پھر اس دن کے بعد منابل نے سہیل کا خیال تک دل سے ترک کر دیا اور اسے ایک خواب سمجھ کر نظر انداز کر دیا حالانکہ وہ اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا رہا مگر جب منابل نے اسے صاف کہہ دیا کہ آپ میرا خیال دل سے نکال دیں۔ میں آپ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تو سہیل بھی اس سے کھنچا کھنچا سا رہنے لگا۔ منابل کے دل میں مردوں کے

خلاف ایک نفرت سی پیدا ہو گئی تھی وہ جوان اور خوب صورت شخصیت کی مالک تھی۔ سب اسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے تھے اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتے تھے مگر مناہل کسی کی طرف مائل ہونے کا خیال بھی ترک کر دیتی۔ سہیل جاذب نظر بھی تھا۔

اس سے محبت بھی کرتا تھا مگر اس دن سمندر کنارے جو بات ہوئی تھی وہ مناہل کو بہت غمزدہ کر گئی تھی۔ سہیل نے کہا تھا چھوڑو وہ تو ایک فضول سا دوست ہے جو تنگ کر رہا ہے ہو سکتا ہے وہ اس کو چاہنے والی کوئی لڑکی ہو جو اس سے بے پناہ محبت کرتی ہو اور اب سہیل کا دل اس سے بھر چکا ہو۔ اس لیے اسے فضول کہہ رہا ہو ممکن ہے کوئی مرد اسے کال کر رہا ہو پھر بھی اسے اس کو ایک فضول سا دوست تو نہیں کہنا چاہیے تھا اس کی دوست ثمرین نے اسے یہ بات سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی کہ سہیل کی اس حرکت کو اتنی سنجیدگی سے مت لو۔ آپ پہلے اس سے پوچھ تو لیں کہ اسے کال کرنے والا کون تھا۔ پھر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں مگر مناہل نے ثمرین کو سختی سے روک دیا تھا کہ پلیز آپ سہیل کا میرے سامنے نام بھی نہ لیں۔ تب ثمرین بھی خاموش ہوئی تھی وہ اس کی عزیز ترین دوست تھی مگر جب اس کی شادی ہو گئی تو اس سے پہلی سی طویل ملاقاتیں مختصر دورانیے کی ہونے لگیں۔ مناہل خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔

گھر میں اس کے رشتے کی بات چلی تھی۔ مگر مناہل نے سب کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا تھا کہ جب تک میں کوئی جاب نہیں کر لیتی تب تک شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔



وہ دن مناہل کے لیے عید کی سی خوشیاں لے کر آیا تھا۔ جس دن اسے جاب ملی تھی اور پہلے دن وہ چارج سنبھال رہی تھی جاب اسے اپنے شہر سے دور ایک قصبہ میں ایک ڈسٹرکٹ ہیلتھ سینٹر میں بطور انچارج میڈیکل ڈاکٹر کی حیثیت سے ملی تھی جو اس نے خوش دلی سے قبول کر لی تھی کہ دور ہے تو کیا با عزت تو ہے ڈرائیو راسے روزانہ گاڑی پہ لے کر آتا کوئی دو گھنٹے کی مسافت تھی چند دن میں ہی وہ اس نئے ماحول اور سفر سے مانوس سی ہو گئی۔ ڈیوٹی سے لوٹ کر آتی تو اسے تھکن کا احساس ہونے لگتا مگر وہ پھر بھی خوش تھی کہ اس کی تنہائی کا عذاب تو کم ہو گیا تھا۔

اس روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی وہ ہیلتھ سینٹر جاتے ہوئے ثمرین سے فون پہ بات کر رہی تھی۔ ثمرین اس سے چھیڑ خانی کر رہی تھی کہ ''محترمہ اب ڈاکٹر بن گئی ہو تو کسی کو اپنا بنا کر اپنے من کی تنہائی کو بھی دور کرنے کا سوچ لو۔ بائیس برس کو پہنچ رہی ہو

محبوبہ سے بیوی تک

ٹرین کے ڈبے میں ایک مشہور سیاسی لیڈر کی خوبصورت سیکریٹری اس پر اپنی حسین اداؤں اور سب سے زیادہ اپنی باتوں کا جادو چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر سیاسی لیڈر نے اپنی نیند سے بوجھل آنکھوں کو زبردستی کھولتے ہوئے کہا۔ سنو! اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیں کہ ہم میاں بیوی ہیں تو کیسا رہے گا؟'' سیکریٹری دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے بولی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' لیڈر نے ذرا سختی سے کہا۔ ''تو پھر بکواس بند کرو۔ خود بھی سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔ اسے کہتے ہیں نہلے پہ دہلا کیا خیال ہے جناب کا......''

ثوبیہ رحمان... سرحد

کوئی دو سال اور اسی طرح گزر گئے تو چاندی کے تار نکلنا شروع ہو جائیں گے۔''

''زیادہ بکواس مت کرو ابھی مجھے جلدی نہیں ہے۔''

منا ہل اسے کہہ رہی تھی اور اسی لمحے ان کی گاڑی سامنے سے آنے والی بائیک سے ایک دھماکے کے ساتھ ٹکرا گئی۔

منا ہل کی چیخ نکل گئی ان کی گاڑی بری طرح لڑکھڑا گئی ان کی گاڑی کو کراس کرتے ہوئے سامنے سے آنے والی بائیک کا ٹائر سڑک سے اتر گیا۔ سنگل سی سڑک تھی ڈرائیور سائیڈ پر بائیک پھسلی اور گاڑی سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ بائیک پر سوار ایک خوش پوش گورا چٹا لمبے قد کا نوجوان تھا۔ جس کی گود میں چار سال کا پھول سا بچہ تھا وہ اسے اسکول چھوڑنے جا رہا تھا۔ ٹکر شدید ہوئی تھی ایک دھماکے کی آواز سے لوگ دور دور سے جائے حادثہ پر پہنچے تھے۔ بچہ خون میں لت پت بے ہوش ہو گیا اور باپ کی ٹانگ ٹوٹ گئی ایک بازو دو جگہ سے فریکچر ہوا منا ہل نے فوری کال کر کے اپنے سینٹر سے ایمبولینس منگوائی اور دونوں زخمی باپ بیٹے کو اپنے سینٹر لا کر نا صرف مرہم پٹی کی بلکہ درد سے بچت کے انجکشن لگا کر انہیں شہر کے اسپتال ریفر کر دیا۔

زخمی ہونے والا ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم تھا ایک سال پہلے ناصر کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا' جواد اس کی اکلوتی اولاد تھی جو اسے جان سے پیارا تھا۔ ناصر بار بار اپنے بیٹے کو بچانے کی درخواست کر رہا تھا۔

وہ خود سے زیادہ جواد کی وجہ سے ہلکان ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر منا ہل کو ناصر اور اس کے پھول سے بچے جواد سے بہت ہمدردی ہو رہی تھی۔ وہ ان کی وجہ سے بہت پریشان تھی اور ناصر کو بار بار یقین دلا رہی تھی کہ ہم ہر صورت جواد کو بچانے کی کوشش کریں گے۔ انہیں اسپتال روانہ کیا گیا تو ایمرجنسی وارڈ میں ڈیوٹی ڈاکٹر کو کال کر کے ناصر اور بچے جواد پر خصوصی توجہ دینے کی تاکید کر دی گئی۔ مگر جب شام کو منا ہل ان کی عیادت کو اسپتال پہنچی تو پتا چلا کہ بچے کو نہیں بچایا جا سکا جبکہ ناصر کو اس حادثے کی خبر سے آگاہ نہیں کیا گیا۔ ناصر کی ٹانگ اور بازو کا آپریشن کر کے انہیں انتہائی نگہداشت وارڈ میں رکھا گیا ہے منا ہل کو یہ سن کر گہرا صدمہ پہنچا۔



''ناصر صاحب آپ کا دکھ انتہائی کربناک ہے مجھے اس حادثے نے بہت دکھ دیا ہے اس بچے کی معصوم صورت ایک لمحے کے لیے میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو پا رہی۔ مجھے آپ سے بہت ہمدردی ہے۔ میں نے اسپتال کے انچارج سے آپ کی بہت سفارش کی ہے پھر بھی آپ کو دوران علاج کوئی کمی ہو تو مجھے ضرور انفارم کرنا یہ حادثہ مقدر میں لکھا تھا غلطی تو نہ ڈرائیور کی تھی اور نہ آپ کی۔'' منا ہل ناصر کی عیادت کرتے ہوئے اسے بڑے ہمدردانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

''غلطی میری تھی ڈاکٹر صاحبہ اگر میں اپنی بائیک کچی سڑک سے نیچے اتار لیتا تو یہ حادثہ کبھی پیش نہ آتا مجھے اپنے بچے سے بہت پیار تھا۔ اس کی آنکھیں اس کی ماں سے بہت مشابہ تھیں اور ستواں سی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔'' ناصر بتا رہا تھا اور اس کی آنکھیں اشکوں سے لبریز ہونے لگی تھیں۔ ڈاکٹر منا ہل کو بھی اپنی آنکھوں میں نمی سی محسوس ہونے لگی۔ تو وہ واپس پلٹنے کے لیے وہاں سے اٹھ گئی۔ دو ماہ کا عرصہ گزر گیا اور اس تمام دورانیے میں ایک دن بھی ایسا نہ آیا جس دن منا ہل ناصر کی عیادت

سکے لیے خوشی ہو۔



مناہل کے کزن شکیل کا رشتہ لے کر اس کے والدین ان کے گھر آئے۔ مناہل کے والدین نے مناہل سے بات کی تو مناہل نے انکار کر دیا کہ ان دنوں میں ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ ہوں۔ میں ابھی کوئی بات نہیں کر سکتی۔ وہ مایوسی سے واپس لوٹ گئے کیونکہ وہ مناہل کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔

پھر جب ناصر چلنے پھرنے کے قابل ہوا اور اسے گھر جانے کی اجازت دے دی گئی تو مناہل اپنی والدہ اور چھوٹے بھائی کامی کو لیے بے پناہ گفٹ لے کر ناصر کے گھر گئی۔ ان کا وہاں والہانہ استقبال کیا گیا۔ مناہل کی والدہ ان کے اچھے برتاؤ سے بہت متاثر ہوئیں اور انہیں کسی روز اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی جو خلوص دل سے قبول کر لی گئی۔



ناصر اپنی والدہ اور بڑی بہن کے ساتھ شام کے کھانے پر مناہل کے گھر پہنچا۔ جس کی اطلاع پہلے سے کر دی گئی تھی ان کے لیے پر تکلف ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ناصر نے اپنی طرف سے ڈاکٹر مناہل کو پھول پیش کیے جو مناہل نے مسکراتے ہوئے قبول کیے۔ پھر کھانے کی میز پر ہی ناصر کی والدہ اور بہن نے مناہل کے امی ابو کو اشارے کی زبان سے درخواست پیش کی کہ مناہل ہمیں بہت پسند ہے اگر آپ لوگ ناصر کے لیے پسند کریں تو ہمیں اس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہ ہوگی۔ مناہل نے ہمارے بیٹے کی بہت خدمت کی ہے پورے تین ماہ اس کی تیمارداری کرنے اور بھرپور نگہداشت سے علاج کرا کر ہمارے دل جیت لیے ہیں۔ ہم لوگ آپ کے درجے سے تو کم ہیں مگر انسانیت کے حوالے سے کم نہیں ہیں اگر آپ کسی قابل سمجھیں تو ہمیں اس سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہ ہوگی۔ ناصر زخم خوردہ ہے۔ مناہل کو کسی محرومی کا سامنا نہیں کرنے دے گا۔

ان لوگوں کا بے پناہ خلوص اور عاجزی دیکھ کر مناہل کے والدین نے پہلے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر سوالیہ نگاہوں سے مناہل کی طرف دیکھا۔ اس لمحے سب کی نظریں مناہل کی طرف اٹھ گئیں۔ جو حلق میں لقمہ روک کر عجیب سے تذبذب میں تھی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہنا شروع کیا۔

”آپ لوگوں کا بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں اس قابل سمجھا مگر افسوس کہ میں نے ابھی اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا اور میں نے آپ لوگوں پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ حادثہ چونکہ میری گاڑی کے ساتھ پیش آیا تھا اور پھر ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے میرا فرض بھی بنتا تھا۔ اللہ نے آپ کو نئی زندگی دی میرے لیے یہی کافی ہے آئندہ بھی خلوص بھرے جذبوں سے ملتے رہیں گے۔“ مناہل نے کہا اور کھانے کی میز سے اٹھ کر چلی گئی۔

جس سے ناصر اس کی والدہ اور بہن کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے چہرے بجھ سے گئے۔

”ارے کوئی بات نہیں ہم نے تو ایسے ہی بات کر دی تھی آپ لوگوں نے ہمیں اتنی عزت دی ورنہ اس دور میں کوئی کسی کو پوچھتا ہے زخمی حالت میں چھوڑ کر گاڑی لے کر بھاگ نکلتے ہیں۔ ناصر کی ماں نے جو سپنا دیکھا تھا وہ پل بھر میں ٹوٹ گیا تھا ناصر اور اس کی بہن بھی بڑی امید لے کر آئے تھے مگر مناہل کا گول سا جواب انہیں خاصا مایوس کر گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ واپس چل دیے تھے تب منابل کی ماں نے اپنے شوہر سے کہا تھا۔

"پتا نہیں وحید یہ لڑکی کیا کرنا چاہتی ہے اچھا خاصا رشتہ تھا زمیندار لوگ ہیں لڑکا ملازم ہے با عزت اور سمجھدار لوگ تھے مایوس کر دیا ان بے چاروں کو۔" بیگم وحید نے افسوس کرتے ہوئے کہا جبکہ وحید کا چہرہ سنجیدہ اور زبان چپ رہی۔



منابل کو ایک چپ سی لگ گئی تھی اور وہ سب سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ ڈیوٹی سے گھر آ کر زیادہ وقت اپنے کمرے میں فیس بک پر گزارتی یا پھر مطالعہ میں مصروف رہتی۔ اس روز بھی وہ انٹرنیٹ پر مصروف تھی کہ ایک اجنبی نے شخص کے ساتھ چیٹنگ شروع ہوگئی۔ وہ پچھلے دس سال سے انگلینڈ میں رہ رہا تھا اور خاندان پاکستان میں تھا۔ نام طارق حیات اور ڈیفنس میں قیام پذیر تھا۔

طارق حیات نے ایک سوال کا جواب پوچھا تھا اور درست جواب دینے والے کو پندرہ دن تک دبئی میں قیام اور آنے جانے کا ٹکٹ دینے کا وعدہ کیا تھا منابل نے بڑے تجسس سے طارق حیات سے اس کا سوال پوچھا تھا۔ سوال بڑا عجیب بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ طارق حیات نے پوچھا تھا کہ۔

"بانسری میں کتنے سوراخ ہوتے ہیں اور بانسری سے انسان کا تعلق کیا ہے۔" منابل نے جواب دینے میں ایک دن کی مہلت مانگی تھی۔ جو اسے کل شام سات بجے تک کا وقت دے دیا گیا منابل نے ہر حال میں اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کا ارادہ کیا اور اس کا دماغ تمام سوچوں کو بالائے طاق رکھ کر بانسری اور انسان پر غور و فکر کرنے لگا۔

پہلی بات تو اسے یہ بھی معلوم نہ تھی کہ بانسری میں سوراخ کتنے ہوتے ہیں بانسری کو اس نے کبھی غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ بس ٹی وی میں بانسری بجاتے ہوئے تو کئی فنکاروں کو دیکھ رکھا تھا مگر اس کے بارے میں جاننے کی اسے کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ اسے اس سوال کے عوض دبئی کے ٹکٹ کا اس قدر شوق نہیں ہو رہا تھا اسے تو اس سوال سے ایک گہری دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور وہ جلد سے جلد اس راز کو جان لینا چاہتی تھی اس نے اپنی کئی دوستوں کو فون کر کے پوچھا تو سب نے اس کا تمسخر اڑایا کہ بھلا تمہیں رات گئے کیا مصیبت آن پڑی کہ تم اتنے اشتیاق سے بانسری کے سوراخوں کا پوچھ رہی ہو۔ اسے سوال کا جواب طنز و مزاح کی صورت میں ملا منابل بڑی بے چین ہوگئی جب کہ ابھی نو بجے تھے جانے صبح کب مارکیٹ کھلے اور اسے آٹھ بجے اپنے اسپتال بھی پہنچنا تھا اس نے ہلکا سا ڈریس پہنا پرس میں کچھ نوٹ رکھے اور مارکیٹ جانے کے ارادے سے چل دی۔ اس نے گھر کے کسی فرد کو بتانا بھی مناسب نا سمجھا کہ اب کس کس سے سر دردی مول لے گی۔ گیراج سے گاڑی نکالی اور چوکیدار کو بتایا کہ میں ذرا مارکیٹ تک جا رہی ہوں۔ جلد ہی لوٹ آؤں گی اب وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کہاں جائے۔ اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا اور اس نے گاڑی کی اسپیڈ تیز کر دی۔

سرخ رنگ کی ٹیوٹا شہر کے مشہور بینڈ ساز کی شاپ پر جا رکی۔ شادی بیاہ پر شہنائی بجانے والے بینڈ ماسٹر مقبول احمد کا نام کسی تعارف کا محتاج نا تھا۔

منابل نے پرس سنبھالا اور شاپ میں داخل ہوگئی شاپ میں موجود نگراں نے اسے ویلکم کیا اور

صوفے پر بیٹھنے کی پیشکش کی۔
"آپ کے پاس بانسری ہوگی۔" مناہل نے تمہید کے بغیر اپنے مقصد کی بات کی۔
"بانسری؟" حیرت سے پوچھا تھا۔
"جی۔" مناہل نے اپنی بات پر زور دیتے کر کہا۔
"بانسری تو نہیں بیگم صاحب ہمارے پاس کلانٹ ہے جسے شہنائی بھی کہا جاتا ہے اور یہ بانسری سے بہت مشابہ ہے۔" شاپ کیپر نے عاجزی سے کہا۔
"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ بانسری میں سوراخ کتنے ہوتے ہیں؟" مناہل نے پرتجسس انداز میں پوچھا۔
"جی ہاں، پورے نو سوراخ ہوتے ہیں اور ہماری کلانٹ میں بھی نو ہی سوراخ ہوتے ہیں یہ دیکھیں شاپ کیپر نے دیوار پر لٹکے چند دوسرے سازوں کے ساتھ موجود کلانٹ اتاری اور مناہل کے قریب کر کے ایک ایک سوراخ پر انگلی رکھ کر گنتے ہوئے نو سوراخ ہونے کا یقین دلایا۔ پانچ پچھلے حصے میں پھر ایک انگلی کا وقفہ چھوڑ کر چار سوراخ جس سے ذرا آگے قلم کی طرح تراشا ہوا وہ حصہ تھا جو منہ میں دبا کر بانسری سے سُر نکالے جاتے تھے۔
مناہل نے کلانٹ پکڑ کر دونوں ہاتھوں سے گھماتے ہوئے اس کا بھرپور جائزہ لیا اور پھر اسے بجانے کی خواہش ظاہر کی ایسے میں ماسٹر جی کو بلا کر کلانٹ بجانے کو کہا گیا۔ اس نے کلانٹ سے ایک معروف گیت کے سُر پیدا کر کے مناہل کو بہت متاثر کیا اس نے انعام کے طور پر اپنے پرس سے ایک بڑا سا نوٹ نکال کر بینڈ ماسٹر کو پیش کیا اور ایک بار پھر اپنی تسلی کے لیے پوچھا کہ بانسری میں نو ہی سوراخ ہوتے ہیں نا اسے یقین دلایا گیا کہ بیگم صاحب کل ہم آپ کو بانسری لا کر دکھا دیں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے کل میں سیکنڈ ٹائم میں یہاں آؤں گی اور خود اپنی آنکھوں سے بانسری کا مشاہدہ کروں گی۔" مناہل نے کہا اور گھر چل دی پھر رات دیر گئے تک وہ بانسری کے نو سوراخوں اور انسان کے وجود کا موازنہ کرتی رہی۔ مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ اسے اس کی عزیز دوست ثمرین نے اتنی بات بتائی تھی کہ صوفیا کرام نے تصوف کی کتابوں میں انسان اور بانسری کا سب سے زیادہ ذکر کیا ہے آپ کسی بک سے مدد لے سکتی ہیں۔ اس نے نیٹ کھول کر عارفانہ کلام کا مطالعہ کیا۔
اس کلام میں انسان اور بانسری کا ذکر تو موجود تھا مگر مفہوم درج نہیں تھا۔
جس بستی کے اسپتال میں مناہل بطور ڈاکٹر اپنے فرائض سر انجام دے رہی تھی اس بستی میں ایک اللہ کے بزرگ قیام فرما تھے جن کے بہت سے مرید ان کے ہاں ہر وقت موجود رہتے تھے مناہل نے خود سے طے کیا کہ وہ کل اس بزرگ سے اس راز کو جاننے کی کوشش کرے گی۔



مناہل کو اس صوفی بزرگ سے نا صرف اس کے سوال کا تفصیلی جواب ملا بلکہ اور بھی راز کی باتیں معلوم ہوئیں۔ جنہیں جان کر وہ بے حد متاثر ہوئی تھی پھر ابھی وہ اپنے دفتر میں ہی تھی کہ اسے طارق حیات کی فون کال موصول ہوئی وہ آج شام اسے کسی ریسٹورنٹ میں ملنا چاہتا تھا۔ مناہل نے بھی یہ مناسب سمجھا کہ دو بدو بیٹھ کر اس کے سوال کا جواب دینا زیادہ موزوں رہے گا۔ لہٰذا مناہل نے طارق حیات سے شام سات بجے شہر کے ایک معروف ریسٹورنٹ میں ملنے کا وعدہ کرلیا اور پھر جب شام کو

منائل ریستوران پہنچی تو طارق حیات پہلے سے وہاں اس کا منتظر تھا تصویری تبادلہ دونوں طرف ہو چکا تھا اس لیے دونوں کو ایک دوسرے کو پہچاننے میں کوئی دقعت پیش نہ آئی طارق حیات ایک درمیانے قد و قامت کا آدمی تھا مناسب خدوخال مگر چہرے پر بھنوؤں کے گھنے بال اور تراشی ہوئی مونچھیں دیکھنے والے پر کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑتی تھیں۔ باہر گھاس کے لان میں طارق حیات نے اس لیے بیٹھنا زیادہ پسند کیا تھا کہ اس کی ہو آزادی سے اس کے پاس رہ سکے۔ ہو اس کی بندریا کا نام تھا جس سے وہ بے پناہ محبت کرتا تھا مانچسٹر میں ہو کو اس نے کافی مہنگی رقم دے کر خریدا تھا اور پچھلے دو سال سے وہ اس کے ساتھ رہ رہی تھی وہ جہاں جاتا اسے ساتھ لے کر جاتا۔ ہو کو بھی طارق سے اتنی محبت تھی کہ اگر وہ اسے اپنے ساتھ نہ لے کر جاتا تو وہ چیختے ہوئے اچھل اچھل کر دیوار سے سر ٹکرانے لگتی اور خود کو زخمی کرنے پر تل جاتی کئی بار وہ اپنا سر زخمی کر چکی تھی اور ایک بار تو طارق کی گاڑی کے ٹائر کے نیچے سر دینے لگی تھی۔ جب طارق اسے چھوڑ کر جانے لگا تھا ہو نے گلابی گھاگھرا اور گلے میں کرتا پہن رکھا تھا گلے میں خوب صورت پٹہ جس سے زنجیر بندھی تھی ہو اچھل کود کرتے ہوئے کبھی طارق کی گود میں بیٹھ جاتی کبھی کندھوں پر سوار ہو جاتی۔ طارق نے اس کے لیے شاید پیک میں بہت سی کھانے کی چیزیں میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ ہو خود ہی اپنی پسند کی چیز نکال نکال کر کھا رہی تھی۔ منائل کو طارق کے ساتھ بندریا دیکھ کر حیرت بھی ہوئی تھی اور ایک گھن سی بھی آئی تھی مگر جب وہ طارق کے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی تو طارق حیات نے اپنی ہو کو اشارہ دیا ہو اچھل کر میز پر آئی

اور منائل کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا منائل نے کچھ ناپسندیدگی سے اپنے ہاتھ کی دو انگلیاں اس کی طرف بڑھائیں مگر ہو نے اپنے دونوں ہاتھوں سے منائل کا پنجہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے جھک کر چوم لیا۔ طارق دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور منائل بھی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ سجائے اپنے ہاتھ کو ٹشو سے صاف کر رہی تھی۔

پھر جب تک ویٹر ڈرنک وغیرہ لے آیا ہو کی بات ہی چلتی رہی۔

''طارق حیات آپ کا سوال بڑا منفرد اور انٹرسٹڈ تھا مجھے بہت محنت کرنا پڑی اس کا جواب تلاش کرنے میں اب خدا جانے میرا جواب درست بھی ہو یا کہ نہیں۔'' منائل نے اصل بات کا آغاز کیا اس عرصے میں ہو پھر سے طارق کی گود میں بیٹھی اور وہ بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چونک کر بولا۔

''تو آپ نے جواب ڈھونڈ نکالا۔''

''یس۔'' منائل نے ڈرنک کا اسٹرا لبوں سے لگاتے ہوئے پرتجسس انداز میں کہا پھر جب اس نے تفصیلی جواب سے طارق کو آگاہ کیا تو طارق کی آنکھیں حیرت سے پھیل سی گئیں۔

''اوہ، اتنا تفصیلی جواب تو میں بھی نہیں جانتا تھا ویلڈن مس منائل۔''

جی طارق صاحب! مجھے اپنے جواب کی تصدیق تمہاری ہو کو دیکھ کر اور بھی مستحکم ہوئی ہے کیونکہ بندر کی مشابہت انسان کے قریب ترین ہے بس اس میں چلبلاہٹ ہے اور قوت گویائی نہیں جبکہ انسان ناطق ہے شاید اسی لیے اسے اشرف المخلوق کا مقام دیا گیا ہے۔'' منائل کہہ رہی تھی۔

اور دونوں کی نظریں بہو کے چہرے پر جمی تھیں جو اپنے ہونٹوں کو مختلف زاویوں سے حرکت دے کر چلبلا رہی تھی۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے مس منال میں آپ کو اپنے گھر کل شام کے کھانے کی دعوت دیتا ہوں اپنا پاسپورٹ بھی لیتی آنا ایک ہفتے کے اندر آپ کو دبئی کا ٹکٹ مل جائے گا آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔"

"تھینک یو طارق صاحب تو اب میں چلوں گی۔" منال نے اجازت چاہی۔

"اگر ہو سکے تو اپنے ہمسفر کو بھی ساتھ لیتے آنا میرا مطلب ہے منگیتر کو۔" طارق نے کچھ ہڑبڑاہٹ سے کہا۔

"ابھی ایسا کچھ نہیں ہے۔" منال نے کہا اور جیسے ہی ٹیبل سے پرس اٹھایا بہو لپک کر اس کے پاس آئی پہلے ہاتھ ملایا پھر اپنا چہرہ منال کے ہونٹوں کے قریب کیا منال نے مسکرا کر دور سے ہی اسے کس کی اور اس کے قدم کار پارکنگ کی جانب اٹھنے لگے۔



برٹش ایئرلائن کا طیارہ دبئی کے لیے پرواز کر رہا تھا اور آنکھوں پر سبز شیشوں والا قیمتی چشمہ لگائے منال کھڑکی کے ساتھ فضا میں نگاہیں جمائے طارق حیات کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس نے منال کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی اور اسے پر تکلف ضیافت پیش کی تو طارق کی والدہ اور بھائی نے پرجوش انداز میں منال کا استقبال کیا وہ کھانے کی میز پر اس کے ہمراہ تھیں۔ طارق بھی اپنی بہو کے ساتھ ٹیبل کے آخری کونے پر موجود تھا۔ منال کی سوالیہ نگاہیں ادھر ادھر شاید طارق کی اہلیہ اور بچوں کی متلاشی تھیں۔ طارق کی والدہ نے محسوس کیا کہ وہ کیا ڈھونڈ رہی ہے تب انہوں نے خود ہی یہ انکشاف کیا۔

"بیٹا! طارق کی شادی ہم نے بڑے شوق اور چاؤ کے ساتھ اس کی کزن سے کی تھی وہ طارق کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی۔ ایک بچے کی ماں بھی بن گئی بچہ ابھی ایک سال کا تھا کہ اس پر اللہ کی لعنت برس پڑی اس نے ایک غیر مذہب کرسچن سے دوستی کر لی۔ کورٹ میں جا کر طارق سے طلاق لی اور بچے کو چھوڑ کر چلی گئی۔ بچہ ماں کی جدائی نہ سہہ سکا اور شدید بیمار رہ کر تین ماہ بعد چل بسا۔ تب سے میرا بیٹا اس زندگی سے دلبرداشتہ ہو گیا ہے اور پھر اس نے یہ بندریا پال لی اور اس کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔" طارق کی ماں نے غمناک آواز میں بیٹے کی درد بھری کہانی سنائی تو سارا ماحول اداسی میں ڈوب گیا۔

منال کو یہ جان کر بہت دکھ ہوا اس نے ترچھی نگاہ سے طارق کے چہرے کی طرف جھانکا جہاں ندامت بے بسی اور اداسی کے سائے برس رہے تھے۔ طارق نے اس کی نگاہوں کی تپش کو محسوس کر کے چہرہ دوسری طرف گھما لیا تھا منال کے دل میں اس کے لیے بے پناہ ہمدردی کے جذبات ابھرے مگر اس نے اپنی توجہ طارق کی والدہ کی طرف موڑ لی۔

"تو اب طارق حیات کو چاہیے کہ پھر سے گھر بسا لیں۔" منال نے مشورہ دیا۔

"بہت کوشش کی ہے ایک سے ایک رشتہ چاہا ہے مگر طارق نے تو قسم کھالی ہے کہ اب میں کسی عورت پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ میرا اعتبار کھو چکا ہے۔" ماں نے بے بسی سے بتایا۔

"بانسری اندر سے خالی ہوتی ہے تو اس میں سے سُر نکلتے ہیں اور جانور کے منہ میں زبان نہیں ہوتی اس لیے یہ وفا کرتے ہیں۔ اگر انسان بھی اندر سے

خالی ہو جائیں، بے زبان ہو جائیں تو مقام ارتقا کو جا پہنچیں باقی سارا فلسفہ تو آپ پڑھ چکی ہیں۔" طارق نے مناہل کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

"ہاں مگر انسان کا مقام ان چیزوں سے بلند ہے بانسری کے سُر اس کے سوراخوں سے برآمد ہوتے ہیں بندر کی آنکھوں میں بھی بے پناہ سُر چھپے ہوئے ہیں اگر کوئی دیکھنا چاہے تو...... اور انسان کا مرتبہ تو افضل ہے ہر مادی اشیا سے جانوروں سے اور فرشتوں سے بھی ورنہ آدم کو سجدہ کرنے کا فرشتوں کو حکم نہ دیا جاتا۔ ٹھہر جانے کا نام موت ہے اور آپ مایوسی کے اندھیرے میں ٹھہر کر بھٹک بھی گئے ہیں۔ ہر قدم ایک نئی منزل کی طرف لے کر جاتا ہے اور ہر نئی منزل ایک نئی زندگی سے آشنا کرتی ہے۔" مناہل نے کہا اور جانے کی اجازت چاہی پھر جب اسے ٹکٹ دینے کے لیے طارق اس کے آفس میں آیا تھا تو بند لفافے میں ایک سطری پیغام مناہل کے نام لکھا تھا۔

"میرے ارتقا کا سوراخ بند ہے جو صرف آپ کھول سکتی ہیں۔"

بس یہ دو جملے مناہل کے دماغ میں ٹھہر گئے تھے اور اس کی ساری سوچیں اسی بات پر زیرو زبر ہو کر اسے صلیب پر لٹکا رہی تھیں اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ادھیڑ عمر عورت جو قابل رشک شکل و صورت کی مالک تھی اور شاہانہ لباس میں ملبوس سب کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ مناہل کو پریشان حال دیکھ کر اس نے اس پریشانی کا سبب پوچھا وہ بھی پندرہ دن کے لیے دبئی اپنے بھیا اور بھابی سے ملنے جا رہی تھیں پھر جب وہ دبئی ائیرپورٹ پر اتریں تو دونوں ایک ساتھ ٹیکسی میں سفر کر رہی تھیں۔ مناہل کو رمشا اپنے ساتھ لے جا رہی تھیں اور پندرہ دن تک اسے خود سے جدا نہیں ہونے دیا۔

رمشا ایک امیر گھرانے کی خاتون تھیں جو جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں اور اب اپنے پاپا کے ساتھ تنہا زندگی بسر کر رہی تھیں۔ مناہل نے اسے طارق کی زندگی سے آشنا کرایا۔ رمشا بھی طارق کے حالات جان کر بے حد متاثر ہوئی۔ فون پر طارق سے بات کی پھر یہ سلسلہ لگاتار دو ہفتے تک چلتا رہا جب رمشا اور مناہل پاکستان لوٹ کر آئیں طارق سے دو بدو ملاقات ہوئی تو مناہل نے ان دونوں سے ایک بات کہی۔

"آپ دونوں کی زندگیوں میں ایک ایک روزن بند ہے۔ جو آپ دونوں کے بیچ ایک پردہ بن کر حائل کھڑا ہے بس ایک قدم بڑھاؤ اور زندگی کی روانی میں آگے بڑھ جاؤ تمہاری گم گشتہ منزل سامنے کھڑی تمہیں پکار رہی ہے۔"

"مگر تم بھی تو کسی بند روزن کے پیچھے کھڑی ہو تم کب اس پردے کی قید سے نکل پاؤ گی۔" رمشا نے مناہل سے پوچھا تو مناہل نے کہا۔

"میں بھی اپنے بند روزن کو کھوج چکی ہوں اور اس بند روزن کا نام ناصر ہے جو میرے ایک قدم کے فاصلے پر میرا منتظر ہے۔"

بانسری کے بھی نو روزن ہوتے ہیں اور انسانی باڈی میں بھی نو ہی روزن ہوتے ہیں اگر وہ کھلے ہوں اور اس بند روزن پر رکھے ہوئے ہونٹ درد آشنا ہوں تو پھر بانسری بھی دل موہ لینے والے سر بکھیرتی ہے اور انسان بھی زندہ دلی کا سرگم بن جاتے ہیں۔

دھوکے باز

محمد حنیف قادری

ہم ہر ایسے واقعہ یا کام کو مافوق الفطرت قرار دیتے ہیں جو ہماری عقل سے ماورا ہویا ہم اس گتھی یا اسرار کو سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں، ہماری یہی خامی ہمارے دشمن کا سب سے بڑا ہتھیار ثابت ہوتی ہے۔
ایک چھوٹے سے گاؤں میں کھیلا جانے والا ڈرامہ' بھارتی ایجنسی "را" کا احوال' اسرار اور تجسس سے لبریز۔

ہمارا گاؤں رنگ پور تو سرحدی چوکی سے کافی ہٹ کر تھا مگر ہماری زمینیں انڈیا کی سرحد سے ملتی تھیں۔ پچیس مربع اراضی کا میں تنہا وارث تھا۔ زمینوں کی دیکھ بھال مکمل طور پر میرے ذمے تھی۔ سرحدی چوکی کے قریب ہی زمینوں پر میرے آباؤ اجداد نے ڈیرہ سا بنا رکھا تھا جہاں پر ہم نے مال مویشی بھی رکھے ہوئے تھے۔ ان دنوں مجھے گھڑ سواری کا جنون کی حد تک شوق ہوا کرتا تھا۔ اسی سلسلے میں لشکارے مارتی سفید رنگ کی ایک گھوڑی جسے میں پیار سے لاڈو رانی کہا کرتا تھا میرے پاس موجود تھی۔ یہ گھوڑی کئی لحاظ سے مجھے بہت پسند تھی۔ گھڑ دوڑ کا میدان ہو یا میلے میں ناچ کا دکھاڑا، میری لاڈو نے کبھی مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ اس گھوڑی کا مالک ہونے کی وجہ سے کئی جگہوں پر میری شہرت تھی۔ جب بھی اس گھوڑی کے ذریعے میں کوئی میدان مار کر آتا تو کئی کئی دن تک سننے جاننے والوں کا جمگھٹا سا لگا رہتا۔ لاڈو کو کئی شوقین لوگوں نے مجھ سے خریدنے کی کوشش بھی کی مگر وہ اس لیے نہ خرید سکے کہ ان کے پاس شاید گھوڑی خریدنے کی استطاعت تو تھی مگر ان کے پاس میرے شوق کا کوئی مول نہیں تھا۔ اپنی لاڈو رانی کے حوالے سے میں کافی محتاط بھی تھا اور جانتا تھا کہ اس دنیا میں ایسے شوقین بھی ہیں جنہیں اگر کوئی چیز روپے پیسے سے نہ ملے تو وہ اسے چھیننے کے درپے ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات تو لوگ اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور وہ کچھ کر جاتے ہیں جس کا انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔

ہماری پچیس مربع اراضی کا تقریباً آدھا حصہ قدرتی جنگل اور جھاڑ جھنکاڑ پر مشتمل تھا اور یہ جگہ زیادہ تر انڈین سرحد سے ملتی تھی۔ اسی جھاڑ جھنکار اور قدرتی جنگل کے درمیان ایک کھنڈر حویلی بھی موجود تھی جس میں شاید کبھی میرے آباؤ اجداد کا بسیرا ہوا کرتا تھا مگر اب یہ حویلی بالکل ہی غیر آباد اور ویران پڑی تھی۔ میں نے اپنے بڑوں سے اس حویلی کے بارے میں کئی پراسرار اور خوفناک باتیں سن رکھی تھیں۔ ہمارے ارد گرد پھیلے ہوئے اس علاقے میں کئی اور لوگ بھی اس حوالے سے کئی مافوق الفطرت اور ناقابل یقین سی باتیں بتاتے رہتے تھے مگر میں نے کبھی ان باتوں پر یقین نہیں کیا۔

میرا گاؤں رنگ پور ہماری زمینوں سے تقریباً تیس کلومیٹر کی دوری پر تھا اور ان دنوں ہمارے علاقے میں کوئی پکی سڑک بھی نہیں تھی۔ ایک کچا اور ناہموار سا راستہ تھا جس پر اکثر لوگ پیدل ہی سفر کیا کرتے تھے البتہ سامان لانے لے جانے کے لیے لکڑی کے پہیوں والے ریڑھے موجود تھے جنہیں ان دنوں پنجاب میں لوگ گڈے کہا کرتے تھے۔ لمبے سفر کے لیے غریب لوگ تو پیدل ہی سفر کیا کرتے تھے اور اگر راستے میں کوئی گڈا وغیرہ مل جائے تو وہ اسے غنیمت

جایا کرتے تھے البتہ کچھ امیر اور صاحب ثروت لوگ اکثر گھوڑوں پر سفر کرتے۔ کچھ لوگوں نے اس مقصد کے لیے تانگے بھی بنوائے ہوئے تھے۔ یہ تانگے کرائے پر دستیاب ہوتے تھے۔ کہیں مرگ یا شادی بیاہ پر دور کہیں آنا جانا ہوتا تو زیادہ تر لوگ گدھے یا تانگے کا استعمال ہی کرتے تھے۔

اس دور میں لوگوں کے پاس آج کے ترقی یافتہ دور کی سہولیات نہیں تھیں مگر لوگوں میں بھائی چارے اور امن کی فضا قائم تھی۔ لوگ ایک دوسرے کا دکھ درد سمجھتے اور محسوس کرتے تھے اور اپنی اوقات سے بڑھ کر ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ گاؤں میں کہیں چوری چکاری کی واردات ہو جاتی تو پورا گاؤں اکٹھا ہو جاتا اور پورا گاؤں ہی اس گھر کے ساتھ کھڑا ہو جاتا جس کی چوری ہوئی ہوتی۔ کوئی بیمار ہو جاتا تو لوگ بیمار پرسی کرتے۔ کوئی مرتا تو بھی لوگ ان کے لواحقین کے غم میں برابر کے شریک ہوتے۔ شادی بیاہ کی رسم میں بھی لوگ بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے۔ اس دور میں لوگوں کے پاس ایک دوسرے کا دکھ بانٹنے کا وقت تھا مگر آج کا معاشرہ ہے کہ کسی کے پاس اپنے رشتہ دار اور عزیزوں کے لیے ہی وقت نہیں تو بیگانوں کے لیے کہاں سے ہوگا۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک رات کی خاموشی میں میرے ڈیرے سے میری پیاری اور چہیتی گھوڑی لاڈو کو چرا لیا گیا۔ یہ دسمبر کے آخری ایام تھے سخت سردی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے ہمارے علاقے کو شدید دھند نے ہر طرف سے گھیرے میں لیا ہوا تھا اور رات کو اکثر دھند اتنی شدید ہو جاتی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چوری کے لیے یہ بہترین حالات تھے جس کا چور نے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ اس بات کا مجھے اس وقت پتہ چلا جب صبح گھوڑی کو چارہ ڈالنے والے نوکر نے آکر بتایا کہ گھوڑی اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ گھوڑی کے لیے میں نے ایک الگ سے کمرا بنوا رکھا تھا جو مویشیوں کے باڑے میں ہی تھا۔ رات کو جب نوکر دوسرے مویشیوں کو سردی سے بچاؤ کے لیے باڑے میں کھلا چھوڑ دیتے تھے تو اسی وقت وہ گھوڑی کو بھی اس کے کمرے میں باندھ دیا کرتے تھے اور کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا کرتے تھے اور گزشتہ رات بھی ایسا ہی ہوا تھا مگر صبح جب شمسو نامی نوکر مویشیوں کے باڑے میں داخل ہوا تو گھوڑی کے کمرے کا تالا ٹوٹا دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے کمرے کا تالا کھولا تو اندر گھوڑی کو نہ پا کر وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہی وہ بھاگم بھاگ میرے پاس چلا آیا۔

شمسو کی زبانی سارے حالات سننے کے بعد میں نے خود باڑے میں جا کر حالات کا جائزہ لیا۔ گھوڑی والے کمرے کا تالا کسی نے اتنے ماہرانہ انداز میں توڑا تھا کہ اسے دیکھتے ہی ایک بات کا مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کسی عام چور کا کام نہیں اور پھر رات کے سمے جب کہ ہمارے اس علاقے کے پرسکون اور سناٹا زدہ ماحول میں درختوں سے پتے گرنے تک کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ ایسے میں کسی چور کا بغیر آواز کیے تالا توڑ کر گھوڑی کو لے کر نکل جانا بڑی حیرت اور اچنبھے کی بات تھی۔ یہ لازمی طور پر کسی ماہر چور کا کام تھا۔ ہمارے علاقے میں چوری کی اکا دکا واردات بھی ہوتی رہتی تھیں مگر اس منفرد انداز میں یہ پہلی چوری تھی جو کہ میرے علم میں آئی تھی۔ لازمی بات ہے اس چوری میں کسی نہ کسی طور کوئی ایسا شخص شامل تھا جو کہ مجھ سے گھوڑی خریدنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے گھوڑی نہیں بیچی تھی اور اس شخص نے اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا اور اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے انگلی ٹیڑھی کر لی تھی۔

مگر ایسے تو جانے کتنے لوگ تھے جنہوں نے مجھ

سے اس سلسلے میں بات کی تھی مگران میں کون ایسا تھا جو اس حد تک پہنچ گیا کہ اس نے یہ قدم اٹھایا۔ سات بجے کے قریب شدید دھند کے دوران ہی ہمارے علاقے کا مشہور کھوجی اللہ دتہ بھی آ گیا۔ اطلاع تو میں نے قریبی تھانے میں بھی کی تھی مگر جانے ابھی تک وہ لوگ کیوں نہیں پہنچے تھے۔ بہرحال کھوجی نے سارے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے کمرے کا آغاز کیا۔ ابتدائی حالات کا جائزہ لینے کے بعد وہ بے چارہ بھی کافی حیران اور پریشان تھا۔ اس سلسلے میں اس نے میرے تجزیے سے اتفاق کیا مگر ایک بات جو اسے زیادہ پریشان کیے ہوئے تھی وہ یہ تھی کہ اس کے مطابق چور کوئی نوعمر لڑکی تھی۔ اس کا اندازہ اس نے پاؤں کے اس کھرے کو دیکھ کر لگایا تھا جو کہ کمرے کے باہر اور اندر لگا ہوا تھا۔ باڑے سے باہر نکلتے ہی چور گھوڑی پر سوار ہو گیا تھا۔

اللہ دتہ ایک تجربہ کار اور محنتی کھوجی تھا۔ اس وقت بھی ہر طرف شدید دھند پھیلی ہوئی تھی۔ کھوجی کے ساتھ میرے نوکروں کے علاوہ قریبی گاؤں دھرم پورہ کے کچھ لوگ بھی شامل تھے۔ کھرے کا رخ ہماری پرانی آبائی حویلی کی طرف تھا۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ کی تفتیش کے بعد اللہ دتہ حیران پریشان سا میرے پاس آیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔

''سرکار! یہ کسی انسان کا کام نہیں لگتا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں سمجھا نہیں۔'' میں نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اقبال پتر! میں نے زندگی میں کئی دفعہ کھرے نکالے ہیں مگر پہلے تو مجھے وہ عجیب و غریب پاؤں کا نشان دیکھ کر ہی حیرت ہوئی جو کہ چور کے پاؤں کا نشان ہے سوچ سوچ کر آخرکار میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کسی نوعمر لڑکی کے پاؤں کا نشان ہو سکتا ہے کسی مرد کا نہیں اور اب کھرا ایک ایسے مقام پر آ کے رک گیا ہے جہاں پر اس کے رکنے کا تک ہی نہیں بنتا۔ حویلی کے کھنڈر میں ایک کونے والے خستہ حال سے کمرے میں جس کی آدھی چھت گری ہوئی ہے وہاں جا کر گھوڑی کا کھرا غائب ہو گیا ہے۔ اس سے ادھر ادھر کافی دور تک میں دیکھ چکا ہوں مگر گھوڑی کے کھرے کا کوئی نشان ہی نہیں مل رہا۔ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟ آخر وہاں سے گھوڑی گئی کہاں؟ البتہ وہاں جہاں پر گھوڑی کا کھرا غائب ہو رہا ہے وہاں پر تازہ خون کے نشانات ہیں مگر قریب میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں تھی جس کا یہ خون ہو! یہ سب کیا ہے مجھے تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا مجھے تو لگتا ہے یہ کسی اور ہی مخلوق کی کارروائی ہے۔'' اللہ دتہ کھوجی نے مجھے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

''چاچا جی! ایسا کیسے ممکن ہے؟'' میں نے انتہائی سنسنی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''اقبال پتر! دل تو میرا بھی نہیں مان رہا۔ بھوت پریت، جنات اور پریوں کے حوالے سے اس حویلی سے جو کہانیاں وابستہ ہیں۔ ان پر پہلے بھی میرا کبھی یقین نہیں رہا اور اب بھی میرا ذہن اسے تسلیم نہیں کر رہا مگر ظاہری شواہد ایک بند گلی میں آ کر رک گئے ہیں۔ ایسے میں ذہن ایک ہی نقطے پر آ کے رک جاتا ہے اور وہ نقطہ سوائے مافوق الفطرت اور ہوائی مخلوق کے سوا کچھ نہیں سمجھاتا۔''

میں نے چاچا اللہ دتہ کھوجی کی بات سننے کے بعد خود جا کر وہ جگہ دیکھی جہاں سے گھوڑی کا کھرا غائب ہو رہا تھا۔ مزید دو گھنٹے کی مغز ماری کے بعد مجھے بھی اللہ دتہ کی باتوں میں سچائی نظر آنے لگی۔ واقعی کھرا یہاں غائب ہو رہا تھا اور ارد گرد دور دور تک کہیں بھی گھوڑی کے سموں کے نشانات نظر نہیں آ رہے تھے۔ واقعی یہ سوچنے کی بات تھی کہ یہاں آ کر گھوڑی کہاں غائب ہو گئی تھی اور اوپر سے یہ خون کے نشانات؟ عجب معمہ

تھا۔ آجا کے ذہن ایک ہی طرف جاتا تھا مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر یہ مافوق الفطرت مخلوق کی کارروائی تھی تو اس سے پہلے کبھی ایسا کیوں نہیں ہوا تھا۔ لوگ تو اس حوالے سے کئی مثالیں دیتے تھے مگر میرا زندگی میں ایسے معاملے سے پہلی دفعہ واسطہ پڑا تھا۔

میرے نوکروں اور یہاں کے رہنے والے باشندوں کو یقین کامل تھا کہ یہاں ماورائی مخلوق رہائش پذیر ہے۔ میرے آباؤ اجداد بھی مجھے اس حوالے سے بتاتے رہتے تھے مگر میں نے کبھی ان کی باتوں پر یقین نہیں کیا تھا۔ کئی لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ اس کھنڈر میں ہر جمعرات کو جنات اور ہوائی مخلوقات کا میلہ لگتا ہے اور ان کی حاضری ہوتی ہے۔ اس بارے میں کئی لوگ مختلف قسم کی کہانیاں بھی سناتے تھے مثلاً ایک بندے نے اسی دوران قسم اٹھا کر یہ بھی کہا کہ اس نے خود وہاں اس مخلوق کو زرق برق لباس پہنے ڈھول کی تھاپ پر رقص کرتے دیکھا ہے۔ جب ایک بندے سے ایسی باتوں کا آغاز ہوا تو پھر تو جیسے پٹارہ ہی کھل گیا اور سبھی اپنی اپنی بولی بولنے لگے اور وہاں ایک ایسی بحث چھڑ گئی جس کا کوئی انت نہیں تھا۔ اتنے میں ہی ڈیرے سے میرے نوکر ناشتا لے کر آگئے اور سبھی لوگ ناشتے میں مشغول ہوگئے۔

دوپہر کے وقت مقامی تھانے کی پولیس بھی آگئی۔ انہوں نے جائے وقوعہ کا معائنہ کیا۔ کھوجی اور دوسرے لوگوں کے بیانات لیے۔ مجھے تسلی دی اور کہا پی کر چلتے بنے۔ شام سے ذرا پہلے مقامی تھانے کا انچارج ایس ایچ او بھی آیا۔ وہ معقول بندہ تھا۔ اس نے مجھ سے مکمل تفصیلات سنیں اور مکمل تعاون کی یقین دہانی کروائی اور شام سے ذرا پہلے تا تھانے پر تھانے سدھار گیا۔ الغرض دو ہفتے تک پولیس، کھوجی اور میرے ہمدرد لوگ اور میں خود گھوڑی کی تلاش میں سر کھپاتے رہے مگر اسے نہ ملنا تھا اور نہ ہی ملی۔

اس حوالے سے میری پریشانی عروج پر تھی اور مجھے اپنی پیاری اور ہر دلعزیز گھوڑی کے بغیر کھانا بھی زہر لگنے لگا تھا۔ میں نے ان لوگوں کی لسٹ تیار کی جنہوں نے مجھ سے گھوڑی خریدنا چاہی تھی۔ کچھ لوگ تو میرے علم میں تھے مگر ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو کہ مجھے کسی میلے میں ہی ملے تھے اور ظاہر ہے میں نے ان کا ایڈریس معلوم نہیں کیا تھا۔ اب میں اس وقت کو کوس رہا تھا کہ میں نے آخر ان کا ایڈریس معلوم کیوں نہیں کیا تھا۔ حالانکہ یہ ایک فضول سا خیال تھا۔ جاننے والوں کو میرے علاوہ پولیس بھی کھنگال چکی تھی مگر کچھ بھی معلوم نہ ہوسکا۔

لاڈو کی تلاش میں میں نے دن رات ایک کر دیا اور اپنے تمام وسائل استعمال کیے۔ اس بات کو ایک سال بیت گیا مگر میری تمام تر کوششیں بے کار گئیں۔ اب تو مجھے بھی یقین ہونے لگا تھا کہ واقعی یہ کسی مافوق الفطرت مخلوق کی ہی کارروائی تھی مگر یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی اور میں اب بھی اس کی تلاش سے مایوس نہیں ہوا تھا۔

دوسرے سال دسمبر کے اوائل ہی میں جب کماد کی فصل کی کٹائی جاری تھی۔ گندم کی بوائی سے ہم فارغ ہوچکے تھے۔ گندم کا پودا زمین سے نکل آیا تھا اور ہم اسے پہلا پانی لگانا شروع کرچکے تھے کہ ایک رات اچانک ہی میرے وفادار نوکر نے ایک عجیب سی اطلاع دی۔ یہ اطلاع کھنڈر نما حویلی کے بارے میں تھی جس کے بارے میں میں نے سبھی نوکروں کو الرٹ کر رکھا تھا کہ اگر کوئی بھی حویلی کے کھنڈر میں عجیب و غریب حرکت دیکھے تو مجھے لازمی اطلاع کرے۔ رات کے تقریباً دو بجے کا عمل تھا کہ شمسو بھاگتا ہوا آیا اور اس نے مجھے ایک عجیب، حیران کن اور ناقابل یقین سی اطلاع دی۔ جسے سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس نے بتایا کہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے ایک لڑکی کو

کھنڈر حویلی کے اسی کمرے میں داخل ہو کر غائب ہوتے دیکھا ہے۔ میری پوچھ گچھ کے دوران اس نے مزید انکشاف کیا کہ چودھویں رات کی چاندنی میں اس نے بالکل سفید رنگ کا شلوار قمیص پہن رکھا تھا اور اس کے سر پر سنہری رنگ کا تاج نمایاں طور پر نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ کسی علاقے کی مہارانی ہو۔ جس وقت اس نے اسے دیکھا اس وقت وہ قبرستان کے راستے سے ہوتی ہوئی کھنڈر نما حویلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس وقت شمسو قریبی گندم کے کھیت میں پانی لگا رہا تھا۔ جونہی اس کی نظر اس خوبصورت حسن کے مجسمے پر پڑی تو ایک دفعہ تو وہ گھبرا گیا اور اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی مفقود ہو گئی مگر جلد ہی اسے اس حوالے سے میرا حکم یاد آیا مگر اس وقت تک وہ خوبصورت حسن کی دیوی کھنڈر نما حویلی میں کہیں غائب ہو چکی تھی۔ اس نے آیۃ الکرسی کا ورد کرتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی مگر وہ جونہی حویلی کے ٹوٹے پھوٹے مین دروازے تک پہنچا وہ حویلی میں اگے جھاڑ جھنکار کے پیچھے غائب ہو چکی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”شمسو کیا تم نے زمین پر اس کے قدموں کے نشانات دیکھے؟“

”او ہو چوہدری صاحب! ادھر تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ مگر یہ تو اب بھی چیک کیا جا سکتا ہے۔“ شمسو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”چلو کوئی بات نہیں۔ ابھی جا کے چیک کر لیتے ہیں۔ تم ایسا کرو کہ مویشیوں کے باڑے سے مشکی گھوڑا نکال لاؤ اور اس پر زین کس دو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ میں نے شمسو سے کہا۔

شمسو یہ سنتے ہی جی اچھا کہتے ہوئے مویشیوں کے باڑے کی طرف بڑھ گیا۔ آپ کو بتاتا چلوں کہ لاڈو کے چوری ہونے کے بعد میں نے ایک مشکی گھوڑا خرید لیا تھا۔ اس گھوڑے میں بھی کافی خصوصیات تھیں مگر یہ لاڈو کا نعم البدل ہرگز نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں جب میں تیار ہو کر ڈیرے سے باہر نکلا تو شمسو گھوڑے کی لگام تھامے میرا منتظر تھا۔ ڈیرے کے نگران کتے رات کے اس پہر جاگ رہے تھے۔ وہ بھی گھوڑے اور شمسو کے قریب اکڑے کھڑے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ڈیرے سے مجھے نکلتا دیکھ کر وہ میری طرف بڑھے۔ یہ بھیاڑی نسل کے وفادار کتوں کی جوڑی تھی جو کہ نگرانی کے ساتھ ساتھ کافی سمجھدار بھی تھی۔ ان کتوں کی خاصیت تھی کہ یہ بلاوجہ نہیں بھونکتے تھے مگر جب یہ کسی اجنبی کو دیکھ لیتے تھے خصوصاً رات کے وقت اسے ڈیرے کے قریب نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔

مجھے ڈیرے سے نکلتا دیکھ کر وہ تیزی سے میری طرف بڑھے اور میرے پاؤں سے آ کر لپٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ان میں سے ایک کتا میرے ہمراہ ہو لیا جبکہ دوسرا ڈیرے پر ہی موجود رہا۔ گھوڑے پر سوار جونہی میں اس مقام پر پہنچا جہاں سے وہ لڑکی غائب ہوئی تھی تو وہاں چاند کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ وہاں پر پاؤں کے مدھم سے نشانات موجود تھے جو یہ ظاہر کر رہے تھے کہ واقعی وہاں سے کوئی گزرا تھا مگر یہ نشان بھی وہیں جا کر غائب ہو رہے تھے جہاں پر گھوڑی کے قدموں کے نشان غائب ہوئے تھے۔ عجب معمہ تھا۔ آخر یہاں سے چیزیں کہاں غائب ہو رہی تھیں۔ جہاں تک مافوق الفطرت مخلوق کی افواہیں تھیں تو سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس کا ابھی تک یقین نہیں ہو رہا تھا اور بالفرض یہ اس مخلوق کی کارروائی تھی بھی تو پھر زمین پر ان کے قدموں کے نشانات کیا معنی رکھتے تھے اور پھر آخر اسی جگہ پر غائب ہونا آخر چہ معنی دارد؟ میرے ذہن میں پہلے ہی کئی شکوک و شبہات جنم لے رہے تھے۔ اس صورت حال میں پہلے تو میں نے کھوجی اللہ دتہ کو بلانا چاہا مگر پھر میں نے ارادہ بدل دیا اور دل ہی دل میں اس معمے کو حل کرنے کا تہیہ کر لیا۔

یہ تمام واقعات جمعرات کو ہی وقوع پذیر ہوتے تھے لہٰذا میں نے اگلی جمعرات کو اس جگہ کی نگرانی کا فیصلہ کرلیا۔ دوسرا جمعرات کو میں نے دن میں اپنی نیند پوری کرلی اور عشاء کی نماز کے بعد ہی پرانی حویلی کے کھنڈر میں برگد کے بڑے درخت کے تنے کے درمیان چھپ کر بیٹھ گیا۔ اسلحے کے نام پر میرے پاس صرف ایک کلہاڑی موجود تھی ان دنوں آتشیں اسلحے کا حصول اتنا مشکل اور پیچیدہ تھا کہ عام بندہ تو اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا البتہ صاحب حیثیت لوگ اسے حاصل کررہے تھے مگر وہ بھی اس کا استعمال خال خال ہی کرتے تھے۔ بہرحال میں پوری ہوشیاری اور چوکسی سے برگد کے تنے کے درمیان بیٹھا رہا مگر میری ساری رات کی محنت بیکار گئی اور مجھے کوئی بھی چیز نظر نہیں آئی۔ صبح کی اذان ہوتے ہی میں مایوس و نامراد واپس لوٹ آیا۔ اس کے بعد بھی میں دو تین جمعراتیں اس جگہ کی نگرانی کرتا رہا مگر ناکامی کے سوا مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔

ان سب باتوں کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں مایوس ہوکر یہ سب چھوڑ دیتا مگر جانے کیوں میں نے اسے ضد اور انا کا مسئلہ بنالیا۔ سردیاں ابھی تھوڑی باقی تھیں۔ میرا نوکر شمسو پچھلے کچھ دنوں سے رشتہ داروں سے ملنے کے لیے لاہور گیا ہوا تھا۔ ڈیرے پر اور نوکر چاکر بھی موجود تھے مگر ان پر مجھے وہ اعتبار نہیں تھا جو کہ شمسو پر تھا۔ ایک رات میں سویا ہوا تھا کہ اچانک جانے کیوں میرا دل گھبرانے سا لگا۔ میں نے چادر کی بکل ماری اور کمرے سے باہر نکلا۔ مجھے تھوڑا سا سکون ہوا تو میں ڈیرے سے باہر نکلا اور یونہی بے خیالی میں کھنڈر حویلی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ابھی تھوڑا دور ہی تھا کہ مجھے حویلی سے کوئی سایہ سا نکلتا ہوا نظر آیا۔ اندھیری رات تھی میں صحیح طرح سے دیکھ نہیں پایا مگر جونہی مجھے شک ہوا میں دبے پاؤں تیزی سے بھاگتا ہوا اس سایے کی طرف بھاگا۔ جلد ہی میں اس سائے سے مناسب فاصلے تک پہنچ گیا۔ رات کے اندھیرے میں میں نے اس سائے کو پوری توجہ مرکوز کرکے دیکھا۔ چال ڈھال سے وہ کوئی لڑکی ہی لگ رہی تھی۔ مگر رات کے اس وقت یہ یہاں کیا کررہی تھی اور انتہائی تیزی سے کہاں جارہی تھی۔ جلد ہی وہ قبرستان جانے والے کچے راستے کی طرف بڑھی۔

یہ راستہ ایسا تھا کہ اس پر ایک طرف کھال تھا جس کے ایک طرف دیسی کیکر اور ٹاہلی کے اندر سارے کھال پر لگے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی میری زمین تھی جس میں گندم کی فصل چھوٹے چھوٹے پودوں کی صورت میں موجود تھی۔ یہ راستہ قبرستان سے ہوتا ہوا قریبی گاؤں تک جارہا تھا۔ اب خدا جانے اس لڑکی کی منزل کیا تھی۔ قریبی گاؤں یا قبرستان۔ بہرحال اس راستے پر اس کا تعاقب جاری رکھا جاسکتا تھا۔ دیسی کیکر کے درختوں کی آڑ میں میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ کبھی کبھی وہ لڑکی تیزی سے چلتے ہوئے پیچھے مڑ کر بھی دیکھتی جارہی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ میں نے اس کا تعاقب کرتے وقت مناسب فاصلہ رکھا جس کی وجہ سے وہ اپنے تعاقب سے آگاہ نہیں ہوسکی۔ میں چاہتا تو اسے وہیں پکڑ سکتا تھا مگر میں رات کے اس وقت اس کی یہاں موجودگی کے مقصد سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ دوسرے میں اسے رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا۔ ابھی تو میں اس کی چال ڈھال سے اسے لڑکی ہی سمجھ رہا تھا مگر میں نے اسے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ قریب سے دیکھنے پر ہی یہ معلوم ہوسکتا تھا کہ وہ کوئی لڑکی تھی یا پھر واقعی کوئی مافوق الفطرت اور ماورائی مخلوق تھی۔ اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرنے والا تھا۔ جونہی وہ قبرستان سے قریب ہوتی جارہی تھی میں اس کے اور اپنے درمیان فاصلے کو کم کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ کیونکہ ایک تو یہ قبرستان بہت پرانا اور وسیع رقبے پر

پھیلا ہوا تھا دوسرے اس میں درختوں اور جھاڑ جھنکار کی بہتات تھی۔ اگر ایک دفعہ وہ قبرستان میں داخل ہو کر میری نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو پھر اس کا ڈھونڈھنا بہت مشکل ہو جاتا۔ اسی لیے میں دبے پاؤں بھاگتا ہوا اس کے اتنا قریب پہنچ جانا چاہتا تھا کہ نہ تو اسے میرے قرب کا اندازہ ہو سکے اور نہ ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہو سکے۔

جونہی وہ قبرستان کے قریب پہنچی تو اچانک قبرستان کے کنارے ایک بڑے سے پیپل کے درخت کے تنے سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور غور سے پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ ایک بار تو مجھے شک ہوا کہ جیسے اس نے مجھے دیکھ لیا ہو۔ میں سراسیمگی کے عالم میں قریبی کیکر کے درخت کے تنے کی اوٹ میں ہو کر آہستگی سے یوں نیچے بیٹھ گیا کہ اسے دیکھ بھی سکوں تاکہ اسی دوران وہ کہیں میری نظروں سے غائب ہی نہ ہو جائے مگر خیریت گزری۔ اس نے تھوڑی دیر ادھر ادھر غور سے دیکھنے کے بعد دوبارہ سے اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ یہاں سے اس نے قبرستان میں داخل ہونے کی بجائے قبرستان کے ساتھ ساتھ گاؤں کی طرف جانے والے راستے پر اپنا سفر جاری رکھا۔ دیسی کیکروں کی اوٹ لیتا ہوا میں ابھی اس کے تعاقب میں ہی تھا کہ زان سے وہ قبرستان میں داخل ہو کر غائب ہو گئی۔ میں نے تیزی سے کھالا پار کیا اور قبرستان میں داخل ہو کر اسے ڈھونڈھنا چاہا مگر وہ تو ایسے غائب ہو گئی جیسے سرے سے اس کا وجود تھا ہی نہیں۔ رات کے اندھیرے میں اس وقت قبرستان کا پرخطر اور خوفناک ماحول اندر سے مجھے ہلائے دے رہا تھا۔

اس وقت میرے پاس ہتھیار نام کی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ ایک بے نام سا خوف میرے اندر سرایت کرتا جا رہا تھا۔ قبرستان کے خاموش اور سنسان ماحول نے مجھ پر عجب سا سحر طاری کر دیا۔ میں ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور انتہائی خوف زدگی اور سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر اس لڑکی کی تلاش میں نظریں گھمانے لگا مگر وہ آفت کی پرکالہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ ایک تو رات کا اندھیرا دوسرے قبرستان کا سناٹا زدہ پرخطر ماحول، اوپر سے اس لڑکی کا میری نظروں سے یکبارگی اوجھل ہو جانا، مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا مگر میں بھی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس آفت نے مجھے بہت نقصان پہنچایا تھا۔ اس نے میری راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر دیا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہی وہ لڑکی تھی جس نے مجھ سے میری پیاری لاڈو کو چھینا تھا۔

میں نے دل کڑا کرتے ہوئے ایک بار پھر سے نئے جوش اور ولولے سے خاموشی اور آہستگی سے اس کی تلاش شروع کی مگر میری کافی دیر کی تلاش کے بعد بھی وہ مجھے نہ ملی۔ آخر کار تھک ہار کے میں نے واپس کی راہ لی مگر یہ دیکھ کر میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا کہ واپسی کے راستے پر مجھ سے کچھ ہی دور وہ آفت کی پرکالہ چلی جا رہی تھی اور اب میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ایک دفعہ پھر سے میں دیسی کیکروں کے عقب سے بھاگتا ہوا اس کی طرف بڑھا مگر اس سے پہلے کہ میں بھاگتے ہوئے اس کے برابر جا کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا اسے شک ہو گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور تیزی سے بھاگنے لگی۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ میرے تعاقب سے واقف ہو چکی تھی۔ اب احتیاط فضول تھی۔ چھلانگ لگا کر میں نے کھالا پار کیا اور رات کے سناٹے میں اسے للکارا۔

”خبردار! تم جو کوئی بھی ہو رک جاؤ ورنہ گولی چلا دوں گا۔“ میں نے جھوٹی دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی اس نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا مگر اس نے بھاگنا موقوف نہیں کیا بلکہ پہلے سے بھی تیزی سے

بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ اتنی تیزی اور مہارت سے بھاگ رہی تھی کہ ایک بار تو مجھے یوں لگا جیسے وہ بھاگ نہ رہی ہو بلکہ ہوا میں کہیں تیر رہی ہو۔ میں اسے پکڑنے کے لیے اپنی پوری قوت، جوش اور جذبے کے ساتھ بھاگ رہا تھا مگر اس کی رفتار اور میری رفتار میں کوئی فرق تھا اور اسی فرق کی وجہ سے میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ وہ ایک لڑکی ہو کر اتنا تیز بھاگ رہی تھی اور میں ایک بھرپور اور توانا مرد ہوتے ہوئے بھی اس کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ میری سانسیں تیز بھاگنے کی وجہ سے پھولی جا رہی تھیں مگر میں اتنا تیز بھاگنے کے باوجود بھی اس لڑکی تک پہنچنے میں نہ صرف ناکام ہو رہا تھا بلکہ یہ فاصلہ بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر کار بھاگتے بھاگتے وہ کھنڈر حویلی کے شکستہ گیٹ تک پہنچ گئی۔ میں اس وقت تک کافی پیچھے تھا۔ جب میں حویلی کے گیٹ تک پہنچا وہ حویلی کے اندر کہیں غائب ہو گئی تھی۔

اف خدا کی پناہ لڑکی تھی یا چھلاوہ۔ اس کا اتنا تیز بھاگنا اور حویلی میں داخل ہوتے ہی غائب ہو جانا۔ یہ سب کچھ اتنا حیرت انگیز اور ناقابل یقین تھا کہ چند لمحوں کے لیے تو میں مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ تیز تیز سانسیں لینے کے دوران میں نے ساری حویلی کا جائزہ لیا اور رات کے اندھیرے میں بغور برگد کا جائزہ بھی لیا مگر وہ کہیں نہیں تھی۔ آج میں کسی پلاننگ کے بغیر ادھر چلا آیا تھا۔ نہ تو میرے پاس ٹارچ تھی اور نہ ہی کلہاڑی۔ ٹارچ میرے ہاتھ میں ہوتی تو میں جھاڑ جھنکار میں بھی اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔

میں نے بھی خیالات کو جھٹکا اور اندازے کے مطابق حویلی میں قدرتی طور پر اگی ہوئی جھاڑ جھنکار کی طرف بڑھا مگر اس سے پہلے کہ میں کسی طرف بڑھتا رات کے سناٹے میں پسٹل کے فائر کی آواز گونجی۔ میں نے یکلخت اپنے آپ کو زمین پر گرا لیا مگر لمحے کے بھی ہزارویں حصے میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ فائر میری طرف تو نہیں ہوا تھا اور اگر یہ فائر مجھ پر نہیں ہوا تو پھر کس پر ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے درد میں ڈوبی ہوئی کسی کی تیزی سے نسوانی چیخ سنائی دی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ میں تیز نسوانی چیخ کے محور کی سمت بڑھا۔ ہو نہ ہو یہ وہی لڑکی تھی۔ جھاڑ جھنکار سے بچتا بچاتا ہوا میں اس تک جا پہنچا۔ میں نے دیکھا جیسے تھا ہے وہ شاید اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔

اس کے پاس پہنچتے ہی میں نے اس کا سر اپنی گود میں لیا اور اس سے پوچھنے کی کوشش کی مگر اس کی حالت شاید اس وقت اس قابل نہیں تھی کہ کچھ بول کر بتا سکتی مگر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہی مجھے یوں لگا کہ جیسے آسمان اپنے پورے بوجھ کے ساتھ میرے سر پر آن گرا ہو۔ یہ ایسی حیرت انگیز بات تھی کہ جس نے مجھے سر سے لے کر پاؤں تک ہلا کر رکھ دیا۔

یہ تو نوری تھی میرے وفادار نوکر فضلو کی بیٹی۔ مگر رات کے اس سمے وہ یہاں کیا کر رہی تھی اور پھر وہ اتنی بہادر کب سے ہو گئی کہ اندھیری رات میں قبرستان اور اس خوفناک کھنڈر حویلی کے درمیان پھر رہی تھی۔ وہ تو دھان پان سی گھریلو لڑکی تھی۔ ایسے کام کب سے کرنے لگی؟ اور وہ کس مقصد کے تحت یہ سب کر رہی تھی؟ اور اس پر فائر کس نے کیا تھا؟ یہ اور اس جیسے کئی سوالوں نے میرا دماغ گھما کر رکھ دیا۔ یہ سب میرے دماغ کے پردے پر ایک سیکنڈ کے بھی ہزارویں حصے میں گزرتا چلا گیا مگر اس وقت سب سے اہم تو نوری کی زندگی تھی۔ میں نے سر جھٹکا اور نوری کے گالوں کو تھپتھپایا اور گمبھیر لہجے میں کہا۔

"نوری! ہوش میں آؤ نوری۔ یہ سب کیا کر دیا تم نے؟"

یہ سنتے ہی نوری نے بے جان ہوتی بند آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کپکپاتے لبوں سے کچھ کہنے کی کو

شش کی مگر وہ اپنی سرتوڑ کوشش کے باوجود اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ یکلخت اس کا بے جان ہوتا کپکپاتا ہاتھ اٹھا۔ شاید وہ کسی قسم کا اشارہ کرنا چاہ رہی تھی۔ میں کچھ بھی سمجھ نہ پایا۔ یکلخت اس کا کپکپاتا ہاتھ نیچے گرا اور ایک آخری ہچکی لیتے ہوئے اس نے جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ اس ساری کارروائی میں فقط دو یا تین منٹ لگے ہوں گے۔ میرے اندر دھواں سا بھرنے لگا۔ میں نے آہستگی سے نوری کا سر اپنی گود سے نیچے زمین پر رکھا اور پاگلوں کی طرح گولی چلانے والے کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگا مگر کہیں بھی مجھے گولی چلانے والے کے آثار نظر نہیں آئے۔ عجب معاملہ تھا۔

تھک ہار کر میں واپس اس جگہ پہنچا جہاں میں نوری کو لاش کی صورت چھوڑ کر گیا تھا۔ مگر جونہی میں وہاں پہنچا میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

نوری کی لاش وہاں موجود نہیں تھی۔ اف خدا کی پناہ؟ کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا؟ میں نے اپنے جسم پر ایک زبردست چٹکی کاٹی مگر سوائے چٹکی کی تکلیف ہونے کے اور کچھ بھی نہ ہوا۔ وہی رات کا اندھیرا، سنسان اور سائیں سائیں کرتی کھنڈر نما حویلی میرے سامنے تھی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ اس کا مطلب ہے یہ سب میرا واہمہ نہیں انمٹ حقیقت تھی اور اگر یہ سب حقیقی تھا تو پھر نوری کی لاش کہاں گئی؟ جسے میں ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں چھوڑ کر گیا تھا؟ اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا؟ یہ سب کیا کھٹ راگ تھا۔ اس سب نے تو جیسے میرے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔

کھنڈر سے دور ڈیرے سے کوئی ٹارچ جلائے شاید اسی طرف آرہا تھا۔ وہ میرا کوئی ملازم ہی تھا جو کہ شاید کھیتوں میں پانی لگا رہا تھا اور کسی ضرورت کے تحت ڈیرے پر گیا ہوگا اور اب پھر سے کھیتوں کی طرف واپس آرہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ کھنڈر حویلی کے قریب سے گزرا تو میں نے اسے اپنی طرف بلا لیا۔ وہ فضلو تھا۔ ایک دفعہ تو وہ مجھے اس ویران کھنڈر حویلی میں دیکھ کر حیران ہوا مگر میری ایک جھوٹی سچی کہانی سننے کے بعد خاموش ہو گیا۔ اس نے ٹارچ مجھے دی اور چلا گیا۔ میں چاہتا تو اسے سچ بھی بتا سکتا تھا مگر میرے ساتھ جو حالات پیش آئے تھے اسے بھی یہ لوگ مافوق الفطرت مخلوق کی کارروائی کا رنگ دیتے اور بعد میں جانے میرے بارے میں کیا کیا مشہور کرتے۔ لہٰذا میں نے خاموشی اختیار کی اور ایک دفعہ اپنی تسلی کر لینا چاہی۔

فضلو کے جانے کے بعد میں نے ٹارچ کی تیز روشنی میں کھنڈر حویلی کا چپہ چپہ چھان مارا مگر نہ تو مجھے نوری کی لاش ملی اور نہ ہی فائر کرنے والے کا کھرا کہیں نظر آیا۔ آخر کار تھک ہار کر میں نے ایک بار پھر اس جگہ کا بغور جائزہ لیا جہاں پر نوری کی لاش پڑی تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ وہاں نوری کا خون تک موجود نہیں تھا اور نہ ہی کسی قسم کی نقل و حرکت کے کوئی آثار تھے البتہ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس جگہ سے نقل و حرکت کے نشانات کو مٹانے کی زبردست فنکارانہ کوشش کی گئی تھی مگر سوال پھر وہی تھا کہ یہ سب کرنے والا کون تھا اور کہاں سے آیا تھا؟ اگر وہ زمین پر چل کر آیا تھا تو اس کے قدموں کے نشانات کہاں غائب ہو گئے۔ گو کہ یہاں زمین کافی پکی تھی اور اس پر کسی قسم کے کھرے کا نشان تادیر قائم رہنا مشکل تھا مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ آثار تو ہونے چاہیے تھے جو کہ نہیں مل رہے تھے اور پھر اتنی جلدی کوئی یہ سب کر کے آخر کہاں غائب ہو گیا؟ کیا وہ آسمان پر اڑ گیا یا زمین کی تہوں میں کہیں غائب ہو گیا؟ آخر وہ کہاں جا سکتا تھا؟

جہاں تک مافوق الفطرت مخلوق کا تعلق تھا تو میرا وجدان اسے ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہو رہا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ جسے میں نے جاگتی آنکھوں سے

اس کی صورت میں دیکھا مجھوں حالت میں محسوس کیا۔ اسے گلنے والے فائر کی آواز سنی اور اور... نہیں... نہیں یہ نہیں ہوسکتا کسی بھی صورت یہ ممکن نہیں۔ نہ تو میں مخبوط الحواس ہوں اور نہ ہی یہ سب میرے دماغ کا خلل ہے۔ یہ کوئی اور ہی چکر معلوم ہوتا ہے مگر ابھی میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ قریبی پاکستانی فوجی چوکی کے جوان چلے آئے جو کہ یہاں پر ہونے والے فائر کی آواز سن کر آئے تھے۔ چوکی یہاں سے کوئی تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی مگر رات کے پرسکون ماحول میں فائر کی آواز کافی دور تک جاتی ہے۔ وہ ڈیرے سے ہوتے ہوئے اندازے پر ہی ادھر آ گئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی مجھ سے فائر کے بارے میں پوچھا کہ کیا فائر اسی جگہ پر ہوا تھا۔ میں نے پہلے تو ٹالنا چاہا مگر اپنے ملک کے رکھوالوں کے ساتھ جھوٹ بولنا میری غیرت نے گوارہ نہ کیا۔ میں نے سب کچھ انہیں سچ سچ بتا دیا۔ میری کتھا سنتے ہی انہوں نے مجھے کہا کہ میں ان کے ساتھ چوکی تک چلوں۔ رات کے وقت ان کے سینئرز سے میری بات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ صبح مجھے کرنل توفیق سے اس سلسلے میں ملنا ہے۔ میں نے ان سے مکمل تعاون کا وعدہ کیا۔

☆☆☆.....

دوسرے دن میں کرنل توفیق سے ملا۔ وہ ملنسار اور شفیق انسان تھے۔ انہوں نے شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی سنی اور سوچ میں ڈوب گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک بندے کو مجھ سے ملوایا اور کہا کہ آئندہ کچھ دنوں تک یہ بندہ آپ کے ساتھ رہے گا اور اس معاملے کے حل ہونے تک مجھے اس سے مکمل تعاون کرنا ہوگا۔

مکمل رازداری کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دوسرے دن ہی ارسلان ایک مفلوک الحال بندے کے روپ میں میرے پاس حاضر ہوا اور میں نے اس پر ترس کھاتے ہوئے اسے اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ رہائش کے لیے میں نے اسے ڈیرے پر ہی ایک کمرا دے دیا۔ ارسلان نامی یہ بندہ بھی عجیب و غریب فطرت کا مالک تھا۔ ہنسنے ہنسانے اور دوسروں سے گھل مل جانے والا انسان۔ پہلے ہی دن اس نے میرے کافی ملازموں سے دوستی گانٹھ لی۔ رات ہوئی تو وہ میرے پاس چلا آیا۔ دس بجے کے قریب ہم ڈیرے سے نکلے اور کھنڈر حویلی جا پہنچے۔ ارسلان نامی شخص نے پیشہ وروں کی طرح سارے کھنڈر کا جائزہ لیا۔ اس کی تحقیق کے انداز سے مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ واقعی وہ شخص انتہائی قابل اور زیرک انسان تھا۔ جلد ہی اس نے حویلی کے ایک حصے کو غور سے دیکھا اور کئی بار مجھ سے اس کھنڈر کی تاریخ کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے اسے بتایا۔

"میری عمر اس وقت سات سال تھی کہ جب میں اپنے ابو کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آیا۔ اس ہجرت نے مجھ سے میرے سبھی پیارے چھین لیے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری ماں، دو بہنوں اور میرے دادا دادی کو سکھوں نے بیدردی سے قتل کر دیا تھا۔ میں اور ابو اس لیے بچ گئے کہ جب بلوائیوں نے حملہ کیا تو میں ابو کے ساتھ شہر میں پھوپو کے پاس گیا ہوا تھا۔ وہ لوگ بھی پاکستان جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ابو مجھے پھوپو کے ہاں چھوڑ کر بقیہ خاندان کو لینے واپس گاؤں گئے تو وہاں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ خون کے آنسو روتے، تار تار دل کے ساتھ ابو جانے کیسے واپس دلی پہنچے اور وہاں سے کئی صعوبتیں جھیلتے ایک دن آخرکار پاکستان پہنچ گئے۔ بہرحال یہاں آ کر انہیں اپنی ہندوستانی زمینوں کے بدلے یہاں پچیس مربع اراضی مل گئی۔ ابو نے یہاں کاشت کاری شروع کی مگر اپنوں کے غم نے انہیں جیسے اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔

میں اس وقت آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا جب وہ بھی مجھے داغ مفارقت دے کر چلے گئے۔ ان کے بعد مجھے ہی ساری زمینوں کا کاروبار سنبھالنا پڑا۔ میں نے تعلیم کو خیرباد کہا اور اپنے گاؤں سے یہاں آ کر ڈیرے لگا لیے اپنے خاندان کے پیاروں کی موت کا دکھ ہی کم نہیں تھا کہ ابو بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ ایسے میں گاؤں میں میرا دل ہی نہیں لگا اور میں نے یہاں زمینوں پر ہی سکونت اختیار کر لی۔"

"یہاں کے لوگ بتاتے ہیں کہ ہم سے پہلے یہ زمینیں ایک ہندو کی تھیں جو کہ اب بھی سرحد پار قریبی ہندوستانی گاؤں رام پور میں رہتا ہے اس نے یہاں حویلی ہوا رکھی تھی جو کہ اس کے دور میں صحیح سلامت تھی مگر جب اسے پتہ چلا کہ اس کی یہ زمینیں پاکستان کے حصے میں آ رہی ہیں تو اس نے اچھی بھلی حویلی کا کباڑہ کر کے رکھ دیا۔ چونکہ ہندوستانی سرحد بھی قریب ہی تھی اور وہاں بھی اس کے حصے میں کافی زمین آ رہی تھی۔ اس نے اپنے نوکروں چاکروں سے کہہ کے اس حویلی کو مسمار کروا دیا اور قابل استعمال تمام چیزیں سرحد پار لے گیا مگر جب میرے والد صاحب کو یہ زمینیں الاٹ ہوئیں تو یہ حویلی ایک کھنڈر کا منظر پیش کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ جانے کیسے لوگوں میں مشہور ہونے لگا کہ اس کھنڈر حویلی میں مافوق الفطرت عناصر نے ڈیرہ جما لیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس نے یہاں پریوں کو دیکھا ہے تو کوئی کہتا ہے کہ یہاں چڑیلوں کا بسیرا ہے۔ جنات اور بھوت پریت کے یہاں پر رہنے اور دیکھے جانے کے بھی کئی قصے مشہور ہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ مجھے لوگوں کی ان باتوں پر قطعاً یقین نہیں۔ یہ نہیں کہ میرا مافوق الفطرت اور ماورائی مخلوق پر یقین نہیں۔ میرا یقین ہے کیونکہ اس بارے میں قرآن پاک میں ذکر ہے مگر اس کھنڈر میں ان کا وجود ہے مجھے اس بات پر یقین نہیں۔"

میری تفصیل سننے کے بعد ارسلان چند لمحوں کے لیے جیسے کھو سا گیا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ ہر جگہ سے ارسلان اور میں تلاش لے چکے تھے مگر ابھی تک کوئی سراہاتھ آتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آج سردی بھی زوروں پر تھی۔ اس کے ساتھ ہی مغرب سے ٹھنڈی ہوائیں بھی چلنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد آسمان بادلوں سے گھر گیا۔ موسم کے تیور دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ بارش ہونے والی ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے میں نے ارسلان سے کہا۔

"ڈیرے پر چلتے ہیں۔" مگر اس نے منع کر دیا۔ ہم نے حویلی میں ہی ایک کمرے میں پناہ لی جو کہ قابل استعمال تو نہیں تھا مگر اس بڑھتی ہوئی سردی میں کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ سردی کی شدت سے بچنے کے لیے میں نے کھنڈر میں ایک جگہ سے کچھ خشک لکڑیاں اکٹھی کیں اور ایک جگہ پر پڑی پرالی کے بہت بڑے ڈھیر سے ایک گٹھا اٹھایا تاکہ ٹوٹے پھوٹے کمرے میں جا کر سردی سے بچاؤ کے لیے آگ جلائی جا سکے۔ ابھی میں نے گٹھا اٹھایا ہی تھا کہ مجھے یوں لگا کہ جیسے پرالی کا گٹھا اٹھانے سے پرالی کے ڈھیر میں اک خلا سا پیدا ہو گیا ہے اور یہ خلا میری توقع سے کچھ بڑا ہی تھا۔ میں نے پرالی کا گٹھا وہیں پر پھینکا اور ٹارچ جلا کر اس پیدا ہونے والے خلا کی طرف غور سے دیکھا۔ مجھے اس پیدا ہونے والے خلا پر کچھ اور شک ہوا۔ اتنی دیر میں ارسلان بھی میرے پیچھے پہنچ چکا تھا اور غور سے خلا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"اقبال لگتا ہے کہ قدرت ہماری مدد کر رہی ہے۔ ٹارچ کو بند کر کے سامنے والے سبھی گٹھوں کو ہٹانا ہوگا۔"

"جی ٹھیک ہے ارسلان بھائی!" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد میں نے ارسلان کے ساتھ مل کر سامنے نظر آنے والے گٹھوں کو جو کہ ایک ترتیب میں

رکھے ہوئے تھے۔ ایک ایک کر کے ہٹا دیا۔ تقریباً دس منٹ کی تگ و دو کے بعد ایک حیرت ناک منظر ہمارے سامنے تھا۔

تیز لائٹ کی روشنی میں ہم نے دیکھا۔ پرالی کے ڈھیر کے درمیان سے گٹھے اٹھانے کے بعد ایک جگہ پر زمین میں لوہے کے موٹے سریے کی مدد سے گول شکل میں جال سا بنا ہوا تھا اور اس جال سے نیچے سیڑھیاں سی جاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کی مکمل تحقیق کر پاتے، ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ سے لوہے کا جال اوپر اٹھنے لگا اور لوہے کے اس جال کے ساتھ ہی ایک اور طرف سے بھی پرالی کا ڈھیر اوپر اٹھنا شروع ہو گیا۔ اچانک ارسلان نے مجھے سریے کے جال سے نیچے اترنے کے لیے کہا۔

''اقبال! جال سے نیچے اترو اور جہاں سے پرالی اوپر اٹھی ہوئی ہے اس کے نیچے سے ہوتے ہوئے خلا میں داخل ہونے کی کوشش کرو۔'' یہ کہتے ہی اس نے پرالی کے ڈھیر کے ایک طرف چھلانگ لگائی۔ اس کے پیچھے ہی میں نے بھی ایکشن لیا۔ جلد ہی ہم دونوں ایک طرف سے اٹھے ہوئے پرالی کے ڈھیر کے نیچے سے ہوتے ہوئے تہہ خانے کی سیڑھیوں تک جا پہنچے۔ اس وقت ارسلان نے بڑی ٹارچ بجھا کر ہلکی سی روشنی دینے والی پنسل ٹارچ روشن کر لی تھی۔ یہ سیڑھیاں تھوڑی ہی دور جا کر ایک بڑے تہہ خانے میں کھل رہی تھیں۔ تہہ خانے میں ایک عجب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر ہم دونوں خاموشی سے تہہ خانے کا جائزہ لیتے رہے۔ یہ ایک چھوٹا سا تہہ خانہ تھا مگر حیران کن بات یہ تھی کہ اس چھوٹے سے تہہ خانے سے ایک سرنگ نکل رہی تھی جو کہ انڈیا کے بارڈر کی طرف جا رہی تھی۔ ارسلان نے ٹارچ کی ہلکی روشنی میں پریشان کن نظروں سے میری طرف دیکھا اور سرنگ میں داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔

سرنگ میں ایک عجب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ شاید یہ سیلن اور مناسب آکسیجن کے نہ ہونے کی وجہ سے تھا۔ ارسلان کی معیت میں یہ سفر جاری رہا۔ تقریباً آدھ گھنٹے کی تگ و دو کے بعد آخر کار ہم سرنگ کے دوسرے کنارے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ سیڑھیاں اوپر چڑھتے ہوئے ہم سرنگ سے باہر نکلے تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ جہاں ہم پہنچے وہ ایک بہت بڑا مندر تھا اور اس میں جا بجا بھگوان کی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ تو گویا ہم واقعی ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو چکے تھے۔ عجب گھن چکر تھا۔ یہ اتنی بڑی سرنگ آخر کس نے اور کس مقصد کے لیے بنوائی تھی؟ کیا یہ انگریزوں کی کارروائی تھی یا پھر انڈین انٹیلی جنس کا شاخسانہ؟ اور پھر میری زمینوں سے یہ سرنگ پاکستان سے انڈیا کی سرحد پار کر رہی تھی اور میں اتنا بے خبر تھا کہ مجھے علم ہی نہیں تھا؟

مندر میں اس وقت ہر سو ہو کا عالم تھا کہیں بھی کوئی حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ارسلان نے مجھے ایک جگہ بٹھایا اور خود جانے کہاں نکل گیا کچھ ہی دیر بعد ارسلان آیا اور ہم دونوں واپس اسی سرنگ سے ہوتے ہوئے اس متروک حویلی تک پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی میری جان میں جان آئی۔ میں نے ارسلان سے اس سارے معاملے کے بارے میں پوچھنا چاہا تو اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اتنی ہی دیر میں جانے کہاں سے کچھ لوگ نکلے اور ہماری طرف بڑھے۔ جانے یہ مصیبت کہاں سے در آئی تھی میں نے انتہائی حیرانی و پریشانی کے عالم میں سوچا۔

رات کے ساڑھے تین بج چکے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ہم اس وقت متروک کھنڈر حویلی میں پرالی کے گٹھوں پر کھڑے تھے۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ٹھنڈی ہوائیں بدستور چل رہی تھیں۔ جس وقت ہم تہہ خانے سے نکلے تھے اسی وقت سے ہلکی بارش ہو

رہی تھی اور ہم بارش میں تقریباً بھیگ رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں ادھر ادھر سے نکلنے والے بندے ہمارے قریب پہنچے تو انہوں نے ارسلان کو سلام کیا۔ میری پریشانی کچھ کم ہوئی۔ یقیناً یہ اسی کے ساتھی اور پاک فوج کے جوان تھے۔ ارسلان نے ان سے پرالی کے ڈھیر کو برابر کرنے کے لیے کہا۔ جلد ہی پرالی کے ڈھیر کو یوں برابر کر دیا گیا جیسا کہ پہلے تھا۔ اس کے بعد ارسلان نے اپنے ساتھیوں کو چند ہدایات دیں اور میرے ساتھ ڈیرے پر چلا آیا۔

......☆☆☆......

دوسرے دن میں اٹھا تو دن کے دس بج چکے تھے۔ نہا دھو کر میں نے ناشتہ کیا اور ارسلان کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ تو صبح ہی سے کہیں کھیتوں میں کام کے لیے نکل گیا ہے البتہ شمسو اپنی بیٹی کے ساتھ لاہور سے واپس آگیا ہے۔

''کیا کہا! شمسو اپنی بیٹی کے ساتھ واپس آگیا ہے، تمہیں کس نے بتایا افضل؟'' میں نے انتہائی حیرانی سے اس سے پوچھا۔

افضل میرا باورچی تھا اور کافی عرصے سے میرے ساتھ رہ رہا تھا۔ مجھے حیرانی سے سوالیہ نشان بنا دیکھا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

''چوہدری صاحب! آپ اتنا حیران کیوں ہو رہے ہیں' کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے؟ وہ پہلے بھی کئی دفعہ لاہور جاتا رہا ہے اور کچھ دن اپنے رشتے داروں کے ہاں رہ کر واپس آجاتا ہے اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟'' اس نے پریشان ہوتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''مگر کیا تم نے اس کی بیٹی کو دیکھا تھا' کیا واقعی وہ......'' ہوسکتا تھا بے اختیاری میں میرے منہ سے کچھ غلط نکل جاتا میں نے بڑی مشکل سے اپنی حیرت پر قابو پایا۔ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ مجھے اپنے تاثرات پر قابو رکھنا چاہیے تھا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے سرسری سے لہجے میں افضل سے کہا۔

''نہیں افضل! میں تو صرف اس لیے کہہ رہا تھا کہ رات سے بارش ہو رہی ہے اور شہر سے یہاں تک کا فاصلہ جو کہ کافی زیادہ ہے اور پیدل طے کرنا پڑتا ہے۔ اگر صبح کے وقت بھی وہ شہر سے چلتا اور موسم صحیح بھی ہوتا تو وہ ظہر سے پہلے یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اتنی جلدی وہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟''

''چوہدری صاحب! وہ تو کل شام ہی اپنی بیٹی کے ساتھ یہاں آگیا تھا مگر شاید سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے آپ سے ملنے نہیں آسکا۔ اب وہ صبح سے دو بار آپ کو دیکھنے آچکا ہے مگر آپ سو رہے تھے اس لیے وہ واپس چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ کہہ گیا تھا کہ جونہی آپ جاگیں تو اسے بتا دیا جائے۔ شاید اسے آپ سے کوئی ضروری کام تھا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا تو میں نے جلدی سے کہا۔

''ہاں افضل! اسے جلدی سے میرے پاس بھیج دو۔ مجھے بھی اس سے کئی ضروری کام ہیں۔''

......☆☆☆......

مسٹر شمس دین عرف شمسو کی کہانی بھی نہایت الجھی ہوئی تھی۔ وہ میرے والد صاحب کے زمانے ہی سے یہاں پر ملازم تھا۔ کام کے حوالے سے اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا بلکہ دو قدم آگے بڑھ کر وہ اپنی ڈیوٹی پوری کیا کرتا تھا۔ جہاں تک اس کی بیٹی کا تعلق ہے تو وہ انتہائی شریف، سادہ اور گھریلو لڑکی تھی۔ ڈیرے کے ساتھ ہی وہ ایک کچے سے مکان میں اپنے والد کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ کبھی کبھار وہ مجھ سے بات چیت بھی کر لیا کرتی تھی مگر اس کی باتوں سے بھی کبھی ایسا نہیں لگا کہ وہ ایسی ویسی لڑکی تھی۔ اس رات جب میں نے اسے متروک کھنڈر حویلی میں دیکھا تھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی تھی۔ اس نے

میری گود میں دم توڑا تھا اسے پستول کی گولی لگی تھی۔ پستول کی گولی کا دھماکا میں نے اپنے کانوں سے سنا تھا۔ اس کے سینے سے ابلتا ہوا خون میں نے اپنے ہاتھوں پر محسوس کیا تھا اور اب جب میں نے یہ سنا کہ وہ اپنے والد کے ساتھ لاہور سے واپس لوٹ آئی ہے تو یج تو یہ ہے کہ ایک بار تو یہ سن کر مجھے یوں لگا کہ جیسے آسمان اپنے پورے بوجھ کے ساتھ میرے سر پر آن گرا ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک آدمی جو مر چکا ہو وہ دوبارہ زندہ ہو جائے؟ ناممکن قطعی ناممکن تو پھر یہ سب کیا تھا؟ سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگا۔

ابھی میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ شمسو چلا آیا۔ میں نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھے اور اس سے خیر خیریت دریافت کی۔ شمسو بھی کچھ کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

''چوہدری صاحب! کیا آپ نے کوئی نیا ملازم رکھا ہے؟''

''ہاں شمسو! بندہ مجھے تجربہ کار لگتا ہے اور ضرورت مند بھی اس لیے میں نے اسے اپنے ہاں رکھ لیا ہے۔ آپ اس سے ملے؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''نہیں میں تو اس سے ابھی مل نہیں پایا مگر ہمارے پاس پہلے ہی بندوں کی کمی نہیں۔ فضول میں بندہ رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اچھا چلو خیر کوئی بات نہیں آپ نے اسے رکھا ہے تو کچھ سوچ کر ہی رکھا ہوگا۔'' شمسو نے سرسری سے انداز میں کہنے کی کوشش کی۔

مجھے اس کے انداز سے محسوس ہوا کہ جیسے شمسو کو نئے بندے کی آمد ناگوار گزری ہے۔ میں نے اسے تسلی تشفی دی اور کام کے حوالے سے گفتگو کی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ چلا گیا مگر میرے ذہن میں شمسو اور اس کی بیٹی کے حوالے سے کئی سوال گونجنے لگے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد سوچ سوچ کر جب میرا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا اور میں شمسو کے گھر میں اس کی بیٹی نوری کو دیکھنے اور ملنے جانے ہی والا تھا کہ وہ خود ہی چلی آئی۔ آج اس کے انداز میں ایک نئی تازگی اور شوخی تھی۔ میں نے غور سے مگر بظاہر سرسری سے انداز سے اسے دیکھا۔ وہ تو بالکل بھلی چنگی اور تر و تازہ دکھائی دے رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بالکل بھی ایسا نہیں لگتا تھا کہ اسے گولی لگی تھی یا وہ کسی اور طرح سے زخمی وغیرہ ہوئی تھی۔ تو پھر یہ سب کیا تھا آخر؟ میرے دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں۔ جانے کیوں آج وہ میری طرف غور سے دیکھ رہی تھی؟ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے وہ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی یا پھر وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتی تھی مگر کر نہیں پا رہی تھی۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا تھا۔ میری تو بالکل ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر وہ مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلی گئی۔

☆☆☆

ارسلان صبح سے جانے کہاں چلا گیا تھا شام تک وہ واپس نہیں لوٹا۔ اس کے حوالے سے مجھے بہت پریشانی ہو رہی تھی۔ شام کے بعد رات گہری ہوتی چلی گئی مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ جانے وہ کہاں چلا گیا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی گیا تھا اب تک تو اسے لوٹ آنا چاہیے تھا۔ میں نے رات کا کھانا کھایا اور چہل قدمی کے لیے گھر سے نکل گیا۔ دن کے ساڑھے بارہ بجے تک بارش رک گئی تھی اور اس کے بعد تھوڑی ہی دیر میں مطلع کچھ صاف ہو گیا تھا اور سورج تھوڑے تھوڑے وقفے سے بادلوں کے پیچھے سے جھلک دکھانے لگا تھا۔ اسی لیے فضا میں نمی کی مقدار کچھ کم ہو گئی تھی۔ بہر حال رات ہوتے ہی سرد ہوائیں ایک بار پھر سے اپنے جوبن پر تھیں جس کی وجہ سے سردی بڑھ گئی تھی۔ میں نے گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ لا محالہ طور پہ میرا رخ کھنڈر حویلی کی جانب ہی تھا۔ چہل قدمی کرتے کرتے میں نے ادھر ادھر کے ماحول پر بھی نظر رکھی اور ارسلان کو بھی تلاش کرتا رہا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ آخر کار

تھک ہار کر میں گھر لوٹ آیا۔ پچھلی رات کی تھکن ابھی نہیں اتری تھی اسی لیے میں جلد ہی بستر پر لیٹ گیا مگر نیند کی دیوی تو گویا مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ میرا ذہن مختلف قسم کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کبھی میں کچھ سوچنے لگتا تو کبھی کچھ اور انہی خیالات سے الجھا میں نیند کی وادی میں اترنے ہی والا تھا کہ کسی نے ہلکے سے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اتنی رات گئے یہ کون ہو سکتا تھا؟ اور پھر یہ بندہ حویلی میں کیسے داخل ہو گیا؟ میرے ملازمین میں سے کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہاں ملازمین کے لیے کئی مکان بنے ہوئے تھے مگر وہ بھی حویلی سے باہر تھے اور حویلی میں میرے علاوہ کوئی بھی نہیں ہوتا تھا اور رات کے وقت پھر بھی ہو حویلی کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہونے کی کسی ملازم میں جرأت نہیں تھی۔ اگر یہ کوئی اجنبی تھا تو پھر وہ حویلی میں داخل کیسے ہو گیا؟ باہر رکھوالی کے لیے کتے موجود تھے اور وہ کسی اجنبی کو قطعاً اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ کتے بھی نہیں بھونکے اور بندہ بھی اندر داخل ہو گیا تو کیا یہ بندہ کوئی چھلاوہ تھا جو کتوں کی نظر میں آئے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ میں ابھی کشمکش میں مبتلا تھا کہ دروازہ کھولوں یا نہیں کہ اتنے میں پھر سے کمرے کا دروازہ ہلکے سے کھٹکھٹایا گیا اور کسی نے باریک سی گھبرائی ہوئی آواز میں مجھے جلدی سے دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔ اس کے بولنے سے مجھے یوں لگا کہ جیسے یہ نوری کی آواز ہو۔ پھر بھی میں نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

”کیا یہ تم ہو نوری؟“ میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”جی! میں نوری ہی ہوں۔ پلیز جلدی سے دروازہ کھولیے۔ اندر آ کر میں آپ کو بتاتی ہوں کہ میں.....“ مگر اس کے مزید بولنے سے پہلے میں نے دروازہ کھول دیا کیونکہ میں نوری کی آواز پہچان چکا تھا۔ جونہی میں نے دروازہ کھولا تو وہ مجھ سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور بڑی مشکل سے اسے اپنے آپ سے جدا کیا اور پوچھا۔

”نوری! کچھ بتاؤ تو سہی کیا آخر ہوا کیا ہے۔ تم کیوں اتنا پریشان ہو؟ اور رات کے اس وقت حویلی کی دیوار پھاند کر یوں مجھ تک پہنچی ہو اور پھر روئے جا رہی ہو؟ کچھ بتاؤ گی تو میں تمہاری کچھ مدد بھی کر سکوں گا۔“ تھوڑی دیر میں میں نے اسے تسلی تشفی دی تو وہ گویا ہوئی۔

”چوہدری صاحب! پہلے آپ وعدہ کریں کہ آپ میری مدد کریں گے؟“ نوری نے لجاجت اور عاجزی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں نوری کہ میں حتی المقدور جتنا بھی مجھ سے ہو سکا میں آپ کی مدد ضرور کروں گا اور پھر مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آج تمہیں ہو کیا گیا ہے آخر؟ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا اور شمسو چاچا کہاں ہیں۔ اگر تمہیں کوئی مسئلہ تھا بھی تو تمہیں اس سے کہنا چاہیے تھا۔ وہ مجھ سے کہتے۔ اس طرح سے رات کے وقت چوروں کی طرح مجھے تمہارا یہاں آنا قطعاً اچھا نہیں لگا۔“ میں نے نوری کو گھورتے ہوئے کہا۔

”مگر ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا میرے پاس۔ بات ہی کچھ ایسی ہے کہ یہ میں شمسو بابا سے تو قطعاً نہیں کہہ سکتی تھی۔ پلیز آپ ایک بار میری بات تو سن لیں۔“ یہ کہتے ہی اس نے ایک بار خوف زدگی سے دروازے کی طرف دیکھا اور میری طرف ایک لکھا ہوا کاغذ کا ٹکڑا تیزی سے پھینکا اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اس نے مجھے آنکھوں سے خفیف سا اشارہ کیا کہ میں اس کی تحریر پڑھ لوں۔ میں نے اس کی مختصر تحریر پڑھی تھی۔

”پلیز اب میں جو کچھ بھی کہوں۔ خدارا اسے تھوڑے سے تردد سے مان لیں مگر آپ کی اداکاری

میں حقیقت کا رنگ ہونا چاہیے۔ جاتے ہوئے میں چارپائی پر تکیے کے نیچے آپ کے لیے ایک مکمل تحریر چھوڑ کر جاؤں گی۔ یہ ایک حقیقی دکھ بھری کہانی ہے۔ خدارا مجھ سے مکمل تعاون کریں۔ آپ کے تعاون سے میری، میرے بھائی اور میری بیمار ماں کی زندگی جڑی ہوئی ہے۔"

"چوہدری صاحب! میں بہت سالوں سے آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں مگر کہہ نہیں پا رہی۔ آج شمسو بابا سو گئے ہیں تو میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر چلی آئی ہوں۔ پلیز اس بات کا برا مت مانیے اور مجھے اپنی بات کہنے کا موقع دیجیے۔ آج میں تہیہ کر کے آئی ہوں کہ کچھ بھی ہو جائے میں آپ سے اپنے من کی بات ضرور کر کے جاؤں گی.... "میری تحریر پڑھنے کے دوران ہی وہ اپنی بات شروع کیے ہوئے تھی اور اس کی تحریر پڑھتے ہی مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ نوری کبھی مجھ سے ایسی باتیں کرے گی اور اس کی نہایت ہی الجھی ہوئی تحریر پڑھ کر ایک بار تو میرا دل چاہا کہ میں اس کے منہ پر دو چانٹے لگاؤں اور اسے یہاں سے دفعان کر دوں کیونکہ مجھے رات کے وقت گھر سے نکل کر غیر مردوں سے باتیں کرنے والی عورتیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں مگر اس کی تحریر کو دیکھتے ہوئے کہ یہ تین زندگیوں کا سوال تھا اور جانے ایسی کیا بات تھی جو نوری مجھے بتانا چاہتی تھی۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور نوری سے کچھ اکھڑے سے انداز میں کہا۔

"دیکھو نوری! لمبی چوڑی تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں۔ سیدھے سیدھے بتاؤ کیا بات ہے۔"

"چوہدری صاحب! سیدھی سیدھی بات ہی تو کرنے آئی ہوں میں آپ سے؟ میرے پاس بھی اتنا وقت نہیں کہ میں ضائع کروں اور میں ضائع کرنا بھی نہیں چاہتی۔ وہ میری سچی بات یہ ہے کہ میں جانے کب سے....." یہ کہتے ہوئے اس نے شرماتے ہوئے مجھ سے منہ پھیر لیا۔

"رہنے دو نوری! میں جانتا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو مگر تمہیں علم ہے کہ میں ایسی باتوں کو اچھا نہیں سمجھتا۔ یہ سچ ہے کہ میں ابھی تک کنوارا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں مگر شادی کے لیے میری اولین ترجیح میری برادری ہے اور میں برادری کے علاوہ اور کہیں شادی تو نہیں کرنا چاہتا مگر میں کسی بھی حال میں آپ کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتا۔ تم خوبصورت ہو حسین ہو اور پچھلے کئی سالوں سے یہاں رہ رہی ہو مگر تم نے پہلے تو کبھی ایسا اشارہ بھی نہیں کیا اور آج ایسا کیا ہو گیا کہ تم رات کے اس پہر مجھ سے ملنے چلی آئی ہو اور ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ یہاں آنے سے پہلے تمہیں کچھ تو سوچنا چاہیے تھا کہ تمہارے باپ کو اگر تمہاری یہاں آمد کے بارے میں معلوم ہو گیا تو وہ کیا سوچے گا تمہارے اور میرے بارے میں۔" میں نے نوری کو سمجھانا چاہا۔

"چوہدری صاحب! مدت ہوئی کہ میں من ہی من میں آپ کو چاہے جا رہی تھی مگر اس کا اظہار اس لیے نہیں کر پائی کہ میرا اور آپ کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ کہاں آپ اور کہاں میں۔ مگر اس دفعہ جو میں لاہور گئی تو وہاں میں نے ایک فلم دیکھی جو ایک لو اسٹوری تھی۔ اس کہانی میں بھی بالکل ہمارے والی ہی چویشن تھی مگر اس میں غریب ہیرو تھا بے چارہ۔ وہ اسی سوچ میں رہا کہ اس کے اور اس کی محبوبہ کے سٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے مگر ایک دن فلم کی ہیروئن خود اس سے پیار کا اظہار کرتی ہے تو ہیرو بھی اپنے جذبات میں بہہ کر اسے بتاتا ہے کہ وہ تو خود من ہی من میں کب کا اس سے پیار کر رہا ہے مگر اپنی حیثیت کو دیکھتے ہوئے اظہار نہیں کر پایا۔ اس کی یہ بات سن کر ہیروئن....." نوری کی بات جاری تھی مگر میں نے اس کی

بات کاٹتے ہوئے نوری سے کہا۔

"نوری! میں نے مان لیا کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو اور مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو مگر اس کے لیے تم نے طریقہ غلط چنا ہے۔ بہر حال مجھے سوچنے کا کچھ وقت دو۔ میرے خیال میں اللہ پاک کوئی بہتر سبب بنا ہی دے گا۔ میری نہ تو کہیں منگنی ہوئی ہے اور نہ ہی نکاح۔ اس معاملے میں میں خود مختار ہوں اور تم امید رکھو میں انشاء اللہ تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ اب تم گھر جاؤ اور دعا کرو۔" یہ کہہ کر میں نے اسے گھر بھیج دیا۔ وہ شاید جانا تو نہیں چاہتی تھی یا پھر وہ اداکاری کر رہی تھی۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا اس کے بارے میں میں بہت الجھا ہوا تھا اور اس کے بارے میں ابھی فیصلہ ہونا باقی تھا۔ وہ گئی تو میں نے اس چارپائی کا تکیہ چیک کیا جس پر وہ بیٹھی رہی تھی۔ وہاں پر واقعی ایک طویل خط لکھا ہوا تھا۔ میں نے لالٹین کی مدھم روشنی میں اسے پڑھنا شروع کیا۔

......☆☆☆......

"میں یہ خط اس لیے لکھنے پر مجبور ہوئی ہوں کیونکہ اگر یہی باتیں میں آپ سے روبرو کہتی تو کوئی اور بھی سن لیتا۔ کیونکہ میرے قمیص کے بٹن میں سے ایک بٹن ایسا ہے کہ جو بظاہر تو انہی عام بٹنوں جیسا ہے جیسے کے دوسرے بٹن مگر یہ بٹن ایک طاقتور وائس رسیور ہے جو کہ میرے اور آپ کے درمیان ہونے والی ہر آواز کو کسی اور تک پہنچا دے گا۔ اور یہ "کسی اور" کوئی اور نہیں وہ ہے جسے آپ میرا باپ سمجھتے ہیں مگر حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔ شمسو نامی یہ شخص قطعاً میرا باپ نہیں۔ آپ بھی سوچیں گے کہ میں کیسے جانتی ہوں اور آپ یہ سب سوچنے میں حق بجانب ہیں کیونکہ یہاں آپ اور سبھی لوگ مجھے اس کی بیٹی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ مگر ٹھہریے میں آپ کو شروع سے بتاتی ہوں۔

میرا نام لاجونتی ہے اور میں سرحد پار رہتی نائی گاؤں کی رہائشی ہوں۔ میرے پتا کو سورگباش ہوئے دوسال کا عرصہ بیت گیا ہے۔ ہم دو بہن بھائی اپنی بیمار

عظیم ہستی

ایک انگریز نے علامہ اقبال سے پوچھا۔ "کہتے ہیں کہ سارے پیغمبر آپ کے براعظم ایشیا میں پیدا ہوئے ہیں کیا یہ سچ ہے؟ اقبال نے جواب دیا۔ "ہاں یہ ٹھیک بات ہے۔" انگریز نے پھر پوچھا۔ "پھر یورپ کو کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔" اقبال نے فرمایا۔ "یورپ میں بھی ایک عظیم ہستی پیدا ہوئی ہے۔" سوال کیا گیا "کون سی ہستی؟" جواب ملا۔ "حضرت ابلیس۔"

(مرسلہ: برکت اللہ احمد.....نواب شاہ)

ماں کے ساتھ انتہائی تنگدستی اور فاقہ زدہ زندگی جیسے تیسے گزار رہے تھے کہ جانے کیسے بھائی کو نشے کی لت پڑ گئی اور وہ غلط صحبت اختیار کرتا چلا گیا۔ میرے اور ماں کے سمجھانے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ دن بدن بگڑتا چلا گیا۔ ہم جو پہلے ہی غربت کی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہے تھے اور بھی بے بس و مجبور ہوتے چلے گئے۔ ماں جو دن بدن بیماری کی وجہ سے لاغر ہوتی جا رہی تھی وہ بالکل ہی بستر سے جا لگی اور گھر کے اخراجات کا سارا بوجھ میرے کندھوں پر آن پڑا مگر اس سے پہلے کہ مجبوراً مجھے گھر سے نکلنا پڑتا ایک دن بھیا نشے میں دھت اپنے ہمراہ ایک بابو نامی بندے کو لے آئے۔ وہ دونوں ماں کے ساتھ کچھ دیر گھسر پھسر کرتے رہے۔ اجنبی بابو تو تھوڑی دیر بعد چلا گیا اور میرا بھائی نشے میں ٹن وہیں کمرے میں ہی زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ شاید اس نے آج کچھ زیادہ ہی پی لی تھی۔

بابو کے جانے کے بعد ماں نے مجھے اپنے پاس بلا

یا اور مجھے بتایا کہ بابو جو کہ بھیا کے ساتھ آیا تھا وہ مجھے ملازمت دینا چاہتا ہے اور اس کے بدلے میں وہ ماں اور بھیا دونوں کا علاج بھی مفت میں کروائے گا اور مجھے تنخواہ بھی دے گا مگر اس کے لیے ہمیں یہ گاؤں چھوڑ کر شہر جانا پڑے گا۔ اس نے ایک اچھی تنخواہ کی آفر بھی کی ہے اور مجھے اپنی تو اتنی فکر نہیں مگر تیرے بھائی کا غم مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے اگر وہ اس کی نشے کی لت چھڑوا دیں تو میرے خیال میں یہ بہت بڑی بات ہوگی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ شہر میں کوئی بہت بڑا اسپتال ہے جہاں میرا اور تیرے بھائی کا علاج ممکن ہے بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ رہا تھا کہ شہر میں وہ ہمیں مکان بھی ہوا کر دے گا جہاں ہم چین سے رہ سکیں گے۔ وہ کل آنے کا کہہ کر گیا ہے۔ اس کی باتیں سن کر میں تو کہتا ہے کہ اسے ہاں کہہ دوں مگر پھر میں سوچتی ہوں کہ جانے یہ سب سچ بھی ہوگا یا نہیں کہیں ہمارے ساتھ کوئی فراڈ ہی نہ ہو جائے مگر وہ کہہ رہا تھا کہ وہ سرکاری بندہ ہے اور یہ کہا اگر ہم نے اس کی بات نہ مانی تو ہمیں پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا مزید اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کی بات نہ ماننے کی سزا میں وہ تمہارے بھیا کو بھی مار ڈالیں گے۔ بہتر یہی ہوگا کہ ہم ان کی بات مان لیں مگر مجھے ایک بات کی قطعاً سمجھ نہیں آئی کہ آخر کار وہ تم سے کون سا ایسا کام کروانا چاہتے ہیں۔ جس کے بدلے میں وہ اتنا کچھ کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے بار بار پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ کہہ رہا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔

اس بات پہ ماں اور مجھ میں بحث ہوتی رہی۔ آخر کار ہمیں مجبوراً وہی فیصلہ کرنا پڑا جو کہ ایک بے بس لاچار اور چاروں طرف سے مایوس ناامید شخص کو کرنا پڑتا ہے۔ میری ماں اور بھیا کو واقعی اسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ میں ان کے ساتھ تقریباً دو ہفتے رہی اور مجھے بھی اس بندے کی باتوں پہ کچھ کچھ یقین ہونے لگا مزید اس نے مجھے ایک مکان بھی دکھایا جہاں ہمیں رہائش پذیر ہونا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ میں راضی ہوگئی اور وہ انکل مجھے اپنے ساتھ ایک دوسرے شہر میں لے گیا۔ وہاں پر میری ٹریننگ ہوئی اور مجھے کافی کچھ سیکھنے کا موقع ملا اور وہیں پر ایک دن میری شمسو اور ایک لڑکی سے ملاقات کروائی گئی۔ اس لڑکی کو دیکھتے ہی مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے سامنے کسی نے قد آدم آئینہ لا کر رکھ دیا ہو۔ اس لڑکی یعنی نوری کی شکل ہو بہو مجھ جیسی تھی۔ نوری اور شمسو دو ہفتے تک میرے ساتھ رہے اور مجھے انہوں نے کم وقت میں کافی کچھ سکھایا۔ وہ مجھ سے نوری کی جگہ پر نوری کا رول کروانا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے نوری نے بھی مجھ پر کافی محنت کی اور آخر کار میں اس قابل ہوگئی کہ میں نوری کی جگہ لے سکوں تو ایک دن مجھے شمسو کے ساتھ یہاں بھیج دیا گیا۔

مجھے کہا گیا ہے کہ میں آپ سے پیار کی پینگیں بڑھاؤں اور آہستہ آہستہ آپ کو شادی پر راضی کراؤں اور آپ سے شادی کر کے کسی مناسب موقعے پر آپ کو میرے ساتھی قتل کر دیں گے اور میں آپ کی جائیداد کی وارث بن جاؤں گی اور یہ ساری زمینیں جو کہ انڈیا کی سرحد سے ملتی ہیں وہ میرے نام ہو جائیں گی۔ جسے وہ بعد میں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں گے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں ان باتوں کی آپ کو بھنک بھی نہ پڑنے دیتی اور وہی کرتی جس کا مجھے حکم دیا گیا تھا مگر یہاں آنے سے پہلے ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے مجھ پر ان لوگوں کی قلعی کھول دی۔ ہوا کچھ یوں کہ نوری اور مجھ میں ایک انسیت کا سا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ایک رات جب میں اور نوری ایک ہی کمرے میں سوئی ہوئی تھیں تو نوری نے جانے کیوں مجھے وہ سب کچھ بتا دیا جو کہ شاید اسے مجھے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شمسو اس کا باپ نہیں بلکہ انڈیا

کی خفیہ تنظیم را کا ایک سفاک اور بے رحم ایجنٹ ہے اور وہ اس کے ساتھ کئی سالوں سے کام کر رہی ہے۔ لوگوں کے سامنے اسے بیٹی کہنے والا رات کے اندھیرے میں اس کے ساتھ شیطانی کھیل کھیلتا ہے۔ شروع شروع میں اس نے اس سے بچنے کے لیے اپنے بڑوں سے شکایت بھی کی مگر اس کے بجائے کہ وہ شمسو نامی اس بھیڑیے کو جس کا اصل نام گنگا رام ہے اس بد سے اور گریہہ کام سے روکتے، انہوں نے خود بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیے اور وہ یہ سب کچھ خاموشی سے سہہ گئی۔ ایک تو گنگا رام اس کا سینئر تھا اس لیے بھی وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی دوسرے اس کے سینئر بھی یہی چاہتے تھے۔ وہ تو ایک جذبہ لے کر اس فورس میں جوائن ہوئی تھی اسے نہیں علم تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب بھی ہوگا اور اسے برداشت بھی کرنا پڑے گا۔ وہ بھی ایک لڑکی تھی اور اس کے بھی کچھ خواب تھے مگر یہاں آ کر لگتا تھا کہ جیسے اس کے بھی خواب چکنا چور ہو جائیں گے۔ آہستہ آہستہ وہ ان لوگوں کے طریقہ کار سے متنفر ہونے لگی۔ مگر ایک دن جب اس سے یہ کہا گیا کہ وہ چوہدری صاحب سے شادی کر لے تو وہ پھٹ پڑی۔ جانے کب کا رکا ہوا لاوا طوفان بن کر بہہ نکلا اور اس نے نہ صرف گنگا رام بلکہ اس کے بڑوں کو بھی کھری کھری سنا دیں۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ چوہدری صاحب میں کوئی خامی تھی۔ نہیں قطعاً نہیں۔ اصل میں بات یہ تھی کہ وہ کسی اور کو دل و جان اور روح کی گہرائیوں سے پیار کرتی تھی اور وہ تھا انگلینڈ میں رہائش پذیر اس کا کزن، جو کہ خود بھی اس کا دیوانہ تھا اور کئی بار اسے شادی کے لیے کہہ چکا تھا مگر وہ اسے ٹالے جا رہی تھی۔ ایسے میں جب اسے چوہدری صاحب سے شادی کے لیے کہا گیا تو وہ پاگل نہ ہوتی تو اور کیا کرتی مگر اسے اس پیار کی اتنی بڑی سزا ملے گی یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ ایک رات اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے سینے میں گولی لگی تھی اور یہ سب مجھے اتفاقی طور پر معلوم ہوا۔ بس اسی دن سے میرا دل ان لوگوں سے کھٹا ہو گیا جو لوگ اپنی دیرینہ وفادار ساتھی کے ساتھ ایسا کر سکتے تھے وہ میرے ساتھ کیا نہیں کر سکتے تھے۔ نوری کا قتل ایک سوچی سمجھی سازش کے مطابق کیا گیا۔ میں نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کر لیا کہ میں ان سے اپنی بہن کی موت کا بدلہ ضرور لوں گی۔

خدارا میری مجبوری سمجھیں اور مجھے کوئی بہترین مشورہ دیں اور ان بھیڑیوں اور بے رحم سفاک قاتلوں کے خلاف میرا ساتھ دیں۔ میں جانتی ہوں کہ میری غداری کا علم ہونے پر یہ میرا اور میرے گھر والوں کا کیا حشر کریں گے مگر اس سے بچنے کے کچھ ایسا کرنا ہے کہ میں نہ صرف اپنے گھر والوں کو بچا سکوں بلکہ اپنے آپ کو بھی سلامت رکھ سکوں۔ جہاں تک آپ سے شادی کا تعلق ہے تو آپ سے شادی میری خوش قسمتی ہوگی مگر میں جانتی ہوں ایسا ناممکن ہے۔

اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے میرا اخلاص ہو نا اور آپ کو یہ خط لکھنا ہی کافی ہے مگر میں اس کے لیے آپ کو ایک اور ثبوت بھی دکھا سکتی ہوں اور وہ یہ کہ آپ کی زمینوں سے ایک سرنگ انڈیا کا بارڈر کراس کر رہی ہے اور اسی سرنگ سے میں بھی گنگا رام کے ساتھ بارڈر کراس کر کے آئی ہوں اور اگر آپ دیکھنا چاہیں تو بے شک دیکھ سکتے ہیں۔ دوسرا ثبوت آپ کی لاڈو نامی گھوڑی کی چوری۔ اس کا بھی مجھے علم ہے کہ وہ انڈیا میں اس وقت کس کے پاس ہے۔ اس کے بارے میں بھی مجھے نوری نے ہی بتایا تھا۔ اگر آپ مجھ سے تعاون کریں تو میرے خیال میں ہم دونوں ہی فائدے میں رہیں گے۔“

آپ کی خیر خواہ۔ فقط ایک بے بس، مجبور و لاچار لڑکی۔

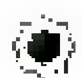
☆☆☆

خط کیا تھا ایک ناقابلِ یقین اور حیرت انگیز داستان تھی۔ ساری گتھیاں سلجھ چکی تھیں۔ مگر اس رات نوری کا قتل ایک سوچی سمجھی سازش تھی اور اس کی لاش کا اتنی جلدی غائب ہو جانا بھی اسی سرنگ کی وجہ ہی سے ممکن ہو سکا تھا اور گھوڑی بھی یقیناً اسی سرنگ سے ہی نکال کر انڈیا پہنچائی گئی ہوگی۔ یقیناً یہ سرنگ اتنی چوڑی اور کھلی تھی کہ اس میں سے گھوڑی آسانی سے سرحد پار جا سکتی تھی۔ جانے کب سے دشمن اس سرنگ کے ذریعے ہمارے ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہا تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ یہ سرنگ یہاں کب سے موجود تھی۔ یقیناً یہ سرنگ اسی ہندو مالک کی کارستانی تھی جو تقسیمِ ہند سے پہلے یہاں کی زمینوں کا مالک تھا۔ اس نے جونہی دیکھا کہ اس کی کچھ زمینیں پاکستان میں جا رہی ہیں تو اس کے شیطانی ذہن نے یہ منصوبہ بنا لیا ہوگا۔ بہرحال اب زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔

صبح ہوتے ہی میں ارسلان کی تلاش میں نکلا اور خدا کا شکر ہے کہ وہ جلد ہی مجھے مل گیا۔ اس کے ساتھ مل کر میں نے اسے بھی حالات سے آگاہ کر دیا اور پھر اس نے اپنے بڑوں کے ساتھ مل کر ایسی پلاننگ کی کہ نہ صرف انڈیا سے میری گھوڑی واپس آ گئی بلکہ لاجونتی کا بھائی اور ماں بھی بلا لیے گئے۔ اس کے لیے ارسلان کو جانے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے یہ ایک الگ کہانی ہے مگر وہ اپنے مقصد میں سرخرو ہو گیا اور جونہی وہ لاجونتی کے بھائی اور ماں کو ہندوستان سے پاکستان لانے میں کامیاب ہوا گنگا رام عرف شمسو اور اس کی پاکستان میں پھیلی ٹیم کے خلاف آپریشن شروع کر دیا گیا۔ کئی گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں اور را کے ایک بڑے نیٹ ورک کے کارندوں کو گرفتار کر لیا گیا مگر اسی دوران لاجونتی اور اس کی ماں اور بھائی کو حفاظت سے ایک ایسے ملک میں شفٹ کر دیا گیا جہاں یہ چالاک دشمن سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس بارے میں مجھے بھی بے خبر رکھا گیا۔

کھنڈر نما حویلی میں کمرے کا ایک ٹوٹے چھوٹے کمرے تک جا کر غائب ہو جانے والا معمہ بھی حل ہو چکا تھا۔ ایک چیز جس پر ہم نے اس وقت غور نہیں کیا۔ وہ تھا کھنڈر حویلی میں جا بجا پھیلی ہوئی پرالی۔ اس کمرے میں کھرا پہنچتے ہی وہ لوگ پرالی پر چلتے ہوئے سرنگ میں داخل ہو جاتے تھے اور پرالی پر وقتی طور پر تو کھرے کا نشان لگتا تھا مگر کچھ ہی لمحوں میں پرالی پھر سے سیدھی ہو جاتی تھی۔ دوسری احتیاط وہ یہ کرتے تھے کہ وہاں پہنچ کر وہ پرالی کے ایک دو گٹھے ہاتھ میں لے لیتے تھے اور آگے چلتے ہوئے بڑی فنکاری سے وہ اپنے قدموں کے نشان پر مناسب پرالی پھینک دیا کرتے تھے۔ گھوڑی چوری کے وقت شدید دھند پڑ رہی تھی اس لیے ہمارے پہنچنے تک انہوں نے جو اپنے کھروں کے اوپر پرالی پھینکی تھی وہ سونے پہ سہاگہ ثابت ہوئی۔ نوری کے قتل کے وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

بہرحال نوری کے روپ میں ہندو لڑکی کملا وتی انتہائی دھوکے باز ثابت ہوئی۔ چہرے مہرے سے وہ اتنی معصوم لگتی تھی کہ ہر کوئی دھوکا کھا جاتا تھا۔ دوسرے ڈیرے میں ایک عرصہ رہی مگر میں اسے نہ پہچان سکا۔ جس کا مجھے عمر بھر افسوس رہے گا۔



قسط نمبر 15

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الٰہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں ان کا پیشہ بندر، ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا مسخر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان وسعتوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

میلے کے آخری دن کا میدان سج چکا تھا۔ دوپہر ڈھلنے کے ساتھ ہی علاقے بھر سے آئے ہوئے لوگ ایک بڑے دائرے میں کھڑے تھے۔ اسی دائرے میں جاگیرداروں، زمینداروں اور میلے کے منتظمین کے الگ الگ جگہوں پر شامیانے لگے ہوئے تھے۔ وہ بھی اپنے اپنے لوگوں کے ساتھ کرسیوں پر براجمان تھے۔ انہی کے درمیان ان کے شہ زور بھی تھے، جو مقابلے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے ہر علاقے کا با اثر آدمی میدان سے باہر مقابلے کے لیے موجود ہے۔ اس وقت لوگوں میں عام تاثر یہی تھا کہ مقابلہ تو رام گڑھ والوں نے جیت ہی لینا ہے۔ مگر تجسس یہ تھا کہ ان کے مقابلے میں آنے والا وہ کون سا شہ زور ہے، جس نے اتنا حوصلہ کر لیا۔ کس نے یہ ہمت کی ہے کہ ان کے سامنے مقابلے کے لیے اترے۔

تماشائیوں کی بڑی تعداد نعرے بازی کر رہی تھی۔ ان میں سب سے زیادہ شور رام گڑھ والوں ہی کا تھا۔ ان سب کے درمیان ٹھاکر رام دیال راٹھی تنی ہوئی مونچھوں اور چڑھی ہوئی خمار آلود آنکھوں سے میدان کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا یہ خمار یونہی نہیں تھا۔ وہ کئی برسوں سے یہ مقابلہ جیتتا آ رہا تھا۔ جس کے لیے ہر طرح کی تیاری بڑے اہتمام سے ہوا کرتی تھی۔ جس کی وہ خود نگرانی کیا کرتا تھا۔

میلے کے لیے رام گڑھ سے نکلنے والی سج دھج ہی نرالی ہوا کرتی تھی۔ ٹھاکر رام دیال بڑے شوق اور اہتمام سے میلے میں شریک ہونے کے لیے آتا تھا۔ چاندی کی زین والے گھوڑے پر سوار وہ سب سے آگے ہوتا، اس کے پیچھے رام گڑھ والوں کا قافلہ ہوتا تھا۔ باجے گاجے کے ساتھ وہ یوں نکلتے جیسے کسی جنگ کے لیے جا رہے ہوں۔

صحرا کے درمیان اس چٹیل میدان میں تین دن تک خوب رونق رہتی۔ یوں لگتا جیسے وہاں پر کوئی بستی اُگ آئی ہو۔ ٹیلے آباد ہو جاتے۔ وہاں خیمے لگ جاتے۔ خرید و فروخت کے لیے میدان کے ایک جانب دکانیں سج جاتیں۔ جابجا ناچنے والوں کی منڈلیاں لگ جاتیں۔ جادوگری اور شعبدے بازی کے کمالات دکھانے والے، عورتوں کے سنگھار اور بچوں کے کھلونے بیچنے والے، مختلف بھگوانوں کی مورتیاں اور تصویریں فروخت کرنے والے، طوائفیں، حکیم، سنیاسی، پتھر نگینے بیچنے اور نوسر بازی والے بھی آ جاتے۔ چھوٹے موٹے نوسر باز، چور اور ٹھگی لگانے والے بھی موجود ہوتے۔ اس میلے میں تفریح کے ساتھ مویشیوں کی نمائش بھی ہوتی۔ تین دن میں جہاں دور دراز کے لوگوں کو آپس میں ملنے کا موقع ملتا، وہاں ہر طرح کے مقابلے ہوتے۔ وہاں اسی میلے میں پتہ چلتا کہ کس علاقے میں کون، کتنا شہ زور ہے۔ وہاں ان

شوقین جاگیرداروں اور زمینداروں کے بارے میں معلوم ہو جاتا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ کیونکہ ان میں بعض ایسے مقابلے تھے، جن کی سرپرستی زر کثیر خرچ کرنے ہی سے ہو سکتی تھی۔ شہ زوروں کے ان مقابلوں سے نہ صرف ان کے شوق کا پتہ چلتا تھا بلکہ علاقے پر اپنی دھاک بٹھانا بھی مقصد ہوتا تھا۔ طاقت کے اس اظہار کی خواہش کی وجہ سے ان مقابلوں کی تیاری کے لیے محنت، زر اور وقت خرچ کیا جاتا تھا۔ عوام کی بھی سب سے زیادہ دلچسپی اسی میدان میں دیکھنے کو ملتی، جہاں شہ زور اپنی طاقت اور مہارت دکھاتے تھے۔ تین دن تک میدان میں مختلف مقابلوں میں ہار جیت چلتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ تیسرے دن دوپہر کے بعد آخری مقابلہ شمشیر زنی کا ہوا کرتا تھا۔ جو اس میدان کا سب بڑا، سب سے سنسنی خیز اور دل ہلا دینے والا مقابلہ ہوتا تھا۔ بڑے بڑے شہ زور یہاں سے ساری زندگی کے لیے اپاہج ہو کر گئے تھے۔ کئی شہ زوروں کی تو یہیں موت ہوگئی تھی۔

ٹھاکر رام دیال رانے کی اسی شمشیر زنی کے مقابلے میں سب سے زیادہ دلچسپی ہوا کرتی تھی۔ یہ دلچسپی اسے اپنے سورگ باشی پتا سے وراثت میں ملی تھی۔ اسی میدان میں اس نے بھی اپنی طاقت اور مہارت کا کئی بار مظاہرہ کیا تھا۔ پھر بعد میں اس نے خود شمشیر زن نوجوان تیار کئے۔ وہ سارا سال ان پر بے تحاشا دولت لٹاتا۔ وہ یہی سمجھتا تھا کہ رام گڑھ والے کبھی شکست نہیں کھا سکتے۔ ہر برس علاقے میں سے کوئی نہ کوئی شہ زور مقابلے پر آتا، شکست کے ساتھ ساری زندگی کے لیے اپاہج ہو جاتا۔ حریفوں نے بڑی محنت کی ہوتی تھی مگر جیت ان کا مقدر نہ بن سکتی تھی۔ یوں یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ شمشیر زنی کے مقابلے میں رام گڑھ والوں سے کوئی بھی مقابلہ نہیں جیتا جا سکتا۔ ٹھاکر رام دیال رانے اس پر نہ صرف فخر کرتا بلکہ اسے یہ زعم بھی تھا کہ وہ ناقابل شکست ہے۔

اس بار اس نے بہت سوچ رکھا تھا۔ وہ اپنے اس ناقابل شکست ہونے کی روایت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

جیت جانے کا خمار بہت سارے لوگوں کو پاگل کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے لیکن یہ نہیں جانتے کہ شکست کے اندر جیت اور جیت کے اندر ہار پڑی ہوتی ہے۔ بس اسے دیکھنے کے لیے نگاہ چاہئے۔

اس وقت میدان میں موجود ہر ذی روح کا دوران خون تیز ہوگیا، جب منصفین میدان میں آگئے۔ یہ مقابلہ شروع ہو جانے کی علامت تھا۔ تماشائیوں کا شور بلند ہوا اور پھر آہستہ آہستہ خاموشی چھانے لگی۔ یہاں تک کہ جیسے آواز سلب ہوگئی ہو۔ بپھرا ہوا ہجوم سماعت بن گیا۔ منصف میدان کے درمیان میں آگئے تھے۔ انہوں نے شہ زوروں کو میدان میں آکر مقابلہ کرنے کی دعوت دے دی۔ تبھی پورے ہجوم کی نگاہیں رام گڑھ والوں کی جانب اٹھ گئیں۔ یہی وہ خمار آلود لمحہ تھا، جس کا نشہ سارا سال رہتا تھا۔ اسی خمار میں ٹھاکر رام دیال رانے نے پورے کروفر کے ساتھ پورے پنڈال پر نگاہ دوڑائی۔ کوئی باہر نہ نکلا تو اس نے اپنے اس شہ زور کو میدان میں جانے کا اشارہ کیا، جو اس کے اشارے کا منتظر تھا۔

شہ زور تیزی سے میدان کی جانب لپکا۔ ایک ہاتھ میں ڈھال اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لہراتا ہوا، بجرنگ بلی کی جے کے نعرے لگاتا ہوا، وہ اس مقام تک چلا گیا، جو میدان کے وسط میں تھا۔ وہیں منصف بھی کھڑے تھے۔ وہ شہ زور اپنی چمکتی ہوئی تلوار اور نقش و نگار والی ڈھال کے ساتھ بجرنگ بلی کے نعرے لگاتا پورے پنڈال کو للکار رہا تھا۔ مگر اس کے مقابلے میں کوئی بھی نہیں نکل رہا تھا۔ کسی طرف سے بھی کوئی شمشیر زن تلوار سونت کر مقابلے کے لیے میدان میں نہیں نکلا تھا۔ شہ زور کی ہر للکار ٹھاکر رام دیال رانے کو ایسا نشہ دے رہی تھی۔ جو پرانی سے پرانی شراب بھی نہیں دے سکتی تھی۔ اس کا نشہ وہی محسوس کر سکتا ہے، جس نے ایسا احساس پایا ہو۔ اس نے بڑے غرور کے ساتھ اپنی دائیں مونچھ کو انگلیوں کی پوروں سے مسلا۔ فتح مندی کا نشہ سب نشوں پر بھاری ہوتا ہے۔ اور یہی لمحات اس کے دماغ کو خمار آلود کر رہے تھے۔

پنڈال میں سے کوئی بھی باہر نہیں آیا تھا۔ جبکہ اس مقابلے کے لیے اعلان پر اعلان کیا جا رہا تھا۔ ٹھاکر رام دیال رائے کی مسکراہٹ مزید گہری ہوتی جا رہی تھی۔ کیونکہ اس کے دماغ پر فتح مندی کا نشہ چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اسی خمار میں جھوم گیا۔ ایک طرح سے وہ پورا علاقہ اپنے نگیں کر چکا تھا۔ پورے علاقے نے یہ مان لیا تھا کہ رام گڑھ والوں سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ میدان میں للکارنے والے شہ زور کے ہر نعرے کے ساتھ ٹھاکر رام دیال رائے کا یہ احساس بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ پنڈال میں بھی یہ سرگوشیاں ہونے لگیں تھیں کہ اب ان کے مقابلے میں کوئی نہیں اترے گا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ ٹھاکر رام دیال رائے کی گردن مزید تن گئی تھی کہ کوئی بھی ان کے مقابلے میں نہیں اترے گا۔ اب فقط منصفین کی طرف سے فتح کا ہی اعلان ہونا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کوئی ان کے مقابلے میں نہیں آیا تھا۔ انہی فتح مندی اور سنسنی خیز لمحات میں ٹھاکر رام دیال رائے نے دماغ میں موجود خیال کے اظہار کا فیصلہ کر لیا۔

پورے علاقے میں دھاک بٹھانے کا یہ سب سے بہترین موقعہ تھا۔ اس طرح ہمیشہ کے لیے یہ مقابلہ وہ اپنے نام کر لے گا۔ یوں پورے علاقے میں اس کے نام کا ڈنکا بج جائے گا بلکہ پھر جس سے جو چاہے گا اپنی بات منوا لے گا۔ اس کے اندر کا راجپوت پوری طرح سے جاگ گیا تھا۔ تبھی وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ منصفوں نے بھی اس کی جانب دیکھا تو ٹھاکر رام دیال رائے نے کہنا شروع کیا۔ وہ جو کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز کو اعلان کرنے والے پورے پنڈال تک پہنچا رہے تھے۔

"ٹھاکر رام دیال رائے کو اس بات پر افسوس ہو رہا ہے کہ پورے علاقے کی جنتا میں سے کوئی بھی نہیں ہے جو رام گڑھ کے شہ زوروں سے مقابلہ کر سکے۔ ٹھاکر جی اعلان کرتے ہیں کہ چاہے کوئی ہار بھی جائے لیکن اس شہ زور کا مقابلہ کرے تو اسے دوگنا انعام دیا جائے گا۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی پورے پنڈال میں بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔ مگر کافی دیر تک کوئی بھی مقابلے کے لیے نہیں نکلا۔ تب ٹھاکر رام دیال رائے کی طرف سے اگلا اعلان کیا گیا۔

"اگر کوئی شہ زور اس زعم میں نہیں نکلتا کہ اس کے ہاتھوں رام گڑھ کا شہ زور مارا جائے تو یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ وہ ڈر سے مت۔ اسے خون معاف ہوگا بلکہ فتح مندی کی صورت میں سوگنا انعام دیا جائے گا۔"

یہ اعلان پورے پنڈال میں گونج گیا۔ مگر حیرت یہ تھی کہ کوئی بھی میدان میں نہیں نکلا۔ ٹھاکر رام دیال رائے میدان مار لینے کے خمار میں جھومنے لگا۔ تبھی اس نے وہ اعلان کروا دیا جس کے بارے میں اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

"اگر کوئی شہ زور مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تو پورا علاقہ یہ مان لے کہ ٹھاکر رام دیال رائے کی برابری کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ انہی کی شان ہے کہ وہ مقابلہ جیت کر جا رہے ہیں۔ اب یہاں بھی شمشیر زنی کا مقابلہ نہیں ہوگا۔ یہ جگہ جہاں یہ میلہ لگا ہوا ہے اب ٹھاکر رام دیال رائے کی ملکیت ہے۔ تاکہ یاد رہے کہ یہ میدان ٹھاکر رام دیال رائے جیت چکے ہیں۔ اس اعلان کے بعد بھی اگر کسی میں ہمت اور جرات ہے، کسی کے خون میں جوش آیا ہے تو وہ سامنے آ سکتا ہے۔"

یہ اعلان کیا ہونا تھا کہ پورے پنڈال میں سراسیمگی پھیل گئی۔ جہاں عوام حیرت زدہ رہ گئے تھے وہاں جاگیردار، بڑے زمیندار اور بااثر لوگوں کو ٹھاکر رام دیال رائے سے اس قدر رعونت کی امید نہیں تھی۔ اس نے کھیل کو جنگ میں بدل دیا تھا۔ نفرت، حسد، ناامیدی اور بے بسی جیسے جذبات سے فضا بوجھل ہو گئی تھی۔ ٹھاکر رام دیال رائے ان جذبات اور بوجھل فضا سے بے نیاز فاتحانہ نگاہوں سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ سبھی اسی کی رعیت ہوں۔ طاقت کا نشہ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کرسی پر بیٹھ جاتا اور منصف اس کی فتح کا اعلان کر دیتے، پنڈال میں سے ایک شخص باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمکتی ہوئی تلوار تھی جسے وہ لہراتے ہوئے دھیرے دھیرے قدموں سے آگے بڑھ

آگے اسی طرف بڑھتا چلا گیا، جہاں منصف کھڑے تھے۔ انہی کے پاس رام گڑھ کا شہ زور کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے سارے پنڈال کو سانپ سونگھ گیا۔ حیرت بھری نگاہیں اس پر جم گئیں۔

اس شخص کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ جسے وہ لہرا نہیں رہا تھا بلکہ تلوار اس نے یوں پکڑی ہوئی تھی جیسے اسے ہتھیار سے زیادہ خود پر اعتماد ہو۔ وہ لمبا تڑنگا تھا۔ اس نے لمبا کرتا پہنا ہوا تھا اور دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ چہرہ سیاہ داڑھی سے مزین تھا۔ سر کے سیاہ دراز گیسو اس کے کاندھوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ پہلی نگاہ میں یہ معلوم نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے، اور کس علاقے کا ہے۔

اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ جس طرح قدم بڑھاتا جا رہا تھا۔ ٹھاکر رام دیال راجے کو اس کے بڑھتے ہوئے قدم کامیابی کے زینے سے پیچھے دھکیل رہے تھے۔ اترتا ہوا نشہ بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔ وہ ایسی ہی اذیت سے دوچار ہو گیا۔ وہ اپنے دشمن کی طرف پوری طرح متوجہ تھا۔ وہ دیکھ ہی نہیں پایا کہ پنڈال کا ماحول بدل گیا ہے۔

تماشائیوں میں سے کسی کو بھی امید نہیں تھی کہ مقابلہ ہوگا۔ سارے لوگ اس پر حیران تھے کہ جس کا نہ تو حلیہ شہ زوروں جیسا ہے اور نہ ہی اس کے ہاتھ میں ڈھال تھی۔ پھر بھی وہ اس خطرناک مقابلے کے لیے میدان میں اتر آیا تھا۔ وہ اپنا دفاع کیسے کرے گا؟ وہ کہیں سے بھی ماہر شمشیر زن نہیں لگتا تھا۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ وہ مقابلے پر اتر آیا تھا اور اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں اس کے سامنے اس کا حریف کھڑا اسے نظروں ہی نظروں میں تول رہا تھا۔ منصف بھی اسے دیکھ کر حیران تھے۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اپنی موت کو دعوت دینے کے لیے میدان میں اتر آئے گا۔ بظاہر ان دونوں میں کوئی مقابلہ نہیں لگتا تھا مگر نووارد شمشیر زن ان کے درمیان اعتماد سے کھڑا تھا۔ ہر جانب پھر سے سکوت طاری ہو گیا تھا۔ تبھی ایک بزرگ منصف نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”جوان! تم بنا ڈھال کے مقابلے کے لیے آ گئے ہو تمہیں احساس نہیں کہ تلوار زخم بھی لگاتی ہے؟“

”بے شک تلوار زخم ہی لگاتی ہے، لیکن سارے زخم دکھائی نہیں دیتے۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے کیا کرنا ہے۔ آپ مقابلہ شروع کروائیں۔“ اس نے انتہائی اعتماد سے کہا تو بوڑھے منصف نے کہا۔

”پھر بھی ہم تمہیں ڈھال مہیا کر سکتے ہیں تاکہ مقابلہ برابری میں ہو۔“

”میں سہاروں کا قائل نہیں ہوں۔ آپ مقابلہ شروع کروائیں۔“ نووارد نے اعتماد سے کہا تو کسی کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ بوڑھا منصف چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس نے مقابلہ شروع کرنے کا اشارہ کر دیا۔

دونوں حریف آمنے سامنے تھے۔ اشارہ پاتے ہی ان کے جسموں میں بجلی کوند گئی۔ رام گڑھ کے شہ زور نے بجرنگ بلی کا نعرہ لگایا اور تلوار بازی کے جوہر دکھاتا ہوا آگے بڑھا۔ نووارد کی نگاہ تلوار پر نہیں حریف پر تھی۔ پورا ہجوم یوں خاموش تھا جیسے ان کی سانسیں رک گئیں اور ہوا کی سنسناہٹ تیز ہو گئی ہو۔ رام گڑھ کے شہ زور نے پوری قوت اور جوانی سے حملہ کیا، جسے نووارد نے انتہائی مہارت سے روک لیا۔ پھر پے در پے وار روکتے ہوئے وہ حریف سے پسپا ہوتا رہا۔ جیسے حریف کی طاقت کا اندازہ کر رہا ہو۔ وہ مسلسل دفاعی حالت میں رہا اور رام گڑھ کے شہ زور کو اپنی مرضی سے میدان میں گھماتا رہا۔ ٹھاکر رام دیال راجے سمجھ رہا تھا کہ نووارد جو چاہ رہا ہے وہی ہو رہا ہے لیکن عام لوگوں کو لگ رہا تھا کہ وہ ابھی زخم کھا کر گرے گا تو اٹھ نہیں پائے گا۔ حیرت انگیز طور پر دونوں میں سے کسی کو زخم نہیں آیا تھا۔

ٹھاکر رام دیال راجے یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی عقل یہ تسلیم کر چکی تھی کہ نووارد ماہر تلوار باز ہے۔ جو پینترے اس نے دکھائے تھے وہ اسے بھی نہیں آتے تھے۔ لیکن وہ تو اس احساس کے ساتھ تلملا رہا تھا کہ نووارد نے آ کر نہ صرف اس کے غرور کو خاک میں ملا دیا تھا بلکہ جن

عزائم کا وہ اعلان کر چکا تھا، اس پر بے دردی سے لکیر پھر گئی تھی۔ انتہائی ندامت کے احساس اور بڑھتے ہوئے غصے کے ساتھ اس کے اعصاب تن گئے۔ ادھیڑ عمری میں شکست کا یہ تھپیڑا وہ سہہ نہیں پا رہا تھا۔ جوش مارتے ہوئے خون میں شرمندگی کی ٹھنڈک نے اس کے جسم کو ترخا کر رکھ دیا تھا۔ اس نو وارد نے میدان میں قدم رکھتے ہی راجپوتی غرور اور انا پر جو کاری ضرب لگائی تھی اس کے زخم نے ٹھاکر رام دیال رائے کو تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بے حال ہو رہا تھا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس نو وارد کو دیکھ رہا تھا جو اس کے شہ زور کو ایسا ہونے پر مجبور کر رہا تھا۔ تلوار بازی کے جوہر اس سے پہلے کبھی دیکھنے کو نہیں ملے تھے کہ بنا ظاہری زخم لگائے وہ حریف کو ناچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ میدان کا رنگ بدل رہا تھا۔ ان جاگیرداروں اور زمینداروں کی طرف سے نو وارد کے حق میں نعرہ بازی شروع ہوگئی تھی جو کبھی رام گڑھ والوں سے شکست کھا چکے تھے۔ کسی نے پچھلی بار رام گڑھ والوں کو شکست سے دوچار کرنا تھا۔ عوام اس بدلتی ہوئی صورت حال میں پرجوش ہو گئے تھے۔ اس سنسنی نے پورے ماحول میں جادو بکھیر دیا تھا۔ واضح شکست کے آثار نے ٹھاکر رام دیال رائے کو پاگل کر دیا۔ اب سے ذرا دیر قبل جو لوگ اس کے سامنے گردنیں جھکا چکے تھے، وہی اب اس نو وارد کی وجہ سے اس کی طاقت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ وہ اپنی عقل کھو بیٹھا۔ بھی دانت پیستے ہوئے انتہائی غصے میں اس کے منہ سے اضطراری انداز میں نکل گیا۔

”اسے اب مر جانا چاہیے۔“

آواز اتنی بلند نہیں تھی لیکن اتنی دھیمی بھی نہیں تھی کہ قریب کھڑا بھانو وہ سن سکے۔ بھانو اس کا وہ خاص ملازم تھا، جو پشتوں سے ان کی خدمت کرتے چلے آ رہے تھے۔ وہ ان ملازمین میں سے تھا جو اپنے مالکوں پر جان نثار کر دیتے ہیں اور مالک کے اشاروں کو لمحوں میں سمجھ بھی لیتے ہیں۔

ٹھاکر رام دیال رائے کی نگاہیں برسر پیکار شمشیر زنوں پر لگی ہوئی تھیں۔ نو وارد بھاری کا پلڑا ثابت ہوا تھا۔ اس نے کئی ایسے وار بھی بچائے تھے کہ اگر ڈھال بھی ہوتی تو بچ نہ پاتا۔ بعض اوقات تو صاف لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اپنے حریف کو تھکا رہا ہے۔ ورنہ ایسے مرحلے بھی آئے تھے کہ جب وہ فیصلہ کن وار کر سکتا تھا۔ پھر اچانک نو وارد نے اپنی تلوار بلند کی اور اگلے ہی لمحے رام گڑھ کے شہ زور کی ڈھال دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک ٹکڑا شہ زور کے ہاتھ میں رہ گیا اور دوسرا دور جا گرا۔ تلوار زنی کے مقابلے میں ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ شہ زور نے حیرت کی انتہاؤں پر جا کر اس گرے ہوئے ٹکڑے کو دیکھا، بس لمحہ اس پر بھاری تھا۔ نو وارد نے اپنی تلوار کی نوک اس کی شہ رگ پر رکھ دی۔

پورے پنڈال میں شور مچ گیا۔ اس شور میں رام گڑھ والوں کی انتہائی ہزیمت کی خوشی زیادہ تھی۔ بظاہر مقابلے کا فیصلہ ہو چکا تھا جو بلاشبہ نو وارد کے حق ہی میں ہوا تھا۔ انہی لمحات میں عوام نے دیکھا ایک سنسناتا ہوا تیر آیا اور اس نو وارد کے بائیں کاندھے میں پیوست ہو گیا۔ اس ہاتھ میں نو وارد نے تلوار پکڑی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ کسی کو کچھ سمجھ میں وجہ بات آتی، ہر طرف سے ہجوم میدان میں ٹوٹ پڑا۔ ہر بندہ یہ سمجھ گیا تھا کہ اپنی شکست سے بچنے کے لیے رام گڑھ والوں نے کیا حملہ ہے۔ ورنہ مقابلہ تو نو وارد جیت ہی چکا تھا۔

پہلے تو ٹھاکر رام دیال رائے کو خود سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا، مگر جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ یہ تیر بھانو نے چلایا ہے تو اس کے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اب وہ اس مقابلے کو ادھورا ثابت کر سکتا تھا۔ کیونکہ ہارنے سے بہتر ہے مقابلہ ادھورا رہ جائے۔ جہاں ہجوم کے میدان میں آ جانے سے وہ گھبرا گیا تھا وہاں وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ انہیں واضح شکست نہیں ہوئی۔ یہ فقط اس کی خود کو دلاسہ دینے کی سوچ تھی۔ ورنہ وہ بھی جانتا تھا کہ اسے شکست ہو چکی ہے۔ اس کی عقل کہہ رہی تھی کہ اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ورنہ بپھرا ہوا ہجوم کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اسے اچھی طرح یہ معلوم تھا کہ اس کے مخالفین حاسدین کے کارندے بھی ہوں گے جو انہیں ناقابل تلافی نقصان

پہنچا سکتے ہیں۔ مگر اس کی راجپوتی انا اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے مرد میدان رہا تھا۔ یوں پیٹھ دکھا کر بھاگنا نہیں چاہتا تھا ورنہ ساری عمر کے لیے اس پر دھبہ لگ جاتا۔ اس کے ملازمین نے اسے گھیرے میں لے کر تلواریں سونت لی تھیں۔ دو بندے توڑے دار بندوقیں لے کر اس کے ارد گرد کھڑے ہو گئے تھے۔ فائر کے لیے وہ توڑے ڈال چکے تھے۔ کچھ دیر تک ہجوم میدان میں رہا، پھر آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ ہر بندہ حیران اور پریشان تھا کہ تیر کھایا ہوا تلوار باز کدھر گیا؟ وہ انہیں دکھائی ہی نہیں دیا تھا۔ وہ اس ہجوم میں کہیں گم ہو گیا تھا یا اسے زمین نگل گئی یا آسمان؟ وہ کہاں گیا؟ ٹھاکر رام دیال رائے سمیت ہر بندے کے ذہن میں یہی سوال تھا۔

حیران و پریشان ہجوم کسی فیصلہ کن اعلان کا منتظر تھا۔ منتظمین بھی ورطۂ حیرت میں تھے کہ کیا کریں۔ شکست خوردہ شہ زور کو اس لیے انعام سے دیں کہ وہ ابھی تک میدان میں تھا یا گم ہونے نووارد کو تلاش کر کے اسے انعام دیں کیونکہ وہ جیت چکا تھا۔ وہ اسی تذبذب میں تھے۔ یہ فیصلہ ہونا باقی تھا۔ وہ ابھی اس پر مشورہ کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ٹھاکر رام دیال رائے اپنے چاندی کی زین والے گھوڑے پر سوار مصاحبوں، ملازمین اور جاں نثاروں کے ساتھ ان کی طرف بڑھ گیا۔ وہ گھوڑے سے نہیں اترا بلکہ وہیں کھڑے کھڑے اپنی کچلی ہوئی انا کے باعث اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اس نے منتظمین کے قریب گھوڑا لے جا کر روک دیا، پھر انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”فیصلہ تو ہو چکا۔ آپ میرے شہ زور کو انعام دیں یا نہ دیں۔ مگر میری طرف سے مقابلے کی ہمت کرنے والے جوان کو پہلے دوگنا انعام دینا تھا لیکن اب سوگنا انعام دینے کا اعلان کرتا ہوں، وہ آئے اور اپنا انعام لے جائے۔“

یہ کہہ کر اس نے گردن اونچی کر کے دور دور تک کھڑے لوگوں کو دیکھا، پھر اپنے گھوڑے کی لگامیں تھام کر چاروں طرف گھوما لیکن وہ نووارد کہیں نظر نہیں آیا۔ ٹھاکر رام دیال رائے جانتا تھا کہ وہ سامنے آ بھی گیا تو اسے سوگنا انعام دینا اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ایسا کر کے ایک تو وہ اپنی انا کو تسکین پہنچاتے ہوئے لاشعوری طور پر اپنی طاقت کا رعب جمانا چاہتا تھا اور دوسرا وہ سننے والوں کو یہ پیغام دے رہا تھا کہ یہ مقابلہ اس کی حیثیت کو کم کر دینے والا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس نووارد کو ملنا چاہتا تھا، جس نے تلوار بازی کے ایسے جوہر دکھائے تھے کہ جس سے وہ خود بھی ناواقف تھا۔ کیونکہ علم اور فن کی کوئی حد ہے اور نہ کنارہ۔ وہ اتنا بڑا انعام دے کر اسے اپنا گرویدہ کر لینا چاہتا تھا۔ ٹھاکر رام دیال رائے کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر بولا۔

”میں جا رہا ہوں۔ اگر وہ بعد میں بھی آ کر اپنے انعام کا مطالبہ کرے تو اسے بتا دیں کہ ٹھاکر رام دیال رائے کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لیے کھلے ہیں۔ وہ جب چاہے آ سکتا ہے۔ وہ ہمارا مہمان ہوگا۔ میں اس کی جان کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔“

اس نے یہ الفاظ بڑے رعب و دبدبے سے کہے تھے اور پھر ان معززین کا ردعمل دیکھے بغیر گھوڑا موڑ لیا۔ وہ میدان سے نکلا تو اس کا رخ رام گڑھ جانے والے راستے کی طرف تھا۔

پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ رام گڑھ کی جانب پلٹتے ہوئے اسے جیت کے نشے کا خمار نہیں تھا۔ اس کا من ہار تسلیم کر چکا تھا مگر دماغ میں ابھی تک جیت جانے ہی کی سوچیں کلبلا رہی تھیں۔ دماغ طرح طرح کی تاویلیں اور دلیلیں دے رہا تھا کہ وہ فتح مند ہے لیکن دل کی ایک نفی ان ساری تاویلوں پر لکیر پھیر رہی تھی۔ وہ قافلے کے ساتھ میدان سے نکل کر صحرا کے درمیان میں بنے ہوئے راستے پر ہو لیا تھا۔ ٹھاکر رام دیال رائے ان سب سے آگے تھا۔ پہلے واپسی پر وہ نعروں کی گونج میں شادیانے بجاتے ہوئے آتے تھے مگر اس بار ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ کسی کی بھی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ جیت یا ہار جانے کے بارے میں لب کشائی کرے۔ وہ بیس یا پچیس لوگ تھے اور وہ سب

تیزی سے چلتے تھے۔ باقی لوگ ابھی پیچھے تھے۔ وہ دونوں بگھیوں اور بیل گاڑیوں میں آرہے تھے۔

اچانک انہیں سامنے موڑ پر ببول کے درختوں کے پاس اگی ہوئی کریر کی جھاڑی کے ساتھ ایک شخص کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس نے کالی چادر اوڑھی ہوئی تھی اور اپنا سر گھٹنوں میں دیا ہوا تھا۔ شام کے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں بھی وہ واضح دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سراب کی مانند دھوکا نہیں دے رہا تھا کہ کسی کو اس کا یقین نہ آتا۔ انہوں نے دوری سے اس شخص کو دیکھ لیا تھا۔ اس شخص نے بھی ان کی آمد پر سر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ ٹھاکر رام دیال رائے کو یہ منظر خلاف معمول لگا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ شخص زندہ بھی ہو اور ان کی آمد کا احساس بھی نہ کرے۔ تو پھر یہ ان کی راہ میں اس طرح کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ اگر یہ اس طرح بیٹھا رہا تو ہمارے گھوڑوں کی سموں تلے آکچلا جائے گا۔ یہ سوچتے ہی اس نے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں اور اس شخص سے تھوڑے فاصلے پر رک گیا۔ پھر اس نے بھانو کو دیکھ کر کہا۔

"کیا میں وہی دیکھ رہا ہوں جو تو دیکھ رہا ہے؟"

"جی مالک! میں پتہ کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور لمحوں میں اس شخص کے پاس پہنچ گیا۔ پھر زور سے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہو تم، اپنا چہرہ اوپر کرو۔"

بھانو کے اس تخاطب پر اس شخص نے اپنا سر اٹھایا، بھانو کی طرف دیکھا اور پھر اسے کوئی اہمیت دیے بغیر اسی طرح سر نیہوڑے بیٹھ گیا جیسے وہ پہلے بیٹھا ہوا تھا۔ بھانو نے جب اس کا چہرہ دیکھا تو وہ چونک گیا۔ اس نے اسے دوبارہ دیکھنے کے لیے کئی بار پکارا مگر اس شخص میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ جیسے اس کا آواز دینا نہ دینا ایک برابر ہو۔ وہ کچھ دیر کوشش کے بعد لوٹ آیا اور ٹھاکر رام دیال رائے کی طرف دیکھ کر گھبرائے لہجے میں بولا۔

"مالک! کوئی سادھو سنت معلوم پڑتا ہے۔"

ٹھاکر رام دیال رائے نے اپنے بڑوں سے کئی بار سنا تھا کہ ناگ ہو یا سادھو، سنت، ان کا راستہ نہیں کاٹنا چاہیے۔ مگر یہاں صورت حال مختلف تھی۔ سادھو، سنت اس کی راہ میں تھا، وہ بھی آدھے ادھورے راستے پر۔ وہ چاہتا تو اس کے پاس سے ہو کر گزر بھی سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی بہت سارے خیال آتے چلے گئے جس میں یہ بات بھی تھی کہ اگر یہ سادھو سنت ہے تو پھر اس کا یہاں بیٹھنا بے معنی نہیں ہو سکتا۔ ضرور اس میں کوئی راز پوشیدہ ہے۔ کچھ دیر پہلے بھی تو میدان میں انہونی ہوئی تھی۔ اگر اب یہ سادھو یہاں بیٹھا ہوا ہے تو ضرور کوئی بات ہے۔ یہ یقین کرتے ہی اس نے کہا۔

"تم سب ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔"

"مالک اگر؟" بھانو نے کہنا چاہا تو ٹھاکر رام دیال رائے نے اس کی طرف سخت نگاہوں سے دیکھا۔ تب وہ خاموش ہو کر وہیں کھڑا رہا۔ ٹھاکر رام دیال رائے گھوڑے پر سے اترا اور ان سب کو وہیں چھوڑ کر آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اس شخص کے پاس جا کر رکا اور سخت لہجے میں بولا۔

"کون ہو تم؟ سادھو یا..." وہ پاکھنڈی کہنا چاہتا تھا کہ اس شخص نے اپنا سر اٹھا دیا۔ تبھی ٹھاکر رام دیال رائے پوری جان سے لرز گیا۔ یہ تو وہی نووارد تھا جس نے ابھی کچھ دیر پہلے میدان میں تلوار بازی کے جوہر دکھائے تھے۔ بھانو کی پہچان میں اگر وہ نہیں آیا تھا تو میدان میں اس کے گیسو سیاہ تھے لیکن اس وقت اس شخص کے ساری زلفیں دودھ کی مانند سفید تھیں۔ وہی تیکھا الف ناک، بڑی بڑی خمار آلود پر جلال آنکھیں، جن میں ایسا رعب موجود تھا جس کے سامنے ٹھاکر کو اپنی حیثیت ذرا سی ہوئی محسوس ہوئی۔ کشادہ پیشانی، وجیہہ ظاہر کرتا ہوا چہرہ، وہ چند لمحے ٹھاکر رام دیال رائے کی طرف دیکھتا رہا، پھر کڑکتی ہوئی آواز میں بولا۔

"پہچانا مجھے ٹھاکر؟ میں کون ہوں؟"

"پہچان تو میں گیا ہوں...... لیکن...... جانتا نہیں کہ ...... تو...... آپ ہیں کون؟"

اگرچہ اس نے بڑے حوصلے سے کہا تھا لیکن اس کی آواز کانپ گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے ایسی صورت حال سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔

”چہرہ ہی پہچان گئے ہو تو اچھی بات ہے۔ ورنہ میری بات سمجھنے میں تجانے تجھے کتنا وقت لگتا اور اس دوران تم نجانے کتنا نقصان اٹھا لیتے۔“ اس بار اس کا لہجہ تنبیہی تھا۔

”لیکن آپ ہیں کون؟“ ٹھاکر کا لہجہ مزید دھیما ہو گیا تھا۔

”تم اگر چاہو بھی تو نہیں جان سکتے ہو اور اگر کوشش بھی کرو گے تو الجھ جاؤ گے۔ شاید میں تیرے سامنے بھی نہ آتا، اگر تیرے غرور اور تکبر نے تجھے، تیری اوقات سے باہر نہ کر دیا ہوتا۔“ اس شخص کے لہجے سے اب غصہ جھلکنے لگا تھا۔

”پر تو ہم راجپوتوں......“

”بس آگے کچھ مت کہنا۔ کیا تم اس دھرتی کا سینہ چیر سکتے ہو، یا آسمان کو چھو لیا ہے تم نے...... تم تو اتنے بے بس ہو کہ اپنی سانس کو اپنے تابع نہیں کر سکتے اور تو اور نسل کا وارث پیدا نہیں کر سکتے ہو۔“ اس کے لہجے میں تضحیک تھی۔

”یہ تو بھگوان کی دیا ہوتی ہے۔ منش اس میں کیا کر سکتا ہے۔“ ٹھاکر نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”پھر بھی...... پھر بھی تمہیں اتنا غرور ہے؟ کیا ایک عظیم طاقت کا احساس رکھنے والا، اپنے بارے میں نہیں سوچتا کہ وہ خود کیا ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ مٹی پتھر کی بنی ہوئی بے جان مورتیاں کسی کو اولاد دینے کی سکت رکھتی ہیں۔ بے جان تو سراپا موت ہے، اس میں زندگی کہاں اور تم اس میں زندگی تلاش کر رہے ہو؟“ اس شخص کے لہجے میں موجود دبدبے سے زیادہ اس کی بات نے دبا کر رکھ دیا۔ اس کے ذہن میں آندھی کی طرح یہ خیال اٹھا کہ وہ تو اس کے دھرم کا اپمان کر رہا ہے۔ وہ جوش سے بولا۔

”آپ میرے دھرم کا اپمان نہیں کر سکتے۔“ گو بات سخت کہی لیکن لہجہ نرم تھا۔

”کچی بات سے وہی گھبراتا ہے جس کے من میں چور ہو۔ میں نے اگر کچی بات کہہ دی ہے تو اس پر یقین کرنے کی بجائے اس پر بحث کر رہے ہو؟ اتنی عقل بھی نہیں ہے کہ میری بات کو سمجھو اور اس پر غور کرو۔ ایک ذرا سی بات تم نہیں سمجھ سکے اور تجھے خود پر غرور ہے کہ جیسے کوئی بھی اس دھرتی پر تم جیسا نہیں؟“ یہ کہتے ہوئے اس شخص نے ٹھاکر کی طرف غور سے دیکھا۔ تو ٹھاکر نے بڑے مان سے کہا۔

”یہ دھرم باتیں ہیں، ان پر بحث، سوچنا اور سمجھنا کیسا؟ پرکھوں کی کہی ہوئی باتیں کیا غلط ہو سکتی ہیں؟“

”اس کا مطلب ہے کہ تم اب بھی اڑے ہوئے ہو۔“ یہ کہہ کر اس شخص نے ٹھاکر کی طرف گہری نگاہ سے دیکھتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔

”جاؤ، تمہیں عقل سمجھ دینے والا اور یہی باتیں سمجھانے والا، تیری نسل سے پیدا ہوگا۔ پھر میں تم سے آ کر پوچھوں گا کہ بول، پرکھوں کی باتیں کیا ہوتی ہیں، تیرا خون تجھے بتائے گا کہ بے جان مورتی میں موت اور انسانی صورت میں زندگی پڑی ہے، جا۔“ ہر ادا ہوتے ہوئے لفظ کے ساتھ اس شخص کا غصہ بڑھتا گیا تھا۔ مگر ٹھاکر کو اس کا غصہ یاد ہی نہیں رہا۔ وہ تو ان لفظوں پر چونک کر رہ گیا تھا، جو اس نے ادا کر دیئے تھے۔ وہ انتہائی حیرت سے بڑبڑایا جیسے تصدیق کر رہا ہو۔

”میری نسل سے؟“

”ہاں، تیری نسل سے...... لیکن یہ یاد رکھ، تیرے غرور کا یہ حال رہا تو بہت پچھتاؤ گے۔“ اس نے سختی سے پھر تنبیہہ کی لیکن ٹھاکر جیسے کسی سحر میں جکڑا گیا تھا۔ وہ وہیں اڑا ہوا تھا۔ اس کے لہجے میں خوشگواریت اتر آئی تھی۔ وہ پھر سے سرسراتے ہوئے انداز میں بولا۔

”میری نسل سے؟“

”ہاں...... ہاں، تیری نسل سے، تجھ سے ایک صورت نے سامنے آنا ہے۔ یہ طے ہے اور لکھ دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں سے بہت کچھ ظاہر ہونے والا ہے لیکن من صورت

کا خیال، زندگی نہیں دے سکتا، جبکہ زندگی کو فقط زندگی ہی سمجھ سکتی ہے، اسے سمجھنے کی کوشش کرے گا تو ہی تو بچے گا، ورنہ نشان بھی مٹ جائے گا۔" اس شخص نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو ٹھاکر نے کچھ کہنے کے لیے اپنے لب کھولے مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے ٹھاکر کو روک دیا۔ اس شخص نے اپنے گرد لپٹی ہوئی سیاہ چادر ہٹائی تو اس کے دائیں کاندھے میں تیر اسی طرح پیوست تھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے وہ تیر کھینچ کر نکال لیا۔ ٹھاکر اپنی جگہ ٹھٹک گیا تھا۔ وہ شخص چند لمحے ٹھاکر کی جانب دیکھتا رہا پھر تیر اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس شخص کے کاندھے سے خون ابلنے لگا تھا۔ تیر خون آلود تھا۔ ٹھاکر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ تیر پکڑ لیا تو وہ شخص اٹھ کر چل دیا۔ ٹھاکر اسے آواز دینا چاہتا تھا، مگر گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے دل میں یہ شدت سے خواہش تھی کہ وہ اسے روک لے، اس سے باتیں کرے، اس سے معذرت کرلے۔ اس سے اپنی نسل کے وارث کے بارے میں باتیں پوچھے، لیکن وہ آواز دے ہی نہیں سکا۔ جبکہ وہ شخص چلتا ہوا اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یوں ہوا کہ جیسے زمین اسے نگل گئی یا آسمان اسے کھا گیا۔ ٹھاکر کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بت بنا کتنی ہی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ اس کے دماغ میں ایک ہی بات گونج رہی تھی جس میں نہ صرف اس کے لیے خوشخبری تھی بلکہ ایک طرح سے تنبیہ بھی تھی۔

"جاؤ، تمہیں عقل سمجھ دینے والا اور یہ باتیں سمجھانے والا، تیری نسل سے پیدا ہوگا۔ پھر میں تم سے آ کر پوچھوں گا کہ بول، پرکھوں کی باتیں کیا ہوتی ہیں، تیرا خون تجھے بتائے گا کہ بے جان مورتی میں موت اور انسانی صورت میں زندگی پڑی ہے۔"

ٹھاکر دیال رائے کو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ اسی پر بیت رہا ہے۔ کیا یہ حقیقت ہے یا کہ وہ سپنا دیکھ رہا ہے۔ کیا یہ خوشخبری اس کے عوض میں ملی تھی کہ وہ اپنا غرور توڑ دے۔ یا اس کے بھاگیہ میں کچھ اور ہی تھا، یا اس کا بھگوان اس سے کچھ دوسرا چاہتا تھا۔ پہلی بار بھگوان کے نام پر اس کا دل نہیں جما تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا خون آلود تیر اسے اس کی حقیقت سے آگاہی دے رہا تھا۔ یہ سپنا نہیں ہوسکتا تھا۔ دن کے ایک ہی پہر میں اتنا کچھ ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

"چلیں مالک!"

بھانو کی آواز پر وہ بری طرح چونک گیا۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ چند قدم کے فاصلے پر رام گڑھ کے لوگ اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یا شاید یہ سارا واقعہ انہوں نے بھی دیکھا ہوگا۔ وہ بھی اس کے گواہ ٹھہر گئے تھے۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا تیر ساری کہانی بیان کر رہا تھا۔ وہ کبھی اس تیر کو دیکھتا اور کبھی لوگوں کو۔ تبھی بھانو نے آگے بڑھ کر وہ تیر اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اپنے گھوڑے تک آیا اور اس پر سوار ہو کر چل دیا۔ تبھی قافلہ بھی اس کے ساتھ بڑھا۔ ٹھاکر دیال رائے کو محسوس ہونے لگا کہ اس کے غرور پر پہلی ضرب نہیں پڑی۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔

☆ ... ☆ ... ☆

جمال اور جسپال، دونوں یوں کھڑے تھے، جیسے بت بن گئے ہوں۔ ایک کے بعد ایک منظر بدلتا جا رہا تھا۔ اس وقت ان کے سامنے رام گڑھ کی وہ حویلی تھی، جس میں ٹھاکر دیال رائے رہتا تھا۔ وہ اس منظر میں کھو گئے۔

☆ ... ☆ ... ☆

وہ حویلی میں موجود اپنی خواب گاہ میں بڑے کروفر سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سے اس شخص کا چہرہ ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم اور غیر معمولی واقعہ تھا۔ جس سے اس کا غرور و تکبر خاک میں مل گئے تھے، جو اس کی موت کے مترادف تھا۔ راجپوتوں میں یہ روایت رہی تھی کہ اگر وہ میدان میں ہار جاتے تو پیٹھ دکھانے کی بجائے مرجانے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس شخص نے تو اسے ایسی موت دے دی تھی، جو لمحہ بہ لمحہ مرجانے کا احساس دے رہی تھی۔ اس کے اندر

کوئی پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ ناجائز طریقے سے وہی جیتا کرتا ہے، جس کے بدلے پڑی مٹی ناجائز ہوا کرتی ہے۔ جیت ہار تو کھیل کا حصہ ہوا کرتی ہے۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اسے ذاتی انا کا مسئلہ بنا لیا جاتا ہے۔ یا پھر ناجائز مٹی سے بنے جسموں کی فطرت ہی یہی ہوا کرتی ہے کہ وہ اپنی قوت کے اظہار کا یہی طریقہ اپناتے ہیں۔ اس وقت جبکہ وہ میدان میں تھا اور اس نے بڑے ظالمانہ انداز میں نووارد کے بارے میں موت کی خواہش کی تھی۔ وہی لمحہ اس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا، جس کی اذیت وہ اب محسوس کر رہا تھا۔ وہ ایک خطرناک سانپ کی مانند ہو رہا تھا، جس کا زہر نکال دیا جائے۔ مجروح انا اور احساس شرمندگی کے ساتھ اس کا سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ انسان تھا، شاید اس لیے ایسا سوچ رہا تھا ورنہ ناجائز مٹی سے بنے ایسے جذبات کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس شخص نے ٹھاکر دیال رائے کو ایک ایسی امید دی تھی، جس سے وہ دنیوں ہو چکا تھا۔ اس کی یہ بات تو اس کے ذہن سے نکل ہی نہیں رہی تھی کہ "جاؤ، تمہیں عقل سمجھ دینے والا اور یہی باتیں سمجھانے والا، تیری نسل سے پیدا ہوگا۔ پھر میں تم سے آ کر پوچھوں گا کہ بول، پرکھوں کی باتیں کیا ہوتی ہیں، تیرا خون تجھے بتائے گا کہ بے جان مورتی میں موت اور انسانی صورت میں زندگی پڑی ہے، جا" وہ جس قدر اس بات پر سوچتا اسی قدر اسے اس کی دوسری باتوں پر یقین آتا جا رہا تھا۔ اگرچہ اسے اپنے دھرم کے انوسار چوکے ہی دے رہی تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی مزید سوال بھی ابھر رہے تھے۔ اس شخص کی یہ بات کہ "پھر بھی   پھر بھی تمہیں اتنا غرور ہے؟ کیا ایک عظیم طاقت کا احساس رکھنے والا اپنے بارے میں نہیں سوچتا کہ وہ خود کیا ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ مٹی پتھر کی بنی ہوئی بے جان مورتیاں کسی کو اولاد دینے کی سکت رکھتی ہیں۔ بے جان تو سراپا موت ہے۔ اس میں زندگی کہاں اور تم اس میں زندگی تلاش کر رہے ہو؟" اسے تکلیف تو دے رہی تھیں لیکن وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ دوسرا کون ہے جو اولاد دیتا ہے؟ میں اگر اپنے دھرم کے انوسار انہی دیوی دیوتاؤں کو اولاد دینے والا سمجھتا ہوں تو پھر میں بے اولاد کیوں ہوں؟ جن سے میں نے اولاد مانگی کیا وہ اس قدر بے بس ہیں کہ میری نسل کا وارث مجھے نہیں دے سکتے ہیں؟ میری بیوی دیپیکا کی گود نہیں بھر سکتے ہیں؟ جبکہ وہ تو دیوانوں کی مانند پرارتھنا کرتی ہے۔ ہم نے ہر طرح کی بھینٹ دی ہے، کیا کسی دیوی دیوتا نے پچھلی سویکار نہیں کیا؟ آخر کیوں؟ کیا کمی کوتاہی ہے؟ کیا میرے بھاگیہ میں ایسا لکھ دیا گیا ہے، اگر ایسا لکھ دیا گیا ہے تو کس دیوی یا دیوتا نے لکھا ہے، کیا میں اس لیے بے اولاد ہوں کہ جس نے لکھا اسے میں نہیں جانتا ہوں؟ سوالوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

یہ سوچ کہیں رک جاتی تو ایک نیا سلسلہ دراز ہو جاتا کہ وہ شخص کیسی شکتی رکھتا تھا؟ کبھی وہ سارے منظر اس کی نگاہ میں گھوم جاتے۔ اس کی تلوار بازی کے جوہر ایک ہی وار میں ڈھال کر دو ٹکڑے کر دینا، اس کے چہرے کا جلال، میدان میں جوان رعنا اور راستے میں بوڑھا مگر چہرہ اتنا ہی پرکشش، دمکتا ہوا جیسے ماہتاب اور اس وقت تو وہ کانپ کر رہ گیا تھا جب اس نے تیر نکال کر اسے تھما دیا تھا۔ اس کی ہمت نہیں پڑ گئی تھی کہ اسے روک سکے۔ اتنی شخصیتوں کا رعب تھا کہ وہ اس شخص کی بات پر اس کا ذہن اور دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ کسی بھی زیرک اور عقل مند شخص کے لیے کسی بھی قسم کا ابہام بے چینی کا باعث سکون نہیں ہوتا۔ اس کے دماغ پر وہی شخص حاوی تھا اور بے چینی تھی کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھی۔

وہ انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ اس کی پتنی دیپیکا اس کے پاس آ گئی۔ اور بڑی محبت سے اس کے پاس بیٹھ کر بولی۔

"ایک بات پوچھوں ناتھ؟"

"ہاں پوچھو۔" اس نے ہنکارا بھرنے والے انداز میں کہا۔ ٹھاکر دیال رائے کی سنجیدگی کم ہی نہیں ہو پائی تھی۔

"میلہ ختم ہوئے کئی دن ہو گئے ہیں۔ میں نے دیکھا

ہے کہ جب سے آپ واپس آئے ہیں آپ کو چپ لگ گئی ہے۔ نہ ہنستے ہیں اور نہ ہی بات کرتے ہیں۔ بس ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے ناتھ؟" جیوتیکا نے بہت مان اور محبت سے پوچھا تو ٹھاکر دیال رائے نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔

"ہاں جیوتیکا، ایک ایسا انہونا واقعہ ہوا ہے کہ جسے میں چاہتے ہوئے بھی اپنے دماغ سے نہیں نکال پا رہا ہوں۔"

"ایسا کیا ہو گیا ہے ناتھ؟" گھبرائے ہوئے انداز میں بولی تو ٹھاکر نے اس کی طرف دیکھا پھر چند لمحوں تک یونہی دیکھتا رہا۔ جیسے وہ اس کی بات کا جواب دینا چاہ رہا ہو لیکن اسے لفظ نہیں مل رہے ہوں۔ تب جیوتیکا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے اپنی بات دہرائی تو جیسے اسے ہوش آ گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ ساری بات سنا دی۔ پھر اپنی خواب گاہ کی دیوار پر سجائے اس تیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ وہی تیر ہے جیوتیکا! وہ شخص میرے دماغ سے نہیں نکل رہا ہے۔ ایک طرف اس نے مجھے موت دے دی۔ میرا غرور، میرا تکبر، میری تمکنت اور میری شان اس نے اپنے پاؤں تلے مسل دی اور یہی ایک راجپوت کی موت ہوتی ہے۔ مجھے وہیں خودکشی کر لینی چاہیے تھی لیکن اسی زبان سے اس نے مجھے جیون بھی دان کر دیا ہے۔ اس پر مجھے غصہ بھی بہت آ رہا ہے اور اس کی بات پر یقین کر لینے کو دل بھی چاہتا ہے۔ لیکن"

"لیکن کیا ناتھ؟" جیوتیکا تیزی سے بولی۔

"میں ڈرتا ہوں۔" وہ شرمندہ لہجے میں بولا۔

"آپ ناتھ..... آپ ڈرتے ہیں۔ مگر کس سے؟" اس نے حیران کن لہجے میں پوچھا۔

"اپنے آپ سے..... اپنے بھاگیہ سے اور....." وہ یوں بولا جیسے اپنے آپ سے لرز گیا ہو۔ تو وہ بھی ڈولتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے ناتھ، بھگوان کی سوگند، میں مر جاؤں گی اگر آپ نے اپنی بات مجھ سے نہ کہی۔ کیوں ڈرتے ہیں آپ؟ کیا ہو گیا ہے؟ آپ تو بھگوان سے بھی لڑنے کی جرات رکھتے ہیں۔ تو پھر بھی؟"

"تم غلط نہیں ہو جیوتیکا! لیکن یہ سوچ، میرے غرور کو مٹی میں ملا دینے والا، مجھے میری نسل کے وارث کا اعلان بھی کر رہا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ سب ہوا کیوں؟" اس کا لہجہ دل دہلا دینے والا تھا جیسے کوئی مرتے ہوئے زندگی کی بھیک چاہ رہا ہو۔

"آپ" اس نے کہنا چاہا مگر ٹھاکر دیال رائے نے اس کی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"اس برس گرمیوں میں مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی تھی۔ رام گڑھ میں ایک ہی گھر مسلمانوں کا تھا۔ اور اس کے پریوار میں صرف تین لوگ تھے۔"

"ہاں میں جانتی ہوں۔ وہ کسان تھا اور ان گرمیوں میں ان کی فصل کو آگ....." یہ کہتے ہوئے جیوتیکا بری طرح چونک گئی۔ اور پھر حیران کن نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تو وہ یاس بھرے لہجے میں بولا۔

"وہ آگ میں نے لگوائی تھی۔"

"کیوں ناتھ، کیوں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"تاکہ وہ ایک ایک دانے کو محتاج ہو جائے۔ وہ میرے پاس آ کر گڑگڑائے، مجھ سے بھیک مانگے یا پھر یہاں سے چلا جائے۔" وہ حسرت سے بولا۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا ناتھ؟" اس نے پوچھا۔

"وہ رام گڑھ میں ایک ہی پریوار تھا۔ میں چاہتا تو ان تینوں کو رات کے اندھیرے میں قتل کر دیتا، یا پھر انہیں یہاں سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیتا۔ مگر اس طرح بات پورے علاقے میں پھیل جاتی۔ میں جانتا ہوں کہ علاقے میں اتنے سے مسلمان ہیں جو سب مل کر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔ میں نے ایسا کرنے کے لیے عقل کا استعمال کیا۔ میں نے اس کے کھیتوں کو آگ اس لیے لگوائی تھی کہ وہ دانے دانے کو محتاج ہو کر میرے پاس آئے اور میں اس کی زمین منہ مانگے دام دے کر خرید لوں

اور اسے یہاں سے چلے جانے پر مجبور کردوں۔"

"لیکن ایسا ہوا نہیں ناتھ۔ وہ پریوار تو اب بھی رام گڑھ میں موجود ہے۔ وہ آپ سے مدد مانگنے بھی نہیں آیا۔" جیوتیکا نے تیزی سے کہا۔

"ہاں ایسے ہی ہوا ہے۔ معلوم نہیں وہ اپنا جیون کیسے گزار رہے ہیں۔ وہ میرے پاس ہی نہیں کسی کے پاس بھی مدد مانگنے نہیں گئے۔ میں نے سوچا تھا کہ میں میلے سے آنے کے بعد اسے خود بلاؤں گا اور اسے یہاں سے چلے جانے پر مجبور کردوں گا۔" ٹھاکر نے حسرت سے کہا۔

"آخر کیا بگاڑا ہے انہوں نے، جو آپ نے انہیں یہاں نہیں رہنے دینا چاہ رہے ہیں۔ وہ تو کسی سے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں رکھتے، یہ تو دو برس پہلے یہاں آئے ہیں ان کا اتنا اثر کیسے ہو سکتا ہے؟" جیوتیکا نے پوچھا۔

"یہ معاملہ دھرم کا بھی ہے جیوتیکا! پنڈت چرن جی لعل نے مجھ سے کہا کہ یہ مسلمان ملیچھ ہوتے ہیں۔ شودروں کی مانند، انہی کا نحوس سایہ اس علاقے پر پڑ گیا ہے کہ انہی دو برسوں میں نہ بارشیں ہوئی ہیں اور نہ فصلیں اچھی ہوئی ہیں اور یہ علاقے میں انہی مسلوں کی نحوست ہے کہ میرے ہاں وارث پیدا نہیں ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر وہ لحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور پھر کہتا چلا گیا۔ "کیا کروں جیوتیکا، جب میں تیری طرف دیکھتا ہوں، اتنے سال کی رفاقت...... اپنی وراثت اور ایک بیٹے کی خواہش، مجھے پاگل کردیتی ہے۔ تم ہی بتاؤ، ہم نے کیا کچھ نہیں کیا۔ کس مندر میں نہیں گئے، کہاں کہاں ماتھا نہیں ٹیکا، یہاں تک کہ کمبھ کے میلے میں بھی گئے، کتنے سادھو سنتوں سے پرارتھنا کروا کے دیکھ لی، کتنے پیڑوں پر تم نے سوت نہیں باندھا، گاؤ ماتا کی پرارتھنا تم اب بھی کرتی ہو، یہاں مندر بنوایا، کیا ہم نہیں جانتے کہ ہم میں ایک بیٹے کی خواہش کتنی شدید ہے۔ کیا ہم نہیں چاہتے کہ بھگوان ہم پر دیا کرے۔" ٹھاکر کے لہجے میں مایوسی گھلی ہوئی تھی۔

"چاہتے ہیں، کیوں نہیں چاہتے۔ اگر پنڈت جی نے کہا ہوگا تو ٹھیک ہی کہا ہوگا۔ انہیں یہاں سے نکال دیں، ان کا جو نقصان ہوا، اس سے زیادہ انہیں دے دیں۔ آپ دوشی نہ ہوں۔ شاید بھگوان ہماری کٹھنائی اس طرح دور کردے۔" وہ بھی اس کی ہمنوا بن گئی۔ ٹھاکر خاموش رہا تھا تو وہ بولی، "آپ میری بات مان لیں ناتھ۔"

"نہیں شاید میں مسلے پریوار کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کرپاؤں گا۔" اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"مجھے لگتا ہے جیوتیکا، جیسے اس مسلے پریوار کو ستانا ہی میرا دوش ہے۔ پنڈت نے جو کہا اس کا الٹ ہو رہا ہے۔ اس بندے کی شکتی میں اپنے آنکھوں سے دیکھی ہے۔ وہ کوئی سپنا نہیں، حقیقت تھی، اگر اب بھی میں نے آنکھیں بند رکھیں تو پتہ نہیں کیا ہو جائے گا۔"

"کیا ایسا کرکے دھرم بھرشٹ نہیں ہوگا؟" جیوتیکا نے حیرت سے لرزتے ہوئے کہا۔

"کیا دھرم اور کیا ادھرم، یہ تو کچھ اور ہی دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے بھاگیہ میں کیا ہے، ہم کیا جانیں۔" ٹھاکر نے کھوئے ہوئے لہجے میں سامنے ٹنگے ہوئے تیر کی طرف دیکھ کر کہا تو جیوتیکا نے اپنا سر جھکا لیا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد بولی۔

"تو کیا کریں گے آپ؟"

"ہمیں اس مسلے پریوار سے شما مانگنی ہوگی۔" ٹھاکر نے کہا تو جیوتیکا کو یوں لگا جیسے ساری راجپوتی ناک مٹی کا ڈھیر ہوگئی ہے۔ اس کے من میں بھی ایک طوفان اٹھا اور پھر لمحوں میں وہاں شانتی آگئی۔ اس نے یوں کہا جیسے اپنی موت مرتے ہوئے زندگی چاہ رہی ہو۔

"اگر یہ راز ہی رہے تو......؟" اس نے کہا تو ٹھاکر نے آہستگی سے سر کو ہلا دیا۔ جیوتیکا نے محسوس کیا کہ ٹھاکر نے یہ فیصلہ کرلیا ہے تو اس کے چہرے پر امید کے چراغ روشن ہوگئے ہیں۔

☆......☆......☆

وہ سہانی شام بڑی دلکش تھی۔ مغربی افق پر جھکتا ہوا سورج اپنی طلائی کرنیں زمین پر نچھاور کررہا تھا۔ گھر سے

نیلے آسمان پر تیرتے ہوئے سفید بادل بسنتی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ذرا دیر پہلے ساکت ہوجانے والی ہوا، یوں چل رہی تھی جیسے وہ غبار آلود ہو۔ موسم بہار کے شروع میں جو بارشیں ہوئی تھیں، انہوں نے رام گڑھ کے اس صحرائی علاقے کی فضا کو شفاف بنا دیا ہوا تھا۔ یوں پورے ماحول میں مست کر دینے والی سوندھی سوندھی مہک رچی ہوئی تھی۔ لہلہاتی فصلوں سے لے کر درختوں تک کے رنگ نکھرے ہوئے تھے۔ ایسی خوشگوار شام میں ٹھاکر دیال رائے اپنی شاہانہ بگھی میں سوار اپنی حویلی واپس آ رہا تھا۔ وہ میلے کی تیاریاں دیکھ کر واپس آ رہا تھا۔ وہ اس سہانی شام سے ضرور لطف اندوز ہوتا مگر اس کا دھیان اسے غافل کیے ہوئے تھا۔

میلے پر جانے کے لیے رام گڑھ کے لوگوں میں وہی جوش اور جذبہ تھا، جو ہمیشہ ہوتا تھا۔ اگلی صبح سورج نکلتے ہی انہیں میلے میں جانے کے لیے رام گڑھ سے نکلنا تھا۔ اسی میدان کی جانب کوچ کرنا تھا، جس میں اس کی راجپوتی انا کو کچل دیا گیا تھا۔ میلے کی ہمیشہ کی طرح بھرپور تیاری بھی اس کے من میں تازگی نہیں بھر سکی تھی۔ سارے جذبے ماند تھے۔ سفید گھوڑوں کی بگھی اپنے راستوں پر چلی جا رہی تھی۔ بھانو بگھی چلا رہا تھا۔ وہ بھی اپنے مالک کی کیفیت سے آشنا تھا، سو وہ خاموش تھا۔ صرف پرندوں کے اپنے گھونسلوں میں جانے کا شور تھا یا بگھی کا، یہاں تک کہ وہ حویلی جا پہنچے۔

ٹھاکر دیال رائے ڈانواں ڈول کیفیت میں بگھی سے اترا اور حویلی کے اندر چلا گیا۔ اسے احساس ہوا کہ حویلی میں سناٹا ہے۔ ہر طرف اور ہر وقت رہنے والی چہل پہل محسوس نہ ہوئی تو وہ چونک گیا۔ کیونکہ اسے پوری طرح احساس تھا کہ آج ضرور کچھ ہوگا۔ اسی لیے اسے سب سے پہلے اپنی پتنی جیوتیکا کا خیال آیا۔ وہ امید سے تھی اور یہی وہ دن تھے جب اس کی نسل کا وارث اس دنیا میں آنے والا تھا۔ وہ کون سا دن ہو سکتا تھا، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ بس ٹھاکر دیال رائے کو قوی امید تھی کہ یہ چمتکار اسی دن ہوگا جب اسے میدان میں جانا ہوگا، ورنہ یہ سب کچھ غلط ہو جاتا۔ وہ ایک دم سے مضطرب ہو گیا۔ اس کے قدم تیزی سے زنان خانے کی جانب اٹھ گئے۔

جہازی پلنگ، سفید ریشمی بستر پر دراز جیوتیکا کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے چہرے پر کرب پھیلا ہوا تھا۔ وہ درد کی اس کیفیت سے گزر رہی تھی، جس کے نتیجے میں کسی بھی عورت کو ماں جیسا اعلیٰ مقام مل جاتا ہے۔۔۔ جیوتیکا کراہ رہی تھی۔ پاس کھڑی دائی جنداں اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے اسے مسلسل حوصلہ دے رہی تھی۔ ٹھاکر پر نگاہ پڑتے ہی اس نے دھیرے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ جس پر جیوتیکا نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی خاص ملازمائیں بھی رکمنی اور کانتا بھی دائی جنداں کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ سترہ برس کی ناامیدی والی زندگی کے بعد جو چمتکار اس نے دیکھا تھا اور جس کی وجہ سے یہ دن اس کی زندگی میں آیا تھا۔ اس کی اہمیت کو وہ پوری طرح سمجھ گیا تھا۔ میلے پر جانے کے دن ہی اس کی پتنی ایسی کیفیت میں آ گئی تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جا تھا۔ بظاہر وہ آزاد تھا، جا بھی سکتا تھا، اسے روکنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ ان دیکھی زنجیریں اسے باندھ چکی ہیں۔ اس کا یقین پختہ ہو گیا۔ مرضی اسی شخص ہی کی چلنی ہے، جس نے اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ اس نے جیوتیکا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ سسکتے ہوئے بولی۔

”ناتھ“

اس ایک لفظ میں نجانے کتنی امیدیں، خواہشیں، خوف، آرزوئیں، اور تشنگی گھلی ہوئی تھی۔ ٹھاکر اس لہجے کا احساس کر کے پورے شریر سے کانپ گیا۔ تبھی اس نے کہا۔

”دھیرج رکھو جیوتیکا بھگوان تم پر بڑی دیا کرنے والا ہے۔“

”پرنتو مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ میرا جیون ہی میرا ساتھ چھوڑ رہا ہے، ناتھ۔“ اس نے سسکتے ہوئے یوں کہا

جیسے وہ کرب کی انتہاؤں کو چھو رہی ہو۔

"نہیں، ایسا نہیں ہوگا، وشواس رکھو۔" اس نے حوصلہ دیا تو وہ بولی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بھگوان مجھ پر اتنی دیا کرے گا۔ آپ کو تو پتہ ہے نا کہ ہم نے ان سترہ برسوں میں کتنا اذیت ناک وقت گزارا ہے۔ اور..." شاید وہ مزید کہتی لیکن درد کی لہر نے اسے مزید کچھ بولنے نہ دیا۔ دائی چنداں فوراً ہی وہاں آگئی۔ اس کے پیچھے ہی رکمنی اور کانتا بھی۔ ٹھاکر نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ کتنا نازک وقت ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ جس شے کی بھی ضرورت ہو حاضر کی جائے، کسی نے بھی غفلت کی تو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔" یہ کہہ کر اس نے کانتا سے پوچھا۔

"حویلی میں اتنا سناٹا کیوں ہے؟"

"مالکن نے حکم دیا ہے کہ اس گھڑی کسی کا سایہ نہ پڑ جائے اس لیے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنی خواب گاہ کی طرف چل دیا۔

اس کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اس کی سوچوں نے اسے خود سے بے گانہ کر دیا تھا۔ جس طرح خود ٹھاکر نے اس شخص کو دیکھا تھا، اسی طرح دوسرے لوگوں نے بھی دیکھا تھا۔ ان کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ ٹھاکر ہی نے اس شخص سے بات کی تھی اور وہ تیر کی صورت میں ایک حقیقت اس کے ہاتھ میں تھما کر چلا گیا تھا۔ اس شخص کے اپنے لہو میں ڈوبا ہوا تیر جو اب اس کی خواب گاہ میں سج چکا تھا۔ اس نے اپنی فتح اور شکست کی بات نہیں کی تھی۔ ٹھاکر کو احساس ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ آج یقین ہو گیا۔ تذبذب بھرے لوگوں نے جو دیکھا وہ چھپا نہیں رہ سکا۔ حقیقت عیاں تھی۔ دھیرے دھیرے یہ بات پھیلنے لگی کہ وہ شخص کوئی اوتار تھا، بھگوان کا کوئی روپ تھا۔ افواہوں نے اسے نجانے کیا سے کیا بنا دیا۔ جس محفل میں بھی ذکر کیا گیا اسے ماورائے مخلوق ہی گردانا گیا۔ ٹھاکر نے ایک دن پنڈت چندن جی لعل سے پوچھا تھا۔

"پنڈت جی یہ بتاؤ کیا ایسی کوئی مخلوق ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں ٹھاکر جی، آتما کے کئی روپ ہوتے ہیں، اوش جو چاہے سو کر سکتی ہے۔ میرے انوسار وہ کوئی بھٹکی ہوئی آتما تھی جو آپ کے ارادے نشٹ کرنے آئی تھی۔ اس کا اپائے بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" ٹھاکر نے پوچھا تو پنڈت آتما، بھوت، پوجا اور بھگوان سے باہر نہیں آ سکا۔ وہ تو بس یہ جان گیا تھا کہ جس دن اس نے اس مسلمان خاندان سے معافی مانگی تھی، اس سے اگلے ہی دن اس کی حویلی میں سبزہ آگیا تھا۔ دیوحیکا کی گود ہری ہوئی تھی۔ تبھی اس کے ذہن میں تھا کہ میرا غرور کدھر گیا؟ جس دن اس نے خود کو بے بس مخلوق مانا اس پر سبزہ آگیا۔ اب اسے یقین آگیا تھا۔ اس کی اپنی موت ہی اسے زندگی بخش رہی ہے۔ لاشعوری طور پر اس کی نگاہ دیوار پر ٹنگے تیر پر پڑی۔ اس کی سوچ کا دھارا ہی بدل کر رہ گیا تھا۔ وہ اسی شخص پر یقین کر چکا تھا۔ موت میں کہیں زندگی میں زندگی چھپی ہوئی ہے۔ یہ زندگی کیا ہے؟ وہی سمجھتا ہے جو زندہ ہے۔

ٹھاکر انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اس کا دروازہ یوں بجا جیسے کوئی دیوانہ دستک دے رہا ہو۔ وہ باہر گیا تو رکمنی اپنی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے کھڑی تھی، اسے دیکھتے ہی بولی۔

"بدھائی ہو مالک بھگوان نے آپ کو پتر دیا ہے۔"

"بھگوان نے نہیں....." بے ساختہ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنے بھی سونے کے سکے اس کے ہاتھ میں آئے اسے دے دیے اور دیوحیکا کی خواب گاہ کی جانب چل دیا۔

دیوحیکا کے چہرے پر خوشیوں کے گلاب کھلے ہوئے تھے۔ ماتا کا روپ ہی تقدس بھرا ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ دیر پہلے موت و حیات والی کیفیت میں جھولتی تھی۔ اب سکون سے آنکھیں موندے پڑی تھی۔ اس کے پہلو میں نوزائیدہ بچہ پڑا تھا۔ دائی چنداں نے اسے اٹھایا اور ٹھاکر کی گود میں

دے دیا۔ اس کالس پاتے ہی ٹھاکر جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا۔ نجانے سے کہاں سے فخر اس میں آ گیا تھا، ایک باپ بن جانے کا فخر جو غرور سے کہیں لذت آمیز تھا۔ اسے بھی احساس ہوا کہ وہ بھی اپنی نسل دے پایا ہے۔ ایک زندگی سے نئی زندگی۔ اس کا اپنا کوئی گمشدہ حصہ۔ گلابی رنگت، کھڑے تیکھے نقش، گول مٹول سا ایک عام سا بچہ جس نے انہیں یہ مقام دے دیا تھا۔ وہ یقیناً اس کے ہاتھوں میں تھا، جو اس شخص نے اسے دیا تھا۔

سورج نکلنے سے پہلے تک رام گڑھ کے لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ٹھاکر دیال رائے کا وارث پیدا ہو چکا ہے۔ رام گڑھ پر ابھی اندھیرا چھایا ہوا تھا، مگر حویلی پوری طرح روشن تھی۔ خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ جس میں مندر کی بجنے والی گھنٹیاں زوردار آواز میں گھل مل گئی تھیں۔ بلاشبہ پنڈت چرن جی لعل کو معلوم ہو گیا تھا کہ حویلی کا وارث آ گیا ہے۔ جس طرح یہ اطلاع رام گڑھ میں پھیلی ہر بندہ اپنی وفاداری جتانے حویلی کی جانب لپکا۔ ہر چہرے پر خوشی تھی۔ ٹھاکر کے مردان خانے میں بدھائی دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ حلوائیوں نے بھی وہیں آ کر ڈیرہ جما لیا۔ اندھیرا چھٹنے لگا اور سورج طلوع ہونے کی سنہری روشنی شرقی افق پر پھیل گئی۔

"ٹھاکر جی! میلے پر جانے کا فیصلہ کیا ہے؟" رام گڑھ کے باسی نے ٹھاکر سے سوال کیا تو وہاں موجود ہر بندے کی نگاہ ٹھاکر پر جم کر رہ گئی۔ تب اس نے بڑے تحمل سے جواب کہا۔

"ایسے موقع پر جبکہ میری نسل کا وارث اس دنیا میں آیا ہے، تو کیا مجھے اپنی خوشیاں چھوڑ کر میلے پر چلے جانا چاہئے؟"

"نہیں ایسا تو نہیں ہونا چاہئے۔" کئی لوگوں نے ہم نوا ہو کر کہا تو وہ بولا۔

"تو پھر سنو، میں نے ایک فیصلہ کیا ہے، مجھے پر بیتا ایسے وقت میں ہوئی جب میں میلے سے آ رہا تھا اور ابھی میلے ہی کا سمے ہے۔ ترنت معمولی بات نہیں ہے۔ اس لیے اب میں کبھی میلے پر نہیں جاؤں گا اور نہ کسی مقابلے میں حصہ لوں گا۔ رام گڑھ کی پرجا اپنے طور پر جانا چاہے، مقابلوں میں حصہ لینا چاہے تو میں انہیں روکوں گا۔ یہ ان کا حق ہے۔"

"ٹھاکر جی! یہ کیسا فیصلہ ہے۔ یہ مقابلے ہمارے لیے کسی یدھ سے کم نہیں ہیں۔ اس طرح تو رام گڑھ والوں کی ناک کٹ کر رہ جائے گی۔" ایک جذباتی نوجوان نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تو اس نے تحمل سے جواب دیا۔

"مجھے یہ احساس ہے وہ چلا جائے۔ رہا ناک کٹنے کا مسئلہ، تو ایسی کوئی بات نہیں ہے، بہت ہو چکا۔ اب دوسروں کو موقع ملنا چاہئے۔" ٹھاکر کو یہ لفظ کہتے ہوئے خود ان کے کھوکھلے پن کا احساس ہو گیا تھا۔

"پھر بھی ٹھاکر جی! آپ رام گڑھ کے لوگوں سے خود کو جدا نہیں رکھ سکتے ہیں۔" ایک بزرگ بندے نے کہا تو وہ بولا۔

"میں کب ان سے الگ ہوں۔ میں نے خود بھی نہ جانے کا فیصلہ کیا ہے، پرجا کو تو نہیں روکا۔ میں شہ زوروں کی سرپرستی اسی طرح کرتا رہوں گا۔ میں آپ لوگوں سے الگ نہیں ہوں۔ اب بھی تم لوگ جو فیصلہ کرو گے میں اس کے مطابق ہی کروں گا۔" اس نے تیزی سے کہا تو ایک بزرگ نے کہا۔

"نہیں، یہ ایسا وقت نہیں ہے۔ آپ نہ جاؤ، لیکن وہاں پر مقابلے کے لیے لوگ ضرور بھیجو، آپ آخری دن آ جانا۔ یہ ہماری انا کا مسئلہ ہے۔"

"تو ٹھیک ہے جیسا آپ لوگ چاہو۔" ٹھاکر نے کہا اور پھر اس موضوع سے توجہ ہٹاتے ہوئے بولا۔

"رام گڑھ اور ارد گرد کی بستیوں میں یہ اعلان کروا دو کہ ہر کوئی تینوں وقت کا تین دن تک بھوجن حویلی میں کرے۔ ہر خاص و عام، ہر مذہب اور ہر ذات کا فرد اس دعوت میں آ سکتا ہے۔"

یوں سورج نکلنے کے ساتھ ہی روشنی پھیلتی چلی گئی۔ میلے پر نہ جانے اور حویلی میں ہونے والی دعوت کے

بارے میں اطلاع ہر جانب پھیل گئی۔

دوپہر ہونے والی تھی۔ حویلی میں جشن کا سماں تھا۔ اتنی بڑی دعوت کے لیے بہت سارے لوگ موجود تھے۔ دالان سے لیکر باہر باغیچوں تک قالین بچھا دیے گئے تھے۔ لوگ آ کر ان پہ بیٹھتے جا رہے تھے۔ مگر سب ایک جگہ نہیں بیٹھ رہے تھے۔ ہندو اپنی ذات پات کے انوسار مختلف ٹولیوں میں بیٹھے تھے۔ اور باقی مذاہب کے لوگ اپنے اپنے لوگوں میں۔ ایک ہی نگاہ میں دیکھا جا سکتا تھا کہ لوگ مذاہب کی بنیاد پر تقسیم ہو کر بیٹھے ہوئے ہیں۔

حویلی کے بڑے دالان میں علاقے بھر سے آئے ہوئے معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو وہ سب ٹھاکر رام دیال رائے کو بدھائی یا مبارک باد دینے آئے تھے۔ دوسرا وہاں پر اس علاقے کا مہا پنڈت بھگوان داس آیا ہوا تھا۔ وہ سب اس کی عزت کرتے تھے۔ ان سب کے دماغ میں یہی تھا کہ یہ کام نپٹا کر ہی میلے میں جایا جائے۔ اسی لیے وہاں پر سب موجود تھے۔ مہا پنڈت بھگوان داس پوری توجہ سے پوجا میں مصروف تھا۔ بھگوان داس کے ساتھ کئی چیلے تھے۔ پنڈت چرن جی لعل بھی اس کا چیلا تھا۔ وہ سب اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے۔ سبھی نے پیلے رنگ کی دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ اوپری ننگے بدن پر جینیو اور پیلے رنگ کی چادر اوڑھی ہوئی تھی، جس پر سنسکرت میں لفظ کڑھے ہوئے تھے۔ بھگوان داس کی طرح سب کا سر منڈھا ہوا تھا اور چہرے پر کوئی بال نہیں تھا۔ بھگوان داس ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے سامنے آگ روشن تھی۔ جس کے آس پاس پھل، میوے اور دوسری کھانے پینے کی اشیا دھری ہوئی تھیں۔ وہ زور زور سے اشلوک پڑھتا جا رہا تھا۔ گاہے بگاہے آگ میں گھی ڈالتا جا رہا تھا۔ وہ نومولود کے لیے پوجا کر رہے تھے۔ معززین کی نگاہیں ان پنڈتوں پر تھیں جو پراتھنا کا سا انداز اپنائے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے پوجا ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ جس کے ساتھ ہی دعوت عام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس پوجا کا ایک حصہ رہتا تھا۔ جس کے مطابق مہا پنڈت نے نومولود کی جنم کنڈلی بنانے اور اس کے مطابق اس کا شبھ نام بھی رکھنا تھا۔

ہندو معاشرہ کوئی باقاعدہ مذہب یا مربوط نظام نہیں ہے، جس میں انسانیت کی فلاح ہی مقدم ہو۔ بلکہ اس کی ایک تاریخ ہے کہ آریان نے مقامی مفتوح لوگوں اور اپنی قوم کو جکڑ کر رکھنے کے لیے رسومات کا سہارا لے کر ایک ایسا معاشرہ تخلیق کیا جس میں انسان کی انسان پر حکومت سے جبر کا نظام وجود میں آ گیا۔ جس کے تلے آج تک انسانیت سسک رہی ہے۔ آج کا ہندو معاشرہ اس کی گواہی خود پیش کرتا ہے، جو انسانی جبر کے بدترین دور سے گزر رہا ہے۔

ایسا اس لیے ہے کہ یہ کوئی الہامی مذہب نہیں بلکہ رسومات، توہمات اور چند ایسے نظریات کی بنیاد رکھتا ہے، جو وید بتاتے ہیں۔ اس بحث سے قطع نظر کہ وید الہامی ہیں یا نہیں، یہ طے ہے کہ ان ویدوں کا ظہور ان آریا لوگوں نے کیا جو یہاں کے مقامی باشندے نہیں تھے اور انہوں نے مقامی باشندوں کو غلام بنا کر جانوروں سے بھی زیادہ ذلیل کیا تھا، رسومات، توہمات اور چند نظریات کی بنیاد میں حالات وواقعات اور ماحول پرستی کی شدید ضرورت کے تحت، ہندو معاشرہ میں ان گنت افکار نے جنم لینا شروع کر دیا۔ جن میں "شکتی کی پوجا اور خوف کا نفوذ" شامل تھا۔ اس نظام نے انسان کو یوں جکڑ لیا جیسے آکٹوپس، جس نے وقت کے دریا میں زندگی کو جکڑ لیا۔ رسومات کی کوئی انتہا نہ رہی اور بڑھتے ہوئے توہمات نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔ نظریات نے مختلف افکار کا چوغہ پہن کر مذہبی رنگ اپنایا تو یہ سلسلہ دراز ہونے لگا۔ ہندو معاشرہ، خصوصاً برہمن نے یا دوسرے لفظوں میں ہندو مذہبی اجارہ داروں نے دھرم کے نام پر مختلف طبقوں کو مختلف طریقوں سے اپنا غلام بنا لیا۔ ذات پات کی حد بندی نے اسی حیثیت کو مقام بنایا کہ زندگی اسی کے تابع ہو گئی۔ منوشاستر نے جو قوانین بنائے اسے مذہبی حیثیت مل گئی۔ انسان کی انسان پر حکومت کو مذہبی

ور جل گیا۔

انسان کا اس دنیا میں آنے اور دنیا سے جانے تک میں ہر مذہب اور ہر نظام فکر میں انسانی بہبود کے لیے طریقہ کار موجود ہیں۔ ان طریقہ ہائے کار میں تبدیلی، رسومات کا مختلف انداز اور فکر کی بنیاد جہاں ایک معاشرے کو دوسرے سے الگ کرتا ہے، وہاں ان رسومات، فکر اور طریقہ کار کی اہمیت اپنے اپنے معاشرے میں اہمیت بھی رکھتی ہے۔ ہندو معاشرہ بے شمار رسومات کا مجموعہ۔ اس معاشرے میں پیدائش سے لیکر راکھ ہو جانے تک کی اتنی رسمیں ہیں، جن کا انت نہیں۔ مختلف علاقوں میں نہ صرف ان کی ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے بلکہ ان کی اہمیت بھی مختلف ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس دھرم کی بنیاد خوف پر رکھی گئی ہے، اس لیے یہ اپنے مستقبل کے بارے میں بہت فکر مند ہوتے ہیں۔ یہی فکر مندی نے چند ایسی رسومات یا فنون میں ترقی کی، جو انہیں کسی نہ کسی طرح اس خوف سے نجات دے۔ ان میں ایک فن مستقبل میں جھانکنے کا بھی ہے، جسے وہ جوتش کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ بچے کی پیدائش پر، جوتش کے ذریعے اس کے مستقبل میں جھانکا جاتا ہے۔ تاکہ یہ اندازہ کیا جاسکے کہ اس بچے کے بھاگیہ یا قسمت میں کیا ہے۔ وہ درست ہے یا غلط، یہ ایک الگ بحث ہے، تاہم، یہ رسم ہے کہ اس کی جنم کنڈلی بنائی جاتی ہے اور جو پنڈت نے کہہ دیا اسے تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

جنم کنڈلی میں جوتش یا علم نجوم سے سہارا لیا جاتا ہے۔ علم نجوم اور فلکیات دو الگ الگ دائروں میں ہونے کے باوجود ستاروں کے بارے ہی میں جاننے کو کہا جاتا ہے۔ قدیم ہندوستان میں جوتش کے علم کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے، جو آج کے جدید دور میں بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ کی آمد سے ہزاروں سال پہلے بابل کی تہذیب میں بھی یہ علم اپنی اہمیت رکھتا تھا۔ ہندوستان میں یہ علم وہاں کی تہذیب کے تسلسل میں آیا پھر اس علم کی پیدائش یہاں ہندوستان میں ہوئی۔ اس بحث سے بھی صرف نظر کرتے ہوئے بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ علم ان مذہبی لوگوں کے ساتھ منسلک رہا جو عبادت گاہوں میں تھے اور اس کا انتظام کرتے تھے۔ مطلب پروہت یا پنڈت وغیرہ اس علم کے وارث قرار پائے انہوں نے اس علم سے بے شمار آمدنی حاصل کی اور یہی لوگ دوسروں کی قسمت کا حال بتایا کرتے تھے۔ یوں یہ لوگ معتبر ٹھہرے۔ ان کا مقام و مرتبہ بلند ہوا۔

اب مائتھالوجی چاہے یونانی ہو یا ہندوستانی، ان مذہبی لوگوں نے ان کی قسمت ان ستاروں کے ساتھ جوڑ دی، جو راس منڈل، منطقۃ البروج یا Zodiac belt کہلاتے ہیں اور انسان ان مذہبی لوگوں کے ہاتھوں یرغمال بن کر اپنی قسمت کا حال جانتا رہا۔ حالانکہ یہ بے بس ستارے اس سورج کے گرد گردش کرتے ہیں جو خود کشش کا محتاج ہے، خود کسی کشش میں تیر رہا ہے اور یہاں تک کہ اپنا نام رکھنے پر بھی قادر نہیں۔ سورج کو سورج کا نام کس نے دیا۔ انسان نے، جب تک وہ اپنی اس صلاحیت پر غور نہیں کرے گا کہ رب تعالیٰ نے یہ صلاحیت انسان کو دی ہے کہ وہ ان کے نام رکھنے سے لیکر اس کی چالوں تک کو جان لے، وہ انسان پر انسان کی حکومت کے لیے ان مذہبی لوگوں کا محتاج رہے گا۔

بھوجن کے بعد پنڈت بھگوان داس نومولود کی جنم کنڈلی بنانے میں پوری طرح محو تھا۔ پیدائش کی ایک ایک ساعت اس کے سامنے تھی۔ ٹھاکر دیال رائے بھی موجود تھا۔ سبھی چیلے اور وہ معززین جو ابھی گئے نہیں تھے، وہ سب وہیں موجود تھے۔ ایک دم سے پنڈت بھگوان داس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں فکر اور چہرے پر خوف طاری تھا۔ سبھی چونک گئے۔ ہر کسی کا یہی احساس تھا کہ کوئی انہونی ضرور ہے۔ کچھ دیر بعد مہا پنڈت نے اپنا سر اٹھایا اور بولا۔

"اس بالک پر سایہ ہے، گمبھیر سایہ۔ جس نے اس کے بھاگیہ چھپا لیا ہے، سایہ... جس سے یہ کبھی نہیں نکل پائے گا۔"

"مہاراج۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" ٹھاکر نے

پوچھا۔

"ترنت ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مجھے تو یہ لگتا ہے یہ تیرا سب کچھ چھین لے گا۔ ایسا بھاگیہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ نشٹ کر دے گا یہ سب کچھ۔ اُتم آتما۔" یہ کہتے ہوئے مہا پنڈت کی آنکھیں پھیل گئیں، جیسے وہ کوئی خوف ناک منظر دیکھ رہا ہو۔ مہا پنڈت کے یوں کہنے پر وہاں سراسیمگی پھیل گئی۔ ٹھاکر دیال رائے بھی چونک گیا۔ اس نے پوچھا۔

"میں سمجھا نہیں مہاراج، یہ..."

مہا پنڈت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تت.... تو بالک، ایسا بالک....." مہا پنڈت نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چیلے بھی اٹھ گئے۔ تو پنڈت جیون جی لعل نے تیزی سے کہا۔

"مہاراج جنم کنڈلی تو بنائیے، بالک کا شبھ نام بھی تو رکھیے؟"

"ہم دوبارہ آئیں گے تبھی سب ہوگا۔ اس وقت نہیں۔" مہا پنڈت نے تیزی سے کہا اور باہر کی جانب چل دیا۔ اس کے چیلے بھی ساتھ ہی چل پڑے۔ علاقے کے وہ معززین خاموشی سے سب دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی چپ چاپ وہاں سے جانے لگے۔ ٹھاکر دیال رائے گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

☆......☆......☆

رام گڑھ میں دو دن دعوت چلی، ہر کسی نے وہیں سے کھایا۔ ایک طرح سے جشن کا سماں رہا۔ دور و نزدیک سے مانگنے والے بھکاریوں نے بھی خوب پیٹ بھرا، راہ چلتے مسافروں کو بھی دعوت دی گئی۔ یہاں تک کہ تیسرے دن کی سہ پہر دسترخوان لپیٹ دیا گیا۔ حویلی میں سکون سا در آیا۔ ٹھاکر دیال رائے جیوتکا کے پاس سے ہو کر اپنی خواب گاہ میں تھا۔ وہ کچھ دیر تک اپنے بیٹے کے ساتھ رہا تھا۔ جس نے حویلی ہی کو خوشیاں نہیں دیں، اسے بھی فخر سے نواز دیا تھا۔ اس کی نگاہ سامنے دیوار پر ٹنگا ہوا تیر تھی۔ اس کے ذہن میں مہا پنڈت کی باتیں گونج رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس شخص کی کہی ہوئی باتیں بھی یاد آ رہی تھیں جو اس نے تیر دینے سے پہلے کہی تھیں۔ دونوں کی باتیں باہم متصادم ہو رہی تھیں۔ وہ بہت الجھا ہوا تو تھا ہی، لیکن ایک نکتے پر وہ کامل یقین رکھتا تھا کہ اس کا بیٹا غیر معمولی حالات میں پیدا ہوا ہے۔ جبکہ وہ ناامید ہو چکا تھا۔ اس نے سارا غرور اور تکبر مٹی کر دیا تھا۔ آئندہ بھی انہونی ہو سکتی تھی۔ ٹھاکر نے ہمیشہ اپنی پیٹھ خالی محسوس کی تھی۔ نوکروں، چاکروں، محافظوں اور شہہ زوروں کی فوج ہونے کے باوجود اسے اپنی تنہائی کا احساس ستاتا رہتا تھا۔ اب محض تین دن کا بیٹا ہونے کے باعث اسے لگا جیسے اس کی پشت پر کوئی ہے۔ حالات کے پانی میں نمک کی مانند گھلتا ہوا حوصلہ اب ایسی چٹان بن گیا تھا جو طوفانوں میں بھی ایستادہ رہنے کی سکت رکھتا ہو۔ زندگی کے پھیکے رنگ، الجھی ہوئی بے ہنگم سوچیں اور بے مقصد شب و روز بالکل ہی بدل گئے تھے۔ اب اسے زندگی بامقصد دکھائی دینے لگی تھی۔ اب اس کے سامنے اپنے پتر کی زندگی تھی۔ جسے اس نے خود بنانا تھا۔ ایسی اعلیٰ تعلیم و تربیت کہ وہ زندگی کے ہر میدان میں کامیاب ٹھہرے۔

انسان کی زندگی سوچ کے ساتھ ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کی تو سوچ ہی بدل گئی تھی۔ ابھی کل ہی کی بات تھی۔ وہ صبح سویرے ہی اٹھ گیا تھا۔ رام گڑھ میں زندگی دھیرے دھیرے جاگ رہی تھی۔ مشرقی افق نیلگوں ہو رہا تھا، جس میں صبح کا ستارہ اپنا آپ منوانے کی کوشش میں ٹمٹما رہا تھا۔ مندر میں بجنے والی گھنٹیوں کا ارتعاش پھیل رہا تھا۔ لوگ اپنے ڈھور ڈنگر باندھ رہے تھے۔ گلیوں میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ حویلی کا ہر مکیں جاگ کر اپنے کام دھندوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ ایسے میں ٹھاکر اپنی خواب گاہ کی کھڑکی میں آ کھڑا ہوا تھا۔ اگرچہ یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا لیکن یہ سب اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ صبح کے نظارے میں زندگی کا احساس بہت خوشگوار تھا۔ اسے یہ صبح نئی لگی تھی۔ اس کی سوچ پھیل گئی۔

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے، وہ بھی انسانوں جیسا گوشت پوست کا ہوتا ہے۔ اس کے لہو کا رنگ بھی ایک جیسا ہوتا ہے اور سارے اعضاء بھی۔ یہاں تک کہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ ہر انسان ایک جیسا ذہن لے کر آتا ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد ہی وہ سماجی مراتب، انداز فکر، مذہب، قوم، رنگ اور نسل میں تقسیم ہوتا ہے۔ فطرت اسے ایک جیسا بناتی ہے۔ اور یہ انسان کی اپنی تقسیم ہے کہ وہ خود ہی دائرے بناتا کر دائرہ در دائرہ تقسیم ہوتا رہتا ہے۔ مان لیا جائے کہ دنیا کی یہ تقسیم مختلف افکار کی مرہون منت ہے۔ تو افکار کی اہمیت سے پہلے انسان کو الوہیت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے ہونے ہی سے یہ سارے رنگ ہیں۔ یہ سارے افکار انسان ہی وہ رہا ہے یہاں یہ بحث الگ ہے کہ یہ افکار کہاں سے آتے ہیں اور کس لیے آتے ہیں؟

بیٹے کے پیدا ہونے سے پہلے اس نے کبھی ایسا سوچا ہی نہیں تھا۔ جس سے اس کی اپنی ذات اور اس کے اردگرد پھیلی کائنات کا حوالہ ہو۔ اس سے پہلے اس کی زندگی چند معمولات کے گرد گھومتی تھی۔ جائیداد، طاقت کا اظہار اور خواہشوں کی تکمیل۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی کیا ہے؟ کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے۔ وہ سورج کو سوریا دیوتا مان کر روزانہ اس کی پوجا کرتا تھا۔ لیکن کبھی اس کی ماہیت، حیثیت اور افادیت پر نہیں سوچا تھا۔ وہ بجرنگ بلی کو مانتا تھا لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ شکتی کا دیوتا کیوں اور کیسے ہے؟ اس کا دھرم یہی تھا کہ جو پنڈت نے بتا دیا، کبھی اس پر سوچنا بھی تو الجھ کر رہ جاتا۔

وہ انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ بھانو و تیزی سے اندر آیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

"بھانو و، خیریت تو ہے، کیا ہوا ہے تمہیں؟" ٹھاکر دیال رائے نے حیرت سے پوچھا۔

"غضب ہو گیا مالک! آپ چلیں میرے ساتھ باہر اور پنڈت چرن جی لعل کی بات سنیں۔"

"ایسی کیا بات بھانو و؟"

"مالک وقت نہیں ہے۔ چلیں۔" بھانو و نے ٹھاکر دیال رائے کا ہاتھ پکڑ کر التجا کی تو وہ اس کے ساتھ باہر کی جانب چل دیا۔ دالان کے پاس پنڈت چرن جی لعل خوف زدہ انداز میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ ٹھاکر دیال رائے نے اس کی طرف دیکھا تو وہ چلاتے ہوئے بولا۔

"ٹھاکر جی! ابھی کچھ سے بعد بیٹا آپ پر چڑھائی کرنے کو ہے۔ آپ کوئی بھی اپائے کر لو۔"

"پنڈت جی، آپ کیا کہہ رہے ہیں، مجھے صاف بات بتائیں کیا ہوا۔" ٹھاکر دیال رائے نے سکون سے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"مجھے مہا پنڈت نے آج میلے میں بلایا ہے تھا۔ وہیں سارے علاقے کے وہی چند معززین تھے جو آپ کے خلاف ہیں۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میلہ ختم ہونے کے فوراً بعد رام گڑھ پر چڑھائی کر دی جائے۔"

"مگر کیوں پنڈت جی؟" ٹھاکر دیال رائے نے پوچھا تو وہ بولا۔

"اس کی وجہ مہا پنڈت بھگوان داس جی مہاراج ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کے گھر میں جو پتر پیدا ہوا ہے، وہ دیوی دیوتاؤں کی اچھا نہیں ہے، بلکہ وہ ایسا پرش ہے جو ان دیوی دیوتاؤں کا اپمان کرے گا۔ وہ ایک مہا آتما کے جیسا ہے جو ہندو دھرم کے خلاف ہوگا، اسے ہمیں ختم کرنا ہوگا۔"

"مطلب انہیں مجھ سے نہیں میرے پتر سے خوف ہے؟" ٹھاکر دیال رائے نے پوچھا۔

"یہی بات ہے ٹھاکر جی، اسی لیے انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ آپ کے بیٹے کی بھینٹ مانگ رہے ہیں یا پھر وہ خود اسے مار دیں گے۔ میلے کے بعد وہ ایک سینا لے کر آ رہے ہیں۔" پنڈت نے کہا تو ٹھاکر نے سوچتے ہوئے کہا۔

"بھانو و، کوئی اور ہوتا تو میں اس کی بات کو اہمیت نہ دیتا۔ مگر یہ پیغام پنڈت جی لے کر آئے ہیں۔ سب کو بلاؤ، ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔"

"جیسے حکم مالک۔" بھانو نے کہا اور فوراً ہی پلٹ گیا۔ جس انہونی کا ٹھاکر دیال رائے لاشعوری طور پر انتظار کر رہا تھا اس کا سے آ گیا، لیکن یہ سے، اتنی جلدی آ گیا؟ یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

حویلی کے مردان خانے میں رام گڑھ کے سبھی بڑے جمع تھے۔ ان کے سامنے ساری صورت حال رکھ دی گئی تھی۔ وہ لوگ لڑنے مرنے کو تیار تھے۔

"ٹھاکر جی، یہ سب لوگ بہات بنا رہے ہیں، انہیں آپ کی شان وشوکت نہیں بھائی، وہ کب سے رام گڑھ کو ختم کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔" یہی ان کی رائے تھی جس کی ترجمانی ایک بوڑھے نے کی تھی۔ اس پر ٹھاکر دیال رائے نے ان سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میرے ایک بیٹے کے لیے بچانے کتنے مارے جائیں گے۔ کیوں نا میں ایسا کروں، یہ سب چھوڑ کر یہاں سے چلا جاؤں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ٹھاکر جی، کیا آپ کی رگوں میں راجپوتی خون پانی بن گیا ہے۔ وہ آپ کو للکارا ہے ہیں اور آپ خوف زدہ ہیں؟" انہوں نے یک زبان ہو کر کہا تو ٹھاکر دیال رائے کے خون نے جوش مارا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ فیصلہ ہو گیا کہ ان کا مقابلہ کیا جائے گا۔ شہ زوروں اور محافظوں کو تیاری کا حکم دے دیا گیا تھا۔ رام گڑھ کے لوگ تیار تھے۔

سورج غروب ہو گیا تھا۔ ٹھاکر اپنی بیوی جیوتیکا کے پاس تھا، جو خوف زدہ ہونے کے ساتھ بے حال ہو رہی تھی کہ اس کے بیٹے کے دشمن حملہ آور ہو رہے ہیں۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

"ناتھ! ایک طرف آپ کا بیٹا ہے اور دوسری طرف آپ کی راجپوتی انا، اگر وہ کامیاب ہو گئے تو دونوں نہیں بچ پائیں گے، لیکن اگر ہم اپنے بیٹے کو بچا لیں تو انا کا کیا ہے۔"

"تو کیا کروں میں؟" ٹھاکر دیال رائے نے پوچھا تو تیزی سے بولی۔

"ہم کسی کو بتائے بنا یہاں سے نکل جاتے ہیں۔ خون بھی نہیں بہے گا۔ ہم یہاں سے بہت دور چلے جاتے ہیں۔"

"میں اپنے لوگوں کو کیا جواب دوں گا؟ وہ میرے خون پر شک کریں گے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا کہ ٹھاکر دیال رائے کے خاندان پر کوئی دھبہ لگے۔ ہم راجپوت اپنی انا کے لیے اپنے بیٹے قربان کر دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور جیوتیکا کی خواب گاہ سے نکل گیا۔

ٹھاکر دیال رائے اپنے شہ زوروں اور محافظوں کے ساتھ اس انتظار میں تھا کہ کب حملہ آور آتے ہیں۔ انہیں اطلاعات مل رہی تھیں کہ میلے کے بعد وہ سب ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ ان کے ساتھ مہا پنڈت موجود ہے جو اس لڑائی کو دھرم یودھ کا نام دے رہا ہے۔ جس سے لوگ مرنے مارنے پر تل گئے ہیں۔ اسی دوران بھانو وہیں آیا اور اس نے آہستگی سے ٹھاکر دیال رائے کو بتایا۔

"مالک! حویلی سے مالکن چلی گئی ہیں، وہ چھوٹے مالک کو بھی ساتھ لے گئی ہیں۔"

"کس طرف گئی ہیں؟" ٹھاکر دیال رائے نے انتہائی پریشانی میں پوچھا تو بھانو نے بتایا۔

"حویلی سے کسی پتہ چلا ہے کہ وہ جنگل کی طرف نکلی ہیں۔"

"چلو انہیں واپس لائیں۔" ٹھاکر دیال رائے نے لمحوں میں فیصلہ کرتے ہوئے کہا اور گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے نکلا، اس کا رخ جنگل کی طرف تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئی ہوگی۔

ایسے ہی ہوا ٹھاکر دیال رائے کو زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ جیوتیکا اسے جلد ہی مل گئی۔ بگھی کھڑی تھی لیکن وہ اس سے کچھ فاصلے پر اپنے بیٹے کے ساتھ اکیلی کھڑی تھی۔ اس کے سامنے چند ایسے لوگ کھڑے تھے، جن کے حلیے ہندو پنڈتوں کی مانند تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی تلواریں تھیں۔ انہوں نے جیوتیکا کو گھیرا ہوا تھا۔ وہ خونخوار انداز میں اس کا راستہ روکے ہوئے تھے۔ جیسے ہی

ٹھاکر اور بھانو وان کے قریب پہنچے، وہ ماہرین ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اس نے جاتے ہی انہیں للکارتے ہوئے کہا۔

"کون ہو تم لوگ اور ٹھاکرانی کا راستہ کیوں روک کر کھڑے ہو۔"

تبھی ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔

"ہم نے ٹھاکرانی کو نہیں، اس بچے کو روکا ہے، ہم نے اس کو نشٹ کرنا ہے، روک سکتے ہو تو روک لو۔" یہ کہتے ہوئے وہ بچہ چھین لینے کے لیے آگے بڑھا ٹھاکر بجلی کی سی تیزی سے ان کے درمیان آ گیا۔ وہ اور بھانو وان کا مقابلہ کرنے لگے۔ چند لمحوں ہی میں ٹھاکر کو یہ احساس ہو گیا کہ وہ زیادہ دیر ان کے سامنے ٹھہر نہیں ہو سکتا۔ سامنے والے تلوار باز تو یوں تھے جیسے نہ انہیں زخم لگتا ہے اور نہ ہی وہ تھکتے ہیں۔ اس وقت تو ٹھاکر کو یقین ہو گیا، جب اس نے واضح طور پر ایک کی گردن پر وار کیا۔ یہ ایسا وار تھا جس سے گردن اڑ کر زمین پر جا گرتی ہے، لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کی تلوار کسی چٹان سے ٹکرائی ہے۔ ٹھاکر کو یقین ہو گیا کہ اس کے سامنے کوئی ماورائی مخلوق ہے۔ ایسے لمحے ہی میں اسے اپنی بے بسی کا احساس ہونے لگا۔ ایک دم سے اس نے اپنے بھگوان سے مدد چاہی، اس کے لبوں سے بجرنگ بلی نکلا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے خود اپنا نعرہ کھوکھلا لگا۔ ذہن کے کسی خانے میں یہ بے بسی موجود تھی کہ اس کا بھگوان کچھ نہیں کر پائے گا۔ وہ مٹی کی مورت اسے زندگی نہیں دے پائے گی۔ ایک دم سے اسے وہ شخص یاد آ گیا، جس نے ایسے ہی کچھ لفظ کہے تھے۔ اس کی پوری توجہ ان کے ساتھ مقابلے پر لگی ہوئی تھی۔ انہی لمحات میں اس نے پوری شدت سے اس شخص کو یاد کیا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کی تلوار بازی کے جوہر اس کی نگاہوں کے سامنے پھر گئے۔ اس وقت وہ حیران رہ گیا جب انہی حملہ آوروں کی پشت پر وہ شخص نمودار ہوا۔ وہی سفید برف کے جیسے گیسو، تنومند بدن، باریش اور چمکتے ہوئے چہرے والا۔ اس کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تیز دھار تلوار تھی۔ اس نے وہیں سے للکارا۔ حملہ آوروں نے پلٹ کر دیکھا۔ اگلے ہی لمحے ان کے درمیان مقابلہ شروع ہو گیا۔ ٹھاکر، بھانو وان اور ٹھاکرانی انہیں دیکھ رہے تھے۔ اس نووارد کی تلوار جسے لگتی وہ گرتا اور گرتے ہی اسے آگ لگ جاتی۔ خون نکلنے کی بجائے دھواں اٹھتا اور لمحوں میں وہ راکھ بن جاتا۔ کچھ ہی دیر میں وہ سبھی راکھ بن چکے تھے۔

"یہ... یہ کیا تھا مہاراج؟" ٹھاکر نے اس نووارد سے پوچھا تو بولا۔

"یہ انسان نہیں تھے۔ تیرے پنڈت بھگوان داس کے جادو کا کرشمہ تھا۔"

"بھگوان داس؟ وہ میرے بچے کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟" ٹھاکرانی نے بیٹے کو چھاتی سے لگاتے ہوئے پوچھا تو شخص بولا۔

"جس طرح اس بچے نے اس دنیا میں آتے ہی تمہیں ماں کے اور ٹھاکر کو باپ کے مقام پر فائز کر دیا، اسی طرح شیطانی قوتوں نے بھی آنکھ کھول لی ہے۔ وہ اس بچے کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ یہ بچہ پروان چڑھے۔"

"کیوں مہاراج کیوں؟" ٹھاکر نے چلاتے ہوئے پوچھا تو وہ تحمل سے بولا۔

"اس لیے کہ یہ کشمکش اس دنیا میں پوری طرح موجود ہے۔ یہ بچہ ایسی صلاحیتیں رکھتا ہے کہ شیطانی قوتیں اس کے مقابلے میں ہمیشہ ڈٹی رہیں گی اور یہ بچہ ان کا مقابلہ کرتا رہے گا۔"

"ایسا کیوں ہے؟" ٹھاکر نے ضدی لہجے میں پوچھا تو وہ بولا۔

"تیرا تکبر، کسی انسان کو شوبھا نہیں دیتا کہ وہ تکبر کرے۔ یہ اس کا حق ہے جس نے سب کو پیدا کیا۔ انسان کی صفت عاجزی ہے، اس کی بندگی بھی ہے، جب تک وہ عاجز ہے۔ بندگی عاجزی ہی سے ہوتی ہے۔ گوشت کے ایک لوتھڑے کے لیے کیوں اتنا تڑپ رہے ہو، کیوں خود پر قابو نہیں رکھ سکتے ہو؟ کہاں گیا تیرا تکبر؟"

"ہمارا امتحان مت لو مہاراج۔" اس نے بے بسی سے کہا تو وہ بولا۔

"میں نہیں کوئی اور ہی یہ چاہتا ہے۔ کیا تجھے نہیں پتا کہ یہ تیرا دھرم، بے جان مورتیوں کو پوجنے والا، یہ زندگی نہیں دے سکتا۔ اس میں تو موت بڑی ہے۔ میں نے تو تمہیں زندگی کی نوید دی تھی۔ موت کون دے رہا ہے؟ اب بولو موت کے اندھیاروں میں گم ہو جانا چاہتے ہو یا زندگی؟"

"میں اپنے بالک کی زندگی چاہتا ہوں۔" ٹھاکر نے یوں کہا جیسے وہ اپنا سب کچھ بھول چکا ہو کہ اس کی اپنی حیثیت کیا ہے۔

"یہ تو طے ہے ٹھاکر، جب تک یہ بچہ تیرے پاس رہے گا تب تک تیرے دھرم کی شیطانی قوتیں اسے ختم کرنے کے درپے رہیں گی۔ ابھی دیکھ لو۔" اس شخص نے کہا۔

"میں کیا کروں مہاراج، مجھے بتاؤ؟" ٹھاکر نے عاجزی سے کہا تو اس شخص نے تیزی سے پوچھا۔

"تم چاہتے کیا ہو؟ اپنا بچہ یا اپنی انا؟"

"دونوں۔" ٹھاکر نے کہا۔

"دو نہیں ملتے۔ ایک کا فیصلہ کرنا ہوگا۔"

"اپنا بچہ۔" ٹھاکر نے ایک دم سے کہہ دیا تو اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھاکر اپنی آنکھیں بند کرو اور ایک منظر دیکھو۔" ٹھاکر نے آنکھیں بند کر لیں پھر چونک کر اس شخص کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا تب اس شخص نے کہا

"اگر تمہیں مجھ پر یقین ہے، یہ منظر اس دنیا میں ہوگا تو پھر اس بچے کو یہیں چھوڑ دو اور پلٹ جاؤ۔ اب یہ تم پر ہے کہ موت کے بعد زندگی پاتے ہو یا زندگی میں موت کا انتخاب کرتے ہو۔"

"میں آپ پر یقین کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"جیوتیکا! بچے کو یہیں چھوڑ دو۔ اگر اس کی زندگی چاہتی ہو تو۔"

جیوتیکا نے ایک نگاہ اپنے بیٹے کے چہرے پر ڈالی، تین دن کا بچہ اور ماں کی ممتا میں کشمکش عروج پر تھی۔ آنسو گالوں سے لڑھک کر بہہ رہے تھے۔ وہ بھی سمجھ چکی تھی کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے اپنا آنچل سیدھا کیا اور زمین پر بچھا دیا۔ پھر اس پر تین دن کا بیٹا رکھ دیا۔

"سنو، یہ بدن کی مٹی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ بدن حلال کا ہو تو اس میں خیال بھی حلال ہی آتے ہیں اور حلال بدن جب مٹی ہوتا ہے تو یہ مٹی ایسے بیج اگاتی ہے، جس میں سے امن اور آشتی اگتی ہے۔ اور اس کی خوشبو دور دور تک پھیل جاتی ہے۔ حرام مٹی سے بنا بدن کبھی اچھا نہیں سوچ سکتا۔ اس کی مٹی ہمیشہ فساد کے کانٹے اگائے گی۔ اب تم سوچ لو۔"

"میں پلٹ رہا ہوں مہاراج، یہ بچہ آپ نے دیا اور اسے آپ ہی کو سونپا۔" یہ کہہ کر ٹھاکر وہاں رہا نہ اپنے گھوڑے کی لگامیں موڑیں تو سامنے کھڑے شخص نے کہا۔

"وہاں ملیچھ! تو جنونی ہے اور یہ بچہ ابھی کسی مذہب پر نہیں۔ میرے آقا ﷺ کے مطابق ابھی یہ فطرت سلیمہ پر ہے۔ تم اسے جو چاہیں بنا دیں۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

"تم جو چاہو بنا۔ میں اپنے دھرم پر نہیں رہا۔ میرے دھرم کے لوگ اس بچے کی وجہ سے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ میں آپ پر چھوڑتا ہوں، آپ اسے جو چاہے بنا دیں۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کا دھرم کیا ہے، جو آپ کا دھرم ہے وہی بنا دیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ لمحہ بھر کو رکا اور پھر جیسے چونکتے ہوئے بولا۔

"بلکہ اپنے جیسا بنا دیں۔"

"جاؤ، پھر تم سرخرو ہو گئے۔" اس شخص نے کہا تو جیوتیکا اپنے بچے کو دیکھتے ہوئے بگھی میں جا بیٹھی۔ اگلے چند لمحوں میں وہ رام گڑھ کی طرف چل دیے۔ ٹھاکر کے چہرے پر ذرا سا بھی ملال نہیں تھا۔ جبکہ جیوتیکا خون کے آنسو رو رہی تھی۔

رام گڑھ پہنچتے ہی ٹھاکر نے دیکھا، ایک لشکر رام گڑھ

کے سامنے تھا۔ اس کے اپنے لوگ بھی لڑنے مرنے کو تیار تھے۔ اسے دیکھتے ہی سب میں جان پڑ گئی۔ حملہ آوروں کے نعروں میں پاگل پن گونج رہا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے ان پر حملہ کر سکتے تھے۔ سارے کا سارا رام گڑھ لڑنے کے لیے تیار تھا اور پھر یہ پاگل پن یدھ کی صورت اختیار کر گیا۔ پنڈت بھگوان داس کے ساتھ علاقے کے وہ لوگ بھی تھے، جو ہمیشہ ہی ٹھاکر کے دشمن رہے تھے۔ ابھی تین دن پہلے ہی اس کی حویلی سے کھا پی کر گئے تھے۔ ایسے وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو کسی کے در سے کھاتے بھی رہتے ہیں اور انہی کے دشمن بھی بن جاتے ہیں، یہی لوگ منافق ہوتے ہیں۔ دونوں طرف سے لوگ ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ منافقت اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ شیطانیت جنس رہی تھی۔

☆......☆......☆

تین دن کا نومولود بچہ اس شخص کے ہاتھوں پر تھا۔ اس کے سامنے جھگیاں تھیں۔ کسی میں روشنی تھی اور کوئی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کسی میں سے ڈھولک بجنے کی آواز آ رہی تھی کوئی گا رہا تھا۔ دوسری جھگیوں کی طرح ایک جھگی کے باہر ریچھ بندھا ہوا تھا۔ جس کے پاس ایک بندریا اور بندر بھی تھے اور ان سے ذرا پرے ایک سفید کتا لیٹا ہوا تھا۔ جھگی کے اندر ایک ادھیڑ عمر مرد اور ایسی ہی عمر کی خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ چراغ کی دھیمی روشنی میں صاف دیکھا جا سکتا تھا کہ ان کے چہروں پر زندگی کی تھکن موجود تھی۔ وہ جھگیاں ان لوگوں کی تھیں جو ذات کے قلندر تھے۔ ان کا پیشہ یہی تھا کہ گلیوں، بستیوں اور شہروں میں ریچھ، بندر اور کتوں کو نچا کر ان کا تماشا دکھا کر روزی روٹی کماتے ہوئے بستی بستی، شہر شہر گھومتے رہتے۔ یہی ان کی زندگی تھی۔ وہ مرد اور خاتون بھی قلندر ذات تھے۔ ان کی اولاد نہیں تھی، جس کی وجہ سے وہ زندگی کو جھیل رہے تھے۔ وہ شخص اس بچے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھائے جھگی میں داخل ہوا تو ان دونوں نے اسے چونک کر دیکھا اور ان کی آنکھوں میں حیرت پھیل گئی۔ وہ بچے کو دیکھ رہے تھے۔

تبھی اس شخص نے کہا۔

"یہ لے لالو، میں نے تجھے تیرا بیٹا لا دیا ہے۔"

"کس کا بچہ اٹھا لایا ہے تو۔" اس نے غور سے بچہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"تجھے اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ پارسہ کیا تو اس بچے کو قبول کرتی ہے؟"

"ہاں، اب تو میں اس قابل نہیں رہی، یہی سہی، میرا بیٹا تو ہوگا۔" پارسہ بولی۔

"چل دے دے اسے، میں اس کی خوشی میں خوش ہوں۔" لالو یوں بولا جیسے وہ بھی اندر سے خوش ہو۔ بھی پارسہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"جھوٹ کہہ رہا ہے تو، میں سمجھتی ہوں۔ لا دے میرا بچہ۔"

اس شخص نے وہ بچہ پارسہ کی گود میں دے دیا۔ اس نے اسے اپنے سینے سے لگایا ہی تھا کہ ممتا کے سوتے پھوٹ پڑے۔ وہ حیران رہ گئی۔ اس نے لالو کی طرف دیکھا اور لرزتے ہوئے بولی۔

"لالو، یہ میرا ہی بیٹا ہے۔ چاہے اس نے کسی دوسری عورت کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" لالو نے حیرت سے کہا تو وہ شخص تیزی سے بولا۔

"یہ بعد میں بتاتی رہنا۔ پہلے اس کا نام سن لو، یہ خوشی محمد ہے۔ اس کے ختنے ہو چکے ہیں۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی یہاں سے نکل جانا۔ اب میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ شخص جھگی سے نکلتا چلا گیا۔ لالو نے جب بچے کو دیکھا جو پارسہ کے سینے سے زندگی پا رہا تھا تو ساری بات سمجھ گیا۔ وہ ساری رات ان کی آنکھوں میں کٹ گئی۔ انہیں خوشی اور حیرت ہی اس قدر تھی۔ قبیلے کے سردار نے رات ہی کہہ دیا تھا کہ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ اور پھر سورج نکلنے سے پہلے ہی قلندروں کی وہ ساری جھگیاں اکھڑنے لگیں۔ لالو بھی ان میں شامل تھا۔ گدھے، گھوڑے اور خچروں پر سامان

لا کر وہ چل پڑے۔

جس وقت سورج کی روشنی پھیل رہی تھی، وہ رام گڑھ کے پاس سے گزر رہے تھے۔ وہاں اب زندگی نہیں رہی تھی۔ موت نے سب کچھ تباہ کردیا تھا۔ انسانی خون کی بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جلی ہوئی لاشوں کے ساتھ ہر گھر جل چکا تھا۔ وہ حویلی جہاں انہوں نے تین دن تک کھانا کھایا تھا، وہ آج کھنڈر بن چکی تھی۔ نجانے کیوں پارس نے اس بچے کے چہرے پر بھی کر رام گڑھ کو دیکھا۔ موت بھی زندگی ہی سے دیکھی جا سکتی تھی۔ وہ رام گڑھ سے آگے نکل گئے۔ ان کے پاس بھٹکتی ہوئی زندگی تھی۔

☆ ☆ ☆

منظر اچانک ہی بدل گیا۔ جمال اور اور جپال ساکت تھے اور یہ سب دیکھ رہے تھے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ بھی اسی منظر کے کردار ہوں۔ وقت تیزی سے نو برس آگے گزر گیا تھا۔ وہ منظر ایک گاؤں کا تھا۔ وہ پوری توجہ سے اس نئے منظر کو دیکھنے لگے۔

☆ ☆ ☆

وہ گرمیوں کی دوپہر تھی۔ گرمی اور حبس نے ہر ذی روح کو سائے تلے پہنچا دیا تھا۔ ایسے وقت میں لالو قلندر جھکے ہوئے شانوں اور بوجھل قدموں سے کھیتوں میں بنے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ اس کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی ساری قوت صرف کر کے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بوڑھے قلندر کا بہت برا حال تھا۔ اس کے بوسیدہ کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ سر کے لمبے بال بکھرے ہوئے اور گرد آلود تھے۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی تھی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ بہت لاغر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ بندر اور کتا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک چھوٹا سا لڑکا بھی چلتا چلا آ رہا تھا۔ جو چہرے سے بہت بھولا اور معصوم دکھائی دے رہا تھا لیکن بھوک اور غربت کی اپنی ایک چھاپ ہوتی ہے جو اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اوپر قمیص پہنی ہوئی تھی جو جا بجا پھٹی ہوئی تھی۔ نیچے اس نے کچھ بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ پیروں سے بھی ننگا تھا۔ لمبے لمبے بکھرے ہوئے بال مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ لالو قلندر نے دور ہی سے کنواں دیکھ لیا تھا اور اس کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ اگر روٹی نہ بھی ملی تو کم از کم یہ جھلسا دینے والی دوپہر تو وہیں گزر جائے گی۔ بچے کو پانی مل جائے گا۔

وہ کنواں سردار ہیرا سنگھ ڈھلوں کا تھا۔ جس کا شمار گاؤں کے ان لوگوں میں ہوتا تھا جنہیں فقط اپنی محنت مزدوری سے غرض ہوا کرتی تھی۔ ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر کے قریب گاؤں اوگی بھی ان گاؤں میں شمار ہوتا تھا، جہاں فصلیں شاداب اور کسان خوشحال تھا۔ دو دریاؤں کے پاٹ میں آباد یہ علاقہ ویسے بھی زرخیز تھا۔ سردار ہیرا سنگھ ڈھلوں نے یہاں اس گاؤں میں آ کر جو تھوڑی سی زمین بنائی تھی، وہ اسی میں ایک اچھی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ اپنی محنت کرتا اور خوشحال تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے تین بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا کلوندر سنگھ تھا۔ جس کی ابھی مسیں نہیں بھیگی تھیں۔

سردار ہیرا سنگھ اپنے کنویں کے پاس درختوں تلے چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی اس نے بیلوں کی جوڑی کو باندھا تھا اور اب خود آرام کرنے کی غرض سے لیٹا ہی تھا کہ اسے دور کھیتوں کے پاس سے ایک قلندر آتا ہوا دکھائی دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ قلندر وہیں آ گیا اور اس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ بچہ بھی اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھا تو جانور بھی بہتے ہوئے پانی میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس نے گدڑی زمین پر رکھ دی تھی۔ اسے سانس چڑھا ہوا تھا جو بحال ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے سانس بحال کرنے کی کوشش میں تھا۔ اس کی کمزور حالت دیکھ کر سردار ہیرا سنگھ ڈھلوں کو بہت ترس آیا۔ اس نے نرم سے لہجے میں پوچھا۔

”او بابا، خیر تو ہے، ٹھیک تو ہے نا تو؟“

”نہیں سردارا، میں ٹھیک نہیں ہوں۔ بس کسی وقت یہ سانسیں ختم ہو سکتی ہیں۔ بہت مشکل میں ہوں۔“ قلندر

نے اکھڑی ہوئی سانسوں میں بتایا۔

"کیا مشکل ہے تجھے؟" ہیرا سنگھ نے پوچھا۔

"مشکل ہی مشکل ہے، میرا بدن میرا ساتھ نہیں دے رہا ہے، نجانے کب کہاں میری زندگی ختم ہوجائے، بس یہ میرا بچہ ہے، سوچتا ہوں اس کا کیا بنے گا۔" قلندر نے تیز سانسوں میں کہا۔

"کیا تیرا کوئی نہیں ہے؟ تیرا قبیلہ، کوئی رشتے دار، کوئی بھی نہیں ہے؟" ہیرا سنگھ نے حیرت سے پوچھا۔

"قبیلہ بھی تھا، ایک بیوی بھی تھی، جواب اس دنیا میں نہیں رہی۔ قبیلہ بھی بچھڑ گیا۔ بس اکیلا ہوں۔" قلندر نے کہا اور خاموش ہوگیا۔ وہ اب سردار کو کیا بتاتا کہ اس کے قبیلے والوں نے اسے الگ کردیا تھا۔ انہوں نے اس بچے کو قبول ہی نہیں کیا تھا۔ ریچھ، کتوں اور بندروں کو اپنی انگلی پر نچانے والے اسے برداشت نہیں کرسکے۔ خود اس نے اس بچے کو بھی کام نہیں سکھایا۔ بچہ ہی ایسی صلاحیتوں والا تھا کہ بجائے اسے کچھ سکھانے کے، ریچھ، بندر اور کتے اس کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ خود ڈر گیا تھا۔ بچے کی فطرت میں ایسا تھا۔ اوپر سے اس کے قبیلے والوں نے نہ صرف اس بچے کو قبول نہیں کیا بلکہ خواہ مخواہ اس کی ذمہ داری بھی نہیں لی۔ جیسے ہی اس کی بیوی پار سدھاری، قبیلے والے بھی اس سے نظر انداز کرنے لگے۔ قلندر در بدر پھرتا، ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک جاتا ہوا، یہاں آگیا تھا۔

"روٹی کھائے گا؟" ہیرا سنگھ نے پوچھا۔

"بھوک تو لگی ہے، پر جاتا ہوں گاؤں میں، کہیں نہ کہیں سے روٹی مل جائے گی، بس یہ ذرا دھوپ ڈھلے اور تھوڑی دیر سانس لے لوں۔" قلندر نے کہا۔

"یار بات سن، بھوکا تو میں بھی ہوں۔ میری روٹی نہیں آئی ابھی تک، بندہ روٹی لینے گیا ہوا ہے، ابھی آجاتا ہے تو کھاتے ہیں۔" ہیرا سنگھ نے کہا تو قلندر نے سر ہلا دیا۔ بچہ شاید بہت تھکا ہوا تھا۔ اس لیے سایہ ملتے ہی زمین پر لیٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد سو گیا۔ سردار ہیرا سنگھ اور لالو قلندر یونہی وقت گذاری کے لیے باتیں کرنے لگے۔

"کدھر کا ہے تو؟" ہیرا سنگھ نے اس سے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتہ، جب سے ہوش سنبھالا ہے، سفر ہی میں ہوں۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم کہاں کہاں تک گئے ہیں۔" لالو قلندر نے کھرکھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیسی زندگی ہے یار یہ بھی، ہمیشہ سفر میں رہنا۔ آج یہاں تو کل وہاں اور ہم بیلوں کی جوڑی کی طرح یہیں گھوم رہے ہیں۔" ہیرا سنگھ نے کہا۔

"جیسے رب رکھے، ویسے رہنا پڑتا ہے۔ میں نے کب کہا تھا کہ میں قلندر بنوں۔ بس بن گیا۔ میں اگر کسی بادشاہ کے گھر پیدا ہوجاتا تو شہزادہ ہوتا۔" لالو نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے کہا تو ہیرا سنگھ کو دور سے اپنا ملازم آتا ہوا نظر آیا۔

"لے بھئی، مجھے لگتا ہے، روٹی آگئی۔ تو منہ ہاتھ دھو لے اور اس بچے کو بھی اٹھا۔" ہیرا سنگھ نے کہا اور کھال کے پاس جاکر منہ ہاتھ دھویا۔ ملازم کھانا لے کر پہنچ گیا تو ہیرا سنگھ نے اس سے پوچھا۔

"کیوں دیر ہوگئی تجھے؟"

"سردار جی، اب آپ کچھ دن دیر سویر ہی سے روٹی کھائیں گے، آپ کے گھر میں بچی ہوئی ہے۔" ملازم نے کہا تو ہیرا سنگھ بولا۔

"او شاباش اے بھئی، سکھ نال دکھی آئی ہے، تین بھائیوں کی اکیلی بہن، چل اس کا نام ہی سکھ جیت کور رکھ دیتے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے روٹی اپنے سامنے رکھی، آدھی روٹیاں اور سالن لالو قلندر اور بچے کو دے دیا اور انہیں دوسری چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ سب کھانا کھانے لگے۔ ملازم نے ان کے پاس پانی رکھ دیا۔ کھانا کھا کر وہ آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ ملازم اپنا کام کرنے لگا اور وہ سو گئے۔

سہ پہر سے ذرا پہلے سردار ہیرا سنگھ اٹھ کر کھیتوں کی

طرف نکل گیا تھا۔ ملازم بھی کہیں کام کر رہا تھا۔ بچہ بھی اٹھ کر بندر اور کتے کے ساتھ کھیل رہا تھا، جبکہ لالو قلندر جس کروٹ لیٹا تھا، اسی کروٹ پڑا رہا۔ کافی دیر بعد جب سردار ہیرا سنگھ واپس آیا تو اس نے لالو قلندر کو غور سے دیکھا اور پھر اسے اٹھایا لیکن وہ بے جان تھا۔ اس کی روح پرواز کر گئی تھی۔ ہیرا سنگھ نے ایک طویل سانس لی اور کھیلتے ہوئے اس بچے کو دیکھا، جسے یہ خبر ہی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کیا بیت گئی ہے۔ ہیرا سنگھ کو اس بچے پر بہت ترس آیا۔

ہیرا سنگھ نے اسی وقت اپنے ملازم کو بلایا اور لالو قلندر کی نعش کو بیل گاڑی پر رکھ کر گاؤں کی جانب چل دیا۔ وہ بچہ بھٹی بھٹی نگاہوں سے اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ بھی طرح شعور تھا کہ آج کے بعد وہ اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ کیونکہ ایسا ہی اس کی ماں کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ پھر کبھی واپس نہیں آئی تھی اور نہ کبھی اس نے اپنی ماں کو دیکھا تھا۔ باپ کے بچھڑ جانے کا اسے شدید دکھ تھا، لیکن اس کی آنکھ میں آنسو نہیں تھا۔

لالو قلندر کی نعش گاؤں میں ہیرا سنگھ کے گھر کے سامنے رکھ دی گئی۔ وہاں چوراہا تھا، جس کے درمیان میں بڑ کا درخت تھا اور اس کے نیچے لوگ بیٹھے رہتے تھے۔ اسے تھڑا کہتے تھے۔ وہاں ہر مذہب کا بندہ آتا تھا۔ ہیرا سنگھ کے گھر کے سامنے احمد بخش چیچ کا گھر تھا۔ وہاں تھڑے پر اس وقت یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ کیا لالو قلندر کی نعش کو جلایا جائے یا پھر دفن کیا جائے؟ وہ سکھ تھا، ہندو تھا یا مسلمان؟ کون تھا وہ؟ اگرچہ یہ مسئلہ اسے نہلاتے وقت حل ہو سکتا تھا لیکن اسے نہلائے کون؟ تبھی گاؤں کے ایک مسلمان بزرگ احمد بخش چیچ نے اس بچے کو اپنے سامنے کھڑا کر کے پوچھا۔

”بتا بیٹا! تیرا باپ بھگوان کو مانتا تھا، واہگورو کو مانتا تھا یا پھر اللہ کو؟“

”پتہ نہیں جی، وہ جس کے گھر سے مانگتا تھا، اسی کو دعائیں دیتا تھا، ہندو کے گھر سے مانگتا تھا تو کہتا تھا بھگوان تجھ پہ کرپا کرے، سکھ اسے کچھ دیتا تھا تو کہتا تھا رب تیرا بھلا کرے، مسلمان دیتا تو کہتا اللہ تجھ پہ کرم کرے۔“ بچے نے معصومیت سے کہا تو احمد بخش چیچ نے اپنے اردگرد کھڑے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو بھائیو، یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی۔ یا تو اس قلندر کی نعش کو دیکھ لو، یا پھر جو بندہ بھی اس کی ذمہ داری لیتا ہے، وہ اپنے مذہب کے مطابق اس کی آخری رسومات پوری کر دے۔“

وحدانیت

لوگوں کی اکثر یہ رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری دعائیں نہیں سنتا کیا کبھی ہم نے یہ غور کیا ہے کہ ہم دعائیں کیا مانگتے ہیں۔ ان کی نیت کیا ہوتی ہے کیا ہم کامل یقین سے دعائیں مانگتے ہیں۔ نہیں قطعی نہیں مانگتے اگر ہم دعا مانگ بھی رہے ہوتے ہیں تو اس میں ہماری بھلائی اور دوسرے کا نقصان ہوتا ہے۔ مثلاً اے اللہ! تو آج اتنی بارش دے کہ دل بھر جائے اس دعا سے ہمارا دل تو بھر جاتا ہے مگر دوسروں کا حال برا ہوتا ہے۔ دعا میں کاملیت نہیں ہوتی۔ اللہ مجھے فلاں چیز دے میں اس سے یہ دو گردوں گا بھلا رب العزت کیسے وہ دعا قبول کر سکتا ہے جس میں ایک انسان کا بھلا ہو رہا ہو اور دوسرے کا نقصان۔ میرا ایمان ہے کہ جب بھی سچے دل سے نفع نقصان سوچے بغیر دعا مانگی جائے قبول ہوتی ہے۔ کہتے ہیں انسان سخت مشکل میں ہو تو اگر وہ کوئی دعا مانگے تو وہ قبول ہو جاتی ہے۔ اس وقت کی دعا بھی نفع نقصان سے پاک ہو کر دل میں ایمان پختہ رکھ کر قبول ہونے کے یقین سے مانگی جاتی ہے اور قبول ہوتی ہے۔

حنا ناز ..... چنڈ داون خان

تبھی ایک شخص نے اس بچے کی پھٹی ہوئی قمیص کا آگے والا پلو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"پر یہ بچہ تو مسلمان ہے۔"

اس کے تصدیق کرنے پر احمد بخش چیچ نے خود ذمہ داری لے لی۔ اس نے گاؤں کے ان مسلمانوں سے کہا، جو وہیں کھڑے تھے کہ اس نعش کو پورے احترام سے دفنا دیا جائے۔ سو فوری طور پر اسے غسل دیا گیا۔ کفن کا انتظام بھی اسی نے کیا اور مغرب کی نماز کے بعد گاؤں کی مسجد میں اس کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔ پھر اسے گاؤں سے باہر قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ لالو قلندر اس دنیا سے چلا گیا۔

اس بچے کی رات ہیرا سنگھ کے مہمان خانے میں گزری لیکن اس سے پہلے اسے نہلایا گیا۔ کلوندر سنگھ کے کپڑے اسے پہنائے گئے۔ جب وہ دفنا کر آگئے تو اسے خوب کھانا کھلایا گیا۔ پھر جو وہ سویا تو صبح جاگا۔ نجانے اتنی میٹھی نیند اسے کیسے آگئی تھی۔ اگلی صبح جب وہ ناشتہ کر چکا تو کلوندر سنگھ اپنے باپو ہیرا سنگھ کے پاس آیا اور بولا۔

"باپو، میں نے اس سے اس کا نام پوچھا تو اس نے بتایا ہی نہیں، کہتا ہے سب مجھے کاکا کہہ کر پکارتے ہیں، اس کا کوئی نام تو ہونا چاہئے نا؟"

"ہاں پتر، اس کا کوئی نام تو ہونا چاہئے، پر یہ مسلمان ہے، اب ہم کیا نام رکھیں یار؟"

"کوئی سا بھی رکھ لیں۔" کلوندر سنگھ نے کہا۔ لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ اسے اپنے گھر کے دروازے پر احمد بخش چیچ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ قریب آیا تو ہیرا سنگھ نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"آئیں بھا جی بیٹھیں۔"

"میں کھیتوں کی طرف جا رہا تھا کہ مجھے خیال آیا۔ وہ کل لالو قلندر کے ساتھ جو بچہ تھا، کیا کرنا ہے اس کا؟" احمد بخش چیچ نے پوچھا۔

"کرنا کیا ہے، ادھر رہے گا ہمارے پاس یا جیسا آپ مناسب خیال کریں۔" ہیرا سنگھ نے کہا تو اتنے میں ہیرا سنگھ کی بیوی لسی کا گلاس لے کر آگئی۔ اس نے احمد بخش چیچ کو گلاس تھماتے ہوئے کہا۔

"بھائی جی، بچہ بہت معصوم اور بھولا سا ہے، وہ تو لگتا ہی نہیں کہ اس لالو قلندر کا ہوگا۔"

"پر کیا کریں، وہ ہے ہی اس کا۔ قلندر کا پتر قلندر۔" ہیرا سنگھ نے کہا۔

"برا مت ماننا ہیرا سنگھ، تم اسے رکھو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، پر وہ مسلمان بچہ ہے، میں کہتا ہوں جہاں چار دوسرے ہیں وہاں پانچواں یہ بھی سہی۔" احمد بخش چیچ نے بہت عقل مندی سے اپنی بات کہہ دی تھی، ایک تو اسے یہ سمجھا دیا تھا کہ مسلمانوں کے بچے کو مسلمانوں ہی کے گھر میں رہنا چاہئے اور دوسرا وہ اس بچے کو اپنا بیٹا بنا کر رکھے گا کوئی نوکر چاکر نہیں۔ ہیرا سنگھ اس کی بات سمجھ گیا۔ اس نے فوراً ہاں میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی بھا جی، میرے گھر میں رہے یا آپ کے گھر میں، ایک ہی بات ہے۔ آمنے سامنے گھر ہے۔ ہم سب اس کی دیکھ بھال کریں گے۔" اس نے بھی احمد بخش چیچ کو یہ بات سمجھا دی تھی کہ وہ بھی اس بچے کی نگہبانی کرتے رہیں گے۔

"بلاؤ اسے کہاں ہے وہ؟" احمد بخش چیچ نے کہا تو کلوندر بھاگ کر گیا اور اسے لے آیا۔ واپس آتے ہی اس نے احمد بخش چیچ سے وہی سوال کیا جو وہ اپنے باپو سے کر چکا تھا۔ تب احمد بخش چیچ نے کہا۔

"ہاں سوچتے ہیں اس کا نام۔" پھر اس بچے کو اپنے پاس بلا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس سے پوچھا۔

"چل اب ہم اپنے گھر چلیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اسے ساتھ لے کر اپنے گھر چلا گیا۔

اصل میں احمد بخش چیچ کی بیوی بھاگاں مائی نے جب اس بچے کو دیکھا تھا تو اس کے دل میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس کا پتر بن جائے۔ ساری رات وہ اسی کے بارے سوچتی رہی۔ صبح نور کے تڑکے وہ بیٹھی رو رہی تھی کہ احمد بخش چیچ نے حیران ہو کر اس سے رونے کی وجہ پوچھی تو بھاگاں مائی نے اپنے دل کا حال کہہ دیا۔ جہاں وہ اپنے اندر کی ممتا سے مجبور ہوگئی تھی، وہاں اسے

وہ اس فرمان کی بھی پیروی کر رہی تھی کہ یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے والا بخش دیا جائے گا۔ پھر اسے بچے پر ترس بھی بہت آیا تھا۔ احمد بخش چچ نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس بچے کو لے آنے کی پوری کوشش کرے گا۔

اس نے بچے کو جیسے ہی بھاگاں مائی کے سامنے کیا، اس نے اپنی دونوں بانہیں پھیلا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ بھی بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ "میرا خوشی محمد۔"

"چل یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ اس کا ابھی تک کوئی نام نہیں تھا، تو نے اسے نام دے دیا۔" یہ کہہ کر اس نے ہیرا سنگھ کے گھر ہونے والی بات بتا دی۔

"ہاں بس اس کا نام خوشی محمد ہی ہے۔ میرا پانچواں پتر۔" بھاگاں مائی نے کہا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ خوشی محمد بھی اس کے ساتھ یوں لگ گیا، جیسے اسے اپنی ماں مل گئی ہو۔

☆ ☆ ☆

برصغیر کا وہ دور تھا، جب دوسری جنگ عظیم ختم ہونے لگ بھگ ایک برس گذر گیا تھا۔ تحریک آزادی اپنے زوروں پر تھی۔ احمد بخش چچ بہت سمجھدار آدمی تھا۔ اس کے تین بھائی مزید تھے، فتح محمد عرف فتو، غلام محمد عرف غلاما اور محمد بخش عرف مندو۔ یہ تینوں بھائی ایک جٹ تھے۔ خوشحال زمیندار ہونے اور چچ ہونے کی وجہ سے وہ وہاں، اوگی پنڈ میں "ٹھیاں دی چچ" والے مشہور تھے۔ اوگی پنڈ میں جو زمین تھی، وہ تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ زمین تقسیم در تقسیم ہوتی ہوئی لوگوں کے پاس تھوڑی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ احمد بخش چچ نے سوچا تھا کہ اس کے اپنے چار بیٹے ہیں اور اب پانچواں خوشی محمد بھی آ گیا۔ اسی طرح بھائیوں کے بھی بیٹے ہیں۔ زمین جب تقسیم ہوئی تو کچھ بھی نہیں رہے گی۔ پھر کیا ہوگا؟ اس کی اولاد اس تقسیم کے بعد کہاں سے کھائے کمائے گی؟

احمد بخش چچ کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ نواب آف بہاول پور نے انیس سو ستائیس سے آباد کاری نظام چلایا ہے۔ جس کے تحت جو شخص چاہے الاٹمنٹ کروا لیتا، زمین آباد کرتا تو اسے وہ زمین مل جاتی۔ اس کے اپنے گاؤں اوگی سے اور آس پاس کے گاؤں سے کافی لوگ وہاں چلے گئے تھے۔ انہیں زمین مل گئی تھی۔ وہاں سب سے بڑا مسئلہ زمین کی آباد کاری تھا۔ بے آب و گیاہ زمین کو لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

احمد بخش چچ نے ایک دن اپنے بھائیوں کو اکٹھا کیا اور ان کے سامنے یہ بات رکھی۔ کافی دیر بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ احمد بخش خود اور فتح محمد دونوں وہاں چلے جائیں اور دو بھائی ادھر ہی رہیں۔ جب وہاں زمین کی الاٹمنٹ ہو جائے تو یہ بھی ادھر ہی آ جائیں گے۔

خوشی محمد کے تقریباً دو سال اس گاؤں میں گزرے۔ اپنے بھائیوں سے زیادہ اس کی کلوندر سنگھ کے ساتھ بنتی تھی۔ دونوں سارا دن کھیلتے، کبھی ہیرا سنگھ کے کنوئیں پر اور کبھی لمیاں دی ہٹی میں وقت گزرتا۔ دونوں ہی اپنے پاس غلیل رکھتے تھے۔ سارا دن پرندوں کا شکار کرتے رہتے۔ کھاتا پیتا اچھا ملا تو خوشی محمد نے خوب رنگ ڈھنگ نکالا۔ تب ایک دم اسے وہاں سے بھی جانا پڑا۔ اسے کلوندر سنگھ کا ساتھ چھوٹ جانے کا بہت دکھ تھا۔ پہلے احمد بخش چچ اور فتح محمد ریاست بہاول پور آئے، وہاں بات چیت کی۔ لوگوں سے ملے۔ ایک دن پلٹے تو دونوں اپنی بیویوں اور بیٹوں سمیت بہاول پور روانہ ہو گئے۔

وہاں انہوں نے دن رات ایک کر دیا۔ صحرائی زمین کو آباد کرنے لگے۔ یہاں تک کہ انہوں نے زمین آباد کر لی اور قیام پاکستان ہو گیا۔ لوگ آگ اور خون کا دریا پار کر کے آنے لگے۔ ان میں احمد بخش چچ کے دونوں بھائی بھی لٹے پٹے ان کے پاس آ گئے۔ احمد بخش چچ نے انہیں اپنے ساتھ ملا لیا اور زندگی نئے سرے سے شروع کر دی۔ اوگی پنڈ والی زمین کا کلیم داخل کر دیا گیا۔ یوں کسی کو کہیں زمین ملی اور کسی کو کہیں۔ وہ سب بھائی پاکستان کے مختلف علاقوں میں چلے گئے۔

☆ ☆ ☆

اس وقت خوشی محمد تیس برس سے اوپر کا ہو گیا تھا، جب

اس کی شادی کی باری آئی۔ چاروں بھائیوں میں سے کسی کی بیٹی ایسی نہیں رہی کہ جس سے خوشی محمد کی شادی ہو سکتی۔ سب بیاہی جا چکی تھیں۔ احمد بخش اب بوڑھا ہو چکا تھا اور بھاگاں مائی اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ ایک فتح محمد ہی اس کے پاس تھا۔ اس کی اولاد بھی بیاہی جا چکی تھی۔ احمد بخش نے ساتھ والے گاؤں میں خوشی محمد کی شادی کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی عقل مندی کی، اسے زمین دینے کا فیصلہ کر لیا۔ نور نگر میں کلیم کی زمین پڑی ہوئی تھی۔ احمد بخش نے وہ زمین خوشی محمد کو دے دی۔ وہ دونوں میاں بیوی وہاں جا کر بس گئے۔

نور نگر کی بستی نجانے کب کی آباد تھی۔ وہاں کے آثار بتاتے تھے کہ یہاں کوئی بستی پہلے بھی آباد تھی۔ وہاں کے لوگ بتاتے تھے کہ یہ پہلے ہندوؤں کی آبادی تھی۔ جو کسی وجہ سے ختم ہو گئی تھی۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ کہیں پر شیطانیت اپنا بھیانک روپ دکھا چکی ہے۔ نور نگر بھی رام گڑھ تھا جو بالکل بدل کر اب مسلمانوں کی بستی بن چکا تھا۔ نور نگر سے فقط دو میل کے فاصلے پر وہ میدان تھا، جہاں ہر سال میلہ لگتا تھا۔ اب میلے میں کھیلوں کی نوعیت بدل گئی تھی اور مسافر شاہ کے مزار کا اضافہ ہو گیا تھا۔

تقریباً سات برس بیت گئے۔ خوشی محمد نے وہاں جا کر خوب محنت کی۔ اس علاقے میں پانی اچھا تھا۔ فصلیں شاداب ہونے لگیں۔ بچپن میں غلیل سے پرندوں کا نشانہ لینے والا شوق اب گن کے ساتھ شکار میں بدل گیا تھا۔ اس کا نشانہ غضب کا تھا اور اسی خوبی کے باعث اس علاقے کے بڑے زمیندار کا بیٹا چوہدری شاہ دین اس کا بہت گہرا دوست بن گیا تھا۔ وہ اکثر شکار پر نکل جاتے۔ خوشی محمد کو سب کچھ مل گیا تھا، بس کمی تھی تو اولاد کی نعمت کی جو ابھی انہیں ملی تھی۔ وہ رب کے ہاں سے ناامید نہیں تھے۔

خوشی محمد کی بیوی صابراں اپنے نام کی طرح صابر وہ شاکر عورت تھی۔ قدرت نے اسے رنگ روپ بھی خوب دیا تھا۔ وہ سادہ سی گھریلو عورت اپنے رب کی رضا میں راضی تھی۔ اگرچہ اسے اولاد نہ ہونے کا دکھ تو تھا لیکن اس نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اسے صرف شاہ دین کا خوف تھا، جس کی بری نظر سے بچنا چاہتی تھی۔ وہ بہت کم باہر جاتی۔ خوشی محمد نے دو نوکر رکھ چھوڑے تھے وہی کام کرتے تھے۔ صابراں نے اشارے کنائے میں خوشی محمد کو شاہ دین کے بارے میں بتایا بھی، جسے وہ نہ سمجھ سکا۔ صابراں نے اپنی لو اپنے رب سے لگا لی۔ وقت گزرتا گیا، یہاں تک کہ قدرت ان پر مہربان ہو گئی۔ وہ امید سے ہو گئی۔

ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام جمال رکھا گیا۔ وہی جمال جو اپنے سامنے سارے منظر دیکھ رہا تھا۔ جب وہ دنیا میں آیا تو اس کا باپ قتل ہو چکا تھا۔ جس کا بدلہ لینے کے لیے وہ اس مقام پر آ کھڑا تھا۔ سارے منظر ایک دم سے ختم ہو گئے۔

☆......☆......☆

ہمارے سامنے اندھیرے میں ڈوبا ہوا میدان تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو روہی والے بابا جی وہیں ہمارے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ہمیں اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"جمال، کیا اب تمہیں سمجھ آ گئی ہے کہ تم کس حد تک قلندر ہو؟"

"لالو قلندر کی وجہ سے وہ قلندر تھا، اسی ناتے میں بھی ہوں۔ میں جان گیا، مجھے اب کیا کرنا ہے۔"

"یہ اچھا ہوا کہ تم سمجھ گئے ہو لیکن ابھی منزل بہت دور ہے، تجھے ابھی بہت سفر کرنا ہے۔" بابا جی نے کہا تو میں نے دھیمے سے پوچھا۔

"یہ آپ نے مجھے میری تین نسلوں کے بارے میں بتایا، آپ انہیں کیسے جانتے ہیں، انسان کی عمر تو ایک..."

"بادشاہ کسی شخص کا نام نہیں ہوتا، ایک مقام کا نام ہے، جو جس وقت بادشاہ ہوتا ہے اسے وہ مقام ملنے کے ساتھ سارے اختیارات بھی مل جاتے ہیں۔ سامنے ماضی تو

چھاکا ابھی سویا ہوا تھا۔ میں نے اسے جا کر جگایا تو وہ حیرت سے اٹھ کر بیٹھ گیا پھر تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

"او جمال تجھے خیر تو ہے؟ ابھی تو صبح نہیں ہوئی اور تو ڈیرے پر آ گیا ہے؟"

"او خیر ہی ہے۔ چل تو اٹھ اور منہ ہاتھ دھو، تجھے کہیں کام بھیجنا ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر حیرت ابھی تک پھیلی ہوئی تھی۔ تبھی اس نے کہا۔

"میں پوچھتا ہوں خیر ہی ہے نا؟"

"تو ایسے کر منہ ہاتھ دھو کے براس بندے کے گھر جا، جو کل یہاں میلہ کروانے کے سلسلے میں آئے تھے۔ انہیں جا کر کہو کہ ہم میلے میں کسی بھی طرح کی گڑبڑ نہ ہونے کی ضمانت دیتے ہیں، وہ میلہ کروانے کی تیاریاں کریں۔" میں نے کہا تو وہ حیرت سے بولا۔

"تو پاگل ہو گیا ہے جو ان کی باتوں میں آ کر یونہی میں بڑ مار رہا ہے۔ تجھے پتہ بھی ہے کہ وہ ہمارے خلاف سازش کر رہے ہیں اور تو پھر بھی پاگل پن کر رہا ہے۔"

"جب میں نے کہہ دیا ہے تو بس کہہ دیا ہے، تو یہ پیغام جا کر ان سب کو دے دے۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا تو وہ جسپال کی طرف دیکھ کر بولا۔

"یار تو ہی سمجھا اسے، پورا علاقہ ہمارے سامنے ہے، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ میلہ خراب کرنے کی پوری تیاری کیے بیٹھے ہیں۔ وہ ہمیں پھنسانے کی پوری" اس نے کہنا چاہا تو جسپال نے کہا۔

"جب تجھے جمال کہہ رہا ہے تو پھر تو ویسا ہی کر جیسا یہ کہہ رہا ہے۔"

اس کے یوں کہنے پر اس نے دیوانوں کی طرح ہم دونوں کی جانب دیکھا اور پھر پوچھا۔

"یہ تم دونوں کی صلاح ہے، لیکن مجھے سمجھاؤ کہ یہ کیسے ہوگا؟" چھاکا اڑ گیا۔

"یار سچ پوچھو تو ہمیں بھی پتہ نہیں کہ یہ کیسے ہوگا، لیکن

معلوم ہوتا ہے اور مستقبل کی سوچ بھی وہی جاتی ہے۔"

"مقام آپ کا..." میں نے پوچھنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولے۔

"نیکی اور شیطان کی کشمکش جاری رہے گی۔ جتنا خود کو مضبوط رکھے گا، تیرے اندر جتنی پاکیزگی آئے گی، تو اتنا ہی مضبوط ہوگا۔ اپنی اور اپنے اندر پڑے قطرے کی حفاظت کرنا، تیری حفاظت خود بخود ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر انہوں نے جسپال کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تیرے پریوار کے ساتھ بہت ظلم ہوا، تیرے دشمن تجھ سے بہت بھاری ہیں پر بیرا سنگھ کی مدد کا اسے حق تو ملنا ہے نا۔ جاؤ، میرا رب تم دونوں کے ساتھ ہے۔" انہوں نے کہا اور مسافر شاہ کے تھڑے سے اتر گئے۔ وہ کچھ دور تک تو دکھائی دیے پھر معدوم ہو گئے۔ ان کے پاؤں تلے روشنی جاگ اٹھی۔ وہ اس لکیر پر چل پڑے۔ پھر لمحوں میں دونوں نگر میں تھے۔

☆......☆......☆

اس رات کا باقی حصہ ہم دونوں نے اپنی آنکھوں ہی میں کاٹا۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ جیسے میری طرح جسپال کو بھی نیند نہیں آئی، ویسے ہی سوال اس کے ذہن میں بھی ہوں گے۔ مگر ہمارے درمیان خاموشی ہی رہی، ایک لفظ تک کا تبادلہ نہیں ہوا۔ ہم کروٹیں بدل بدل کر تھک گئے تو میرے ساتھ ہی وہ بھی اٹھ گیا۔ میں جو ایک ذرا سی اجنبیت اس سے محسوس کرتا تھا، وہ اب نہیں رہی تھی اور مجھے پورا یقین تھا کہ اس کے من سے بھی اجنبیت نکل گئی ہوگی۔ ابھی سورج نکلنے کے آثار ہویدا نہیں ہوئے تھے، میں نے بائیک نکالا اور ہم ڈیرے پر چلے گئے۔ اس صبح میں نے پہلی بار نور نگر کو نئے انداز سے دیکھا۔ یہی جگہ کبھی رام گڑھ ہوا کرتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ زمین چالیس برس بعد اپنا مالک بدل لیتی ہے۔ یہاں تو بستی ہی کا رنگ ڈھنگ بدل گیا تھا۔ کھنڈر کس نے آباد کیے کوئی پتہ نہیں، ممکن ہے قیام پاکستان کے بعد یہاں کے لوگ چلے گئے ہوں۔

دشمنوں کی سازش نہ صرف ناکام ہوگی بلکہ یہ انہی پر الٹ جائے گی یہ میرا گمان کہتا ہے۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو ایک دم سے خاموش ہوگیا، اس کے چہرے سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے وہ مطمئن نہیں ہوا۔ تبھی اس نے دھیمے سے لہجے میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں جاتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ جیدہ اپنے کام کاج میں مصروف تھا۔ ہم بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگے۔

سورج نکلنے پر ہم واپس گھر کی جانب لوٹ آئے۔ اماں اور سوہنی ناشتہ تیار کیے بیٹھی تھیں۔ میں نے اور جسپال نے نہا دھو کر اچھے کپڑے پہنے اور ڈٹ کر ناشتہ کر کے باہر نکلنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ہمارا گیٹ بجا۔ میں اٹھ کر باہر گیا تو سامنے ایک نوجوان دیہاتی لڑکی اور ایک تنومند جوان کھڑا تھا۔ لڑکی نے ہمارے ہی علاقے کی عورتوں جیسا لباس پہنا ہوا تھا، سر پر بڑا سا سرخ آنچل تھا۔ جوان نے بوسکی کی قمیص پہنی اور لٹھے کی چادر باندھی ہوئی تھی۔ ان سے ذرا فاصلے پر بائیک اسٹینڈ پر لگی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں ان سے پوچھتا، وہ لڑکی بولی۔

''جمال بھائی، ہم تم سے ملنے آئے ہیں۔ اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے؟''

''مگر میں تم لوگوں کو جانتا نہیں، پہچانتا نہیں، تم لوگ ہو کون؟'' میں نے دونوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ جوان بولا۔

''جمال بھائی کہیں بیٹھ کر بات کریں؟''

''آؤ......'' میں ان دونوں کو غور سے دیکھتا ہوا اندر لے گیا۔ میں مجبور تھا کہ یوں کسی اجنبی کو اپنے گھر میں لا رہا ہوں، ممکن ہے اس کے پاس اسلحہ ہو، کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر نجانے کیوں میرے دل نے گواہی دے دی تھی کہ ان پر اعتماد کر لیا جائے۔ وہ دونوں ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ جسپال انہیں دور کھڑا غور سے دیکھ رہا تھا۔

''باتیں بعد میں کرتے ہیں، پہلے بتاؤ کیا کھاؤ پیو گے۔'' میں نے پوچھا۔

''سب کچھ کھائیں پئیں گے جمال بھائی لیکن پہلے یہ تو جان لو کہ ہم ہیں کون؟''

''تو بتا دو، یہ تو تم دونوں ہی نے بتانا ہے نا؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں پروین ہوں اور یہ میرا منگیتر ذوالفقار عرف زلفی۔ اسے تو تم پہلی بار دیکھ رہے ہو گے لیکن مجھے آپ نے ایک بار دیکھا ہوا ہے، میرے ذہن میں تھا کہ میرا چہرہ تمہیں یاد ہوگا۔'' پروین نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''کہاں دیکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شاہ زیب کے ڈیرے پر، یاد ہے تمہیں وہاں ایک کمرے میں ایک بوڑھا آدمی اور دو لڑکیاں بندھی ہوئی ملی تھیں۔ جنہیں تم نے بڑی عزت کے ساتھ واپس بھیجا تھا۔'' پروین کے یاد دلانے پر میرے ذہن میں فوراً آ گیا۔

''ہاں مجھے یاد آ گیا، کیا وہ تم تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ان میں ایک لڑکی میں تھی اور دوسری اس زلفی کی بہن اور اس کا باپ تھا۔'' پروین نے بتایا تو زلفی بولا۔

''جمال بھائی! میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ تو نے میری بہن اور باپ کے ساتھ میری منگیتر کی بھی مدد کی اور انہیں حفاظت سے گھر بھیجا۔'' زلفی نے ممنونیت سے کہا تو میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''یار اتنے عرصے بعد؟''

''میں یہاں نہیں تھا۔ اگر یہاں ہوتا تو ان بے غیرتوں کی جرأت نہ ہوتی۔ مجھے یہاں آئے ہوئے صرف تین دن ہوئے ہیں اور اب بھی دیکھنا میں کیا کرتا ہوں۔'' وہ یوں بولا جیسے اپنے آپ پر قابو پا رہا ہو۔ تب میں نے پوچھا۔

''اتنا عرصہ سے کہاں ہو؟''

''جیل میں، سزا کاٹ رہا تھا۔ تین دن پہلے رہائی ہوئی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا، کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''قتل کیے تھے۔ خیر، وہ کیس تو نہیں بڑا مجھ پر بچ گیا

ہوں، ڈکیتی پڑ گئی تھی۔ اسی کی سزا کاٹی ہے۔ پر دشمنوں نے میرے باپ سمیت میری بہن اور میری منگیتر پر بڑا ظلم کیا انہوں نے۔" یہ کہہ کر وہ پھر یوں ہو گیا جیسے خود پر قابو پا رہا ہو۔

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں جمال بھائی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ چارپائی سے نیچے بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"زلفی نے آج تک کسی کے سامنے ہاتھ نہیں جوڑے، پر میں ہاتھ باندھ کر تم سے منت کر رہا ہوں کہ مجھے کوئی کام بتا، کسی دشمن کا پتہ دے۔ میں تیرا احسان مند ہوں۔ جو تو نے مجھ پر احسان کیا ہے، میں اس کا بدلہ تو نہیں دے سکتا، پر جان تو دے سکتا ہوں۔ میری بہن اور منگیتر کی عزت کی تم نے، بتا جمال بھائی بتا، میں تیرے کسی بھی کام آ سکتا ہوں۔ سمجھ لو کہ میں تیرا زر خرید ہوں۔"

"پہلے تم چارپائی پر تو بیٹھو۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو وہ اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا، پھر بولا۔

"مجھے جیل ہی میں ساری بات معلوم ہو گئی تھی۔ تب سے میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ پہلے تیرے کام آؤں گا، پھر اس بے غیرت وقاص کی....." یہ کہتے ہوئے اس نے دانت پیس کر گالی دے ڈالی تو میں نے پوچھا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وقاص پیرزادہ نے ہی اپنے بندے بھیجے تھے اور انہی کے ہاتھ انہیں واپس اپنے گھر....."

"نہیں، اصل میں وہی بندہ تھا۔ یہ شاہ زیب تھا یا پیرزادہ وقاص، چوہدری شاہنواز تھا یا سردار کھرل یہ سب ایک ہی ہیں۔ ان سب نے علاقے کو اپنے قبضے میں لیا ہوا ہے۔ میں نے بندے سردار کھرل کے مارے تھے۔ اس نے پیرزادہ وقاص سے کہہ کر انہیں گھر سے اٹھوایا، شاہ زیب کے ڈیرے پر رکھا تا کہ اگر میں واپس آ بھی جاؤں تو ان سب کا مقابلہ نہ کر سکوں۔ میرے دشمن یہ سب ہیں۔" زلفی نے کہا تو میں ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گیا۔ کہیں یہ کوئی سازش تو نہیں ہے؟ میں اس معاملے میں خاموش رہا اور بولا۔

"زلفی، رب نے مجھے اتنا حوصلہ دیا ہے کہ میں اپنی حفاظت کر سکوں۔ مجھے تم سے کوئی کام نہیں لینا اور نہ ہی میرا کوئی ذاتی دشمن ہے۔ تو جو چاہے سو کر۔"

"لیکن ایک شرط پر؟" یہ کہہ کر اس نے میرے چہرے پر دیکھا۔

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"جب بھی میری ضرورت پڑے۔ مجھے آواز ضرور دے لینا۔ رب کی قسم تجھ سے پہلے جان دوں گا، یہ زلفی کا وعدہ ہے۔"

"دیکھ جمال بھائی، اس کے جیل سے آنے پر ہم نے شادی کرنا تھی، لیکن اب یہ آیا ہے تو ہم دونوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب تک اپنے دشمن ختم نہ کر لیں، ہم شادی نہیں کریں گے۔"

"یار، دعا کر کہ ایسا ہو ہی نہ، خیر تو بیٹھ میں تیرے لیے کچھ لاتا ہوں۔" میں یہ کہہ کر اٹھنے لگا تو جسپال ٹرے پکڑے ہوئے آتا دکھائی دیا۔ اس نے کھانا ان کے سامنے رکھ دیا اور میرے ساتھ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پروین سے بولا۔

"تو اندر جا اماں کے پاس، وہیں ادھر بیٹھ کر کھا لے، اماں نے کہا ہے۔"

زلفی کھاتے ہوئے اپنی جیل کی روداد سنانے لگا۔ وہ وجہ بتانے لگا جس باعث اسے قتل کرنا پڑے۔ وہ کھا چکا تو کچھ دیر بعد پروین بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ایسے میں چھاکا آ گیا۔ جیسے ہی وہ گیٹ سے اندر آیا اور اس کی نگاہ زلفی پر پڑی تو وہ بری طرح چونک گیا۔ میں نے اس کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ اس نے بائیک کھڑی کی اور سیدھا اس کی طرف آیا۔ تب تک زلفی بھی اٹھ گیا۔ وہ دونوں یوں گلے ملے جیسے صدیوں کے بچھڑے ہوئے ہوں۔ میں نے چھاکے سے پوچھا۔

"تو جانتا ہے اسے؟"

”ارے یار، یہ بھی تو ہے زلفی ڈکیت۔“ چھاکے نے بتایا تو ایک دم سے میرے ذہن میں یہ نام گونج گیا۔ اس کے بارے میں سنا ہی کرتا تھا، کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اس کی اس علاقے میں کبھی بڑی دہشت ہوا کرتی تھی۔ وہ ان نوجوانوں کے لیے بڑا ہیرو تھا جو کسی نہ کسی طرح جرائم کی دنیا میں قدم رکھنا چاہتے تھے۔ جہاں تعلیم نہ ہو وہاں جرائم پیشہ زیادہ ہوتے ہیں۔ اور انہیں پیدا کرنے والے یہی جاگیردار، وڈیرے اور زمیندار ہوتے ہیں۔ کچھ دیر بعد چھاکے کو معلوم ہو گیا کہ وہ کس وجہ سے میرے پاس آیا ہے۔

”یہ کب سے تیرا جاننے والا ہے، تُو نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔“

”کافی عرصے سے ہم نے ایک دوسرے سے کام لیے ہیں۔ پر اتنا واسطہ نہیں تھا۔ میں اس تعلق کو چھپا کر ہی رکھتا رہا ہوں، اس جیسے اور پتہ نہیں کتنے تعلق ہیں، اب کس کس کا ذکر کروں۔“ چھاکے نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

”ہاں، تو بتا، کیا کر آیا ہے؟“

”ان سب لوگوں کو پیغام دے آیا ہوں۔ آگے سے کوئی حیران ہوا اور کوئی مسکرا دیا۔ اب پتہ نہیں ان لوگوں کے دل میں کیا ہے۔“ چھاکے نے کہا تو زلفی نے تجسس سے پوچھا۔

”میں پوچھ سکتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے؟“

اس پر چھاکے نے مختصر انداز میں اس سے کہہ دیا تو وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”میں سمجھ گیا ہوں کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ بس ذرا سی تصدیق کرنا ہوگی۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے کہا۔

”جمال بھائی، تم جانتے ہو، ذخیرے میں پیرزادے نے اپنا ایک نیا ٹھکانہ بنا لیا ہے؟“ اس نے بتاتے ہوئے پوچھا تو اس نے تفصیل بتا دی۔

”میں اس کے بارے میں جہاں تک ہو سکتا تھا، چیل میں خبر رکھتا تھا۔ کئی شکی ساتھی اس کے بارے میں بتا دیتے تھے۔ مجھے کوئی تین مہینے پہلے ایک خبر ملی تھی کہ اس نے ذخیرے میں بندے رکھے ہیں۔ وہ سارے ہی اشتہاری ہیں۔ ان سے وہی ڈکیتی، قتل اور ایسی ہی وارداتیں کروا رہا ہے۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ ایک دم وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔“

”وہ جدی پشتی زمیندار ہے۔ اور......“ چھاکے نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

”وہی تو، پہلے بھی وہ ایسا ہی تھا۔ لیکن اب یا تو اس پر کسی کا ہاتھ ہے یا پھر کوئی وقت اس کے ساتھ آ ملی ہے۔ پہلے اتنا حوصلہ نہیں تھا اس میں، پہلے بھی تو یہ ذخیرہ اسی کی ملکیت تھا۔“ زلفی نے اپنے طور پر تجزیہ کیا۔

میں اس ذخیرے کے بارے میں جانتا تھا۔ ایک دو بار میں شکار کرنے اس طرف گیا تھا۔ وہ درختوں سے بھرا ایک جنگل تھا۔ پہلے وہ قدرتی تھا، بعد میں دریا کی زمین پر ناجائز قبضہ کر کے اسے پھیلا کر مصنوعی جنگل بنایا گیا۔ جس سے لکڑیاں فروخت کی جاتی تھیں۔ اس کے ایک طرف سڑک تھی۔ خاصا جنگل پار کرنے کے بعد دوسری جانب دریائے ستلج تھا۔ اگر ایک طرف سے خطرہ ہوتا تو وہ لوگ دوسری طرف نکل جاتے تھے۔ پہلی تو بات یہ ہے کہ اس طرف کوئی جاتا ہی نہیں تھا۔ ممکن ہے اب پیرزادہ وقاص نے اپنے مقصد کے لیے بندے وہاں رکھ چھوڑے ہوں۔ ان کے ڈیرے پر بھی تو ایسے کئی بندے پڑے ہی رہتے تھے۔

”ایسے میں جبکہ وہ اتنا طاقتور ہو گیا ہے، تو کیا کرے گا۔“ میں نے پوچھا۔

”یہی تو میں نے تصدیق کرنی ہے، اگر اس نے میرے ساتھ منافقت کی ہے تو میں کیوں نہ کروں اور میں نے تو وقاص کو مارنا ہی مارنا ہے، جب بھی موقع ملے، چاہے آج ہی۔“ زلفی تیزی سے بولا۔

”چلو دیکھتے ہیں کیا کرتا ہے تو؟“ میں نے کہا تو اس نے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔

''جمال بھائی! تو میرا محسن ہے۔ میری جان بھلے چلی جائے، پر بس چلے نا تو تجھ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ چھاکا جانتا ہے میرے بارے میں۔''

''فون ہے تیرے پاس؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ہے۔'' اس نے بتایا تو میں نے کہا۔

''رابطہ رکھنا۔ پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔'' میں نے کہا اور بات ختم کردی۔ وہ بھی سمجھ گیا۔ وہ پروین کے آنے تک انتظار کرتا رہا، وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا آنچل تھا۔ پروین وہ زلفی کو دکھاتے ہوئے بولی۔

''اماں نے دیا ہے، کہہ رہی تھی کہ تم پہلی بار ہمارے گھر آئی ہو۔''

زلفی نے میری طرف دیکھا اور شدت جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ہمارے علاقے میں رواج تھا کہ جب بھی کسی کو گھر سر پر ڈالنے والا آنچل، دے دیا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے بیٹی یا بہن کے طور پر عزت دی گئی ہے۔ میں نے پروین کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار دیا تو زلفی میرے گلے ملا۔ پھر اس کے بعد وہ چلے گئے۔ نجانے کیوں مجھے زلفی پر اعتماد ہو رہا تھا۔

ہم تینوں ذرا اطمینان سے بیٹھے تو میں نے چھاکے سے کہا۔

''اس علاقے میں جب شاہ زیب نہیں رہا، چوہدری شاہنواز بھی پکڑا گیا ہے۔ کبھی پیرزادہ وقاص چاہتا تھا۔ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ شاہ زیب کے بارے میں سازش کا گواہ تو میں خود ہوں۔''

''اسے گمان بھی نہیں تھا کہ تم اس طرح واپس آؤ گے اور حویلی کے ساتھ ساری جائیداد بھی تیرے اشارے پر ہوگی۔ اب وہ تمہیں اپنے راستے کا کانٹا سمجھ رہا ہے۔ اور سازش ہی کے ذریعے ہی ختم کرنا چاہتا ہے۔'' چھاکے نے جواب دیا تو جسپال بولا۔

''یار تم لوگ کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ ابھی جاتے ہیں اور اس کا کام ہی ختم کردیتے ہیں۔ نہ وہ رہے گا اور نہ کوئی سازش۔''

''یہ بہت آسان ہے، لیکن اس کے بعد ہم بھی انہی میں سے ہی ہو جائیں گے۔ ضرورت ہوئی تو یہ کام بھی ہو جائے گا۔ ہم نے یہاں رہنا ہے جسپال، اور علاقے میں اپنی ساکھ بنانی ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ دشمن سانپ کی مانند ڈنگ مارے گا۔ فی الحال سانپ کا زہر نکالنا ہے، اس کا سر نہیں کچلنا۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ الجھتے ہوئے بولا۔

''مجھے تمہاری منطق کی سمجھ نہیں آتی، میں تو کہتا ہوں کہ عوام کو پتہ چلنا چاہئے کہ ہم ان سانپوں کا نہ صرف زہر نکال سکتے ہیں بلکہ ان کا سر بھی کچل سکتے ہیں۔''

''نہیں، ہم نے خوف کی فضا طاری نہیں کرنی۔ ایسا ظالم لوگ کرتے ہیں۔ ہمارا مقصد تو لوگوں کو شعور دینا ہے، انہیں بتانا ہے کہ ان کا حق کیا ہے۔ فطرت نے انہیں جو انہیں آزادی دی ہے، وہ اس کے مطابق جئیں۔ ہمیں لوگوں کی محبت چاہئے۔'' میں نے کہا تو جسپال کاندھے اچکا کر رہ گیا۔

''تو محبت صاحب، پھر کرنا کیا ہے؟'' چھاکے نے پوچھا۔

''ابھی تم نے صرف یہ کرنا ہے کہ علاقے میں اپنے لوگوں کو پھیلا دو، پتہ کرو کہ آخر وہ کر کیا رہا ہے؟''

''سمجھو ہوگیا۔'' چھاکے نے کہا۔

''تم یہ کرو، میں اور جسپال افضل رندھاوے سے مل کر آتے ہیں۔'' میں نے کہا تو اس نے غور سے مجھے دیکھا اور سمجھ گیا کہ میرا اس سے ملنا ضروری ہے۔ میں نے سیل فون نکال کر رندھاوے کا نمبر پش کیا۔ اس کا فون بند تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد فون کرنے کا سوچ کر سیل جیب میں رکھ لیا۔ پھر جسپال کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چل، حویلی کی خبر لیں، ادھر جاکر بیٹھ پہ بھی کچھ دیکھتے ہیں۔''

میرے یوں کہنے پر وہ اٹھا اور گاڑی نکالنے چل دیا۔ میں نے اندر جا کر سوہنی سے پوچھا کہ وہ جانا چاہے گی؟

وہ بھی تیار ہوگئی۔ ہم نے اماں کو بھی ساتھ لیا اور حویلی چلے گئے۔

بظاہر سکون تھا۔ کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ صرف میلے والی بات سامنے تھی۔ میں حویلی کے لان میں اسی چھتری تلے بیٹھا ہوا تھا، جس کے نیچے کبھی شاہ دین بیٹھا کرتا تھا۔ میرے پاس جسپال اور تانی بیٹھے ہوئے تھے، ہمارے درمیان یونہی گپ شپ چل رہی تھی۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ مجھے افضل رندھاوے کو فون کرنا ہے۔ میں سیل نکالا اور رابطہ کیا۔ لمحوں میں اس سے رابطہ ہو گیا۔

"بڑی عمر ہے جمال تمہاری۔ میں ابھی تمہیں فون کرنے والا تھا۔" اس نے پرجوش لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

"خیر تو ہے نا؟"

"ہے بھی اور نہیں بھی، یہ تو وقت بتائے گا، ویسے خبر سن لو، چوہدری شاہنواز کی ضمانت ہوگئی ہے، ابھی کچھ دیر پہلے۔ شاہ زیب اور ملک سجاد اسے لینے عدالت میں آئے ہوئے تھے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ تینوں اب اکٹھے جائیں گے۔" اس نے بتایا۔

"تیرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چوہدری شاہنواز، ملک سجاد اور شاہ زیب ایک ہوگئے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"جی، اور دوسری اطلاع یہ ہے کہ شاہ زیب اب اپنی زمین واپس لے گا اور پوری طرح سوہنی بی بی کا مقابلہ کرنے آرہا ہے۔" اس نے مزید کہا تو میں نے پوری توجہ سے پوچھا۔

"یہ اطلاع دی کس نے؟"

"یار میرے بندے ہیں نا ان کے ارد گرد، خیر تم گھبرانا نہیں، میری بات ہوگئی ہے، کچھ دیر بعد کوئی نہ کوئی بندہ تمہارے پاس ضرور پہنچے گا۔"

"ٹھیک ہے میں انتظار کروں گا۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جسپال اور تانی میرا چہرہ دیکھ کر اندازہ لگا چکے تھے کہ بات کس نوعیت کی ہوگی۔ میں نے کال کی تفصیل بتائی تو جسپال نے کہا۔

"میرے خیال میں یہ اچھا نہیں ہوا کہ دشمن خود ہی چل کر ہمارے پاس آرہا ہے۔"

"لیکن اس کے لیے پوری پلاننگ کی ضرورت ہوگی۔ خیال رہے کہ تینوں نے اپنے طور پر انتقام لینا ہے، اور وہ کسی حد تک بھی جاسکتے ہیں۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"چل، دیکھ کون تجھ سے آکر بات کرتا ہے۔ پھر اپنی پلاننگ کریں گے۔" تانی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں ہنس دیا۔ پھر بولا۔

"یہ سارا کچھ جو ہو رہا ہے، یہ سارے حالات جو بن رہے ہیں، کیا ہم نے بنائے ہیں؟"

"نہیں تو؟" تانی نے کہا۔

"تو پھر سوچنا کیسا؟ حالات جیسے بھی ہوں، ہم نے اپنا دفاع کرنا ہے۔ ہمارا مقصد صرف فتنے کو ختم کرنا ہے۔" میں نے کہا تو وہ ماحول جو ایک دم سے کھردرا ہو گیا تھا، وہ ٹھیک ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ ہم باتیں کرتے، باہر سے ملازم نے آکر بتایا کہ کوئی صاحب ہیں جو مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک خاتون بھی ہے۔

"کون ہیں یہ؟" پوچھا۔

"شکل سے وہ غیر ملکی لگتے ہیں، یہاں کے نہیں ہیں۔" ملازم نے کہا۔ تبھی تانی نے تیزی سے کہا۔

"اسے اچھی طرح چیک کر کے گاڑی وہیں کھڑی کر لینا اور انہیں ادھر بھیج دو۔"

"ٹھیک ہے جی۔" ملازم نے کہا اور واپس مڑ گیا۔ ٹھیک انہی لمحات میں جسپال کا فون بج اٹھا۔ اس نے اپنا سیل دیکھا اور ماتھے پر تیوریاں ڈالتے ہوئے کہا۔

"نمبر کوئی نہیں ہے، شاید روہی سے ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اسپیکر آن کر کے فون کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو جسپال۔ جسمیندر بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف سے آواز آئی تو جسپال نے پوچھا۔

"او جسمیندر، کیا حال ہے تیرا، کدھر ہو؟ اور اتنے

عرصے بعد کال کی؟"

"میں، اوھر کینیڈا میں ہوں۔ کال اس لیے کی کہ ابھی تمہارے گیٹ پر، بلکہ، جمال کے گیٹ پر، نہیں میرا مطلب ہے سوشی بی بی کی حویلی کے گیٹ پر دو مہمان آ کر رکے ہیں۔ وہ اپنے ہی بندے ہیں۔" جمشید رنے ایک ہی سانس میں اپنی معلومات بتانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جتادیا کہ ہمارے بارے میں سب جانتا ہے۔

"کون ہیں وہ، کس لیے آئے ہیں وہ؟" جسپال نے تیزی سے پوچھا۔

"اپنے ہی لوگ ہیں، دوست ہیں میرے اور وہ جو بات کریں گے، وہ خود ہی کریں گے۔ حالات جو بھی ہوں، مجھے یقین ہے کہ تم سب ان کے ساتھ سلوک اچھا کرو گے، وہ مہمان ہیں تمہارے۔" جمشید رنے دوسرے لفظوں میں ہمیں احساس دیا کہ اگر بات سمجھ میں آتی ہے یا نہیں آتی، ان کے ساتھ اچھا ہی برتاؤ کیا جائے۔

"ٹھیک ہے، میرے خیال میں وہ آ گئے ہیں۔" جسپال نے دور سے ایک نوجوان جوڑے کو آتا دیکھ کر کہا تو جمشید ر بولا۔

"بعد میں کال کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔

میرے سامنے ان کے درمیان پختہ راہداری پر نوجوان جوڑا چلا چلا آ رہا تھا۔ لڑکے نے رائل بلیو سوٹ کے ساتھ ہلکی نیلی شرٹ اور سرخ ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ لمبے قد کا کسرتی بدن والا، اس کے ساتھ سفید کرتا، کالی جینز والی لڑکی تھی جس کے بال بوائے کٹ تھے۔ اس نے سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔ ایک چھوٹا سا بیگ کاندھے پر تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر سیدھے ہی ہماری طرف آ گئے۔

"تائی، ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔" جسپال نے کہا تو تائی اٹھ کر دور چلی گئی۔ وہ وہاں سے ہٹی نہیں بلکہ فون پر ہی سب کہہ دیا۔ وہ ان کی طرف سے الرٹ تھی، تائی کی یہ ادا مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ نوجوان نے آتے ہی اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور انگریزی میں بولا۔

"ہیلو میں جان ہوں، برطانیہ سے۔ تم جسپال ہو نا اور یہ جمال۔"

"میں جسپال ہی ہوں۔" اس نے ہاتھ ملایا تو جان نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھا دیا

"میں کرسٹینا فرانس سے۔"

وہ دونوں ہاتھ ملا کر بیٹھ گئے تو نوجوان نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ سے پہلے کبھی نہیں ملا، مگر آپ کے بارے میں مجھے بتایا ضرور گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جمشید ر نے ہمارے بارے میں آپ کو فون کر دیا ہوگا۔" اس نے تصدیق کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بتا دیا ہے۔ لیکن اس نے تم دونوں کی آمد کا مقصد نہیں بتایا۔" جسپال نے کہا۔

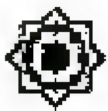
"اگر آپ کو جلدی ہے تو میں چند منٹ میں اپنی بات ختم کر دیتا ہوں لیکن اگر مجھے اپنی بات سمجھانے کا موقعہ دیں گے تو میں پوری تفصیل سے بات کہوں گا بھی اور اگر آپ چاہیں گے تو میں سمجھانے کی کوشش بھی کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، تم اطمینان سے اپنی بات کہو۔" جسپال نے کہا تو اسی دوران میرا سیل فون بج اٹھا۔ وہ چھاکے کی کال تھی۔ میں نے فون رسیو کیا تو چھاکے نے تیزی سے کہا۔

"اوئے زخمی نے کارروائی ڈال دی، اس نے وقاص کو گولیاں ماردی ہیں۔"

یہ خبر ہلا دینے والی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی، میں اس اطلاع پر کیسے ردعمل کا اظہار کروں۔

باقی ان شاءاللہ آئندہ ماہ



کبوتر کی چوری

ریاض بٹ

اس دور کا احوال جب پولیس کو نہ ٹیلی فون کی سہولت حاصل تھی نہ جدید آلات تفتیش کی، وہ صرف اور صرف اپنی عقل اور انسانی نفسیات کے سہارے مجرموں تک پہنچ جاتی تھی۔
نئے افق کے سب سے زیادہ پسند کیے جانے والے صفحات۔

کچھ عرصہ پہلے ایک دن میں جاگتے ہوئے آنکھوں سے اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک خبر پر میری آنکھیں ٹھہر گئیں، جس طرح کسی عاشق کی نگاہیں اپنے محبوب پر ٹھہر جاتی ہیں اور وہ پلکیں جھپکانا بھول جاتا ہے لیکن میں نے دو آنکھیں یعنی اپنی عینک اتاری ان کے شیشوں کو صاف کیا اور غور سے خبر پڑھنے لگا......

"بلی کار کھا گئی۔"

ایک سیٹھ صاحب جو جانوروں کی لڑائی دیکھنے کے حد درجہ شائق تھے (اور جنہوں نے خود بھی چند مرغ، بٹیر اور کتے پالے ہوئے تھے) ایک دن اپنی کار میں بیٹھے کہیں کسی کام سے جا رہے تھے کہ ایک جگہ کافی لوگوں کو اکٹھا دیکھ کر اپنے ڈرائیور سے کار روکنے کو کہا جونہی کار رکی انہوں نے ڈرائیور سے کہا۔

"جاؤ دیکھو یہاں کیا ہو رہا ہے؟" ڈرائیور نے واپس آ کر بتایا کہ بٹیروں کی لڑائی ہو رہی ہے سیٹھ صاحب ڈرائیور کے ساتھ خود اس جگہ گئے اور انہماک کے ساتھ لڑائی دیکھنے لگے ان کے سامنے ایک بٹیر نے چار پانچ بٹیروں کو بھگا دیا۔ انہوں نے بٹیر کے مالک سے کہا۔

"یہ بٹیر مجھے دے دو میں منہ مانگی قیمت دوں گا۔" اس نے انکار کر دیا۔ سیٹھ صاحب نے خود بٹیر کی قیمت لگائی اور اس میں اضافہ کرتے رہے جب بٹیر کا مالک پھر بھی انکار پر قائم رہا تو سیٹھ صاحب غصے میں آ گئے اور بولے۔

"تم قیمت بتاؤ۔ میں ہر قیمت پر بٹیر خریدوں گا۔" بٹیر کے مالک نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا اگر آپ مجھے اپنی کار دے دیں تو......

سیٹھ صاحب نے اس کی خواہش پوری کرتے ہوئے بٹیر لے لیا۔ دو دن بعد ایسا ہوا کہ بلی بٹیر کھا گئی۔

قارئین یہ تو ایک خبر تھی اس میں مبالغہ آرائی بھی ہو سکتی ہے لیکن اس خبر کو پڑھ کر مجھے اپنی ایک تفتیشی کہانی یاد آ گئی اور میں نے اپنی ڈائریوں کو کھنگالنا شروع کر دیا اور آخر کافی تگ و دو کے بعد مطلوبہ کہانی مجھے مل گئی۔ لیجیے آپ کی نذر کرتا ہوں۔

اس دن میں جب تھانے پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ ایک صاحب حیثیت بندہ کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہا ہے، میں نے اس کے انتظار کی گھڑیوں کو ختم کرنے کے لیے اسے بلوا لیا۔

جب وہ میرے کمرے میں داخل ہو کر میرے کہنے پر میرے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا تو میں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا، وہ تیکھے نقوش والا ایک سانولا سا بندہ تھا۔

ایسے تیکھے نقوش مردوں میں کم ہی ملتے ہیں، جسم درمیانہ اور عمر پچاس کے قریب لگتی تھی، چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے اس کی کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو۔ ویسے دیکھنے میں وہ کافی چاک و چوبند اور صحت مند لگتا تھا، میں نے نرم لہجے میں اس سے آنے کا مقصد پوچھا۔

"جناب! بات ایسی ہے کہ......" وہ خاموش ہو گیا اور اپنے ہاتھوں کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے ان سے کہہ رہا ہو

تم ہوا ہو۔

میں نے لہجے کو ذرا خشک کرتے ہوئے کہا۔ ”جب آپ یہاں تک آ ہی گئے ہیں تو کچھ بتائیں بھی۔“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور دکھی لہجے میں بولا۔

”تھانیدار صاحب! میرا کبوتر کھو گیا ہے بڑا قیمتی کبوتر تھا۔ چند دن پہلے ایک بندہ مجھے دس ہزار دے رہا تھا۔“ آج کل دس ہزار کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب ان پیسوں سے آپ دس مرلے کا پلاٹ خرید سکتے تھے۔

”اچھا۔“ میں نے اسے گھورا۔ ”اب ہم اس کام کے لیے رہ گئے ہیں۔“

”جناب مجھے اپنی جان کا بھی خطرہ ہے۔“

”وہ کیسے؟“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

پھر اس نے جو کہانی سنائی وہ میں آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں۔

بندے کا نام تیمور تھا وہ صاحب حیثیت تھا اسی شہر میں صابن بنانے کا اس کا کارخانہ تھا۔ بقول اس کے وہ عرصہ تیس سال سے کبوتر بازی کر رہا تھا اس کے پاس کافی نایاب نسل کے کبوتر تھے جو کبوتر کھو یا تھا وہ بھی ایک نایاب یا کمیاب نسل کا تھا۔ اس کبوتر نے ہزاروں کی بازیاں جیتی تھیں اور یہ کبوتر اسے جان سے بھی پیارا تھا۔ چند دن پہلے ایک اسی طرح کا صاحب حیثیت آدمی اس کے پاس آیا اور کہنے لگا یہ کبوتر مجھے دے دو میں منہ مانگی قیمت دوں گا لیکن تیمور نے انکار کر دیا۔ وہ آدمی بھی اس کی طرح کوئی سرپھرا تھا جاتے جاتے دھمکی دے گیا کہ......

”نہ تم رہو گے اور نہ تمہارا کبوتر۔“

”اللہ کے بندے تم کبوتر اسے دے دیتے تو آج یوں پریشان تھانے میں نہ بیٹھے ہوتے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”تھانیدار صاحب! اس کبوتر میں تو میری جان تھی۔“ میں نے اسے محرر کے پاس بھیج دیا اور تھانے کے دوسرے کاموں میں الجھ گیا ایسے سرپھرے بندوں سے بحث کرنا فضول ہوتا ہے اور اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے تھے۔ لوگ دھمکیاں بھی دیتے رہتے تھے لیکن بہت کم یہ دھمکیاں اپنے انجام کو پہنچتی تھیں۔

علاوہ ازیں وہ کبوتر کے خریدار کو جانتا تک نہیں تھا صرف حلیہ اس کے ذہن میں نقش تھا۔ میں نے اس کو تاکید کی تھی کہ جان کو خطرے والی بات کے ساتھ اس بندے کا حلیہ بھی لکھوا دے کہ اس حلیے والے بندے نے مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔

ویسے یہ بات ہی بچکانہ اور مضحکہ خیز لگتی تھی کہ ایک کبوتر کی خاطر...... بہرحال ساتھ میں اگر انسان کی نفسیات کا مطالعہ کیا جائے تو کوئی بات بھی ناممکن نظر نہیں آتی اور ایسے شوقین مزاجوں سے تو بہ ہی بھلی۔

اے ایس آئی جب میرے کمرے میں آیا تو میں نے آج کا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”سر! لوگ اپنی محبوبہ یا بیوی کو جان کہتے ہیں یہ بندہ کبوتر کو......“

”بھئی اس دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک سرپھرا ہے۔“

”خیر یہ بات تو ہے سر! اور ہم پولیس والوں کا تو ایسے لوگوں سے پالا پڑتا ہی رہتا ہے۔“ اس نے حسب عادت ہاتھ سے اپنے بال سنوارتے ہوئے کہا اس کے بعد ہم دوسرے معاملات پر بات چیت کرنے لگے۔

یہ غالباً دو دن بعد کی بات ہے کہ ہمیں اطلاع ملی تیمور صاحب قتل ہو گئے ہیں اور لاش کارخانے میں پڑی ہے اطلاع کارخانے کا ایک ورکر لے کر آیا تھا۔ میں نے سپاہی کو ضروری تیاری کا حکم دیا۔

پھر تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم جائے وقوعہ پر موجود تھے کارخانہ بہت زیادہ بڑا یا وسیع نہیں تھا تقریباً دس مرلے میں عمارت تھی اور اس کے چاروں طرف باؤنڈری وال تھی۔ تقریباً اس کے کارخانے کا رقبہ چند دس مرلے ہوگا۔

لاش مشرقی دیوار کے ساتھ پڑی تھی اردگرد کافی خون پھیلا ہوا تھا اس کا گلہ کسی تیز دھار آلے سے کاٹا گیا تھا' شہ رگ کٹ گئی تھی وہ سردیوں کے آخری ایام تھے۔ صبح اور رات کو خنکی زیادہ ہوتی تھی لاش کے اردگرد جمے خون سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس شخص کو قتل ہوئے کم ازکم آٹھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔

اس کے نام پتے تو ہم واقف ہی تھے لیکن یہ بات ہمیں الجھا رہی تھی کہ تیمور رات اندازاً ایک بجے کارخانے میں کیوں آیا تھا۔ میرے ساتھ اس وقت سپاہی بشارت کے علاوہ کارخانے کا منیجر' پروڈکشن انچارج اور سیلز منیجر موجود تھا۔ ضروری کارروائی کے بعد میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادی اور سپاہی بشارت کو ساتھ ہی بھیج دیا۔

پھر ہم منیجر کے کمرے میں آکر بیٹھ گئے منیجر کا نام نوازش علی معلوم ہوا۔

''ہاں تو منیجر صاحب سب سے پہلے تو یہ بات بتائیں کہ رات کی شفٹ کو کون سپروائز کرتا ہے؟'' میں نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ نوازش علی ایک درمیانے قد کا گول مٹول سا بندہ تھا اس کے سر کے اوپر بہت کم بال تھے جن کو اس نے اپنی کھوپڑی کے اوپر تیل لگا کر کنگھے کی مدد سے بٹھایا ہوا تھا۔

اس نے چند لمحے میرے سوال پر غور کیا پھر گویا ہوا۔

''تھانیدار صاحب! رات کو ایاز فورمین (آج کل) سپروائز کرتا ہے۔''

یہاں میں ایک بات آپ کو بتادوں کہ اس وقت فیکٹری میں کام رکا ہوا تھا' تقریباً تیس کے قریب ورکرز تھے جن میں عورتوں کی تعداد دس کے قریب تھی جن میں زیادہ تر جوان تھیں' سب کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

''اچھا۔'' میں نے ہنکارا بھرا پھر پوچھا۔ ''رات کو کتنے ورکرز کام کرتے ہیں اور کیا ان میں عورتیں بھی ہوتی ہیں؟''

''جناب رات کو بھی تقریباً تیس ہی ورکرز کام کرتے ہیں' ہم ان کی شفٹیں بدلتے رہتے ہیں۔'' منیجر نے جواب دیا۔

''نوازش علی صاحب! آپ نے میرے سوال کا ادھورا جواب دیا ہے۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب تھانیدار صاحب؟'' وہ حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا پھر اپنے سر پر اس طرح ہاتھ پھیرنے لگا جیسے اندازہ کرنا چاہتا ہو کہ جو تھوڑے بہت بال ہیں کہیں وہ بھی تو نہیں اڑ گئے۔

''میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا رات کو بھی عورتیں کام کرتی ہیں؟''

''تھانیدار صاحب! ہماری تو مت ہی ماری گئی ہے۔'' پھر اس نے بتایا کہ صرف مرد ہی کام کرتے ہیں۔

''میں رات میں کام کرنے والے مزدور ورکرز سے بھی سوال و جواب کرنا چاہتا ہوں۔''

''اس کے لیے شام کا انتظار کرنا پڑے گا آپ کو کیونکہ رات کی ڈیوٹی والے ورکرز مختلف جگہوں پر رہتے ہیں' اس وقت ان سب کو اکٹھا کرنا مشکل ہے۔'' نوازش علی نے معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ میرا اے ایس آئی شام کے بعد آئے گا۔'' اس کے بعد فرداً فرداً وہاں موجود مرد و زن سے میں نے کچھ سوال کیے لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہوسکی۔ یہاں اے ایس آئی ابرار کا تھانے کا انتظام و انصرام سنبھالے ہوئے تھا۔

تھوڑی دیر بعد چائے کا دور چلا اور ہم تیمور کے قتل پر بات چیت کرنے لگے۔

''سر! اب کبوتر کی چوری کو بھی دیکھنا پڑے گا اور اس شخص کو بھی جس نے تیمور (جو اب مقتول تھا) کو جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔

''دیکھو ابرار! ہمارے پاس اس شخص کا صرف خاکہ ہے اس پر کام کرو۔'' میں نے چائے کی پیالی جو خالی ہوچکی تھی ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے سر!" ابرار نے بھی اپنی خالی پیالی ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا اور مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔ مجھے یہ بھی پتا چلا کہ تیمور کے دو بچے ہیں ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکی کی شادی ہو چکی تھی اور وہ باہر ملک اپنے خاوند کے ساتھ رہ رہی تھی اس نے اپنے بھائی کو بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے پاس بلا لیا تھا اور فی الفور ان کے آنے کا امکان بھی نہیں تھا۔ علاوہ ازیں مقتول کی بیوہ پر دو سال پہلے فالج کا حملہ ہوا تھا اور وہ چارپائی پر تھی۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کو خدا نے بے شمار دولت دی ہوتی ہے لیکن ان کے حالات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شام کو میں نے اے ایس آئی ابرار اور کانسٹیبل وزیر کو ساری بات سمجھا کر کارخانے میں بھیج دیا اور خود تھانے میں ہی بیٹھا رہا۔ مجھے ان کا انتظار تھا تقریباً دس بجے رات وہ آئے اور ابرار نے مجھے رپورٹ دی۔

ایک تو وہ کارخانے کی عمارت کو فی الحال سیل کر آیا تھا اور رات اور دن میں کام کرنے والے مرد و زن کے پتے نوٹ کرنے کے علاوہ انہیں پابند کر آیا تھا کہ وہ جب تک تیمور کے قاتل کا سراغ نہیں مل جاتا تھانے میں بتائے بغیر کہیں نہ جائیں۔

یہ تو ہماری مجبوری ہوتی ہے رپورٹ کے متعلق مختصراً میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔

تیمور (مقتول) ہفتے میں ایک دن ضرور رات کو کارخانے کا چکر لگاتا تھا لیکن اس کی وزٹ زیادہ سے زیادہ نو بجے ہوتی تھی۔ اس رات بقول چوکیدار (رات والے) اور فورمین ایاز کے تیمور کارخانے میں نہیں آیا تھا۔ رات والے ورکرز نے بتایا تھا کہ رات بارہ بجے سے دو بجے تک وہ چائے وغیرہ پیتے تھے اور آرام کرتے تھے پھر اٹھ کر اپنی اپنی پروڈکشن پوری کرتے تھے۔ رات کو کٹائی اور پیکنگ وغیرہ کا کام نہیں ہوتا تھا۔ یہ کام دن کو کام کرنے والی خواتین کرلی تھیں ایاز فورمین سمیت کسی نے بھی کارخانے کے مالک کو کل رات نہیں دیکھا تھا۔

معاملہ کافی پُراسرار تھا رات کی تاریکی میں کوئی کھیل کھیلا گیا تھا کیا مقتول دیوار پھلانگ کر آیا تھا؟ اور اگر دیوار پھلانگ کر نہیں آیا تھا تو کیسے آیا تھا؟ باؤنڈری وال کافی اونچی تھی اور اس کے اوپر خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں میں نے گھوم پھر کر دیکھ لیا تھا تاریں کہیں سے بھی کٹی ہوئی نہیں تھیں۔ دیوار پھلانگ کر آنے والی بات بالکل بچکانہ لگی تھی۔

پھر یہ سب کیا تھا؟ علاوہ ازیں ٹو کہ قتل بھی ہماقہ نہیں ہوا تھا۔ مقتول کے متعلق پتا چلا تھا کہ کافی رنگین مزاج تھا لیکن کارخانے میں کام کرنے والی کسی عورت کو اس سے شکایت نہیں تھی۔

خیر اس کے قتل کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور تھی اس کی بیوی (اب بیوہ) عرصہ دو سال سے فالج کے حملے کی وجہ سے بستر پر تھی۔ اس کا عورتوں کی طرف راغب ہونا کوئی عجوبہ نہیں تھا وہ دولت مند تھا اپنا شوق پورا کرسکتا تھا۔

خیر وہ جیسا بھی تھا اب قتل ہو چکا تھا ہم نے اس کے قاتل کو پکڑنا تھا۔

اس رات تقریباً گیارہ بجے میں آرام کرنے اپنے کوارٹر میں گیا اس لیے صبح ذرا دیر سے تھانے پہنچا۔

میں نے اپنے سامنے پڑے ضروری کاغذات کو نمٹا کر کانسٹیبل وزیر کو اپنے کمرے میں بلا لیا اور اس کے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی کہ وہ مقتول کے متعلق معلومات حاصل کرے وہ چلا گیا۔ شام کو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی اور ساتھ لاش بھی۔

لاش تو ضروری کارروائی (کاغذی) کے بعد لواحقین کے حوالے کردی اور خود پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پڑھنے لگا۔

مقتول کو تیز دھار آلے سے گلا کاٹ کر ہی قتل کیا گیا اور وقت رات ساڑھے بارہ بجے سے ایک بجے کے درمیان لکھا تھا شہ رگ کٹ جانے کی وجہ سے موت جلد ہی واقع ہوگئی تھی گویا پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے میرے بیشتر اندازوں کی تصدیق کردی تھی ابھی میں رپورٹ

پڑھ کر فارغ ہی ہوا تھا کہ اے ایس آئی ابرار میرے کمرے میں داخل ہوا۔

"ہاں بھئی کیا رپورٹ ہے؟" اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

رپورٹ پڑھ کر اس نے حسب عادت اپنے ہاتھ اپنے بال سنوارے اور بولا۔

"سر! میں نے نامعلوم آدمی کا خاکہ تیار کروا کے مختلف تھانوں کو بھجوا دیا ہے اِدھر اُدھر سے بھی معلومات حاصل کی ہیں لیکن فی الحال کوئی حوصلہ افزا رپورٹ نہیں ہے ویسے سر! ایک بات اور بھی ہوسکتی ہے۔"

"وہ کیا بھئی؟" میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"تیمور نے کسی خیالی بندے کا حلیہ ہمیں نہ بتایا ہو؟" آخر میں اس کا لہجہ خیال انگیز ہوگیا تھا۔

میں اس کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا لیکن وضاحت اسی سے سننا چاہتا تھا اس لیے بولا "مگر اس کی وجہ؟"

"سر! اس کا ایک قیمتی کبوتر چوری ہوگیا تھا اس لیے وہ چاہتا ہو کہ ہم اس کی تفتیش کریں' اس لیے یہ ممکن ہے کہ کسی بندے کا وجود ہی نہ ہو۔"

"کوڑی تو تم دور کی لائے ہو لیکن ایسا ہونا ممکن تو ہے اس لیے اب ہمیں واقعی کبوتر کی چوری والے معاملے کو بھی دیکھنا پڑے گا۔" اس قسم کی باتوں کے درمیان چائے کا دور بھی چلا۔

بہرحال یہ دو دن بعد کی بات ہے کہ ہم مقتول کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بیوہ کی دائیں ٹانگ اور بازو پر فالج کا حملہ ہوا تھا اس کی عمر چھیالیس سال کے قریب ہوگی۔ خوب صورتی اب بھی اس کے چہرے پر تھی بیماری نے اسے کافی لاغر کردیا تھا اور اس کی آنکھوں میں کرب ہلکورے لے رہا تھا۔

ہم نے پہلے تو اس سے اظہار افسوس کیا پھر اصل موضوع کی طرف آگئے۔

"بی بی! ہم آپ کے شوہر کو تو واپس نہیں لاسکتے لیکن اس کے قاتل کو گرفتار کرکے قرار واقعی سزا ضرور دلواسکتے ہیں۔" اے ایس آئی نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں آپ کی بات سمجھ گئی ہوں لیکن میں عرصہ دو سال سے بستر پر ہوں باہر کی دنیا سے میرا تعلق کٹ چکا ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں؟" خاتون عقل مند لگتی تھی۔

"صرف ہمارے چند سوالوں کے جواب دے دیں۔" میں نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پوچھیں۔" اس کی آواز بوجھل تھی اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"کیا کبوتر کی چوری کے متعلق آپ کو علم ہے؟"

"انہوں نے ذکر تو کیا تھا دراصل مجھے ان کی کبوتر بازی ایک آنکھ بھاتی تھی اس لیے میں نے ذرا توجہ نہیں دی تھی۔"

"کیا انہوں نے کسی دھمکی کا بھی ذکر کیا تھا؟"

"دھمکی..... کیسی دھمکی.....؟"

جب اے ایس آئی نے وضاحت کی تو وہ بولی۔

"بالکل نہیں۔"

پھر اس کے بعد ہم اس کے کمرے سے نکل آئے تھے' کوٹھی کافی بڑی تھی تقریباً سات کمرے تھے باغ بھی تھا جس میں آم اور شہتوت کے درخت تھے۔ ایک پورا کمرا کبوتروں کے لیے مختص تھا۔ جہاں سے کبوتروں کی آوازیں آرہی تھیں۔ چھت پر ایک بہت بڑی کبوتروں کی چھتری بھی تھی جس کے اوپر آٹھ دس کبوتر بیٹھے ہوئے تھے جو اس بات سے لاعلم تھے کہ ان کا مالک قتل ہوگیا ہے ویسے میں نے ان میں اضطراب دیکھا تھا جیسے وہ اپنے مالک کو ڈھونڈ رہے ہوں۔ مقتول نے دو بندے ان کی دیکھ بھال کے لیے رکھے ہوئے تھے۔

ایک نام توفیق اور دوسرے کا نام سخاوت معلوم ہوا ان سے انٹرویو کے بعد کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی۔ کبوتر واقعی چوری ہوا تھا لیکن وہ کسی ایسے بندے سے لاعلم تھے

جس نے مقتول سے کبوتر خریدنے کی بات کی ہو یا اسے کسی قسم کی دھمکی دی ہو۔

عجیب گورکھ دھندہ تھا' جس کا کوئی سرا کھوج ہاتھ نہیں آ رہا تھا البتہ...... کبوتر واقعی نایاب اور قیمتی تھا۔

کچھ باتیں ہمیں کھٹک رہی تھیں' انہی باتوں میں مقتول کا قتل اور کبوتر کی چوری پنہاں تھی' ان دونوں کا آپس میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا' یہ ہمارا قیاس تھا' اندازہ تھا' جو صحیح بھی ہو سکتا تھا اور غلط بھی۔ جیسا کہ آپ تفتیشی کہانیوں میں پڑھتے رہتے ہیں کہ ہماری تفتیش کی گاڑی تو شک کے پہیوں سے چلتی ہے۔

اور یہ بات بھی آپ کے علم میں ہے کہ جن بندوں پر ہمیں شک ہوتا تھا ان کو ڈھیل دے کر ان کے گرد اپنا جال بنتے تھے۔ وہ ہم کر رہے تھے اور بعض اوقات ایسے ہوا تھا کہ شک والے تمام بندے صاف ثابت ہوتے تھے اور ایک ایسا بندہ قاتل یا مجرم نکل آتا تھا جس پر ہمارا شک بھی نہیں جاتا تھا' خیر اس طرح کے کاموں میں اس طرح تو ہوتا ہی ہے۔

تھانے میں واپس آ کر میں نے کانسٹیبل وزیر کو طلب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ میرے حکم پر اپنے مشن پر گیا ہوا ہے اور ابھی واپس نہیں آیا۔

بہرحال ایک گھنٹے بعد وہ میرے کمرے میں آیا اور آتے ہی کسی گراموفون ریکارڈ کی طرح بجنے لگا۔

سر! میں نے مقتول کے متعلق ادھر ادھر سے پتا کیا ہے اسے کبوتر بازی سے کم ہی فرصت ملتی تھی' کبھی اس کا کوئی اسکینڈل سامنے نہیں آیا تھا وہ رنگین مزاج تھا تو اپنی غیر نصابی سرگرمیاں انتہائی رازداری سے جاری رکھے ہوئے تھا نہ زیادہ شاہ خرچ تھا اور نہ زیادہ کنجوس۔ البتہ اپنے کبوتروں کے لیے وہ شاہ خرچ ہی تھا اور ہر تین ماہ بعد بڑی بڑی بازیاں جیتتا رہتا تھا' کبھی کبھی اس کی ہار بھی ہو جاتی تھی لیکن جب سے گم ہونے والا کبوتر اس کے پاس آیا تھا وہ کبھی نہیں ہارا تھا۔" کانسٹیبل اپنی رپورٹ دے کر چلا گیا اور میں سوچوں کے جال بننے لگا۔

اگر کبوتر کی وجہ اس کے قتل کا باعث بنی تھی تو وہ اپنے کارخانے میں قتل کیوں ہوا تھا؟ کسی اور جگہ کیوں نہیں ہوا تھا۔ جس بات پر میں سوچتا تھا وہ سوچ آگے جا کر مجھے ایک بند گلی میں لے جاتی تھی۔

ان دنوں آج کی طرح اتنی زیادہ قتل و غارت نہیں ہوتی تھی اور نہ دوسرے جرائم مثلاً ڈاکہ' رہزنی' چوری چکاری اور بم دھماکے ہوتے تھے۔ اس لیے عموماً ہمیں کسی کیس کو حل کرنے کے لیے کافی وقت مل جاتا تھا' آج کل تو حالات کچھ اور ہیں۔ البتہ آج کی پولیس کو جو سہولتیں میسر ہیں ہمارے وقتوں میں نہیں تھیں۔

البتہ بعض اوقات ایسی باتیں ہو جاتی تھیں جیسے اندھے کے ہاتھ بٹیر آنا کہہ سکتے ہیں۔ اچانک سپاہی بشارت نے آ کر مجھے اطلاع دی کہ ایک بندہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے اس نے کافی کریدا ہے لیکن وہ کوئی بات نہیں بتانے پر راضی نہیں ہے۔

"ابھی بھیج دو' دیکھتے ہیں وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔" میں نے سپاہی بشارت سے کہا۔

"ابھی لیں سر!" وہ یہ کہتے ہوئے میرے دفتر سے نکل گیا چند لمحوں کے بعد وہ جس بندے کو لے کر میرے پاس آیا وہ ایک دھان پان سا بندہ تھا۔ اس کی عمر بیس سال کے اریب قریب ہوگی' موسم کے لحاظ سے اس نے شلوار قمیص کے اوپر ہاتھ سے بنا ہوا اون کا سفید سویٹر پہنا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں دو تین انگوٹھیاں تھیں جن میں پتھر جڑے ہوئے تھے رکھ رکھاؤ سے غریب ہی لگتا تھا جب وہ میرے کہنے پر میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے پوچھا۔

"ہاں بھئی' جوان! تم کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے ہو؟"

"جناب! میں ایک جرم کا اقرار کرنے حاضر ہوا ہوں' مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی' دن میں بھی سوچتا رہتا ہوں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

میں سمجھ گیا کہ اس کا ضمیر جاگ اٹھا ہے جو اسے مضطرب اور پریشان رکھے ہوئے ہے' ایسے حالات

میں جب تک جرم کا اقرار نہ کرلیا جائے انسان پُرسکون نہیں ہوسکتا۔

''تھانیدار صاحب! تیمور صاحب کا کبوتر میں نے چوری کرایا ہے۔''

''اوہ......'' میں اچھل پڑا اور اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اور تیمور کا قتل......؟''

''میں نے اگر قتل کیا یا کروایا ہوتا تو اس کا بھی اقرار کرلیتا۔ دراصل تھانے دار صاحب! اگر تیمور صاحب کا قتل نہ ہوتا تو شاید مجھے تھانے آنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی' میں معاملہ باہر ہی کرلیتا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے لہجہ سخت کرتے ہوئے کہا' یہ بندہ تو مجھے حیران پر حیران کررہا تھا۔

اس کے بعد اس نے جو بات بتائی وہ میں اپنے الفاظ میں آپ کے گوش گزار کردیتا ہوں۔ اس میں کچھ باتیں بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔

بندے کا نام مبارک علی تھا' ایک دن اس کی ماں کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی (وہ کافی عرصے سے پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا تھی) وہ سڑک کے قریب کسی سواری کے انتظار میں کھڑا تھا کہ تیمور اپنی کار میں وہاں سے گزر رہا تھا' مبارک علی نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے کار روک کر پوچھا۔

''کیا بات ہے؟'' بقول مبارک علی کے اس کے لہجے سے رعونت چھلک رہی تھی اور چہرے کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ وہ غصے میں بھی ہے۔

''جناب! میری ماں کی حالت بہت خراب ہے اگر آپ ہمیں اسپتال تک چھوڑ دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔''

''یہ کوئی ٹیکسی تو نہیں ہے؟'' تیمور نے غصے بھرے لہجے میں کہا اور کار آگے بڑھالے گیا۔

مبارک علی کو بہت غصہ آیا' وہ پہلے ہی پریشان تھا اس کی ماں کے سانس اکھڑ رہے تھے۔ تقریباً دس منٹ بعد اسے گاڑی ملی۔ وہ ایک غریب بندہ تھا اس وقت اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ ٹیکسی کرواسکتا' وہ سرکاری اسپتال جارہا تھا' بہرحال جب وہ اسپتال پہنچا تو ڈاکٹروں نے کہا۔

''تم نے بہت دیر کردی' خیر ہم کوشش کرتے ہیں۔''

وہ ایمرجنسی میں اس کی ماں کو لے کر چلے گئے اور وہ مضطربانہ انداز میں اسپتال کے برآمدے میں ٹہلنے لگا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد اسے اطلاع ملی کہ اس کی ماں اپنے مالک حقیقی سے جاملی ہے اس کی دنیا اندھیر ہوگئی جیسا کہ ذکر کرچکا ہے کہ اس کی ماں کافی عرصے سے ایک جان لیوا مرض میں مبتلا تھی اس نے سرپٹا تو تھا۔ وہ ایک غریب آدمی تھا کسی اچھے اور مہنگے اسپتال میں اپنی ماں کا علاج نہیں کرواسکتا تھا لیکن وقتی طور پر وہ یہ سوچنے لگا اگر تیمور صاحب اپنی کار میں اس کی ماں کو اسپتال لے آتے تو شاید اس کی ماں بچ جاتی' انسان کبھی کبھی ایسے بھی سوچتا ہے۔

ماں کو آخری منزل پر پہنچانے کے بعد وہ تیمور سے انتقام لینے کے لیے بے چین رہنے لگا۔ اسے تیمور صاحب کے سارے حالات کا علم تھا' دراصل وہ نزدیک ہی رہتا تھا' جس علاقے میں تیمور صاحب کی کوٹھی تھی اس کے قریب ہی غریبوں کی ایک بستی آباد تھی۔

اسے پتا تھا کہ ایک کبوتر میں تیمور صاحب کی جان ہے اس کی ماں نے کچھ زیور رکھا ہوا تھا جو اس نے مبارک علی کی ہونے والی دلہن کے لیے رکھا تھا' مبارک علی کی منگنی ہوچکی تھی بقول مبارک علی کے یہ زیور اسے ماں کے مرنے کے بعد ملا تھا ورنہ وہ زیور بیچ کر ماں کا علاج کرواتا بہرحال جس بات نے جس طرح ہونا ہوتا ہے اسی طرح ہوتی ہے۔ اس میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

مبارک علی غصے میں پاگل ہوگیا تھا اور اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کہیں گم ہوچکی تھیں (زیور کے متعلق میں نے قیاس آرائی کی ہے کہ اس کی ماں نے کیوں رکھا ہوا تھا) جیسا کہ آپ کے علم میں آچکا ہے

تیمور نے دو بندے کبوتروں کی دیکھ بھال کے لیے رکھے ہوئے تھے' ان میں سخاوت کو اس نے شیشے میں اتار لیا اور زیور اسے دے دیا۔ پہلے وقتوں کے کھرے سونے سے بنے زیور کو دیکھ کر سخاوت کے منہ میں پانی آ گیا اور اس نے مطلوبہ کبوتر چوری کر کے مبارک علی کو دے دیا۔ دونوں بندے تیمور کے بھروسے کے تھے لیکن انسان کو بہکتے دیر نہیں لگتی' اس کے ساتھ لگا ہوا شیطان اسے بہکاتا رہتا ہے (یہ باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں) لیکن کہانی کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے یہاں ہی بیان کر دی ہیں۔

مبارک علی نے یہ بات بھی بتائی تھی کہ وہ کبوتر کی چوری کے بعد کیا کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی میں آپ کو وہ بات نہیں بتاؤں گا' مناسب موقع پر اس کا ذکر آئے گا۔

بہر حال میں نے اسے کانسٹیبل کی بیرک میں بٹھا دیا اور کانسٹیبل وزیر کو بھیج دیا کہ وہ سخاوت کو لے کر آ جائے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ مطلوبہ بندہ لے کر آ گیا۔ میں نے سخاوت کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا وہاں بارہ بجے ہوئے تھے کیونکہ میری ہدایت کے مطابق کانسٹیبل اسے مبارک علی کی زیارت بھی کروا لایا تھا۔

یہ ایک نفسیاتی حربہ ہوتا ہے جو اندر سے مجرموں کو توڑ دیتا ہے اور انہیں اقبال جرم کرتے ہی بن پڑتی ہے۔ سخاوت نے بھی ہمیں ذرا پریشان نہیں کیا۔

کانسٹیبل وزیر نے ایک بات یہ بتائی کہ سخاوت کو جونہی یہ بات معلوم ہوئی کہ اسے تھانے بلایا گیا ہے۔ اس نے کانسٹیبل کو ایک معقول رقم بطور رشوت کی پیش کش کی اور کہا۔

"تھانے دار صاحب سے کہہ دینا سخاوت نہیں ملا۔"

کانسٹیبل اسے یہ کہہ کر لے آیا کہ تھانے میں کٹ مکا کروا دے گا' یہ بات تو کانسٹیبل بھی سوچ سکتا تھا کہ سخاوت نے غائب ہو جانا ہے۔

"دیکھو سخاوت! اب تمہارا اور مبارک علی کا کٹ مکا ہوگا اور اس کا فیصلہ مقتول کی بیوہ کرے گی۔ تم دونوں فی الحال حوالات کی سیر کرو گے۔

بیوہ کے ذکر پر سخاوت نے ایک ایسی بات کی طرف اشارہ کیا تھا جو اندھیرے میں روشنی کی کرن ثابت ہو سکتی تھی اب مشتبہ بندوں کے گرد گھیرا تنگ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

میں نے فوراً مین ایاز اور چوکیدار کو بلوا لیا اور ان کے آنے تک مختلف کام نمٹانے میں مصروف ہو گیا۔ ہم نے چونکہ سب کو پابند کیا ہوا تھا اس لیے شام سے پہلے پہلے وہ آ گئے۔

تھانے کے اہلکاروں کو پتا ہوتا ہے کہ انہیں کیا کرنا ہے سپاہی پہلے چوکیدار کو میرے کمرے میں لایا اور میرے اشارے پر کسی جن کی طرح چوکیدار کے سر پر مسلط ہو گیا۔ چوکیدار کا نام ستار تھا اور وہ ادھیڑ عمر تھا۔

"ہاں تو ستار صاحب! اس رات جب تیمور صاحب قتل ہوئے تھے بقول تمہارے کارخانے میں نہیں آئے تھے۔" میں نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی..... صاحب....." اس نے مجھ سے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

"بشارت۔" میں نے سپاہی کو مخاطب کیا۔

"یس سر! حکم....." وہ اٹین شن ہو گیا۔

"لگتا ہے ستار صاحب کا ستار بجانا پڑے گا۔" میں نے چوکیدار کو گھورتے ہوئے کہا۔

"سر! ادھر ہی اس کے تار چھیڑ دوں یا....."

"فی الحال ادھر ہی شروع ہو جاؤ۔" میں نے کہا۔ لیکن ابھی اس کے دو تین تار چھیڑے تھے کہ وہ بجنے لگ گیا۔

اس نے بتایا کہ اس رات تقریباً بارہ بجے تیمور صاحب کارخانے میں آئے تھے اور انہوں نے اسے منع کیا تھا کہ کسی کو نہ بتایا جائے کہ وہ آئے تھے۔

"لیکن جب وہ قتل ہو گیا تو بھی تم نے کیوں نہ بتایا؟" میں نے سوال کیا۔

"جناب! ایاز صاحب نے منع کر دیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے کسی کو خاص کر پولیس والوں کو بتایا تو وہ چوری کا الزام لگا کر مجھے نوکری سے نکال دیں گے میرا اس نوکری کے علاوہ کوئی آسرا نہیں تھا تھانے دار صاحب! میں اور میرا خاندان بھوکا مر جاتا۔" پھر وہ رونے لگا مجھے اس پر ترس تو آیا لیکن میں اپنے فرض سے مجبور تھا۔ میں نے اسے حوالات میں بند کر کے فورمین ایاز کو بلا لیا اور سپاہی بشارت کی مدد کے لیے ایک کانسٹیبل کو بھی بلا لیا۔

فورمین ایاز ایک ہٹا کٹا مضبوط ہاتھ پیروں والا بندہ تھا۔

"فورمین صاحب! چوکیدار نے تو سب کچھ بک دیا ہے اب آپ کی باری ہے۔"

"اس نے کیا بک دیا ہے جناب! اسے کیا پتا؟" اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا اور اس کے چہرے کے تاثرات ایسے ہو گئے جیسے دل ہی دل میں خود کو ملامت کر رہا ہو کہ اس نے یہ کیا کہہ دیا۔

لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا تھانے کی دہشت نے اس کی ہوا نکال دی تھی اور میں بھی بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔

"ٹھیک ہے چوکیدار کو کچھ پتا نہیں لیکن یہ بات تو آپ کو یاد ہی ہوگی کہ آپ نے چوکیدار کو منع فرما دیا تھا کہ تیمور صاحب کے آنے کے متعلق کسی کو نہ بتائے ورنہ اسے چوری کا الزام لگا کر نوکری سے نکال دیا جائے گا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ جھوٹ بکتا ہے۔" اس نے مریل سی آواز میں کہا۔ میں نے کانسٹیبل اور سپاہی کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

"اسے لے جاؤ اور یہ جب تک سچ نہ بولے میرے سامنے مت لانا۔"

رات کافی ہو گئی تھی میں آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا مجھے تو یہی امید تھی کہ صبح قفل تیار ہوگا کیونکہ باقی رات اسے کھانے میں صرف جوتے ملنے والے تھے۔ اس سے پہلے اے ایس آئی ابرار آ چکا تھا اور تھانے کا انتظام و انصرام میں اس کے سپرد کر آیا تھا۔ ویسے میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ اگر صبح قفل تیار نہ ہوا تو ایاز کا ریمانڈ لوں گا لیکن اس کی نوبت نہیں آئی دوسرے دن سب کچھ ٹھیک ہو گیا ایاز نے سب کچھ اگل دیا اس کیس میں کچھ پہلو ایسے ہیں جو آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کریں گے اور آپ آخر میں یہ کہہ اٹھیں گے کہ......؟ آگے کی کہانی یوں ہے۔

مقتول تیمور عیاش طبع نہیں تھا صرف بیوی کی بیماری کے بعد فطری تقاضوں سے مجبور ہو گیا تھا لیکن اس معاملے میں وہ بہت محتاط تھا بالکل خفیہ طریقے سے اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ ایاز اس کا رازدار تھا۔ کبوتر بازی کا جنون اپنی جگہ تھا لیکن فطری تقاضے اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت تھے۔ ایاز نے بتایا کہ اس نے تیمور کا قتل اس کی بیوی کے کہنے پر کیا ہے ظاہر ہے اس وقت وہ اس کی بیوی تھی یہ بات سن کر میں دنگ رہ گیا۔ بقول ایاز کے تیمور کو کارخانے کی ایک عورت پسند آ گئی تھی اور اس نے ایاز کو ایک بڑے انعام کا لالچ دے کر کہا تھا کہ اس کے ساتھ بات کروا دے۔ ادھر چند دن پہلے تیمور کی بیوی

نے اسے یہ لالچ دیا تھا کہ کسی پُراسرار طریقے سے اگر وہ تیمور کو دنیا کے تختے سے اٹھا دے تو وہ کارخانے کا انتظام مکمل طور پر اس کے سپرد کر دے گی اور ایک لگی بندھی رقم کے علاوہ اسے کارخانے سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ یہ ایک بہت بڑا لالچ تھا اس لیے اس نے زیادہ سوچ کو بے کار سمجھتے ہوئے ایک منصوبہ بنایا اور تیمور کو یہ جھانسہ دیا کہ عورت سے بات ہو چکی ہے۔ وہ رات بارہ بجے کے قریب آ جائے' اس کے دن پورے ہو گئے تھے' ایاز نے اسے جگہ بتادی تھی کہ عورت اپنا سب کچھ اس کے حوالے کرنے اس جگہ موجود ہوگی۔ حالانکہ اس نے عورت سے بات ہی نہیں کی تھی' تیمور پر حیثیت غالب آئی ہوئی تھی اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ رات کو عورتیں کارخانے میں نہیں ہوتیں۔

وہ آ گیا اور اس جگہ عورت کی بجائے ایاز کو اپنا منتظر پایا' اس وقت تقریباً ساڑھے بارہ بج چکے تھے اور کارخانے میں ہو کا عالم تھا۔

ایاز کے پاس قصائیوں والی چھری تھی اور وہ مقتول سے زیادہ طاقتور اور مضبوط ہاتھ پیروں والا تھا' اس نے تیمور کو گرا لیا اور اسے ذبح کر دیا' اس نے شہ رگ اس لیے کاٹی تھی تاکہ تیمور جلد ٹھنڈا ہو جائے' ایسا ہی ہوا۔

وہ ایک جوڑا ساتھ لے کر آیا تھا' اس نے کپڑے اتار کر دوسرے پہن لیے اور آلۂ قتل اور خون آلود کپڑوں کو دیوار کے ساتھ گڑھا کھود کر دفن کر دیا (جو کہ بعد میں ہم نے برآمد کر لیے تھے) لالچ انسان کو کیسا حیوان بنا دیتا ہے۔

یہ اسی دن شام کی بات ہے کہ میں اور اے ایس آئی ابرار تیمور کی بیوہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

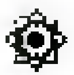
اس کا بیان مختصر تھا' یہ میں اپنے الفاظ میں سنا دیتا ہوں تیمور اور اس کی شادی محبت کی شادی تھی' ماں باپ سے الگ ہو کر انہوں نے شادی کی تھی۔ بقول اس کے دونوں میں بہت محبت تھی لیکن جب سے اس پر فالج کا حملہ ہوا تھا تیمور نے اس سے بات کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ وہ دن رات انگاروں پر لوٹتی تھی' وہ سوچتی تھی کہ کیا تیمور کو صرف اس کے جسم کے ساتھ محبت تھی اگر اس پر فالج کا حملہ ہوا تھا تو اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ تیمور کم از کم دو پیار کے بول ہی بولتا تھا تو وہ مطمئن رہتی۔

وہ اس کا علاج تو کروا رہا تھا لیکن فاصلے بڑھا دیے تھے۔ دوسری طرف ایاز بہت کایاں شخص تھا وہ حالات کا جائزہ لے رہا تھا اور کارخانے پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے ملتا رہتا تھا اور اس کو یہ بتاتا رہتا تھا کہ تیمور باہر عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے بلکہ جھوٹ موٹ یہ بھی بتا دیا کہ تیمور عنقریب ایک عورت کے ساتھ شادی کرنے والا ہے اور اسے آہستہ آہستہ اثر کرنے والے زہر سے ختم کر دے گا اور سب کچھ اس عورت کے نام کر دے گا یہ باتیں جلتی پر تیل کا کام کرتی تھیں اس نے ایاز کو وہی باتیں کہیں جن کا ذکر آ چکا ہے۔

آخر میں اس نے اپنا تندرست ہاتھ آگے کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے گرفتار کرلیں۔" ابھی میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا ہاتھ بے جان ہو کر گر گیا اور وہ خود بھی بے جان ہو گئی۔

اس کے بعد کہنے سننے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی لیکن میں آخر میں وہ باتیں بتا دیتا ہوں جو آپ کو کھٹک رہی ہیں۔ سخاوت نے یہ کہا تھا کہ ایاز' تیمور صاحب کی غیر موجودگی میں ان کی بیوی کے پاس آتا رہتا تھا اور مبارک علی کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ کبوتر کے بدلے خفیہ طریقے سے تیمور صاحب سے کار مانگے گا۔



روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

مسز شہزادی..... سندھ

جواب:۔رشتوں کے لیے:۔بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

روزگار کے لیے۔سورۃ القریش 111 مرتبہ عشاء کی نماز کے بعد اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

گھر اگر کرائے کا ہے تو تبدیل کرلیں۔اگر اپنا ہے تو کسی عامل سے رابطہ کریں اثرات ہیں۔

غ۔ق..... خانیوال

جواب:۔نماز کی پابندی کریں۔بعد نماز عشاء 41 مرتبہ آیۃ الکرسی پڑھ کر اپنے پورے جسم پر دم کریں۔استغفار کثرت سے کریں۔

بشریٰ ملک..... فیصل آباد

جواب:۔ہر ماہ صدقہ دیں والدہ کا اور گھر کے تمام افراد کا سوچ کر۔حسب حیثیت (مرغی/بکرا) پریشانی نہیں آئے گی۔

فجر کی نماز کے بعد ایک مرتبہ سورۃ یٰسین اور ایک مرتبہ سورۃ رحمٰن پڑھا کریں۔ٹھیک ہو جائیں گی۔

شاز یہ نذیر..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

جواب:۔فرض نماز کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر 11 مرتبہ یا قوی پڑھیں۔

رمشہ..... فیصل آباد

جواب:۔مسئلہ نمبر 1۔رشتے کے لیے جو بتایا جاری رکھیں۔کبھی دیر ہوتی ہیں پر کام ہو جاتا ہے۔عشاء کی نماز کے بعد 3 مرتبہ سورۃ عبس پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔جو رکاوٹ بندش ہے ختم ہو۔(آپ دونوں بہنیں کریں)۔

مسئلہ 2:۔سورۃ مومن روزانہ پڑھیں دونوں بھائی۔اپنے مرض پر دم کریں۔اول وآخر 3'3 مرتبہ درود شریف۔اگر کوئی دوا بھی استعمال میں ہے تو اس پر بھی ایک مرتبہ دم کرلیں۔

حنا علی..... کراچی

جواب:۔رشتے کے لیے:۔بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

ہر نماز کے بعد 111 مرتبہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔نیت رکاوٹ ختم ہو۔گھر کے تمام افراد پڑھیں۔

ہفتہ میں ایک مرتبہ سورۃ البقرہ پانی پر دم کرکے پورے گھر میں چھڑکیں۔

P۔ع..... پسرور

جواب:۔فرض نماز کے بعد 11 مرتبہ سر پر ہاتھ رکھ کر یا قوی پڑھیں۔پڑھتے بیٹھتے سے پہلے 11 مرتبہ یا علیم پڑھیں۔اپنے رشتے کے لیے پہلے استخارہ کریں پھر کوئی فیصلہ کریں۔

علی حسن..... ماڈل ٹاؤن

جواب:۔سورۃ الشمس روزانہ 40 مرتبہ پانی پر دم کرکے پلائیں۔اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

دعا..... کالا گوجراں جہلم

جواب:۔بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ (اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف)۔نوٹ:۔جن کے بھی رشتوں کا مسئلہ ہے وہ خود پڑھیں۔

بھائی کے لیے استخارہ کرلیں۔

مسئلہ نمبر 2:۔ نماز کی پابندی کریں قرآن کی تلاوت اور صدقہ بھی دیں۔

ش۔ت ...... ملک وال

جواب:۔ رشتے کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

بعد نماز عشاء 111 مرتبہ سورۃ القریش اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ اپنے لیے دعا کریں نوکری اور دوسرے مسئلوں کے لیے۔

بہتر ہے بچی خود کرے ورنہ آپ کرلیں۔ (3 ماہ)

عبدالصمد ...... ملتان

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 41 مرتبہ سورۃ القریش پڑھ کر اپنے روزگار اور پریشانیوں کے لیے دعا کریں۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود پڑھیں۔

سدرہ عنایت ...... حافظ

جواب:۔ تمام وظائف جاری رکھیں۔ تجیمد آنے کے بعد صرف استغفار درود شریف' تیسرا کلمہ مستقل پڑھتی رہیں اور دعا بھی کریں۔

طیبہ افتخار ...... جہلم

جواب:۔ اللہ کی بندی اللہ سے ڈرو استغفار کرو۔ نماز کی پابندی کرو اور عشاء کی نماز کے بعد 313 مرتبہ آیت کریمہ پڑھا کرو۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

اللہ آپ کو نیک صالح بنائے۔

ثمینہ ...... فیصل آباد

جواب:۔ جو بتایا ہے وہ جاری رکھیں۔

نائلہ اشفاق ...... کوٹ غلام محمد

جواب:۔ سورۃ مومنون ایک مرتبہ پڑھ کر پانی پر دم کرلیں۔ وہ پانی زیادہ سے زیادہ پلائیں۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر دم کردیں۔ لڑائی جھگڑے نہیں ہوں گے۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

ہر نماز کے بعد یا رحمان' یا رحیم 11'11 مرتبہ پڑھ کر اپنے شوہر کا تصور لا کر ان کے دل اور دماغ پر پھونک ماریں کہ آپ کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

http://facebook.com/elajbilquran

www.elajbilquran.com

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail @ gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے جولائی 2014ء

نام .... والدہ کا نام .... گھر کا مکمل پتا ....

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں ....

خوشبوئے سخن

عنبر اسرار

اے اقبال ہم شرمندہ ہیں

اے اقبال ہم شرمندہ ہیں
اک خواب جو تم نے دیکھا تھا
اس خواب کی یہ تعبیر نہیں

جو جوان تھے تمہارے شاہین صفت
اب ان کی وہ پرواز نہیں
دلدادہ ہیں وہ فلموں کے
گفتار نہیں کردار نہیں

اتفاق کا تھا جو اک سپنا
مشرق مغرب سب اپنا
اب سرحدی ہیں بلوچی ہیں
سندھی ہیں پنجابی ہیں
کشمیری ہیں بنگالی ہیں
سب لڑتے ہیں زبانوں پر
ان میں کوئی اتحاد نہیں
اک خواب جو تم نے دیکھا تھا
اس خواب کی یہ تعبیر نہیں
ورکیا توحید جو تھی
واحد ملت مسلمہ تھی
اب بریلوی ہیں اور سنی ہیں
شیعہ ہیں اور دیوبندی ہیں
اک خواب جو تم نے دیکھا تھا
ایک دوسرے کے سب بھائی تھے
جان و مال نچھاور کرتے تھے
سب عزتوں کے رکھوالے تھے
اب خودکش دھماکے کرتے ہیں
تھوڑے سے پیسوں کے بدلے
جانوں کا صدقہ لیتے ہیں

حکمران جھکتے ہیں غیروں کے آگے
عزت ان کو راس نہیں
عوام محبت کرتی ہے
اس محبت کا ان کو پاس نہیں
کرتے ہیں سجدہ غیر وں کو
اک سجدے سے ہوتے فیض یاب نہیں
اک خواب جو تم نے دیکھا تھا
اس خواب کی تعبیر نہیں
اے اقبال ہم شرمندہ ہیں
تیرے خواب کی یہ تعبیر نہیں

ریحانہ سعیدہ......لاہور

ورثہ

یہ کائنات
اس کا ذرہ ذرہ
چمن کا ہر پھول ہر پتی
نم آلودہ ہے
یہ چاند یہ تارے
یہ زمین و آسمان
اور یہ سورج
آبدیدہ ہے
یہ باد صبا بھی گیلی گیلی ہے
ہاتھوں کی نم ہتھیلیاں
ہرن کی غزالی آنکھیں بھی
اپنے اندر سمندر رکھتی ہیں
یہ سب شبنم شبنم روتے ہیں
آنسوؤں سے اپنا دامن بھگوتے ہیں
پھر کیوں یہ دنیا کہتی ہے
کہ دکھ تو صرف
ورثہ انسانوں کا ہوتے ہیں

طاہرہ جبین......تارا لاہور

گیت

جو گالوں پہ تیرے کوئل پیار کی کھلے

سدا اس ڈالی کے گل کو پانی ملے
دھڑکتے دل سے جب چھلکتی ہے سانس کی خوشبو
چہرہ اک تقدس سے ہو جاتا ہے سرخرو
تو قدم اٹھائے پھر ترے ساتھ بادِ بہاری چلے
سدا اس ڈالی کے گل کو پانی ملے
ترے ہونے کے احساس سے ہنگامہ ہے زندگی کا
یوں بزمِ آرائی سے شور مچا ہے رنگا رنگی کا
صبح ترے نور سے ہو شام سائے سے ڈھلے
سدا اس ڈالی کے گل کو پانی ملے
جو گالوں پہ ترے کونپل پیار کی کھلے

سید عبداللہ شاہد..... حیدرآباد

غزل

غم جن کے برسوں سے ہم اٹھاتے رہے
وہی ہمیں پھر سے بھول جاتے ہیں
یہ اور بات تھی ورنہ زندگی میں
بیتے دن پھر مجھے بھی رلاتے رہے
بدل گیا موسم تیری یادوں کے ساتھ
گلشن میں پھول رنگ برنگے کھلاتے رہے
پاس رہ کر بھی وہ میرا دل دکھاتے رہے
جو تھے دل کے قریب نظروں سے دور جاتے رہے
کس کو دلائیں ہم اپنی وفا کا یقین جاوید
عہد محبت پھر لوگ مر مر کے نبھاتے رہے

محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد

غزل

ہوا ہوگی چراغوں کا اثر بھی مختلف ہوگا
نگاہوں میں اجالوں کا سفر مختلف ہوگا
نئے انداز میں بکھریں گے اب کے پھول اشکوں کے
خبر کیا تھی جو لوٹیں گے تو گھر بھی مختلف ہوگا
کچھ اپنے گاؤں کے حالات بھی بدلے ہوئے ہوں گے
وہ اپنی یاد کا تنہا شجر بھی مختلف ہوگا
سمٹ آئیں گے آنکھوں میں گلابوں کے نئے موسم
سو اب کی بار خوابوں کا نگر بھی مختلف ہوگا
در و دیوار عاطر پڑھ رہے ہیں بے قراری کو
ادھر یہ حال ہے تو پھر ادھر بھی مختلف ہوگا

رانا حنیف عاطر

غزل

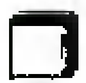
بھری برسات میں ہم جل رہے ہیں
یہ کن حالات میں ہم جل رہے ہیں
بدن پر جم گئی ہے برف پھر بھی
سہانی رات میں ہم جل رہے ہیں
انا کے دل سے کوئی تو نکلے
خود اپنی ذات میں ہم جل رہے ہیں
ذرا سی بات تھی، کچھ بھی نہیں تھا
ذرا سی بات میں ہم جل رہے ہیں
محبت مسئلہ رانا نہیں ہے
مگر جذبات میں ہم جل رہے ہیں

قدیر رانا..... راولپنڈی

غزل

تھے گلستاں میں جو بہار کے پھول
بن گئے اب وہ زلفِ یار کے پھول
میری سانسوں میں بس گئی خوش بو
ہیں یہ دل کش ترے دیار کے پھول
صبح ہوتے ہی میرے آنگن میں
اس نے پھینکے ہیں اپنے ہار کے پھول
توڑ کر باغباں نے پھینک دیے
دھوپ میں شاخِ سایہ دار کے پھول
اس کی آنکھوں میں ایک نشہ ہے جمال
اس کی آنکھوں میں ہیں جو پیار کے پھول

صبیح جمال..... کراچی





عفان احمد

حدیث

"حضرت انسؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ جس شخص میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کو سب سے زیادہ ہو دوسرے یہ کہ صرف اللہ کے لیے کسی سے دوستی رکھے تیسرے یہ کہ دوبارہ کافر بننا اسے اتنا ناگوار ہو جیسے آگ میں جھونکا جانا۔"

(البخاری' باب حلاوۃ الایمان)

دلچسپ وحیران کن معلومات

☆ کار سازی دنیا کی سب سے بڑی انڈسٹری ہے۔

☆ نیلی وہیل کی بیٹی کسی بھی جانور کی پیدا کردہ سب سے بلند آواز ہے۔

☆ مچھلیاں آپس میں باتیں کرسکتی ہیں۔

☆ کبھی بھی کھلی آنکھوں کے ساتھ چھینک نہیں آسکتی۔

☆ کسی غار سے نکلتے وقت چمگادڑیں ہمیشہ بائیں ہاتھ مڑتی ہیں۔

☆ چوہا' اونٹ کی نسبت زیادہ لمبے عرصے تک پانی کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔

☆ ہر سال سڑکوں پر پچاس ملین کاروں کا اضافہ ہوتا ہے۔

☆ خواتین مردوں کی نسبت دوگنا تعداد اور رفتار سے اپنی پلکیں جھپکتی ہیں۔

☆ ایک عام پنسل سے پینتیس میل لمبی لائن کھینچی جاسکتی ہے یا ہم اس سے انگریزی کے پچاس ہزار الفاظ لکھ سکتے ہیں۔

انتخاب: کامران شاہد ...... گجرات

خلیل جبران خلیل

☆ اگر تم نے ہر حال میں خوش رہنے کا فن سیکھ لیا ہے تو یقیناً تم نے دنیا کا سب سے بڑا فن سیکھ لیا۔

☆ جب کوئی شخص قتل کرتا ہے تو قاتل کہلاتا ہے لیکن اگر کوئی جج کسی شخص پر موت کا پروانہ جاری کرتا ہے تو منصف کہلاتا ہے۔

☆ انسان کی حقیقت ان چیزوں میں نہیں ہوتی جو وہ ظاہر کرتا ہے بلکہ ان چیزوں میں مخفی ہوتی ہے جنہیں وہ ظاہر نہیں کرتا۔

☆ مجھے چاہیے کہ میں زمانے کا قیاس اپنے اس قول سے نہ کروں کہ "کل تھا اور کل ہوگا۔"

☆ اگر تم کسی سے محبت کرتے ہو تو اسے آزاد چھوڑ دو اگر وہ واپس نہ آیا تو سمجھ لو کہ وہ کبھی تمہارا تھا ہی نہیں اور اگر وہ واپس آگیا تو اس کی قدر کرو۔

☆ اس خوشی اور مسرت سے دور رہو جو کل غم کا کانٹا اور زندگی کا روگ بن جائے۔

☆ اس دنیا میں اتنی بلند و بالا دیواروں والے محلات میں نہ رہو جس سے تمہاری آواز ہی گھٹ جائے۔

☆ نصیحت وہ کڑی بات ہے جسے ہم کبھی غور سے نہیں سنتے' خوشامد اور چاپلوسی ایسا بدترین دھوکا اور فریب ہے کہ ہم اسے بڑے غور اور توجہ سے سنتے ہیں۔

☆ عقل مند سوچ کر بولتا ہے اور بیوقوف بول کر سوچتا ہے۔

☆ باطل ہیں وہ تمام اعتقادات' نظریات' خیالات اور تعلیمات جو انسان کی زندگی میں بدقسمتی لائیں۔

☆ وہ سب جذبے' خیال اور نظریات جھوٹے ہیں جو انسان کو مایوسیوں کی طرف لے جائیں۔

☆ انسان کا یہ فطری اور پیدائشی حق ہے کہ وہ اس زمین پر کامیاب اور کامران زندگی بسر کرے۔

حمید ایوب ...... ناظم آباد' کراچی

نوشیرواں عادل کا قصہ

بیان کیا جاتا ہے کہ نوشیرواں عادل کے واسطے ایک شکارگاہ میں کباب تیار ہورہے تھے اور نمک موجود نہ تھا۔ ایک غلام کو گاؤں میں دوڑایا تا کہ نمک لے آئے۔ نوشیرواں بادشاہ نے کہا نمک قیمت سے لانا ایسا نہ ہو کہ بری رسم پڑ جائے اور گاؤں برباد ہو جائے۔ غلام نے کہا: اتنی مقدار سے کیا خرابی پیدا ہو جائے گی؟ نوشیرواں نے فرمایا ہر ظلم کی بنیاد شروع میں تھوڑی ہوتی ہے پھر جو شخص آیا اس نے اس پر اضافہ کیا یہاں تک کہ ظلم اس حد تک پہنچ گیا اگر بادشاہ رعیت کے باغ سے ایک سیب بلا قیمت کھائے گا تو اس کے غلام درختوں کو ان کی جڑ سے اکھاڑ دیں گے بادشاہ اگر آدھے انڈے کے برابر یعنی تھوڑا سا ظلم بھی جائز رکھے گا تو اس کے سپاہی ہزار مرغ سیخ پر کباب بناڈالیں گے یعنی بڑے بڑے ظلم کر گزریں گے۔ (گلستان ص ۴۵)

فائدہ: برے زمانہ والا ظالم دنیا میں نہیں رہتا ہے لیکن اس پر لعنت برابر رہتی ہے۔

(مرسلہ: سید مظہر حسین شاہ ..... گجرات)

ہنر سیکھنے کی ترغیب

ایک دانش مند اپنے بیٹوں کو نصیحت کررہا تھا کہ اے پیارے بچو! ہنر سیکھو اپنے اندر کوئی کمال پیدا کرو اس لیے کہ دنیا کا ہر ملک اور دولت اعتماد کے قابل نہیں اور مال و دولت ہر وقت خطرہ میں ہیں یا چور ایک ہی دفعہ میں چرا لے جائے گا یا مال والا اپنا مال تھوڑا تھوڑا کرکے کھا جائے گا لیکن ہنر ایک جاری ابلنے والا چشمہ ہے اور ہمیشہ کی دولت ہے اگر ہنر والا غریب ہوجائے تو کوئی غم کی بات نہیں اس لیے کہ ہنر اس کی ذات میں ایک دولت ہے وہ جہاں جائے گا روزی اور عزت پائے گا۔ (گلستان ص ۱۸۳)

(مرسلہ: جاوید اختر ..... بھکر)

سب سے بڑی طاقت

اخلاق ایک طاقت ہے بلکہ اخلاق سب سے بڑی طاقت ہے ایک اچھا سلوک دشمن کو دوست بنا سکتا ہے۔ ایک میٹھا بول ایک سرکش آدمی سے اس کی سرکشی چھین سکتا ہے۔ ایک ہمدردانہ برتاؤ ایک ایسے جھگڑے کو ختم کرسکتا ہے جس کو ختم کرنے کے لیے لاٹھی اور گولی کی طاقت ناکام ہوچکی وہ بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بتائی گئی ہے۔

"اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوسکتی تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہوگیا ہے جیسے کوئی دوست قرابت والا۔"

اسلام میں تالیف قلب کا اصول بھی اخلاق سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن میں زکوٰۃ کی رقم کی کئی مدیں بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک خاص مد تالیف قلب کی ہے اس مد کے تحت ان لوگوں کی مالی اعانت کی جاتی ہے۔ جن کے دل اسلام کے لیے نرم کرنا مطلوب ہوں اس اصول کے تحت رسولؐ نے عرب کے متعدد سرکش سرداروں کو رقمیں دیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد وہ لوگ بالکل ٹھنڈے پڑ گئے اسلام کی یہ تعلیم اس بات کی ایک کھلی تصدیق ہے کہ اللہ نے اخلاق کے اندر زبردست تسخیری طاقت رکھی ہے۔

مرسلہ: عبید یوسف ..... کراچی

ایمان کے ساتھ عمل

ایک دفعہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتائیے فرمایا۔ "جو اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس میں سے دوسروں کو دے۔" عرض کیا اگر وہ ضعیف ہو کر مدد کی قوت نہ رکھتا ہو فرمایا۔ "جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو اس کا کام کردے۔" عرض کیا اگر وہ خود بھی ایسا ہی ناکارہ ہو فرمایا۔ "اپنی ایذا رسانی سے لوگوں کو بچائے رکھے۔"

(مستدرک حاکم۔ سیرۃ النبیؐ)

انتخاب: اسد علی ..... گجرات

قسط نمبر 11

جگت سنگھ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگداز داستان جو کلاسک داستانوں میں شمار ہوتی ہے ...... جبر و جور کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھیوں کا احوال' جو حاکمانہ غرور کے کوہساروں کے ساتھ پورے جاہ و جلال سے ٹکرا جاتی ہیں. یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانۂ عبرت ہے' جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور دشمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان "جگت سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے. اس کہانی کا مرکزی کردار "جگت سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے سورماؤں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا. درِ اصل فطری طور پر امن و آشتی کا پیامبر ہے. "جگت سنگھ" کے کردار کا رومانی پہلو' جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "ویرو" کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جذبات رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے.

"جگت سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا؟ آئیے قارئین یہ جاننے کے لیے ہم بھی زیر نظر کہانی میں "جگت سنگھ" کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سرسبز کھلیانوں' اونچے نیچے ٹیلوں اور پر خطر کھنڈرات کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں.

"سر میں سمجھتا ہوں اسے فوری طور پر اسپتال میں ٹرانسفر کرنا پڑے گا۔ کیس سیریس ہونے سے پیشتر اسے طبی امداد دینی ضروری ہے۔" ڈاکٹر میڈیکل بیگ بند کرنے لگا۔

سوبر کا چہرہ اتر گیا۔ پھانسی کا حکم سنانے کے سلسلے میں ہونے والی دیر اسے کھٹک رہی تھی۔

"آل رائٹ ڈاکٹر.... اپنی رپورٹ اور اسٹریچر بھیج دیں۔"

"اوکے سر!" کہہ کر ڈاکٹر جانے لگا۔ میکلین صاحب کی ہدایت اس کی پشت سے ٹکرائی۔

"ڈاکٹر میں قیدی کی چوکیداری کا سخت انتظام کرتا ہوں مگر آپ بھی چوکنے رہیں۔ کوئی ایسی دوا اس کے ہاتھ نہ لگے جس سے......"

ڈاکٹر نے سر گھما کر اثبات میں گردن ہلائی۔ "ڈونٹ وری سر۔"

جگت کام کرنے کے بہانے کوٹھری میں سے سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ سوبر اور ڈاکٹر کی انگریزی میں بات چیت سے وہ صرف اتنا سمجھ سکا تھا کہ گرو بخش کو پھانسی دیئے جانے کا دن مقرر ہو چکا ہے۔ مگر اس وقت کی بھاگ دوڑ کسی نئے موقع کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ جگت کو گرو بخش پر غصہ آ رہا تھا۔ فرار ہونے کی ترکیب کے سلسلے میں بھوک ہڑتال شروع کر دی اور اب وہ خود اپنے جال میں پھنس گیا۔

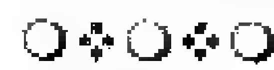
جیل کا اسٹریچر لے کر دو سفید پوش وارڈ آ گئے۔ جگت کو خوف سا محسوس ہوا۔ کیا گرو بخش کو یہاں سے لے جا رہے ہیں...... گھبرا دینے والی اس کال کوٹھری میں چند دنوں کا ساتھ ملا تھا وہ بھی چھن گیا مگر وہ لوگ اسے کہاں لے جا رہے ہیں؟

"ذرا سنبھل کے۔" سوبر وارڈ سے کہہ رہا تھا۔ اب جگت سے رہا نہیں گیا' چکی پیسنا بند کر کے دروازے کی سلاخیں دونوں ہاتھوں سے تھام کر فکرمندانہ نظروں سے

باہر کی جانب دیکھنے لگا۔ اسٹریچر کا وزن اٹھا کر ایک وارڈ بوائے باہر نکلتا نظر آیا۔ جگت کی ہتھیلی پسینے سے بھیگ گئی۔ اس نے آنکھیں پھیلا کر دیکھا۔ گروبخش کو کمبل اوڑھایا ہوا تھا۔

"کیا ایک بار پھر اس کا چہرہ دیکھنے کو نہیں ملے گا؟"

جگت کا دل ایک بار پھر دھڑک اٹھا۔ اسٹریچر میں پڑا ہوا جسم شانے تک کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ اسی لمحے گروبخش کا چہرہ نظر آیا۔ اسے دیکھ کر جگت کے دل میں درد ہونے لگا۔ چمکتے ہوئے چہرے اندر دھنسی ہوئی آنکھیں لبوں سے چپکی ہوئی چکناہٹ جگت کو چیخنے کی خواہش ہوئی مگر اسی لمحے اسٹریچر کو لیے ہوئے وارڈ بوائے آگے بڑھ گئے اور اس ایک پل میں گروبخش نے ایک آنکھ کھول کر جگت کی جانب دیکھا' پھر آنکھ بند کر لی۔ جگت نے یہ بھی دیکھا کہ گروبخش کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اسٹریچر کے پیچھے چلتے ہوئے سوپر کے جوتوں کی آواز مدھم ہوئی۔ اسی لمحے اس کے ذہن میں چمک سی پیدا ہوئی' کیا گروبخش بے ہوش بن گیا تھا؟ اس کی ترکیب کا پہلا حصہ پورا ہوتے ہی اس کے لبوں پر نظر آنے والی مسکراہٹ فتح کی خوشی کی… ؟ جگت کے ذہن پر الجھن سوار ہوگئی۔ گروبخش کو یہاں سے لے گئے۔ اس کا غم کیا جائے یا خوشی منائی جائے…؟



جیل کی تیس فٹ بلند دیوار کے پیچھے ہی اسپتال تھا۔ ویسے تو جیل کے صدر دروازے سے اسپتال میں آنے جانے کا راستہ تھا مگر ایمرجنسی کے لیے دیوار میں ایک دروازہ رکھا گیا تھا۔ گروبخش کو اس دروازے سے لے جایا گیا۔ سوپر میکلین' گروبخش کی بگڑی ہوئی حالت کو ممکن حد تک پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا حالانکہ بھوک ہڑتال پر اترے ہوئے قیدی کو اسپتال میں لے جانے کا یہ نیا واقعہ نہیں تھا۔ پھر بھی سوپر صاحب اتنی رازداری برت رہا تھا۔ کیا کچھ اچانک ہونے والا ہے؟ یہ سوال اس کے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔ ڈاکٹر حسین نے اس خاص مریض کے لیے اسپتال میں کونے والا کمرہ خالی کرا لیا تھا۔ ہوا اور روشنی کے لیے ایک سلاخوں والی کھڑکی بھی اسی کمرے میں تھی اور اس پر نظر رکھنے کے لیے شیشے کا دروازہ تھا۔

ڈاکٹر حسین نے فوراً مریض کا علاج شروع کر دیا۔

گلوکوز چڑھانے کے لیے گروبخش کی ہتھکڑی نکال دی گئی۔ حرکت نہ کر سکے اس لیے انجکشن دیا گیا۔ مریض کے بیڈ کے برابر ایک نرس بٹھائی گئی اور دروازے کے باہر دو مسلح سپاہیوں کا پہرہ لگا دیا گیا۔ گلوکوز کے پانی کی دوسری بوتل خالی ہونے تک شام ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر حسین نے نرس کو ہدایت دی تھی کہ دو بوتلیں خالی ہونے کے بعد مجھے مطلع کرنا۔ نرس نے رسٹ واچ میں دیکھا۔ ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ نصف گھنٹے بعد اس کی ڈیوٹی ختم ہوتی تھی۔ کلائی کی نبض سے سوئی نکال لی گئی۔ اس وقت مریض کے لبوں سے کراہ نکل گئی۔ نرس کی پشت دروازے کی سمت تھی۔ نرس مریض کے سر کی جانب کھڑی ہو کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی پھر نرم لہجے میں بولی۔ "گرو…!"

مریض کی پلکیں حرکت کرنے لگیں۔ لہٰذا وہ سر جھکا کر اس کے کان میں بولی۔ "طوفان!"

جادوئی اثر ہوا۔ گروبخش کی آنکھیں فوراً کھل گئیں۔ دو چار بار اس نے آنکھیں جھپک کر دیکھا۔ نرس کا دھندلا چہرہ اب صاف نظر آنے لگا۔ پھولوں کی پتیوں کی طرح گروبخش کے لب کھلے۔ "سونیا!" چار آنکھیں ملیں نظروں کے تار بن گئے۔ دل کی گتی زور کرنے لگی۔ چند لمحوں کی خاموشی نے بہت کچھ کہہ دیا۔ تب گروبخش نے سونیا کی زلفوں کی طرف دیکھا اور اس کی نظریں سونیا کے ابھرے ہوئے سینے پر لٹکتے ہوئے کراس پر جم گئیں۔ سونیا گروبخش کا مطلب سمجھ کر مسکرائی۔ "میں مادام بن گئی ہوں۔ یہاں تک پہنچنا ضروری تھا۔" نرس ایک لمحہ کے لیے رک گئی۔ پھر عقب میں دیکھ کر اس نے مزید کہا۔ "تم ہوش میں آ گئے' اس کی اطلاع کرنے جا رہی ہوں۔ پھر میری ڈیوٹی ختم ہو جائے گی۔"

ہلکے ہاتھوں سے گروبخش کی پلکیں بند کر کے نرس باہر چلی گئی۔ پھر پہرہ دیتے ہوئے سپاہیوں کو سنانے کے

لیے بڑبڑائی۔ "مریض ہوش میں آرہا ہے' میں ڈاکٹر کو اطلاع دینے جارہی ہوں۔"

سپاہی اٹینشن ہوگئے۔ ڈاکٹر حسین کے آنے کے بعد گروبخش نے آنکھیں کھول دیں۔ "میں کہاں ہوں؟ مجھے یہاں کیوں لایا گیا؟" وہ بڑبڑایا۔

ڈاکٹر نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا پھر اسٹیتھو اسکوپ سے اس کو جانچنے لگا۔ "جوان! یہ جیل کا اسپتال ہے۔ اب تم ہماری نگرانی میں ہو۔" پھر نبض پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "مجھے امید ہے کہ یہاں تم اپنی ضد جاری نہیں رکھ سکو گے۔"

گروبخش نے ڈاکٹر کے برابر کھڑی ہوئی نرس کی جانب دیکھا مگر وہ نظر ہٹا کر کام میں لگ گئی۔ گروبخش نے کمزور آواز میں کہا۔ "ڈاکٹر! اگر دوبارہ مجھے اس کوٹھڑی میں لے جاؤ گے تو اس صورت میں میری ضد جاری رہے گی۔"

ڈاکٹر کے پاس اس کی بات کا جواب نہیں تھا۔ یہ اس کے بس سے باہر کی بات تھی۔ اسی لمحے سوپر کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس کے ہاتھ میں کاغذات نظر آرہے تھے گروبخش کو ہوش میں دیکھ کر اسے اطمینان ہوا۔

"ویل... میں اپنا فرض پورا کرنے آیا ہوں۔" اس نے کہا مگر گروبخش کو اس کی پروا نہ تھی۔ سوپر نے کاغذ پھیلا کر پھانسی کا آرڈر سنایا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ نرس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی مگر اس نے چہرے پر بے پروائی کا نقاب ڈالے رکھا۔ سوپر نے سوچا تھا کہ پھانسی کا حکم سنتے ہی قیدی چیخ مارے گا' ہاتھ پیر اچھالے گا' کم از کم آہ ضرور بھرے گا۔ مگر اس کی بجائے گروبخش کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تب سوپر کو سخت دھچکا لگا۔ حب الوطنی کے مضبوط جذبے نے اس جوان کو موت کے مقابلے میں کتنا بے خوف بنا دیا تھا۔

سات بج گئے۔ رات کی ڈیوٹی والی نرس کمرے میں داخل ہوئی تب ڈاکٹر حسین نے سونیا سے کہا۔ "مس ماریا! تم اب جاسکتی ہو۔"

"تھینک یو ڈاکٹر!" کہہ کر ماریا نے قدم بڑھائے۔ جاتے وقت ایک نظر گروبخش پر ڈالی۔ گروبخش نے آنکھیں بند کرلیں اور سونیا کے سینڈلوں کی دور ہوتی ہوئی آواز سننے لگا۔ پھانسی کی خبر سے سونیا کے معصوم دل میں محسوس کیے گئے صدمے کی لرزتی ہوئی آواز وہ سینڈل کی آہٹ میں محسوس کررہا تھا۔ محبت انسان کو کیسی کیسی قربانیاں دینے کا عزم بخشتی ہے؟ چار سال پہلے سونیا لاہور کے کالج میں انٹر سائنس کی طالبہ تھی۔ اس وقت اس نے پہلی بار گروبخش کو دیکھا۔ دبلا سا' اونچا قد' آنکھوں میں بے چینی' آواز میں درد بھری مٹھاس۔ سونیا کے دل میں گروبخش نے مقام حاصل کرلیا۔

گروبخش نے پوچھا۔ "سونی! میں سکھ تم ہندو بزرگ ہمارے پیار کو نہیں مانیں گے۔"

تب سونیا کے چہرے پر عزم جھلکنے لگا۔ "مجھے اس کی پروا نہیں' میری ڈاکٹر بننے کی خواہش ہے تب تک ہمیں صبر کرنا پڑے گا۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

چھ ماہ کے دوران ہی اچانک ایک نیا موڑ آگیا۔ گرو نے کالج آنا بند کردیا۔ وہ انقلابیوں کی ٹولی میں شامل ہوگیا۔ "سونی میری راہ بدل گئی ہے۔ اب دیش کی آزادی تک ہمیں ملن کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

چار سال بیت گئے۔ سونیا میڈیکل کالج کے تیسرے سال میں پہنچ گئی۔ سرمایہ دار باپ نے اسے دہلی سے لاہور تعلیم کی غرض سے بھیجا تھا اور وہ ہاسٹل میں رہتی تھی۔ لہٰذا گروبخش کی انڈر گراؤنڈ سرگرمیوں میں ساتھ دینے لگی۔ انقلابی زخمی ہوتے یا بیمار ہوتے ان کا علاج کرتی۔ اس کی وجہ سے دوسری چار لڑکیاں بھی اس خطرناک مہم میں شامل ہوگئی تھیں مگر پولیس کمشنر پر بم پھینکتے ہوئے گروبخش گرفتار ہوگیا۔ تب سونیا نے محسوس کیا کہ اس کے پیار کے سپنے چور چور ہوگئے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ گرو کو دی جانے والی پھانسی دیکھنے کے لیے وہ زندہ نہیں رہے گی۔ جب مرنا ہی ہے تو ایک بار آخری کوشش کیوں نہ کرلی جائے؟ جس دن گروبخش جیل میں داخل کیا گیا سونیا بھی اسی دن مس ماریا بن کر جیل کے اسپتال میں داخل ہوگئی۔ کرسچن نرس بننے کی غرض سے گروبخش کے من پسند لمبے سیاہ ریشمی

بالوں کو کاٹ دیا۔ گلے میں کراس پہن لیا۔ گروبخش کے ساتھیوں نے لاہور کے کرسچین چرچ کے بڑے پادری کا سفارشی خط جعلی دستخطوں کے ذریعے بنایا۔ چرچ کی جانب سے جیل کے اسپتال میں خدمت کی غرض سے اکثر لڑکیاں بھیجی جاتی تھیں۔ سازش پر عمل کرنے کا پیغام گروبخش تک اس کے سیل میں کس طرح پہنچایا گیا یہ بات اب تک راز میں رہی ہے مگر تیسرے دن گروبخش نے منصوبے کے تحت بھوک ہڑتال شروع کردی۔ اس وقت سے سونیا جیل کے اسپتال میں اس کی آمد کی منتظر تھی۔ چار پانچ دن سے اس کے کام کو دیکھ کر ڈاکٹر حسین خوش ہوگیا۔ ''مس ماریا! تم نرس سے زیادہ ڈاکٹر بننے کے لائق ہو۔'' حسین نے کہا سونیا کو ڈر لگا کہ کہیں یہ ادھیڑ عمر ڈاکٹر اس سے محبت شروع نہ کردے۔



کبھی میں نہ آنے والی بے چینی نے جگت کو گھیر لیا۔ گروبخش کے متعلق معلوم کرنے کی غرض سے اس نے دوپہر سے شام تک چار بار مختلف طریقوں سے کوشش کی۔ اسے گروبخش کی فکر ستا رہی تھی۔ یہ کسی کو محسوس نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ ''وہ انقلابی بچہ ابھی زندہ ہے؟'' اس نے سنتری سے پوچھا مگر سنتری نے بے پروائی سے کہا۔ ''بھوک ہڑتال پر اترے ہوئے قیدیوں کی بیس بیس دن تک زندہ رہنے کی مثالیں موجود ہیں۔ تو سوا مخادون کو تو ابھی پانچواں دن ہے۔'' روٹی دینے کے لیے آئے ہوئے میٹ سے جگت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اب تو باورچی کو ایک قیدی کے لیے کم پکانا پڑتا ہوگا اس کی بھوک ہڑتال کی وجہ سے۔'' ''جیل میں بیٹھا ہوا یہ ڈاکو کیسے عجیب خیالات رکھتا ہے۔ یہ سوچ کر میٹ مسکرایا۔ ''ارے بھائی! یہاں تو روز پانچ دس بھرتی ہوا کرتے ہیں۔ ایک قیدی کی بھوک ہڑتال سے کھانا کم نہیں ہوجاتا۔''

''مگر تمہارا کیا خیال ہے وہ زندہ رہے گا؟'' جگت سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔ اسے عجیب سا جواب ملا۔ ''زندہ کتنے دن رہے گا؟ بارھویں دن اسے مرنا ہے۔ کھائی کر پھانسی چڑھا ہوتا تو روح کو تسکین ملتی۔'' یہ سن کر جگت کا دل بیٹھنے لگا۔ کھانے کی روٹی اس نے ایک کونے میں رکھ دی۔ گروبخش کا ایک جملہ اندھیری کوٹھری میں گونجنے لگا۔ ''یہ تو فرار ہونے کی ترکیب ہے۔ تمہارے بھی کام آئے گی...... '' نہیں نہیں...... گروبخش تم نے جلدی کردی۔ مجھے اشارہ کرتے تو میں تمہیں راستہ بتاتا دوست! تم اکیلے جیل کے سخت انتظام سے کیسے فرار ہوسکو گے......؟

جیل کے برابر ہی آفیسروں کے کوارٹر تھے۔ ڈاکٹر حسین برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ مس ماریا اس کے ذہن سے محو نہیں ہورہی تھی۔ پانچ چھ دن کے ساتھ نے اس خوبصورت لڑکی کی تصویر بیس سال سے خالی پڑے ہوئے دل پر نقش کردی تھی۔ اس پر محبت کی بارش کرنے کو ڈاکٹر کا دل چاہنے لگا۔ حسین ہونے کے باوجود غرور نہ ہو، الفاظ میں امرت ٹپک رہا ہو، کرسچین ہونے کے باوجود حرکات ہندوستانی ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر کے دل میں اس نے گھر کرلیا تھا۔ ڈاکٹر سوچ رہا تھا۔ ''شاید اس کی ماں ہندوستانی ہوگی اور وہ یتیم ہونے کے باعث کرسچین بنالی گئی ہوگی۔'' ڈاکٹر کا تجسس بڑھ گیا۔ اس لڑکی کے ماں باپ کے متعلق معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔ چرچ کے پادری سے مل کر اس کے متعلق اطلاعات فراہم کی جائیں۔ پھر...... پھر ماریا کے رشتے کی بات۔'' ماریا کے متعلق خواب دیکھتے ہوئے ڈاکٹر حسین آرام کرسی ہی پر سوگئے۔

جیل سے تین میل کے فاصلے پر لاہور کی گھنی آبادی والی گلی میں چار منزلہ ایک بلڈنگ کے کمرے میں شمع کے اجالے میں انقلابیوں کی میٹنگ ہورہی تھی۔ سونیا کی رپورٹ سن کر سب کے چہروں پر امید کا جالا پھیل گیا۔ گروبخش کا سب سے قریبی ساتھی مہر بولا۔

''پھانسی کو بارہ دن باقی ہیں۔ ہم اسے چار دن میں فرار کرادیں۔ کیوں بشن؟''

بشن کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''آج چوتھا ہے۔ ساتواں آٹھواں کے بعد آسمان کا اندھیرا مفید ثابت ہوگا۔''

"مگر سونیا کی نائٹ ڈیوٹی اتوار کو ہوگی۔" گوپال نے یاد دلایا۔ "اتوار کی صبح کر کچھوں کو چرچ جانا ہوتا ہے لہٰذا نائٹ مل سکے تو....."

"یہ اچھا ہے ہم ایک ساتھ دو دھماکے کریں گے۔" مہرا پُرمسرت لہجے میں بولا۔ "مجھے اطلاع ملی ہے کہ پیر کو سحر کے وقت گورنر ٹرین میں دہلی جائیں گے۔"

سب کی آنکھیں جوش سے چمکنے لگیں۔ مہرا نے پلان سمجھایا۔ "گرو بخش کو ایک اور دو کے درمیان اسپتال سے فرار کرا کر جیپ میں لے جانا ہے۔ لاہورا اسٹیشن سے چار میل دور ایک بڑا نالہ ہے۔ وہاں گورنر کی ٹرین کو الٹ دینا ہے۔"

دو چار لمحوں کے لیے سب کے سانس رک گئے۔

مہرا بولا۔ "سونیا! کل صبح گرو بخش کو پلان سمجھا دینا..... چار دن میں اسے کھا پی کر طاقت جمع کرنی ہوگی۔ اتوار کو رات ایک بجے۔"

اسی لمحے ہوا کا جھونکا کمرے میں داخل ہو گیا اور شمع بجھ گئی۔ اس نیم اندھیرے نے سب کو خاموش کر دیا۔ سونیا کا دل دھڑکنے لگا۔ کیا وہ کسی اچانک انجام کا اشارہ تھا؟

تیز قدموں سے چلتی ہوئی سونیا اسپتال کے گیٹ میں داخل ہوئی۔ چوکیدار اب اسے پہچاننے لگا تھا لہٰذا پاس دکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ شب بیداری اور تڑپ کے باعث تھکی ہوئی آنکھیں گرو بخش کا جائزہ لینے کے لیے ترس رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سات کی ڈیوٹی ہونے کے باوجود پونے سات بجے آ گئی تھی۔ بلند دیوار والے بڑے گیٹ میں داخلے کے بعد لان والا میدان آتا تھا۔ میدان کے درمیان گول چھوٹا سا باغیچہ بنا ہوا تھا۔ قیدیوں کے اگائے ہوئے پھولوں کی نرم پتیوں پر ابھی شبنم کے قطرے جھلک رہے تھے۔ صبح کی بادِ نسیم کے جھونکوں سے پھولوں کو جھومتے دیکھ کر وہ رک گئی۔ جھک کر اس نے موگرے کے پھولوں کا ایک گچھا توڑ لیا۔ موگرے کی تازہ کنواری خوشبو اپنے ساتھ میں سموتی ہوئی وہ آگے بڑھنے لگی۔ برسوں کی عادت کے مطابق اس کا ہاتھ موگرے کے پھولوں کو بالوں میں ٹھہرانے کے لیے بڑھا مگر انگلیاں گتی ہوئی لٹوں کو چھو گئیں۔ اس وقت دل کو دھچکا سا محسوس ہوا۔ وہ سونیا کی جگہ ماریا بن گئی ہے۔ یہ حقیقت وہ لمحہ بھر کے لیے بھول گئی تھی۔ اب اسے خیال آیا کہ اندر جلدی پہنچ جانے میں اس کی جلد بازی ظاہر ہو جائے گی۔ اس نے جلدی سے رسٹ واچ کے کانٹے کو پندرہ منٹ آگے بڑھا دیا۔ دوسرا دروازہ طے کر کے وہ اسپتال کی سیڑھیاں طے کرنے لگی۔ اسی لمحے ڈاکٹر کی استقبالیہ آواز سنائی دی۔ "گڈ مارننگ ماریا.....!" اور ماریا سناٹے میں آ گئی۔ روزانہ آٹھ بجے آنے والا ڈاکٹر سین آج جلدی آ گیا تھا اور مس ماریا کے نام سے پکارنے کی بجائے آج صرف ماریا کہا تھا۔

اس نے اپنی حیرت کو جلدی سے سمیٹ کر مسکرا کر جواب دیا۔ "گڈ مارننگ ڈاکٹر!" وہ پھولوں کے گچھے کو پشت پر چھپاتی ہوئی بولی۔ "آج آپ جلدی آ گئے ہیں؟" ڈاکٹر کی نظریں سونیا کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں تھامے ہوئے پھول پر نظریں ٹھہر گئیں۔ نرم مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولا۔

"ماریا! آج کچھ زیادہ خوش نظر آ رہی ہو..... پھول لے آئی ہیں۔"

"اوہ.....!" سونیا نے بے نیازی سے کہا۔ "میں تو بھول گئی تھی۔ آپ کے لیے یہاں کے باغیچے سے توڑ کر لا رہی تھی۔" یہ کہہ کر اس نے پھولوں والا ہاتھ بڑھایا۔

ڈاکٹر نے تھینکس کہہ کر سونیا کی مرمریں انگلیاں دباتے ہوئے پھولوں کا گچھا لے لیا۔ شباب کی تازگی اور جوش بھرے لمس سے ڈاکٹر کی نسوں کا ٹھنڈا خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ سونیا نے خفت سے ہاتھ کھینچ کر نظریں جھکا لیں۔ ڈاکٹر کو اس حرکت میں کنواری شرم دکھائی دی۔ اس نے لمبی سانس لے کر پھولوں کو سونگھا۔

"آہاہا..... کیسی میٹھی خوشبو ہے جیسے تیرا دل سونگھ رہا ہوں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے۔" وہ کسی اناڑی شاعر کی طرح بڑبڑایا۔ سونیا نے کھسکنے کے لیے رسٹ واچ کی طرف دیکھا۔

"اچھا سر! میں جا رہی ہوں۔ وقت ہو گیا۔ مس گارائی کو فارغ کروں۔" اور وہ تیزی سے اندر جانے لگی۔

"ڈونٹ بی فارمل ماریا۔" اس کے کانوں سے ڈاکٹر کا جملہ ٹکرایا۔ "سر نہیں حسین کہو مجھے۔"

ڈاکٹر کی بات کو ان سنی کرتی ہوئی وہ جلدی سے غائب ہو گئی۔ گروبخش کے کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ باہر بیٹھے ہوئے پہریدار جمائیاں لے رہے تھے۔ سونیا کو دیکھ کر ان کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔ فراک پہنے ہوئے لڑکی کے ڈھلے ہوئے پیروں کی گول اور حسین پنڈلیاں دیکھتے ہوئے دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ سونیا سرسراتی ہوئی اندر چلی گئی۔

گروبخش کے بیڈ سے کچھ دور دیوار کے سہارے اسٹول پر بیٹھی ہوئی مس گارائی نے سونیا کے قدموں کی آہٹ سن کر سر اٹھایا۔ "اوہ... آ گئیں؟" کتاب بند کرتی ہوئی وہ کھڑی ہو گئی۔ سونیا کی بے چین نظریں گروبخش پر جم گئیں مگر فوراً ہی گارائی کے خیال سے وہ ہوشیار ہو گئی۔

"مریض کیسا ہے؟" اس نے عام انداز سے پوچھا۔

"ذرا بھی تکلیف نہیں دی۔ ساری رات سوتا رہا ہے۔"

"یہ کہہ کر گارائی نے کتاب دکھائی۔" لہٰذا یہ جاسوسی کہانی پڑھ کر وقت پاس کر رہی تھی۔ بدمعاشوں کی قید میں پھنسا ہوا جاسوس فرار کے لیے پلان بنا رہا تھا۔ یہ پڑھ رہی تھی کہ تم آ گئیں۔" کتاب کو بغل میں دباتی ہوئی وہ بولی۔ "اب گھر جا کر پڑھوں گی تب تسلی ہو گی۔ دیکھیں جاسوس کس طرح فرار ہوتا ہے؟" یہ سن کر سونیا کا چہرہ اتر گیا۔

"اچھی بات ہے پڑھ کر کل بتانا کہ آخر میں کیا ہوا؟" اس نے ایسے ہی کہا۔

"نہیں بھئی جاسوسی کہانی کا انجام کہہ دینا اچھا نہیں۔ تمہیں دلچسپی ہو تو کل کتاب لا دوں گی۔ تم پڑھ لینا۔"

"ارے باپ رے۔" سونیا خوفزدہ انداز میں بولی۔ "مجھے ایسی کہانیاں پڑھتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔"

"ڈرپوک لڑکی۔" کا خطاب دے کر گارائی روانہ ہو گئی۔ سونیا نے اطمینان کی سانس لی۔ دروازے پر بیٹھے ہوئے پہریداروں کو دیکھا پھر گروبخش کے بیڈ کے قریب سرک آئی۔ موگرے کے پھولوں سے گروبخش کے رخسار تھپتھپا کر اسے جگانے کا منصوبہ بنایا تھا وہ تو ڈاکٹر حسین نے خراب کر دیا لہٰذا یہ کام انگلیوں کے سپرد کیا۔ نرم مس سے گروبخش کے لب مسکرا دیے۔ پھولوں کی پتیوں پر چمکتی ہوئی شبنم کی طرح اس کے پتلے لب روشن تھے۔ سونیا کو وہ لب چوم لینے کی خواہش ہوئی مگر ماریا کے بھیس نے اسے روک لیا۔ ایک غلط قدم سارا پلان ختم کر دے۔ اس کو خوف محسوس ہوا۔

"ڈرپوک لڑکی آ گئی؟" گروبخش نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ سونیا چونک اٹھی۔ وہ لاڈ کرتی ہوئی بولی۔

"اچھا... سونے کی اداکاری کرتے ہوئے جاسوس کی طرح مس گارائی کے ساتھ میری بات چیت سن رہے تھے؟"

"گارائی نے تم سے غلط کہا کہ میں ساری رات گہری نیند سویا تھا۔"

"پھر...؟" اس نے اطراف میں نظریں گھماتے ہوئے پوچھا۔

"نصف شب سوچ کر اور باقی نصف شب پیار کرتے ہوئے گزار دی۔" گروبخش نے ہنستے ہوئے کہا۔ "گارائی کے ساتھ نہیں بلکہ خواب میں تمہارے ساتھ رات بسر کر دی۔"

یوں تو سونیا نے بھی اسی حالت میں رات گزاری تھی پھر بھی گروبخش کی بات نے اسے کپکپا دیا۔ حالات آخری چار سالوں سے ان کے درمیان دیوار بنا رہے تھے۔ دن بدن فرض کی دیوار بلند تر ہو رہی تھی۔ جیل کی دیواروں سے بھی زیادہ بلند اور مضبوط۔

"چپ کیوں ہو گئیں سونیا......؟" گروبخش نے اسے خیالات سے بیدار کر دیا۔ سونیا نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ ڈاکٹر کے راؤنڈ کا وقت ہو گیا تھا۔ "وہ اچانک آ جائے گا۔ لہٰذا ہم اشارے سے بات کریں گے۔ میرا دل دھڑک رہا

ہے۔" اس نے کہا پھر کام کرنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "اتوار تک سب ٹھیک کر لیتا ہے۔"

"پلان مکمل ہو گیا ہے؟" گروبخش کی آواز بدل گئی۔ نرمی کی جگہ سختی آ گئی۔ "مجھے مختصر بتا دے تاکہ میں سوچ سکوں۔"

"ابھی نہیں ..... " سونیا نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "پہرے داروں کی ڈیوٹی بدلنے کے بعد پھر بات کریں گے۔ انہیں شک ہو جائے گا۔" اور سونیا مریض کو انجکشن کرنے کے لیے سامان لینے کمرے سے باہر چلی گئی۔

ڈاکٹر حسین اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ صبح سے ایک سنجیدہ بات پوچھنے کے متعلق ان کے ذہن میں کشمکش سی ہو رہی تھی۔ دل مضبوط کر کے وہ کہنا چاہتا تھا اسی لمحے جیل سپرنٹنڈنٹ میکلین اپنے خاص قیدی گروبخش کی حالت معلوم کرنے آ گیا اور ڈاکٹر کے ذہن میں گھومتی ہوئی بات وہیں رہ گئی۔

"ڈاکٹر! اس کا پروگریس کیسا ہے؟" سوپر نے سوال کیا۔

"ویری فائن۔" ڈاکٹر حسین اپنے علاج کی تعریف کرتا ہوا بولا۔ "چوبیس گھنٹے میں تمہارا قیدی بیٹھنے لگے گا۔"

"اسے کب خوراک دیا جائے گا؟" سوپر نے دوسرا سوال کیا۔

"فی الحال تو اسے انجکشن دیا جا رہا ہے۔" ڈاکٹر لمحہ بھر رک کر بولا۔ "ہاں صاحب! یہ بار بار کہہ رہا ہے کہ اگر مجھے پھر اسی کوٹھڑی میں بند کیا گیا تو اس صورت میں خوراک نہیں لوں گا۔ اس کا یقین ہو جانے پر وہ خوراک لے گا۔ ضد کر رہا ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

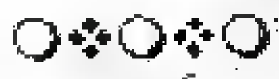
"اسے صحت مند ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟"

"اگر اسے خوراک ملے تو چار پانچ دن میں چلنے لگے گا۔" پھر بغیر پوچھے پُرمسرت لہجے میں ڈاکٹر نے کہا۔ "سر آپ فکر نہ کریں پھانسی کے دن سے پہلے میں اسے "میڈیکل فٹنس" کا سرٹیفکیٹ دے سکوں گا۔"

ڈاکٹر کی ہوشیاری میکلین کو کھلی مگر انگریزوں کی تہذیب کے زیر اثر مسکرا کر اس نے کہا۔ "ڈاکٹر! تم میری طرف سے اسے یقین دلاؤ کہ اسے آخر تک اسپتال میں رکھا جائے گا تمام سہولتیں دیں گے۔" اتنا کہہ کر وہ واپس لوٹ گیا۔

سوپر کی پُراسرار بات اور حرکت نے ڈاکٹر کے ذہن کو سوچ اور الجھن میں گرفتار کر لیا۔ ایسا سخت آدمی اچانک اتنی نرمی اختیار کرے ضرور اس میں کوئی اسرار ہے۔

اسی لمحے میکلین اپنے جیل کے آفس میں بیٹھا اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "وہ انقلابی اسپتال میں رہنے کی ضد کیوں کر رہا ہے؟ ضرور اس کی کوئی چال ہوگی۔" وہ سوچنے لگا۔ پھر اپنی عقلمندی پر خوش ہوتا ہوا بڑبڑایا۔ "مگر کوئی فکر نہیں! ڈاکٹر کے یقین دلانے پر وہ جلد اچھا ہو جائے گا۔ اس کے فوراً بعد اچانک ہی اسے جیل میں ٹرانسفر کر دوں گا۔ پھانسی کا قیدی زیادہ تر آخری دن نروس ہوتا ہے۔ اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ انہی لمحات میں خودکشی کی کوشش کرتا ہے مگر میں اس انقلابی بچے کو ایسا موقع ہی نہیں دوں گا۔ بچے! ہم انگریز ایسے احمق نہیں۔ ورنہ تم لوگوں پر اتنا عرصہ حکومت کس طرح کر سکتے تھے؟



جگت بھی چکی پیستا ہوا گروبخش کے خیالات میں گم تھا۔ آج صبح گیہوں لانے والے جمعدار نے کہا تھا۔ "اب تمہارا کام آدھا کر دیا گیا ہے۔ صاحب تم سے بہت خوش نظر آ رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے اس انقلابی سے ڈاکو اچھا جو ذرا بھی گڑبڑ نہیں کرتا۔" مگر جگت کو سوپر صاحب کی بات سن کر خوشی نہیں ہوئی۔ وقت آنے پر وہ بھی اپنا چمتکار بتانا نہیں بھولے گا۔ تب اس کی سمجھ میں آئے گا کہ ڈاکو کی گڑبڑ تمہارے جیسے انگریز کو پسینہ لا سکتی ہے۔ فی الحال اسے گروبخش کی فکر ستا رہی تھی۔ جیل اسپتال کے متعلق کچھ معلومات فراہم ہونے پر وہ گروبخش کے فرار کی ترکیب سمجھ سکتا تھا مگر کس سے پوچھا جائے؟ کس طرح پوچھا جائے؟ بہت زیادہ تجسس کی صورت

میں مشکوک ہوجانے کا اندیشہ تھا کہ گرو بخش نے اسپتال سے فرار ہونے کے لیے یہ داؤ لگایا ہے۔ گرو بخش کی فکر اس کے ذہن کو سکون نہیں دے رہی تھی۔ چکی پیسنے میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

سنتری اودھم سنگھ باہر کھڑا قیدی کی بے چینی دیکھ رہا تھا۔ "ارے تو سو سا تھٹو چکی میں دانے ڈالے بغیر چلا رہے ہو۔ ذہن کہاں لگا ہوا ہے؟" جگت چونک گیا۔ سر گھما کر دیکھا۔ اودھم سنگھ کے بزرگ چہرے کی جھریاں مسکرا رہی تھیں۔ "کیوں..... گھر یاد آ رہا ہے جگا؟" قیدی کو نام سے پکارنے پر پابندی کے باوجود سنتری کے لہجے میں اپنائیت تھی۔ پیشانی کا پسینہ خشک کرتا ہوا جگا سیل کے دروازے پر آ گیا۔

"چاچا! تمہارے جیل خانے نے پیسنے کی ایسی عادت ڈال دی ہے کہ دانے ختم ہونے کے باوجود ہوش نہیں رہا۔"

"ارے ہاں... مجھے پتہ چلا کہ تمہارا کام نصف کر دیا گیا ہے جو تم نے فوراً ختم کر لیا۔"

"یہی تو مصیبت ہے چاچا۔" جگت نے سنتری کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔ "اب وقت کس طرح کٹے گا؟ البتہ تم دو گھڑی باتیں کرنے میں میرا ساتھ دو تو وقت بھی کٹ جائے گا۔"

اودھم سنگھ بھی جیسے اس وقت کا منتظر تھا۔ بولا۔ "جگا سچ بات تو یہ ہے کہ دو تین دن سے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔" جگت کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ کیا پوچھے گا؟

"میرا لڑکا روز کہتا ہے کہ باپو! آپ جگا ڈاکو کا پہرہ دیتے ہیں پھر مجھے اس کی بہادری کی کہانی کیوں نہیں سناتے؟ لڑکا اپنے اسکول کے بچوں سے فخریہ کہتا ہے کہ میرے باپو جیل میں جگا کا پہرہ دیتے ہیں۔"

جگت خوش ہو گیا۔ جیل کے سنتری کا لڑکا اس کے نام پر فخر کرتا ہے کیسا عجیب لیکن اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ اودھم سنگھ جگا کی کہانی سننے کے لیے متجسس تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا لہٰذا جگا بولا۔ "چاچا! میں اکیلا بولتا رہوں اس میں لطف نہیں آپ نے بھی بیس سال جیل میں چوکیداری کی ہے آپ کے پاس بھی بہت کہانیاں ہوں گی۔"

"مگر بھائی میری باتوں میں مار دھاڑ کی گرمی نہیں ہوگی۔"

"کیوں نہ ہوگی؟ یہاں ہر قسم کے قیدی آتے ہیں۔" جگا نے کہا۔ پھر کچھ دیر رک کر بولا۔ "سب لوگوں نے جیل پوری نہیں کاٹی ہوگی۔ کوئی ضرور جیل توڑ کر بھاگنے کی کوشش کر چکا ہوگا۔"

دوسری پوزیشن میں قیدی کا یہ تجسس اودھم سنگھ کو چونکا دیتا مگر جگا کے کارنامے سننے کی ہوس میں اسے شک محسوس نہیں ہوا۔ وہ یاد کرتا ہوا بولا۔ "ہاں..... کچھ ایسے واقعات ہوئے ہیں۔ ابھی چھ ماہ پہلے کی بات ہے چار سال کی قید پایا ہوا جوان جیل کے باغیچے میں کام کرتا ہوا فرار ہو گیا ساتھ ہی بیچارے اسپتال کے چوکیدار کی ملازمت بھی لیتا گیا۔"

"مگر ایسا کیسے ہو گیا؟" جگا کا تجسس بڑھ گیا۔ "اسپتال میں بھی جیل جیسا سخت انتظام ہوگا۔ وہاں سے کس طرح فرار ہو سکا؟" پھر جگت نے محسوس کیا کہ اس نے جلد بازی کی ہے کیونکہ اودھم سنگھ چپ ہو گیا تھا۔ جواب کے لیے جگت کو انتظار کرنا پڑا۔

"اسپتال سے فرار اس وقت آسان تھا اور قیدی نے بہترین ترکیب آزمائی۔ باغیچے کی گھاس لے جانے والی گاڑی میں چھپ گیا۔" سنتری کہہ رہا تھا۔ "مگر اب وہاں انتظام سخت کر دیا گیا ہے۔ دیواریں بلند کر دی ہیں۔ چھٹکارے کا ایک راستہ ہے جو ابھی آزمایا جا سکتا ہے۔"

"ہو نہیں سکتا؟" جگت کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"اگلے ماہ ایسا ہوا تھا۔" سنتری زیر لب مسکراتا ہوا بولا "جیل کی طرح اس نے دنیا سے بھی چھٹکارا پالیا۔ بے چارے نے زہر پی لیا۔"

"اوہ.....!" جگت نے آہ بھری۔ چھٹکارے کا اس نے کیا مطلب لیا تھا؟ اسی لمحے جیل کا ڈپٹی جیلر راؤنڈ پر آ گیا لہٰذا سنتری اٹینشن ہو کر دروازے پر ٹہلنے لگا۔

○❖○❖○

"جوان! تمہارا مطالبہ سوپر صاحب نے منظور کرلیا ہے" ڈاکٹر حسین نے راؤنڈ لگاتے ہوئے گروبخش کے بیڈ کے قریب جاکر کہا۔ "تمہیں آخر وقت تک اسی جگہ رکھا جائے گا۔ اب تو تم بھوک ہڑتال چھوڑ دو گے؟"

گروبخش سوچ میں ڈوب گیا' مگر ڈاکٹر کے عقب میں مریض کا چارٹ لے کر کھڑی ہوئی سونیا نے اشارہ کیا' لہٰذا گروبخش نے کہا۔ "اچھی بات ہے' میں بھوک ہڑتال ختم کردوں گا۔"

وہ اتنی آسانی سے مان جائے گا اس کی ڈاکٹر کو امید نہیں تھی۔ "گڈ بوائے۔" اس نے گروبخش کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا۔ "ماریا! مریض کے لیے فروٹ جوس بنانے کا آرڈر دے دو۔ شام چاول دیے جائیں۔" فتح کی مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتا ہوا حسین چلا گیا۔ پھر اس کے الفاظ دہراتی ہوئی سونیا بولی۔ "گڈ بوائے! ڈاکٹر صاحب تم پر بہت خوش ہے۔ جوائی کی طرح مہمان نوازی کررہا ہے۔" پھر آنکھیں نچاتی ہوئی بولی۔ "کیا خیال ہے' جنوائی ہو گے؟"

"سونیا۔ یہ قصائی کی مہمان نوازی ہے۔" پھر دانت پیس کر بولا۔ "قتل کرنے سے پہلے بکرے کو کھلا پلا کر تازہ کیا جاتا ہے۔"

"مگر اتوار کو بکرا مذبح خانے سے فرار ہوجائے گا پھر بیچارے سر پکڑ کر روئیں گے۔"

پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد سونیا کو یاد آیا' اسپنج کرنے کا پانی ٹھنڈا ہورہا تھا۔ بیڈ کی آڑ میں پارٹیشن رکھ کر پانی میں تیلیون بھگو کر اسپنج کرنے میں مشغول ہوگئی۔ بھیگا ہوا کپڑا گروبخش کے جسم پر گردش کررہا تھا مگر اس لمس سے سونیا کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ اپنے محبوب کی خدمت کرنے کا پہلی بار موقع ملا تھا۔ انقلابی گروپ میں شامل ہونے کے بعد گروبخش سے بہت کم ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی سونیا مایوس ہوجاتی' انگریز دیش چھوڑ کر نہیں جائیں گے اور وہ اس جنم میں گروبخش سے نہیں مل سکے گی پھر دل ہی دل میں بھگوان سے کہتی۔ "بھگوان! اگر ایسا ہو تو دوسرے جنم میں ادھورے ارمان پورے کرنا۔" چار سال کے بعد گروبخش کے ساتھ رہ کر چار دن کے لیے اس کی خدمت کرنے کا موقع ملا۔ اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ یہاں سے فرار کے بعد نہ جانے کب گروبخش سے ملاقات ہوگی؟ پنجاب پولیس اس کی گرفتاری کے لیے زمین آسمان ایک کردے گی۔ پہلے کمشنر کا قتل اور اب گورنر کے قتل کے لیے۔ سونیا کے ہاتھ رک گئے۔ گروبخش اسے نظر بھر کر دیکھ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو سونی؟" پوچھنے کے باوجود وہ خاموش رہی تو کھلے سینے پر گردش کرتے ہوئے سونیا کے ہاتھ کو دبا کر کہا۔ "تمہیں محسوس نہیں ہورہا کہ تم بہت زیادہ خطرے میں ہو؟ فرض کرو اگر تمہاری اصلیت کا پتہ چل جائے پھر کیا ہوگا؟"

"گرو! مجھے اپنی فکر نہیں' میں نے میرا سے کہہ کر خود یہ کام اپنے سر لیا ہے۔ شاید اس میں بھی قسمت کا کوئی اشارہ ہو' دیکھو! تمہاری خدمت کا اسی بہانے موقع مل گیا۔" سونیا کے الفاظ میں محبت کی چاشنی تھی۔ گروبخش محبت کے جوش کو نہیں روک سکا۔ اس نے سونیا کا ہاتھ لبوں پر رکھ کر اس کی انگلیاں چوم لیں۔ سونیا کا دل بھرپور جذبات سے دھڑکنے لگا۔ پیار کی بے خودی میں ڈوب جانے کا اسے ڈر محسوس ہوا۔ اس نے پھرتی سے اپنے ہاتھ ہٹا کر اسپنج شروع کردیا۔ پارٹیشن کی آڑ میں اسے اس سے زیادہ کام کرنا تھا۔ گروبخش کو اتوار کی رات کا پلان سمجھا دینا تھا۔

"غور سے سننا۔" سونیا نے کہا۔ "میں مس ماریا کرسچن ہونے کی وجہ سے اتوار کو چرچ جاتی ہوں۔ مجھے نائٹ ڈیوٹی ملے گی۔ سردی کی اندھیری رات ہوگی۔ رات کو بارہ بجے جیلر راؤنڈ پر نکلے گا۔ چوکیدار اس وقت تک اٹینشن رہیں گے ایک بجے اسپتال کے پہریداروں کا چائے کا وقفہ ہوتا ہے۔ تب وہ باری باری سرے والے باورچی خانے میں چائے پینے جائیں گے۔ ہم نائٹ ڈیوٹی

والوں کو بھی دو میں چائے چینا ہوتی ہے۔ اتوار کی رات کی چائے روز کی طرح نہیں ہوگی۔" سونیا سانس لینے کے لیے رکی۔ گرو بخش غور سے سن رہا تھا۔ "بارہ بجتے ہی میں تمہارے کمرے سے چلی جاؤں گی۔ اس رات چائے بنانے میں تھوڑی دلچسپی لوں گی۔ مجھے چائے میں نیند لانے والا پاؤڈر ملانا ہے۔ پینے والوں پر اس کا اثر آدھے گھنٹے میں ہوگا۔ لہٰذا ڈیڑھ بجے تمہارا کام شروع ہوگا۔"

"بہت اچھے....." گرو بخش تحسین آمیز نظروں سے سونیا کو دیکھنے لگا۔ وہ انقلابیوں کے ساتھ رہ کر مضبوط دل والی بن چکی تھی۔ یہ سب کہتے ہوئے اس کی آواز میں لرزش نہیں تھی۔ "مگر سونیا! کمرے سے باہر جانے کا راستہ اس کھڑکی کے ذریعے ہوگا؟ اس کی سلاخیں مجھے کھٹک رہی ہیں۔"

"یہ کام آسان ہوگا۔ کمرے میں کھلی ہوا دینے کے لیے روزانہ صبح شام آدھا گھنٹہ کھڑکی کھولی جاتی ہے۔ کل سے میں کھڑکی بند کرتے وقت سلاخوں کے سرے میں تھوڑا تھوڑا ایسڈ چھڑکتی رہوں گی۔ درمیان کی تین سلاخیں ڈھیلی کرنی پڑیں گی۔ اتنی جگہ کافی ہوگی؟"

سونیا سنجیدہ انداز میں پوچھ رہی تھی مگر گرو بخش نے مذاق میں کہا۔ "بالکل..... میں زیادہ موٹا نہیں ہوں۔ بھئی ویسے میرا خیال ہے یہ ترکیب مہرا کے دماغ کی پیداوار ہوگی۔ اس نے تم سے سلاخوں کے درمیان فاصلہ بھی پوچھا ہوگا؟"

سونیا نے اثبات میں سر ہلایا لہٰذا گرو بخش نے مزید کہا۔ "میں بھی یہاں پڑا یہی اندازہ لگا رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا دو سلاخیں کافی رہیں گی۔ اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ سلامتی کی خاطر بڑا سوراخ ہونا چاہیے۔ مگر ایسڈ روز تھوڑا کیوں ڈالنا چاہیے؟"

"مہرا سے میں نے یہی سوال کیا تھا تب پتہ چلا کہ اس کا حساب کتنا صحیح تھا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ سلاخیں اتنی ڈھیلی نہیں ہونی چاہئیں کہ جیل کے آدمیوں کو شک ہو جائے۔ پھر جیل کے پہریدار بھی دور سے کھڑکی کی سلاخیں دیکھتے رہتے ہیں۔ انہیں آخر تک سلاخیں بھی نظر آنی چاہئیں۔ مہرا کو اندر کے متعلق اس قدر ایک ایک چپے کی خبر ہے کہ مجھے تعجب ہوتا ہے۔ میں روز یہاں آتی ہوں پھر بھی اندر کیا ہو رہا ہے اس کی اسے مجھ سے زیادہ خبر ہے۔" سونیا نے بتایا۔

"ہمم....." گرو بخش پرخیال لہجے میں بولا۔ "باہر نکلنے کے بعد مجھے کسی پہریدار کی رائفل چھیننا پڑے گی۔ جس کے سہارے سیدھا باہر جا سکوں گا۔"

"نہیں..... صبح ہونے تک کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ تم فرار ہو چکے ہو۔" سونیا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ گرو بخش تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔ سونیا کام کے بہانے پارٹیشن کے پیچھے گئی۔ باہر پہریدار نہیں بالکل رہے تھے پھر گرو بخش کے قریب آ کر سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔

"پیر کو سحر کے وقت گورنر اسپیشل ٹرین سے دہلی جا رہا ہے۔ وہاں دھماکا کر کے ہمیں پورے ہندوستان کو نیند سے بیدار کرنا ہے۔"

گرو بخش بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے دہکنے لگے۔ گورنر کو ختم کرنے کی خواہش اسے پوری ہوتی نظر آئی۔ "شاباش مہرا! تم نے غضب کا پلان بنایا ہے۔"

مگر سونیا کو ہوشیاری کی بات کہنی باقی تھی۔ "یہی وجہ ہے کہ تمہارے لیے جیل کی دیوار پھاندنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس کا پورا نقشہ تمہیں سنیچر کی صبح ایک لفافے میں میرے پاس سے مل جائے گا۔ اسے ذہن میں بٹھا کر کاغذ پانی میں ڈبو کر اسے صاف کر دو گے۔"

"اس کی فکر نہ کرو..... ضرورت پڑنے پر میں کاغذ کھا بھی سکتا ہوں۔" گرو بخش کے جسم میں پھرتی آ گئی مگر سونیا نے اس کا شانہ دبا کر لٹا دیا۔ "اور گرو بخش! تمہیں اتوار تک جسم میں کمزوری کی اداکاری جاری رکھنی چاہیے۔"

"دوسرا کوئی حکم؟" گرو بخش نے مزاحاً پوچھا۔

"ہاں..... جیل کی دیوار کے اوپر پہنچ کر تم نیچے اترنے سے پہلے شمالی سمت میں ساتھیوں کے سگنل پر نظر رکھنا نہ بھولنا۔" سونیا نے کہا۔

"سگنل! کس بات کا سگنل؟"

"نصف شب میں روشنی کی چمک..... نصف فرلانگ کے فاصلے پر گھنے درخت پر سے سبز روشنی چمکے گی۔ یہ سلامتی کا اشارہ ہوگا۔ وہ لوگ وہاں جیپ میں تمہارا انتظار کریں گے۔ جیپ وہاں سے ریلوے لائن کی سڑک پر غائب ہوجائے گی۔" سونیا ایک ہی سانس میں بولی۔

"اور پھر بم دھماکا..... !" گروبخش بولا۔ "اب میں اتوار کی نصف شب کا انتظار کروں گا۔" سونیا چھپکے انداز میں مسکرا کر وہاں سے چلی گئی۔

بدھ کو ڈاکٹر سین نے سونیا سے کچھ کہنے کی ہمت پیدا کرلی۔ "پاریا! اتوار کو تم کیا کروگی؟" تب سونیا لرز گئی۔ کیا اسے اتوار کے پلان کا پتہ چل گیا ہے؟ ڈاکٹر نے تفصیل سے کہا۔ "میں یہ کہہ رہا تھا کہ اتوار کو اگر تم فری ہو تو میرے ہاں کھانے کا پروگرام رکھا جائے۔ چھٹی کا دن اکیلے بور کرتا ہے تم مجھے کمپنی دوگی؟"

سونیا کو فرار حاصل کرنے کے لیے کہنا پڑا۔ "تھینکس ڈاکٹر! مگر اتوار کا پورا دن مجھے چرچ میں گزارنا پڑے گا۔ بائبل پڑھتی ہوں۔" یہ سن کر ڈاکٹر کی مسرت بجھ گئی۔ لہٰذا سونیا نے جلدی سے کہا۔ "مگر صاحب! پیر کو شام اگر کہیں تو ضرور آؤں گی۔ اسپتال سے فارغ ہوکر فری رہتی ہوں۔"

"شام......" ڈاکٹر پھر خوش ہوگیا۔ شام کا وقت ہی ایسی گفتگو کے لیے مناسب ہوتا ہے۔ اس کا اس نے کیوں خیال نہیں کیا؟ یہ لڑکی کافی سمجھدار ہے" وہ بولا۔ "وعدہ.... پھر پیر کی شام کی بات پکی۔"

"اوکے۔" سونیا نے لہک کر کہا اور ڈاکٹر کا ذہن چار دن پہلے پیر کی شام کا متلاشی ہوگیا۔

جمعرات کو ستار اسپتال کے کھڑکی دروازے چیک کرنے آپہنچا۔ کمرے کی کھڑکی پر اس نے ہتھوڑے سے دو ضربیں لگائیں تب گروبخش کے دل پر چوٹ لگی مگر ستار کے لیے یہ روز کا معمول تھا۔ اسے کوئی غلط بات محسوس نہیں ہوئی۔

جمعہ کو کوئی خاص بات نہیں ہوئی مگر سنیچر کو صبح سونیا نے آکر گروبخش کے تکیے کے نیچے نقشے کا کاغذ سرکا دیا۔ تب فرار ہونے کے پلان کا پہلا حصہ مکمل ہوگیا۔ سونیا کا دل دھڑکنے لگا مگر اس نے گروبخش کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ شام جدا ہونے سے پیشتر آنکھوں کے اشاروں میں دونوں نے بات کرلی۔ "اب کل شام ہماری آخری ملاقات ہوگی۔"

اتوار کا دن گروبخش کو کافی لمبا محسوس ہونے لگا۔ بار بار وہ نقشے کو ذہن میں دہرانے لگا۔ اب اسے بیڈ کاٹ رہا تھا۔ کھڑکی کی سلاخیں کھٹک رہی تھیں۔ پیر کو سحر کے وقت گورنر کی ٹرین کو الٹ دینے کا دھماکا ذہن میں گونجنے لگا۔

اتوار کی رات آگئی۔ سونیا نے سارا دن الجھن میں گزارا تھا۔ یہ بات اس کے چہرے سے نظر آرہی تھی۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہے؟" گروبخش نے جلدی سے پوچھا۔

سونیا آج کم بولنے کا فیصلہ کرکے آئی تھی۔ ممکن ہے آخری لمحے کسی کو شک ہوجائے اس صورت میں بازی پلٹ جانے کا ڈر تھا۔ اکثر آخری لمحے گڑبڑ ہوجاتی ہے۔ لہٰذا مسکرا کر اشارہ کیا۔ "بالکل ٹھیک ہے۔" آدھے گھنٹے بعد گروبخش کے پاس اسے چکر لگانے جانا تھا' کیونکہ اب مریض اچھا ہوچکا تھا۔

"نو..... دس..... گیارہ..... بارہ..... جیل کا گھنٹہ سردی کی رات میں گرج اٹھا۔ سونیا آخری بار گروبخش سے ملنے کے لیے آگئی۔ تھرمامیٹر کا پارہ گرا کر وہ گروبخش کے منہ میں رکھنے کے لیے قدرے جھکی۔ گروبخش نے ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن تھام لی۔ پھر آہستہ سے نیچے کھینچ لیا۔ سونیا نے گروبخش کی پیشانی پر تپتے ہوئے لب رکھ دیے۔ آنکھ پر سے سرکتا ہوا آنسو گروبخش کے رخسار پر گرا۔ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ وہ بولی۔ "گروبخش! سنبھلنا۔"

"تم بھی سنبھلنا سونی۔" گروبخش بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ جدا ہونے کے لمحات دونوں کو ہلا سے گئے۔

"میں جارہی ہوں۔" کہتی ہوئی سونیا دور ہٹ گئی۔

گروبخش کے کانوں میں اس کے الفاظ گونجنے لگے۔

”مریض سوگیا ہے... دروازہ بند کردینا۔“ سونیا نے جاتے ہوئے پہریداروں سے کہا۔

تھوڑی دور جانے پر اسے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔

ایک کا گھنٹہ بجنے پر باہر پہریداروں کی ہلچل سنائی دی۔ لہٰذا گروبخش بستر پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اسے اپنا سانس سنائی دے رہا تھا۔ ایسی خاموشی تھی کہ وہ آہستہ سے کھڑا ہوگیا۔ کھڑکی آہستہ سے کھول دی اور سلاخوں کے باہر دیکھنے لگا۔ گہرا اندھیرا‘ ٹھنڈی ہوا اور سناٹا دیکھ کر گروبخش کپکپا کر رہ گیا۔ درمیان کی سلاخ پکڑ کر زور لگایا۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ سلاخ الگ ہوگئی۔ گروبخش کچھ دیر سانس لینے کے لیے رکا پھر پہریدار کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ پہریدار کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ چاربے لی کرتا چلے تھے۔ پندرہ منٹ کے بعد گروبخش نے سلاخیں نکال دیں۔ پھر باہر سے آہٹ سنائی دی۔ اسی لمحے ہوا سے مٹی اندر آگئی اور اس نے اپنا نکتا آئی ہوئی چھینک کو روکا۔ ڈیڑھ بجے وہ کھڑکی سے باہر کود گیا۔ کھڑکی زمین سے دس فٹ بلند تھی۔ پیر زمین سے لگتے ہی اس کی قمیص عقب سے کھنچ گئی۔ کپڑا پھٹ گیا جس سے ہلکی آواز ہوئی۔ اس نے زور سے جھٹکا مارا اور کپڑا کھڑکی سے الگ ہوگیا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ خوف انسان کو کتنا ڈرپوک بنا دیتا ہے؟ پیر کی زنجیر ہلکی آواز میں کھڑکی وہ سانس روک کھڑا رہا پھر نیچے لیٹ کر گھاس میں پیٹ کے بل سرکنے لگا۔

سب کچھ پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔ لہٰذا گروبخش کی ہمت بڑھ گئی۔ دور ایک دیوار کے ساتھ کھڑی بن کر بیٹھے ہوئے چوکیدار کا سایہ نظر آیا۔ وہ سمجھ گیا کہ جاڑے کا نشہ چڑھ رہا تھا۔ درمیان کی ایک دیوار چڑھ کر پار کرنے میں تکلیف ہوئی۔ زنجیر کی ہلکی سی آواز آئی پھر بھی چھوٹ ہوا۔ اب صرف بیس فٹ کے فاصلے پر دیوار نظر آرہی تھی۔ گھاس پر سرکتا ہوا وہ اس کے قریب پہنچنا چاہتا تھا‘ ٹھنڈی گھاس کے لمس سے جسم کے بال کھڑے ہوجاتے تھے۔

دس فٹ کا فاصلہ ایک میل کے برابر محسوس ہونے لگا۔ دو قدم سرک کر وہ رک جاتا تھا۔ اطراف میں نظریں گھما کر دیکھ لیتا تھا۔ اندھیرے آسمان میں چمکتے ہوئے ستارے جیسے اس کی چالاکی پر مسکرا رہے تھے۔ پندرہ فٹ کا فاصلہ طے کیا اسی لمحے گھاس میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ ساتھ ہی زوردار پھنکار سنائی دی۔ گروبخش کا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ آنکھوں کے سامنے چمکتی ہوئی سیاہ آنکھوں والا ناگ پھنکار رہا تھا جیسے گورا میکلین راستہ روکے کھڑا ہو۔ ناگ پر جھپٹ کر اس کا منہ کچل دینے کی خواہش ہوئی مگر یہ آسان کام نہیں تھا۔ وہ سانس روکے گھاس میں سر رکھ کر آنکھیں بند کیے لیٹ گیا جیسے وہ ناگ دیوتا کو پرنام کر کے راستہ چھوڑ دینے کی التجا کر رہا ہو۔ کچھ دیر بعد گھاس میں پھر سرسراہٹ ہوئی۔ اس نے آہستگی سے سر اٹھایا۔ راستہ صاف تھا۔ اب یقین ہوگیا کہ اسے کوئی روک نہیں سکے گا۔ اس یقین کے بل پر وہ مزید پانچ فٹ پار کر گیا۔ سردی میں ٹھنڈی دیوار کو چھوتے ہی اسے قدرے سکون ملا۔ پھر وہ سانس لینے کے لیے رکا اطراف میں نظریں گھمائیں‘ پھر پتھر کی دیوار پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کچھ دیر ہاتھ میں کچھ نہیں آیا۔ اسے خوف محسوس ہونے لگا۔ کیا مہرا ڈور لٹکا نہیں سکا ہوگا؟ اگر ایسا ہے تو اسے پہریدار کی رائفل چھین کر جان پر کھیلنا پڑے گا مگر اسی لمحے ہوا کے جھونکے سے دیوار سے لگی ہوئی کوئی چیز حرکت کرنے لگی۔ مسرت سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ آہستہ سے سرک کر وہ اس جگہ پہنچ گیا۔ ڈور کو چھوتے ہوئے اسے محسوس ہوا جیسے وہ جنت کی سیڑھی ہو۔ اب اسے خیال آیا کہ اس نے ڈور سیاہ رنگ سے رنگی ہوئی تھی لہٰذا اندھیرے میں نظر نہیں آئی۔ گروبخش کی ناک سے تارکول کی بو کرائی‘ مہرا کی چالاکی پر وہ خوش ہوگیا۔ اس کی آسانی کے لیے رسی میں ہر دو فٹ پر ایک گانٹھ لگائی گئی تھی۔ بھگت سنگھ کا نام لے کر گروبخش گانٹھ میں پیر کا انگوٹھا لگا کر بڑی ہوشیاری سے تیس فٹ بلند دیوار پر چڑھنے لگا۔

ادھر جیل سپرنٹنڈنٹ میکلین کو نیند نہیں آرہی تھی۔

اچانک کچھ ہونے کے خطرے کے پیش نظر شام سے اس کا ذہن گھوم رہا تھا۔ وہ بستر سے اٹھ گیا کئی بار وہ بستر چھوڑ کر باہر نکل جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ جیل کے پہریدار نیند چرانے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔

ایک ہاتھ میں اپنا پستول اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ تھام کر وہ باہر آ گیا۔ وہ ایک پہریدار کو اونگھتا دیکھ کر اسے غصہ آ گیا۔ ٹارچ جلانے کے لیے اس نے ٹارچ کے سوئچ پر انگلی رکھی۔ اسی لمحے پتھر سے ٹکرا کر زنجیر کی کھنکھناہٹ آواز سنائی دی۔ وہ چونک گیا۔ دیوار کی بلندی پر سفید لباس کا ہیولا نظر آیا۔ گروبخش نے بلندی پر پہنچ کر دیکھا اسے باہر شمال کی جانب نصف فرلانگ کے فاصلے پر سبز روشنی نظر آئی۔ ساتھی اسے سگنل دینے کے لیے حاضر تھے۔ اب اسے ڈور کھینچ کر دوسری جانب لٹکانی تھی۔ پھر وہ نیچے جا سکتا تھا۔ ڈور کھینچنے کے لیے وہ قدرے جھکا مگر.....

اسی لمحے رات کی سیاہ چادر کو چیرتی ہوئی سفید روشنی کی لکیر اس پر چھا گئی۔ گروبخش لڑکھڑا گیا۔ نیچے کودنے کے لیے وہ تیار ہو گیا۔ اسی لمحے میکلین کے پستول سے سنسناتی ہوئی گولی نکلی۔ گروبخش کے پیر لڑکھڑائے مگر مضبوطی سے اس نے سنبھالا لیا اور جیل کے اندر گرتے ہوئے جسم کو زور کر کے باہر کی جانب پھینک دیا۔ میکلین کی پستول سے نکلی ہوئی دوسری گولی خالی گئی۔ زمین پر وزن دار چیز گرنے کا دھماکہ سنائی دیا۔ سنسان جیل پہلے دھماکے سے پھر الارم سے گونجنے لگی جیسے زلزلہ آیا ہو اسی طرح دوڑ بھاگ اور شور مچ گیا۔ پہریداروں نے صدر دروازہ سنبھال لیا۔ قیدی آنکھیں ملتے ہوئے "کیا ہوا؟ کون فرار ہوا؟" کی پوچھ گچھ کرنے لگے۔ جاگتے ہوئے جگت کے منہ سے اچانک نکل گیا۔ "گروبخش۔"

گروبخش کو گرتا دیکھ کر میکلین نے کچھ سوچے بغیر باہر کی جانب دوڑ لگائی۔ فرار ہوتے ہوئے قیدی کو گولی مارنے کے لیے پستول اس کے ہاتھ میں تیار تھا۔ ٹارچ اسی طرح جل رہی تھی مگر دیوار کے عقب میں پہنچتے ہی اس کے پیر تھم گئے۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے گروبخش کو پہچان لیا۔ خون میں لت پت تڑپتے ہوئے جوان کو دیکھ کر انگریز میکلین کا کلیجہ ہل گیا۔ سر پتھر سے ٹکرانے کی وجہ سے نصف کھوپڑی ٹوٹ چکی تھی۔ نیچے جھک کر میکلین نے اس کی نبض دیکھی۔ گروبخش کی مٹھی میں دبی ہوئی ڈھول آہستہ آہستہ نکل رہی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا' سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "انقلاب....." اتنا لفظ اس انقلابی کے منہ سے باہر آ رہا تھا مگر زندہ باد کہنے تک وہ زندہ نہیں رہا' ایک ہچکی آئی' جسم سکڑ گیا اور گردن ڈھلک گئی اور روح نکل گئی۔ میکلین نے اس کا بے جان ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ صرف اتنا بولا۔

"فرار ہو گیا۔"

دوڑ کر آتے ہوئے چوکیداروں نے لاش کو قبضہ میں لے لیا تو میکلین دروازے کے اندر داخل ہو گیا۔ اسپتال میں سنسنی پھیل گئی۔ ڈاکٹر سین دوڑا ہوا آ گیا۔

"ہر ایک کی تلاشی لو کوئی باہر نہ جائے۔" سوپر گرجا' سب لرز گئے میکلین' گروبخش والے کمرے میں داخل ہوا۔ پہریداروں کو انگریزی میں گالی دے کر بولا۔ "آخر میں اس کمرے سے کون باہر گیا تھا؟"

"نرس..... کرچین نرس۔" ایک پہریدار کپکپاتا ہوا بولا۔

"کہاں ہے وہ؟" سوپر نے حکم دیا۔ "اسے پکڑو۔" سارا اسپتال کھنگال ڈالا گیا مگر سونیا نظر نہیں آئی۔ ڈاکٹر سین کا چہرہ اتر گیا۔ اسی لمحے ایک پہریدار دوڑتا ہوا آیا۔ "صاحب! باتھ روم اندر سے بند ہے۔ کھڑکایا' مگر کوئی جواب نہیں دے رہا۔ نہ ہی دروازہ کھولتا ہے۔"

"دروازہ توڑ دو....." میکلین کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "جلدی۔"

دروازہ توڑ کر دیکھا۔ سنگ مرمر کی سفید زمین پر سفید لباس والی نرس گھٹنوں میں سر دیے پڑی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کی ناک کے پاس انگلی رکھی۔ سانس ابھی کچھ باقی تھی۔ چہرے پر موت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ برابر میں ایک بوتل پڑی ہوئی تھی۔ اس پر "زہر" کا لیبل

لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر حسین کا دل بھر آیا۔ بھرائے ہوئے لہجے میں وہ بمشکل بولا۔

"اسے اٹھا کر اندر لے آؤ جلدی۔"

میکلین کے چہرے ابھر آئے۔ دوسرا شکار بھی ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ نرس کے بے حس جسم سے نظریں ہٹا کر وہ بولا۔

"خدا کرے اسے مرنے نہ دینا۔ ہر طریقے سے اسے بچالو۔" اس کے آخری جملے میں ایسی عاجزی تھی جیسے ایک باپ اکلوتی بچی کی زندگی بچانے کی التجا کر رہا ہو مگر ڈاکٹر اس کا مطلب سمجھ گیا۔ ماریا کے پاس سے انقلابی گروپ کی اطلاع حاصل کرلی تھی۔ اس سازش میں اور کون شامل ہے؟ اس کی کڑی سے کڑی ملانا تھی۔ ڈاکٹر حسین خاموش رہا۔ ماریا کے اس اقدام سے اسے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ بار بار ماریا کے ماضی کو جاننے کی خواہش اگر اس نے دبائی نہ رکھی ہوتی تو یہ وقت نہ آتا۔ پھر بھی اسے بچایا جاسکے تو...... اس نے زہر کی پوری شیشی حلق میں انڈیل لی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جلد ہی اثر ہوا تھا۔ اس کے گلابی چہرے پر موت کی زردی چھاتی جارہی تھی۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے چہرے پر زندگی کی جھلک نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر درد کی لکیر تک نہیں تھی۔ کیا زہر کی تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا؟ کتنے مضبوط دل والی لڑکی... کیسا بھیانک اقدام کر بیٹھی تھی مگر اس نے خودکشی کیوں کی؟ گرفتاری کے ڈر سے... ؟ ماریا کو موت کے پنجے سے چھڑانے کے لیے ڈاکٹر تیزی سے علاج کرنے لگا۔ پیٹ میں سے زہر نکالنے کے لیے الٹیاں کرائیں انجکشن لگایا جس کے لمس نے ڈاکٹر کے جسم میں مسرت بھردی۔ اسی ماریا کے ٹھنڈے جسم پر اچانک ہاتھ چھو جاتا تو ڈاکٹر کا جسم کپکپانے لگتا تھا۔ سونیا نے کچھ حرکت کی برابر میں مٹھیاں کس کر کھڑے ہوئے میکلین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

اسی لمحے گروبخش کا مردہ جسم خون سے لت پت اسٹریچر پر ڈال کر لایا گیا۔ ڈاکٹر کی توجہ ادھر ہوگئی۔ ابھی شام ہی جاتے ہوئے اس نے مسکرا کر گروبخش سے کہا تھا۔ "ینگ مین! یو آر پروگریسنگ ویری ویل۔" (نوجوان! تم تیزی سے صحت یاب ہو رہے ہو) تب مریض کس طرح نرمی سے مسکرایا تھا۔

"یس ڈاکٹر دس کریڈٹ گوز ٹو یو۔" (جی ہاں ڈاکٹر! اس کا سبب آپ کا علاج ہے)

مگر اس گروبخش کا مردہ جسم خون سے لت پت چہرے کو دیکھ کر ڈاکٹر لرز گیا۔ انگریز سوپر کی موجودگی کے باوجود وہ بڑبڑایا۔

"شہید ہوگیا۔"

"ڈاکٹر دیکھو! وہ ہوش میں آرہی ہے۔" سوپر نے اس کی توجہ نرس کی جانب مرکوز کی۔ سونیا کی پلکیں حرکت کرکے کچھ اوپر اٹھیں۔ سوپر اور ڈاکٹر بے چین ہوگئے۔ آنکھیں کسی کو تلاش کرنے والے انداز میں گردش کرنے لگیں۔ شاید اسے دھندلا نظر آرہا تھا۔

مگر زمین پر رکھے ہوئے اسٹریچر پر پڑے ہوئے گروبخش پر نظریں ٹھہر گئیں۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک آگئی۔ زور کرکے اس نے گردن اٹھائی۔ ڈاکٹر کہنا چاہتا تھا "ماریا ماریا" مگر اس کی گردن کی رگیں کھنچ گئیں۔ اور وہ بستر پر گر پڑی۔ جسم میں جھٹکا سا لگا۔ دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھا ہوا کراس لرز کر ٹھہر گیا۔ سونیا کی روح چلی گئی۔ مگر آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ آنکھ کے کونے سے سرکتے ہوئے دو آنسو رخسار پر بہتے ہوئے بستر پر گرے۔

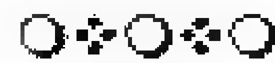
"اوہ گاڈ!" میکلین ہاتھ ملتا ہوا بولا۔ "ہم نے اسے بھی کھودیا۔"

ڈاکٹر حسین سینے میں زور کرکے اٹھتے ہوئے درد کو دبانے کے لیے ہونٹ بند کیے کھڑا رہا۔ اس کی نظر سونیا کی بند مٹھی پر جم گئی۔ وہ چونک گیا۔ دائیں ہاتھ کی مٹھی میں سے کوئی سفید چیز نظر آرہی تھی۔ میکانکی طور پر اس نے مٹھی کھول دی۔ اندر سے تہہ کیا ہوا اور مرجھایا ہوا کاغذ باہر نکل آیا۔ میکلین بھی چونک گیا۔ لرزتے ہوئے ہاتھ سے ڈاکٹر نے تہہ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

”اگر انگریز کے دل میں انسان کی آخری خواہش کا احترام ہو تو میرے آخری سنسکار ہندو طریقے سے کرنا۔“ نیچے دستخط تھے۔

”گرو بخش کی سونیا۔“

”ہندو طریقہ..... گرو بخش..... سونیا...“ ڈاکٹر بڑبڑایا۔ دل میں ہتھوڑا ہوئی مار رہا جیسے اسی لمحے بم توڑ گئی ہو۔ ڈاکٹر کے دل میں سناٹا چھا گیا۔ میکلین نے دیکھا پہریدار اور اسپتال کے لوگ اپنے چہروں پر پھیلا ہوا سوگ چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ گورنر کو اس پچویشن سے آگاہ کرنے کے لیے جانا ضروری تھا۔ اس کے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ گورنر صاحب کو سحر کے وقت دہلی جانا تھا اس سے پیشتر انہیں اطلاع کرنی چاہیے۔ گرو بخش کے شوٹ ہونے کی خبر عوام میں گڑبڑ مچا دے گی۔ طوفان ہوں گے مگر اس وقت میکلین کو گرو بخش کے پھانسی کے پھندے سے نکل جانے کا افسوس تھا۔ پھر اسے دوسرا بھیانک خیال آیا تب وہ گھبرا گیا۔ گرو بخش کو گولی مارنے والے انتقام لینے کی خاطر کوئی انقلابی حلف لے گا۔“ لہٰذا اسے ہوشیار رہنا چاہیے مگر گورنر صاحب اس کے کام سے خوش ہوں گے یا پھر اس سازش کی اسے آخر تک بو نہیں آئی اس کے لیے اسے ڈانٹیں گے۔ جاتے ہوئے میکلین مختلف قسم کے خیالات میں غرق تھا۔ کرسچین نرس کا اسرار اسے زیادہ بے چین بنا رہا تھا۔



جس طرح اچانک آیا ہوا طوفان تباہی لانے کے بعد گزر جاتا ہے اسی طرح جیل کا شور تھم گیا۔ جیلر، ڈپٹی جیلر، سنتری، جمعدار، میٹ سب اچانک آئی ہوئی آفت کی وجہ سے ہوشیار ہو گئے۔ وہ اب سب سلامتی کا سانس لیتے ہوئے گزرے ہوئے حالات کے تانے بانے ملا رہے تھے۔ ہر ایک کو اسپتال کے پہریداروں پر رحم آ رہا تھا۔ فرض سے غافل رہنے پر انہیں سزا ہونی تھی۔ قیدی اپنے میٹ کے پاس سے اطلاع حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے۔ ”انقلابی قیدی فرار ہوتے ہوئے شوٹ کر دیا گیا۔“ اس خبر نے سب کے دل ہلا دیے۔ تب اندھیرے میں ایک چیخ سنائی دی۔

”کس نے مارا گرو بخش کو؟ میں اسے ختم کر دوں گا۔“ سناٹا چھا گیا۔ ساری جیل خاموش ہو گئی۔ ”یہ دھمکی کس نے دی تھی؟ سور صاحب اس کی کھال اتار دیں گے۔“ خطرناک قیدیوں کے سیل کی جانب سے آنے والی آواز ”جگا ڈاکو“ کی تھی۔ سنتری اودھم سنگھ دوڑتا ہوا آیا۔ جگت کے سیل میں ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ ہاتھ کی مٹھیوں میں سلاخیں تھامے کھڑے ہوئے جگت کا چہرہ دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ روشنی نے جگت کی آنکھیں بند کر دیں۔ اودھم سنگھ کی آواز سنائی دی۔

”جگا! یہ کیا پاگل پن ہے؟ ایسی دھمکی دی جاتی ہے؟“ دوسرا سنتری بھی آ گیا۔ ”کمال ہے۔ یہ روز اس انقلابی کو گالیاں دیتا تھا۔ اب اس کی موت سے بپھر اٹھا ہے۔“

”تم سب غدار ہو۔ دیش کے دشمن ہو۔“ جگت کا خون شعلے برسا رہا تھا۔ ”ایک جوان دیش کی خاطر قربانی دے کر شہید ہو گیا اور تمہارے خون میں گرمی نہیں آئی؟ چوڑیاں پہن لو تم لوگ۔“

”جوان نے ہی نہیں لڑکی نے بھی قربانی دی ہے۔“ سنتری بول اٹھا۔ ”کہتے ہیں انقلابی کو چھڑانے کے لیے وہ لڑکی کرسچین نرس بن کر اسپتال میں داخل ہوئی تھی۔“ کچھ دیر رک کر بولا۔ ”اس بے چاری نے زہر پی کر خودکشی کر لی۔“ اودھم سنگھ نے دیکھا یہ سن کر جگت سکتے میں آ گیا۔ اس کے چہرے کا کھنچاؤ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ سلاخوں پر سر رکھ کر وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ اچانک ایک سسکی سنائی دی۔ پھر ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ جگت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ متعجب ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ یہ ڈاکو انقلابی کی موت پر چھوٹے بچے کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔

ڈپٹی جیلر آ گیا۔ ”کون چیخ رہا ہے......؟“ اس نے

سخت لہجے میں کہا۔ سنتری اودھم سنگھ نے اٹین شن ہو کر اسے سلیوٹ کیا۔ ڈپٹی کچھ کہے اس سے پیشتر اس نے اشارے سے نو سو ساٹھ نمبر کے قیدی کے سیل کی جانب اسے متوجہ کیا۔ کسی کے رونے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ اسے بھی سخت حیرت ہوئی۔ پھر جیسے یہ عام بات ہو اس طرح بولا۔

"ایسے پتھر دل کے لوگ رو سکتے ہیں۔ جبکہ ہم جو پیٹ کی خاطر یہاں ملازمت کر رہے ہیں شہید کی موت پر دو آنسو بھی نہیں بہا سکتے۔"

انقلاب ادھورا رہا۔ سحر کے وقت گورنر دہلی نہیں جا سکا۔ دھماکا نہیں ہوا۔ کرو بخش کو سبز روشنی کا سگنل دے کر مہرا کرو بخش کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی لمحے فائر ہوا۔ ساتھیوں نے کرو بخش کو نیچے گرتے دیکھا۔ مہرا جیل کی دیوار کی جانب جھپٹنا چاہتا تھا مگر ساتھیوں نے اسے تھام لیا۔ پتھر پر جیسے ناریل ٹوٹنے اس طرح کرو بخش کی کھوپڑی ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ بشن نے مہرا کو تھامتے ہوئے کہا۔

"مہرا کھیل ختم ہو گیا ہے۔ اب کرو بخش کی لاش ہی ملے گی۔" مگر مہرا نکلنے کے لیے زور کرنے لگا۔ اسی لمحے میکلین جیل سے باہر نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ بشن کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا لہٰذا اس نے مہرا کے سر پر ٹارچ کی ضرب لگائی۔ مہرا بے ہوش ہو گیا۔ گوپال اور بشن نے اسے اٹھا کر جیپ میں ڈالا اور انقلابی اندھیرے کی چادر میں غائب ہو گئے۔ انہیں سونیا کی فکر تھی۔ اتوار کی شام اسپتال سے جانے سے پیشتر سونیا صرف اتنا بولی تھی۔ "کرو بخش زندہ باہر آئے گا تب ہی ہم ملیں گے۔" پیر کی صبح پتہ چلا کہ سونیا نے موت کے سفر میں بھی کرو بخش کا ساتھ دیا تھا۔ جگت کی روشن کی ہوئی انقلاب کی مشعل کرو بخش کے آخری سانس کے ساتھ جیسے بجھ کر رہ گئی۔

جگت نے باقی رات بیٹھے بیٹھے گزار دی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ کرتیمن نرس کی قربانی نے اس کا دل دہلا دیا تھا۔ بار بار اسے وہ یاد آ رہی تھی۔ "نہیں نہیں بیس سال تک اس جیل میں نہیں رہا جائے گا۔ کچھ کرنا پڑے گا۔" پچھلے پہر کی رات کی بیداری میں اپنے جسم میں چھپے ہوئے ڈاکو کو وہ جھنجوڑ کر بیدار کرتا رہا۔ "جاگ جگا! پولیس کے ہاتھ لگنے کی اچھائی دکھا کر تجھے کیا ملا؟ لوہے کی زنجیریں...... یہ بلند دیواریں ...... دانے پیسنے کی چکی اور بیس سال کی قید کی مصیبت۔ گھر آباد کرنے کی بجائے جیل آباد کی۔ ویرو کے ساتھ کے بجائے لمبی جدائی ملی۔ ابھی موقع ہے اچھے کام کر کے جیل کے افسران کا اعتماد حاصل کر لے پھر......"

سیل کا دروازہ کھلنے کے باوجود جگت کھڑا نہیں ہوا تب سنتری اودھم سنگھ نے پوچھا۔ "کیوں یاد ہے جگا؟ تمہیں آج عدالت میں جانا ہے۔ تمہاری اپیل کے فیصلے کا دن ہے۔" پھر بھی جگت خاموش رہا۔ "صاحب تمہیں دس بجے لینے آئیں گے تیار رہنا۔"

جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو اس طرح جگت سوجی ہوئی آنکھوں سے اودھم سنگھ کو دیکھنے لگا۔ دانے کے ڈبے اندر رکھ کر میٹ چلا گیا پھر سنتری دروازہ بند کر رہا تھا اس وقت جگت کو خواہش ہوئی کہ سلاخوں سے ہاتھ نکال کر اس کی گردن دبا دے اس کی رائفل چھین لے مگر اودھم سنگھ کے چہرے پر پھیلی ہوئی ہمدردی نے اسے روکا۔ تالا بند کرتے جاتے ہوئے وہ بولا۔ "جگا! اپیل میں تم بری ہو جاؤ اس کے لیے گھر کے افراد نے منت مانی ہے۔"

اودھم سنگھ کے لہجے کی اپنائیت اور محبت نے جگت کو بے خود کر دیا۔ ایسے نیک شخص کی ملازمت چھین کر فرار ہونا شرافت اور انسانیت نہیں دوسرا کوئی طریقہ سوچنا پڑے گا۔ جگت دس بجے کا انتظار کرنے لگا۔



پیر کی رات کسی تھکے ہوئے بوڑھے کی طرح گھسٹ رہی تھی۔ چندن کو محسوس کر رہی تھی کہ یہ لمبی رات کبھی ختم نہیں ہوگی۔ بڑے بار دانے کے بچھونے پر پہلو بدلتی ہوئی وہ رات کو طعنے دے رہی تھی۔ "اسے تو اتنی دھیمی کیوں بیت رہی ہے؟ آج ذرا جلدی سے صبح کر دے۔

ورنہ میں مرجاؤں گی۔“ اور رات جیسے چندن کی بات پر مسکرا دی ہو۔

کھلی کھڑکی سے ہوا کا تیز جھونکا کمرے میں داخل ہوکر چندن کی گھنیری زلفوں کو بکھیر گیا۔ انتہائی قاتل سردی ہونے کے باوجود چندن مشرقی سمت کی کھڑکی کھول کر لیٹی ہوئی تھی۔ کیونکہ لاہور اسی جانب تھا اور لاہور کی جانب سے آتی ہوئی ہوا کے جھونکے اسے جگت سنگھ کے لمس کا لطف دے رہے تھے۔ ٹھنڈی ہونے کے باوجود اس میں نرمیت کی گرمی تھی۔ ہوا کے جھونکے سے لگتا ہوا فانوس ہلنے لگا جس کی وجہ سے دیوار پر پڑنے والا سایہ لرز کر رہ گیا۔ چندن کور کی نظر سفید دیوار پر پڑی ہوئی سیاہ لکیروں پر جم گئی۔ اس نے ان کی گنتی کی۔ گیارہ لکیریں تھیں بس...... انہیں جیل گئے ہوئے صرف گیارہ دن ہوئے ہیں؟ سال کے تین سو پینسٹھ دن کے اس سال میں کتنے بہت سارے دن ہوئے؟ اتنی لکیریں بنانے کے لیے پورے مکان کی دیواریں بھی شاید کم پڑ جائیں گی۔ کل ہی ماں جی نے انہیں دیکھ کر کہا تھا۔ ”ارے بہو! دیوار پر کوئلے سے لکیریں کس نے ڈالی ہیں؟ لاؤ! میں گیلے کپڑے سے صاف کردوں۔

تب چندن کا دل دھڑک اٹھا۔ ”نہیں ماں جی...... میں نے دنوں کا حساب لگانے کے لیے دیوار خراب کی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے سر جھکا لیا تھا۔ اس کے چہرے کو غور سے دیکھ کر ماں جی نے سرد آہ بھری۔

”مگر بچی! دن گننے سے کم نہیں ہوتے بلکہ کافی لمبے ہوجاتے ہیں۔“ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے دیکھو! ایک سورج غروب ہوتے ہی دل پر لکیر پڑ جاتی ہے پھر دیوار کو سیاہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”ماں جی! آپ ہمت نہ ہاریں۔“ چندن ساس کو دلاسا دیتی ہوئی بولی۔ ”اوپر والے کے بھروسے پر برے دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ سسر جی کہہ رہے تھے کہ اپیل میں ضرور ہماری طرف فیصلہ ہوگا۔ سرجن صاحب کی سفارش پر بڑے وکیل کو روکا گیا ہے۔ روزانہ کن کن کر رو پے دے رہے ہیں۔ وہ بیکار نہیں جائیں گے۔“

ایسا دلاسہ ابھی ماں کے دل میں ٹھنڈک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اب تو اوپر والے مالک پر سے بھی ان کا اعتماد ڈگمگا رہا تھا۔ وہ بڑبڑائیں۔ ”مجھے محسوس ہورہا ہے کہ اتنے بہت سارے نیچے والے اکیلے اوپر والے کو کچھ نہیں کرنے دیں گے۔“

یہی وجہ تھی کہ چندن کو منگل کی صبح کا انتظار بے چین بنا رہا تھا۔ سسر جی صبح کی پہلی گاڑی میں لاہور سے واپس لوٹنے والے تھے عدالت میں کیا ہوا؟ یہ جاننے کا تجسس زور کررہا تھا۔ لاہور جانے کے لیے گھر سے نکلتے ہوئے سسر سے اس نے کہا تھا۔ ”باپو! آپ انہیں غور سے دیکھیں وہ دبلے تو نہیں ہوگئے؟ جیل والے ان سے سخت مزدوری کراتے ہوں گے۔ ان کو کھانا برابر ملتا بھی ہے یا نہیں؟ یہ پوچھ لینا۔ ہماری فکر نہ کرنے کے متعلق انہیں کہنا۔“

چندن نے بہت کچھ کہہ ڈالا اور سوہن سنگھ ”ہاں ہاں“ کررہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ عدالت میں جگت سے بات نہیں کرسکیں گے مگر یہ کہہ کر بہو کا دل کیوں دکھایا جائے؟ جاتے ہوئے انہوں نے دل سے فیصلہ کرلیا کہ واپس لوٹنے کے بعد جگت کے متعلق صرف اچھی باتیں بتائیں گے۔ البتہ انہوں نے اتنا کہا۔ ”بہو! اپیل کا فیصلہ ایک دن میں نہیں ہوجاتا۔ مدتیں لگیں گی اور اس بہانے بار بار جگت کا چہرہ دیکھنے کو ملے گا۔“

دیوار کی لکیریں نظر نہ آئیں اس کے لیے چندن نے سر پر سیاہ کمبل اوڑھ لیا۔ آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کی۔ شاید آدھے گھنٹے میں سوجاتی مگر اچانک راستے پر کسی کی آہٹ سنائی دی۔ وہ کمبل چہرے سے ہٹا کر سننے کی کوشش کرنے لگی۔ ”نہیں...... یہ گاؤں کا چوکیدار نہیں تھا۔ اگر وہ ہوتا تو بار بار زمین پر لاٹھی مارتا چلتا۔ پھر کون ہوگا؟ پھر بھی اطمینان کرنے کے لیے اٹھ گئی۔ فانوس کی روشنی بڑھانے کے لیے ہاتھ بلند کیا مگر پھر رک گئی۔ کھڑکی کے پاس کھڑی ہوکر اس نے راستے

پر نظر کی۔ ہلکے اجالے میں ایک سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ وہ چونکی ہوگئی۔ ضرور کوئی ہے۔ اس نے ذہن میں سوچا۔ کیا وہ تو نہیں ہوں گے؟ نہیں اب وہ فرار ہو کر گھر نہیں آ سکتے کوئی چور ہوگا..... مگر ایسا نہیں ہو سکتا...... اس گھر میں چوری کرنے کی کوئی ہمت نہیں کر سکتا پھر......؟ عجیب طرح کی بے چینی دل میں ہلچل مچانے لگی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ سسر گھر پر نہیں ہیں۔ ہم ساس بہو دو عورتیں ہیں۔ اس چویشن کا فائدہ اٹھا کر کوئی دشمن گھر کو بدنام کرنے کی چال تو نہیں کھیل رہا؟ چندن کا سینہ دھڑکنے لگا۔ نیچے جا کر ساس کو جگانے کا خیال آیا۔ مگر ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا پہلے یقین کر لینا چاہیے ممکن ہے پتی بھائی چھپ کر ملنے آئے ہوں۔ چھت کے دروازے کی زنجیر کھول کر وہ باہر نکل آئی۔ دل میں گھبراہٹ کے ساتھ عجیب سی حالت میں وہ چھت کی نکڑ کے قریب پہنچ گئی آس پاس نظر ڈالی مگر کچھ نہ دیکھ سکی۔ شکی من کو سمجھاتے ہوئے وہ واپس لوٹنے لگی اسی لمحے ایک سایہ نظر آیا۔ باڑے کی دیوار سے چپکا ہوا کوئی کھڑا تھا۔ مگر اس کا سایہ چھپ نہیں سکا مگر وہ حرکت نہیں کر رہا تھا۔ چندن نے دھیمے لہجے میں پکارا۔ ”کون ہے؟“ پھر بھی جواب نہیں ملا۔ سایہ وہیں جما رہا۔ چندن نے سامنے والے گھر کے دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں تالا تھا۔ ان کے گھر کا اکیلا دشمن موہن سنگھ جاپی کے ساتھ کچھ دن پیشتر یاترا کے لیے امرتسر گیا ہوا تھا۔

چندن الجھن میں پڑ گئی۔ کیا کرنا چاہیے؟ شور کر کے سب کو جگائے؟ مگر نہیں۔ اس سے فائدے سے زیادہ نقصان کی توقع تھی۔ ”کوئی بھی ہو......“ چندن بڑبڑاتی کمرے میں واپس لوٹ گئی۔ چھت کے دروازے کی زنجیر مضبوطی سے بند کر دی۔ فانوس کی روشنی کچھ تیز کر دی اور بستر پر کروٹ کے بل لیٹ گئی۔ ”جاگتے ہوئے صبح کر دوں گی۔“ اسی ارادے سے وہ آنکھیں کھلی اور کان تیز رکھ کر پڑی رہی۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد باڑے کی گھاس پر کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ چندن چونک کر بیٹھ گئی۔ کسی کے چھلانگ لگانے کا دھماکہ تھا۔ اسی لمحے چھت کے برابر کھڑے ہوئے درخت کے پتے کھڑکھڑائے۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی گھر میں گھس رہا ہے اٹھ کر وہ کھڑکی بند کرنے کے لیے تیزی سے جھپٹی۔ اسی لمحے کوئی چھت پر چڑھ آیا۔ کھڑکی بند کر کے پوچھا۔ ”کون ہے......؟“ مگر جواب میں کوئی دبے قدموں سے دروازے کی چھت کی طرف بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ چندن کا جسم پسینے سے بھیگ گیا۔ اس نے پھر پوچھا۔ ”کون ہے؟“ دروازے کے قریب آ کر باہر والے نے جواب دیا۔

”میں..... میں ..... میں ہوں..... “ زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ باہر سے دروازہ کھینچنے کی کوشش کی گئی۔ چندن لرز گئی۔ اس نے ہمت مجتمع کر کے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

”میں جگا ہوں۔ جلدی کھول۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ پھر پوری قوت سے دروازہ کھینچا گیا۔

چندن نے آواز پہچان لی۔ لمحہ بھر کے لیے اسے نیچے جا کر ماں جی کو جگانے کا خیال آیا مگر اس میں خطرہ تھا۔ سوچنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ زنجیر پر تالا مارنے کا خیال پیدا ہوا مگر اسی لمحے دروازے کے اوپر سلاخوں اور روشن لیٹر میں سے کسی کا ہاتھ اندر آتا ہوا نظر آیا۔ وہ ہاتھ زنجیر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ چندن پھرتی سے برابر والے کمرے میں دوڑ گئی۔ بڑا صندوق کھول کر اندر سے تلوار اٹھا لائی۔ میان میں سے چمکتی ہوئی تلوار باہر نکالی۔ اس دوران اس شخص کا انگوٹھا زنجیر کو چھو رہا تھا۔ چندن کا ہاتھ لرزنے لگا۔ تلوار ہاتھ سے گر تو نہیں جائے گی۔ مگر لمحے بھر میں اس کا روپ بدل گیا۔ ہونٹ مضبوطی سے بند کر کے اس نے تلوار بلند کی۔ زنجیر گرانے کے لیے زور کرتے ہوئے انگوٹھے پر زور سے تلوار مارتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ ”کھڑاک......“ کی آواز ہوئی اور ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی فرار ہوتے ہوئے شخص کے قدموں کی آہٹیں، درخت کی شاخوں کی کھڑکھڑاہٹ اور باڑے کی دیوار سے نیچے کودتے ہوئے ہونے والا دھماکہ

سب کچھ چندن نے بند آنکھوں سے سنا۔ جب ہمت کرکے آنکھیں کھولیں تو تلوار پر خون کے دھبے دیکھ کر خوفزدہ ہوگئی۔ پیشانی پر چھلکے ہوئے پسینے کو صاف کرنے کے لیے ہاتھ پھیرا مگر ہتھیلی میں خون کی سرخی مل گئی۔ زنجیر پر نظر ڈالی وہاں بھی خون نظر آ رہا تھا۔ فرش پر سرخ چھینٹے پڑے ہوئے تھے مگر کچھ دور کیا پڑا ہوا تھا؟ قریب جاکر دیکھا وہ کسی کے ہاتھ کا کٹا ہوا انگوٹھا تھا..... اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ دماغ گھومنے لگا۔ پاگل کی طرح دوڑتی ہوئی اوپری منزل کی سیڑھیاں طے کرکے نیچے پہنچ گئی۔

"ماں..... ماں جی....." اس نے ماں جی کو پکارا اس کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر ماں جی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ہاتھ میں دبی ہوئی تلوار تھامے کھڑی ہوئی چندن کو دیکھ کر ڈر گئیں۔

"کیا ہوا چندن..... کیا ہوا؟" ان کی نظر تلوار پر جمی ہوئی تھی۔ اب چندن کو خیال آیا تلوار کو فرش پر پھینک کر وہ ماں جی سے چمٹ گئی اور ان کے سینے میں منہ چھپا کر بلک بلک کر رونے لگی۔ ماں جی کا دل دہل گیا۔ "کیا ہوا؟ بتا تو سہی مجھے....." ماں جی نے کہا۔ مگر کچھ دیر تک چندن بول نہ سکی۔ آنسوؤں سے ماں جی کا دوپٹہ بھیگ گیا۔ وہ ضبط نہ کرسکیں۔ "ارے بچی! مجھے بھی تو بتا۔ میری جان آدھی ہو رہی ہے۔" ان الفاظ کا فوری اثر ہوا۔

چندن نے سر اٹھا کر بمشکل کہا۔ "ماں جی! کوئی ہمارے مکان میں گھس آیا تھا۔"

ماں جی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ جلدی سے کھڑی ہوگئیں۔ "ہمارے مکان میں.....؟"

"جی ہاں..... چھت پر آکر کوئی دروازہ کھولنا چاہتا تھا۔" چندن کی گھبراہٹ ابھی باقی تھی۔

ماں جی نے دانت پیس لیے۔ پھرتی سے نیچے پڑی ہوئی تلوار اٹھا کر گرجیں۔ "اس مکان میں داخل ہونے کی ہمت کرنے والا کون ہے؟" یہ کہہ کر وہ اوپری منزل کے زینے چڑھنے لگیں۔ ان کی بیماری اور بڑھاپا جیسے غائب ہوگیا تھا۔ چندن ابھی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اسی لمحے وہ اوپر پہنچ گئیں۔ چندن بھی پیچھے دوڑ گئی۔ وہ ساس کی بہادری دیکھ کر حیرت زدہ تھی۔ ذرا بھی ہچکچاہٹ کے بغیر ماں جی نے چھت کے دروازے کھول دیے۔ ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ تلوار تھامے ہوئے بوڑھی کلائیوں کی نسیں تن گئی تھیں۔ وہ کسی کو چیلنج کرنا چاہتی تھیں کہ چندن ان کے پاس پہنچ گئی۔

"نہیں ماں جی..... وہ فرار ہوگیا۔" چندن نے جلدی سے کہا پھر ماں جی کے ہاتھ سے تلوار لے کر کہا۔ "وہ اپنی نشانی چھوڑ گیا ہے۔ دیکھیے۔" چندن نے فرش پر پڑے ہوئے انگوٹھے پر تلوار کی نوک رکھتے ہوئے کہا۔

ماں جی کبھی خون بھرے انگوٹھے اور کبھی چندن کو متعجب نظروں سے دیکھنے لگیں۔ اب ان کی نظر زمین پر خون کے چھینٹوں پر پڑی۔ آہستہ آہستہ ان کی سمجھ میں بات آگئی۔ بہو نے تلوار کا وار کردیا تھا۔ چندن کی ہمت اور پھرتی پر وہ واری ہوگئیں۔ "عجیب بات ہے..... اتنا کچھ ہوگیا پھر بھی میں سوتی رہی۔ چندن! تم نے مجھے بیدار کیوں نہیں کیا؟"

"مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کو جگاتی تو بہتر تھا مگر اتنا وقت نہیں تھا۔ وہ شخص زنجیر کھول کر اندر گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔" چندن نے جواب دیا۔

ماں جی چھت پر چکر لگا کر لوٹ آئیں۔ "مگر وہ کون تھا؟ کس لیے آیا تھا؟"

چندن کو اس سوال نے الجھن میں ڈال دیا۔ "کون تھا یہ تو پتہ نہیں چلا۔ کیوں آیا تھا؟ یہ اندازہ لگانا باقی تھا۔"

"دشمن ہے چوری کرنے آیا ہو۔" ماں جی نے اندازہ لگایا۔

"نہیں..... چوری کی نیت سے نہیں آیا تھا۔" چندن نے یقینی لہجے میں کہا۔ "چوری کی نیت سے آنے والا شخص گھر کے لوگوں کو دیکھ کر فرار ہوجاتا ہے مگر میں نے اسے آواز دی تھی۔"

"اسے آواز دی تھی؟" ماں جی نے حیرت زدہ لہجے

میں پوچھا۔
"جی ہاں..... میں نے پوچھا کہ کون ہے؟ اس نے جواب دیا 'میں ہوں' میں نے پھر پوچھا 'تم کون ہو؟' اس نے جواب میں کہا 'میں جگا ہوں۔ جلدی کھول۔'"

یہ سن کر ماں جی لرز گئیں۔ "ارے دیکھے بغیر تلوار مار دی۔ ممکن ہے جگت جیل سے فرار ہو کر....." ماں جی کچھ اور کہنا چاہتی تھیں مگر چندن نے انہیں روک دیا۔

"نہیں..... ماں..... نہیں۔" چندن پرجوش لہجے میں بولی۔ "وہ نہیں تھے۔ میں ان کی آواز بھی نہیں پہچانتی کیا؟ اور وہ کبھی بھی گھر کے لوگوں سے اپنے آپ کو جگا کہہ کر بتاتے نہیں تھے۔ آواز اور بولنے میں صاف بناوٹ جھلک رہی تھی۔" چندن کچھ دیر رک کر بولی۔ "وہ سمجھ رہا ہوگا کہ میں احمق بن جاؤں گی مگر جس مرد کا جسم چھو چکی ہو اس کا سانس تک عورت پہچان لیتی ہے۔" چندن سر جھکا کر بول رہی تھی۔

ماں جی کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہیں کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ وہ الجھن میں پڑ گئیں۔

"جگت نہ ہو اور ممکن ہے اس کا کوئی ساتھی ہو۔ کسی کام کے سلسلے میں چھپ کر آ گیا ہو پھر تو بیچارے کی حالت بری ہوگی۔"

"نہیں..... وہ بیچارہ نہیں تھا ماں جی! میں نے سب سوچ لیا تھا۔ وہ شخص ہر صورت میرے کمرے میں گھسنا چاہتا تھا۔ وہ جاننے والا ہوگا یقیناً اسے پتہ ہوگا کہ گھر میں سسر موجود نہیں ہیں۔" پھر نظریں جھکا کر بولی۔ "اور اوپری منزل پر میں اکیلی ہوتی ہوں۔"

"کیا مطلب!" کہتے ہوئے ماں جی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "دشمن اس گھر کی عورت پر ہاتھ ڈالنے آیا تھا؟" غصے میں ان کے لب کپکپانے لگے۔ "بہو! اگر میں بیدار ہوتی تو انگوٹھے سے اسے چھٹکارا نہ ملتا۔ گردن اتار لیتی اس حرام زادے کی۔" پھر کچھ دیر میں پرسکون ہو کر چندن کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ "تم نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ اب وہ سمجھ گیا ہوگا کہ جاٹ کے گھر کی عورتیں بھی ہتھیار اٹھانا جانتی ہیں۔ تمہارے سسر سنیں گے تو اس کی جان نہیں چھوڑیں گے۔ بغیر انگوٹھے کے شخص کو کہیں سے تلاش کر لیں گے۔"

"نہیں ماں جی..... سسر جی یہ بات نہیں سنیں گے۔" چندن نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "ان کا بیٹا قتل کی سزا بھگت رہا ہے۔ اب باپو کو کیسے مجرم بنائیں؟ بہتر ہے کہ یہ بات ہم دونوں کے علاوہ تیسرا نہ جانے۔"

"مگر....." ماں جی کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر انہیں الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے پھر بھی کہہ ڈالا۔ "ایسی بات گھر کے آدمی سے پوشیدہ کس طرح رکھی جا سکتی ہے؟"

"یہ میں جانتی ہوں پوشیدہ رکھ کر پاپ میں پڑ جاؤں گی ماں جی! مگر یہ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ ایسی بات سن کر مردوں کا خون جوش مارنے لگتا ہے پھر وہ ضبط نہیں کر سکتے۔" چندن کچھ دیر رک گئی۔ اسے جو کچھ کہنا تھا وہ کہنے کا موقع تھا۔ "تمہارے بیٹے کو پتہ چل گیا تو وہ جیل توڑ کر انتقام لینے آ جائیں گے اور....." پھر وہ بول نہیں سکی۔ ماں جی سب کچھ سمجھ گئیں۔ چندن بہت دور کی سوچ سکتی تھی اس سے انہیں مسرت ہوئی۔ اس واقعے کو دبا دینا بہتر تھا۔ رائی کا پربت ہو گیا تو اس کے وزن سے پورا خاندان کچل جائے گا۔

چندن نے فرش پر پڑا ہوا انگوٹھا اٹھایا۔ تب اس کی آنکھوں سے نفرت برس رہی تھی۔ ایک انچ جتنا مردہ ٹکڑا ہونے کے باوجود چندن کے جسم میں خوف کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اسے ابکائی ہونے لگی۔

"بہو! اسے کیا دیکھ رہی ہو بچی؟ لاؤ میں اسے باہر پھینک دوں۔" ماں جی نے کہا۔

چندن غور سے انگوٹھا دیکھ رہی تھی۔ "دیکھا ماں جی! ناخن پر مہندی لگی ہوئی ہے۔ سکھ یا ہندو ناخن نہیں رنگتے..... کیا آنے والا مسلمان ہوگا؟" چندن نے کہا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" ماں جی بھی اب دلچسپی لینے لگیں۔ "ہمارا ایک ہی دشمن ہے وہ سامنے رہتا ہے۔" وہ خاموش ہو گئیں پھر اندازہ لگاتی ہوئی بولیں۔ "ممکن ہے

ہمیں گاؤں میں بدنام کرنے کے لیے کوئی کرائے کا آدمی بھیجا ہو۔ اس کی بیوی دیرو جگت کے ساتھ فرار ہوئی تھی اس کا انتقام لینے کے لیے ایسی اوچھی حرکت کی ہو۔"

"کچھ بھی ہو...... میں کٹا ہوا انگوٹھا سنبھال کر رکھوں گی۔ ڈبیہ میں رکھ دوں گی۔" چندن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ماں جی چندن کو حیرت سے دیکھنے لگیں۔ مگر وہ کہہ رہی تھی۔ "ممکن ہے کبھی یہ بات انہیں بتانی پڑے تب یہ نشانی دکھاؤں گی۔" ماں جی کے جواب کا انتظار کیے بغیر چندن نے کٹا ہوا انگوٹھا ڈبیہ میں رکھ کر ڈبیہ صندوق کی تہہ میں چھپا کر رکھ دی پھر اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

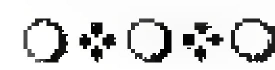
"اب میں جلدی جلدی خون کے داغ دھو دیتی ہوں۔ آپ فانوس تھام رکھیں۔ چھت پر بھی اور نیچے باڑے میں بھی دیکھ لیں۔"

ماں جی چندن کی بے چینی سمجھ گئیں۔ جب جگت کے باپو آئیں اس وقت جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اس طرح کرنا ضروری تھا۔ ساس اور بہو کام پر لگ گئیں۔ باڑے میں گھاس کے ڈھیر پر خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ دونوں نے مل کر گھاس کو اوپر نیچے کر دیا۔ انجانے میں کوئی جرم ہو گیا ہو جسے چھپانے کی کوشش کر رہی ہوں ایسی پراسرار حرکتیں کرتی نظر آ رہی تھیں۔ ماں جی نے ایک بار کہا بھی۔ "چندن! میں کہہ رہی ہوں کہ یہ سب کچھ کرنے سے جگت کے باپو کو بتا دینا بہتر رہے گا۔ ہم عورتیں لمبا عرصہ بات کو پیٹ میں نہیں رکھ سکیں گی۔"

"نہیں ماں جی...... میں آپ کے پیر پکڑتی ہوں......" چندن گڑگڑائی۔ "اس کام کا انجام ایسا برا ہوگا کہ ہمیں زندگی بھر پچھتانا پڑے گا۔"

ساس اور بہو صبح تک جاگتی رہیں۔ دونوں کے ذہنوں میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔

"وہ انجانا شخص کون تھا......؟"



جنگل کے مرغے نے بانگ دی جس کے کافی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ جگت کی ماں کھڑکی کھولنے کے لیے اٹھ رہی تھیں تب چندن کور نے انہیں روکا۔ "ماں جی! آپ رہنے دیں۔ میں کھڑکی کھولتی ہوں۔" سر اور سینے پر دوپٹہ ڈال کر چندن کھڑکی کھول رہی تھی۔ اس وقت سسر سے بہت کچھ جان لینے کا تجسس زور کر رہا تھا مگر اس کو ضبط کرنا پڑا۔ کھڑکی کی زنجیر کھولتے ہوئے اسے اپنا انگوٹھا ساکت محسوس ہونے لگا۔ چندن ایک جانب ہٹ گئی۔ سسر کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے کھڑکی بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ ماں جی برآمدے میں کھڑی تھیں۔ سوہن سنگھ کو تعجب ہوا۔

"ساس بہو اس وقت جاگ رہی ہیں؟"

اسی لمحے چندن پھرتی سے پانی کا لوٹا بھر کر لے آئی۔ اس نے ساس کا جواب غور سے سنا۔

"آپ آنے کو تھے لہٰذا نیند اڑ گئی۔" پھر مزید بولیں۔ "بہو تو ساری رات نہیں سوئی۔"

چندن کو ڈر محسوس ہوا ماں جی شاید رات کی بات کر دیں گی مگر سوہن سنگھ نے اس کا دوسرا مطلب نکالا۔ "میں جانتا ہوں بہو کو خبر سننے کا انتظار ہے۔" تب چندن کو اطمینان ہوا۔

ہاتھ منہ دھو کر پگڑی کھونٹی پر رکھ کر جگت کے باپو چارپائی پر لیٹ گئے۔ ایک بڑی جماہی لی۔ ساری رات ٹرین میں جاگ کر کاٹی تھی۔ چندن کور دروازے میں کھڑی اور ماں جی چارپائی کے برابر بیٹھی تھیں۔ سوہن سنگھ نے راستے بھر ذہن میں بات جمائی تھی پھر بھی شروعات کرتے دیر ہوئی۔ ماں جی کا ضبط چھوٹ گیا۔ وہ بولیں۔ "جگت اچھا تو ہے؟"

"بالکل......" سوہن سنگھ نے شروع کیا۔ "ہم نے اسے جیسا چھوڑا تھا ویسا ہی ہے۔ بلکہ مجھے کچھ اور صحت مند نظر آیا۔ سرجن صاحب کی سفارش سے اسے جیل میں زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا۔ اور سے اس کا پہریدار بھی اس کی فکر رکھتا ہے۔"

"اور کیا بات ہوئی؟" چندن کے دل کی بات ماں جی کے لبوں سے نکل آئی۔

”کورٹ میں ہم اس سے بات نہیں کر سکتے۔“ سوہن سنگھ نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ”بہو! مجھ سے پوچھنے کے متعلق کہہ رہی تھی تب بھی مجھے معلوم تھا مگر پیٹ میں باپ رکھ کر ہاں کرتا رہا۔ یہ اچھا ہوا کہ اس کی جیل کا پہریدار بھی کیس سننے آیا تھا اس سے بہت کچھ معلومات حاصل ہوگئیں۔ نہیں تو مجھے جھوٹ بولنا پڑتا۔“

چندان کی آہ نکل گئی۔ دوسرے کا دل رکھنے کے لیے انسان کو اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ رات والے انجانے شخص کی بات دل میں رکھنے کے لیے اس کا ذہن بھٹکنے لگا۔ ماں جی نے دوسرا سوال کیا۔ ”جیل کے پہریدار نے جگت کی کیا بات بتائی؟“

”وہ کہہ رہا تھا آپ کسی بات کی فکر نہ کریں۔ میں بیٹے کی طرح اس کا خیال رکھتا ہوں۔ کھانے کو زیادہ دیتا ہوں۔ کچھ دن بعد کوٹھڑی کی بجائے بیرک میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ رہنے لگے گا۔ وہ بیچارہ یہ بھی کہہ گیا کہ جگت کی رہائی کے لیے اس نے منت مانی ہے۔ وہ ضرور رہا ہوجائے گا۔“

کورٹ والے کیا کہتے ہیں؟“ چندان نے سوال کیا۔

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا بہو بیٹی!“ سوہن سنگھ کی آواز نرم ہوگئی۔ پھر فوراً ہی پرجوش لہجے میں بولے۔ ”ہمارے وکیل نے زوردار دلیلیں کی ہیں۔ ہمیں تو کچھ بھی نہیں آیا مگر کرچین ڈاکٹر ساتھ تھے انہوں نے بتایا کہ شروعات اچھی ہوئی ہے فیصلہ ہمارے فیور میں آنا چاہیے۔“ پھر درمیان میں جمائی لے کر بولے۔ ”کرچین ڈاکٹر نے جگت کو ہمت بھی دلائی تھی کہ بیٹا! میں تجھے رہا کرا کر دم لوں گا۔“

تینوں خاموش ہوگئے۔ چندان کور سوچنے لگی۔ ”صرف اتنی بات؟ سسر سے بہت کچھ پوچھ لینے کا جی چاہا مگر کس طرح پوچھتی؟ ابھی وہ تھکے ہارے تھے زیادہ پریشان کرنا بہتر نہ تھا۔ پھر بھی اس نے ایک بات پوچھ لی۔

”باپو! جیل میں رشتے داروں کو ملاقات کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ سنا ہے؟“

سوال ادھورا تھا مگر سوہن سنگھ اس کا مطلب سمجھ گئے۔ جگت سے ملنے کی خواہش نے یہ بات اگلوائی تھی۔ ”ہاں..... میں نے معلوم کیا تھا دو ماہ میں ایک بار ملاقات کی اجازت دی جاتی ہے۔“ سوہن سنگھ نے کہا۔ چندان کی آہ نکل گئی مگر سوہن سنگھ کی جمائیوں کے درمیان دب کر رہ گئی۔

”نو دن کے بعد تاریخ ملی ہے۔“ بات کو ختم کرنے والے انداز میں بڑبڑا کر آنکھیں بند کر کے سوہن سنگھ لیٹ گئے جگت کی ماں اور بہو سے انہوں نے بہت کچھ چھپایا تھا۔ یہ بات ان کی بند پلکوں میں کنکر کی طرح چبھ رہی تھی۔

جگت جب عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوا اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر وہ اور تایا بھڑک اٹھے تھے۔ جگت ان کی جانب دیکھ کر مسکرایا تھا مگر اس کی مسکراہٹ میں غمگینی تھی۔ عدالت کی کارروائی کے دوران وہ پہلے کی نسبت زیادہ لاپروا نظر آ رہا تھا جیسے اسے فیصلے کی بالکل پروا نہ ہو۔ سوہن سنگھ کو تھوڑا سا غصہ آ گیا۔ اپیل لڑنے کے لیے اتنے پیسے خرچ ہو رہے تھے۔ فیصلہ آئے گا اس وقت وہ قرض دار بن چکے ہوں گے۔ مگر جگت کی آنکھیں اتنی سرخ کیوں تھیں؟ انہوں نے عدالت میں نظریں گھمائیں اور ایک شخص کو دیکھا جو ان کی جانب غور سے دیکھ رہا تھا پھر تو جب وہ اس جانب دیکھتے اس شخص سے نگاہیں ٹکراتی تھیں اس کی سفید داڑھی مونچھ اور جھریوں والا چہرہ، سر پر راجستھانی پگڑی اس شخص کو کبھی دیکھا ہے؟ ایسا انہیں یاد نہیں آ رہا تھا۔ دوپہر کو لنچ ٹائم کے دوران کورٹ کے میدان میں درخت کے نیچے بیٹھ کر وہ تایا کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے تب وہ شخص شرماتا ہوا ان کے قریب آ گیا۔ سوہن سنگھ نے اس کی جانب دیکھا تب وہ ہلکا سا مسکرایا۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہا پھر بولا۔

”کیا آپ جگت کے باپو ہیں؟“ تایا بھی یہ سن کر بھڑک گئے۔ دونوں کو اس سوال میں الجھن نظر آئی۔ اس

انجانے شخص نے کہا۔ "میں جیل کا پہریدار ہوں' جگا کی کوٹھڑی پر میرا پہرہ ہوتا ہے۔"

سوہن سنگھ کی دلچسپی بڑھ گئی۔ "یہاں آئیے...... ہم ساتھ کھانا کھائیں گے۔" سوہن سنگھ نے کہا۔ نانا کو جو نوائی کی بات کھلی مگر وہ شخص ان کے پاس بیٹھ گیا۔

"میرا نام اودھم سنگھ ہے۔ تمہارے بیٹے نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔" اس شخص نے کہا مگر دونوں نے اس کی بات کا نوٹس نہیں لیا۔ تب اودھم سنگھ قدرے جھینپ گیا۔ "یہ بزرگ بھی جگا کے رشتے دار ہوں گے۔"

"ہاں...... میں جگت کا نانا ہوں۔" نانا نے اپنی پہچان خشک لہجے میں کرائی۔ سوہن سنگھ کی زبان کچھ کہنا چاہتی تھی۔

"بھائی! آپ عدالت میں کس سلسلے میں آئے ہیں؟"

اودھم سنگھ نے پراٹھا چباتے ہوئے کہا۔ "جگا کا کیس سننے آیا تھا۔" پھر اس نے محسوس کیا کہ انہیں تعجب ہوا ہے۔ لہٰذا بولا۔ "اس کی رہائی کے لیے میں نے منت مانی ہے۔" جیل کے پہریدار کے منہ سے یہ بات سن کر دونوں سنانے میں آگئے۔ یہ شخص انہیں احمق تو نہیں بنا رہا؟ مگر اودھم سنگھ پوچھے بغیر کہہ رہا تھا۔ "ابھی میری رات کی شفٹ چل رہی ہے لہٰذا یہاں آنا ممکن ہوا' کچھ دن جگا کو تکلیف کا احساس رہا مگر اب سب ٹھیک ہے۔ کام بھی آدھا کردیا گیا ہے۔"

سوہن سنگھ نے دیکھا کہ وہ شخص خود سب باتیں بتا رہا تھا تو اسی سے کیوں نہ کچھ معلوم کیا جائے؟ سسر پسند نہیں کریں گے پھر بھی پوچھا۔ "بھائی! اس کی آنکھیں اتنی سرخ کیوں ہو رہی ہیں؟" پوچھتے ہوئے باپو کی آواز بھرا گئی۔

"کل رات وہ بہت روئے۔" اودھم سنگھ نے کہا۔ اسی لمحے نانا کے ہاتھ سے نوالہ گر گیا۔ سوہن سنگھ آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگے۔

"روئے تھے؟ مگر کیوں؟" ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی' جگت جیسا شخص رو نہیں سکتا تھا۔ "اسے کیا دکھ ہوگا؟"

"وہ انقلابی قیدی شوٹ کردیا گیا اس کی وجہ سے جگا کو دکھ پہنچا۔" اودھم سنگھ نے بتایا۔

"اس میں اس کے باپ کا کیا گیا؟" نانا گرجے مگر انجانے آدمی کے سامنے بولنے کی غلطی انہیں محسوس ہوئی۔ "جیل سے فرار ہونے کی صورت میں جیل والے اس کی آرتی تو نہیں اتاریں گے۔"

"میں بھی آپ سے یہی کہنا چاہتا تھا۔" وہ ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ "جگا کے ذہن میں فرار ہونے کے خیالات گردش کر رہے ہیں۔ اس نے مجھے نہیں بتایا مگر اتنے سالوں سے جیل میں کام کرتا ہوں' لہٰذا......"

"لہٰذا تمہیں شک ہوگیا ہے۔" نانا گرم ہوگئے۔

اودھم سنگھ کو یہ بات کھلی مگر سوہن سنگھ کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر اس نے برا نہیں مانا۔ "بھگوان کرے میرا شک ہی ہو۔ یہ تو آپ کو خبردار کردیا۔ مجھے اس سے بیٹے جیسی محبت ہے۔" کہتے ہوئے اودھم سنگھ کی آواز بھیگ گئی۔

نانا ٹھنڈے پڑ گئے۔ سوہن سنگھ کو کھانا نہیں بھایا۔ نانا پانی پینے کی خاطر کنوئیں پر گئے تب موقع غنیمت جان کر جگت کے باپو نے اودھم سنگھ سے کہا۔ "میرے سسر کا مزاج ذرا تیز ہے۔ ان کے بولنے کا برا نہ ماننا۔" پھر جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "بچوں کی مٹھائی کے لیے دے رہا ہوں۔ جیل میں بھی میرے بیٹے کا خیال رکھنے والا کوئی ہے یہ جان کر مجھے راحت ہوئی۔"

اودھم سنگھ نے روپیہ لینے سے انکار کیا۔ "مجھے بخشش نہیں چاہیے بزرگو۔" مگر سوہن سنگھ کے بہت زیادہ اصرار کرنے پر وہ انکار نہیں کرسکا۔ "بہتر ہے...... میں آپ کا احترام کرتے ہوئے لے رہا ہوں مگر میں نے آپ کو ہوشیار کردیا ہے۔ یہ بات کسی کو نہ بتائیں کیونکہ میری ملازمت چلی جائے گی۔ کچھ برسوں بعد پنشن پر جانا ہے۔ وہ بھی گنوا دوں گا۔"

عدالت برخاست ہونے کے بعد اودھم سنگھ رخصتی سلام کرنے کے لیے ان کے پاس آگیا۔ سوہن سنگھ کو وہ

شخص بھلا آدمی دکھائی دیا مگر اس کی بات سننے کے بعد اس کے دل میں فکر پیدا ہوگئی۔ مگر وہ کسی سے کہہ نہیں سکتے تھے پھر بھی کرتین ڈاکٹر کو اشارہ کرنا پڑا تھا۔ "آپ جگت کے کان میں کہہ دیں کہ فیصلہ ہماری فیور میں آئے گا ہمت نہ ہارے۔"

اگر یہ باتیں جگت کی ماں اور چندن کور کو معلوم ہوتیں تو وہ تڑپ اٹھتیں گی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے سفر کی تھکن کے بہانے عدالت کی بات مختصر کر کے ساس بہو کے مزید سوالات سے نجات حاصل کر لی تھی ناشتہ کر کے انہوں نے کہا۔ "میں اوپری منزل پر سونے جا رہا ہوں۔ مجھے دو پہر ڈھلے اٹھا دینا۔"

چندن چپ کر رہ گئی۔ رات والے واقعے کی کوئی نشانی ان کے ہاتھ تو نہیں لگ جائے گی؟

چندن کور دل بہلانے کی خاطر گھر کے کام میں لگ گئی۔ صبح کی دھوپ ہر طرف پھیل چکی تھی۔ اچانک دروازے کی زنجیر کھڑکی۔ ماں جی پوجا میں بیٹھی ہوئی تھیں لہٰذا چندن دروازہ کھولنے کے لیے باورچی خانے سے باہر آگئی۔ اس نے سوچا شاید تا و سسر لوٹ آئے ہوں گے۔ دروازہ کھولتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ ایک سیاہ برقعے والی عورت کھڑی تھی۔ چندن سے کچھ پوچھنے سے پیشتر ہی وہ سیدھی مکان میں داخل ہوگئی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے چندن کور کے ذہن میں ایک خیال گزرا اور وہ لرز کر رہ گئی۔ رات گھر میں گھسنے والا شخص مسلمان تھا۔ وہی تو برقعے میں نہیں آیا ہوگا؟ جیتے کو دل چاہا مگر دن دہاڑے ایسا کرنا بیوقوفی تھی۔ اب تو سسر بھی گھر میں تھے۔ ہمت کر کے برقعہ پوش عورت کے پیچھے برآمدے کی طرف چلی۔ ماں جی نے آہٹ سنی لہٰذا وہ پھیرتا ہوا ان کا ہاتھ تھم گیا۔ پیچھے تھے انہوں نے آواز دی۔ "کون ہے؟"

آنے والی نے تیزی سے چہرے سے نقاب ہٹا لیا۔ ماں جی سن ہو گئیں۔ "ارے ویرو تم...؟" ماں جی کے حیرت سے کھلے ہوئے منہ سے نکل گیا۔

چندن کا خوف خوشی میں بدل گیا۔ وہ ویرو سے لپٹ گئی۔ "تم نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔ اچھا ہوا چیخی نہیں۔"

"بہت اچھا ہوا......" برقعہ اتارتی ہوئی ویرو بولی۔ "لوگ جمع ہو جاتے اور میری پول کھل جاتی۔" ویرو ماں جی کی جانب متوجہ ہوئی۔ اس کے پیر نہیں اٹھ رہے تھے کیونکہ ماں جی کے چہرے پر پہلے جیسی مسرت نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ برقعہ پہن کر خاموشی سے آئی اس وجہ سے ناراض ہوں گی۔ ویرو نے سوچا اور ماں جی کے پیر میں جھک گئی۔

ماں جی نے لرزتی ہوئی آواز میں دعا دی۔ "تمہارا سوبھاگیہ...!" ماں جی لحہ بھر رک گئیں۔ "سلامت رہے۔" انہوں نے اپنا جملہ مکمل کیا۔

چونکہ صورتحال ایسی نازک تھی اس میں سوبھاگیہ کی سلامتی کی دعا کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔ پھر ماں جی کی آواز میں وہ گرمجوشی نہیں تھی جو ویرو چاہتی تھی۔ ماں جی نے پہلے اسے ماں کی محبت دی تھی۔ اسی ماں جی کی جانب سے ایسے خشک برتاؤ سے اس کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ سوچنے لگی۔ "شاید جوان بیٹے کی بیس سال کی قید کے صدمے کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے؟"

"کیا سوچ رہی ہو ویرو بہن؟" کہہ کر چندن نے اسے سوچ سے نکال دیا۔ وہ کچھ شرمندہ سی ہوگئی پھر پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لا کر بولی۔

"بیتے ہوئے دن یاد آ گئے تھے۔" پھر مکان میں چاروں جانب دیکھتی ہوئی بولی۔ "تب یہاں صرف ماں جی اور باپو تھے۔ تم دونوں نہیں تھے۔ میں روز گھر کا کام ختم کر کے یہاں آ جاتی' کچھ کام کر جاتی' کچھ دل کا بوجھ ہلکا کرتی' کچھ دلاسا لے جاتی۔" ویرو کے لب حرکت کر رہے تھے مگر اس کی آنکھیں ماضی کی یاد ذہن کے پردے پر ابھرتے دیکھ رہی تھیں۔ "اب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سب کچھ بدل گیا ہے۔ سامنے والا مکان ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا بلکہ میں نے خود بند کر دیا۔ اب صرف یہی میرا گھر کھلا ہے اگر استقبال ملے گا تو آؤں گی۔"

ماں جی چونک گئیں۔ کیا ویرو آسرا حاصل کرنے آئی

تھی؟ چندن کو ویرو کی بات میں کوئی اسرار نظر نہیں آیا۔

"یہ تمہارا گھر ہے ویرو بہن! یہاں آپ کو ہمیشہ عزت ملے گی۔" چندن نے کہا۔ ماں جی دہل گئیں۔ چندن نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ "مگر آج کی طرح برقعہ اوڑھ کر نہ آنا۔ کیونکہ چہرہ دیکھے بغیر استقبال نہیں ہوگا۔" چندن ہنسنے لگی مگر ماں جی کے چہرے پر سنجیدگی چھائی رہی۔

ویرو بھی سنجیدہ ہوگئی۔ "اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔ کھلے عام آتی تو اس صورت میں سارے گاؤں کی آنکھیں پھیل جاتیں۔ زبان دراز ہو جاتی، میرا نام تو بدنام ہو ہی چکا ہے میں اس مکان کی طرف نکتہ چینی کرنے کا کسی کو موقع دینا نہیں چاہتی۔" ویرو بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "خالہ کے گھر کا بہانہ کرکے آئی ہوں۔ پڑوسی مسلمان خاتون سے برقعہ مانگ لیا۔"

"ویرو بہن! یہ سب کرنے سے بہتر تھا کہ مجھے بلا لیتیں۔ میں فوراً آجاتی۔" چندن کہہ رہی تھی۔ اسی لمحے ماں جی پوجا پاٹ کرکے ان کے قریب آ گئیں۔ ویرو ان کی جانب دیکھنے لگی۔ ان کی آنکھوں کے کونوں میں اسے ناخوشی نظر آئی۔

"سب لوگ ٹھیک تو ہو؟ باپو جی گھر میں نہیں ہیں؟" ویرو نے پوچھا۔

چندن پانی کا لوٹا بھر کر لائی۔ ماں جی ویرو کی آنکھوں سے اس کے دل کا حال معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"سسر جی ہیں، وہ اوپر کے کمرے میں سو رہے ہیں۔ سفر کی تھکن اور بیداری کی وجہ سے انہیں نیند آ گئی ہے۔" لوٹا رکھ کر چندن نے جواب دیا۔

"ارے ہاں ... میں پوچھنا ہی بھول گئی۔" ویرو نے آواز میں تجسس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کل عدالت میں کیا ہوا؟" اس کے سوال نے دونوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ چندن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ماں جی کے لب بند ہوگئے۔ عدالت میں کیس کی تاریخ کے متعلق بھی ویرو کو معلومات تھیں۔ ویرو نے نظریں جھکا لیں مگر اس سے پیشتر ماں جی اس کا ارادہ سمجھ گئیں۔ وہ یہ خبر معلوم کرنے کے لیے دوڑی آئی تھی۔ باپ سے بھی پوشیدہ رکھ کر۔

"تم باتیں ہی کرو گی یا پکانے میں میری مدد بھی کرو گی؟" چندن ویرو کا ہاتھ تھام کر باورچی خانے میں لے گئی۔

ماں جی چارپائی پر لیٹ گئیں۔ ان کی نظریں دروازے پر لٹکتے ہوئے ویرو کے برقعے پر جم گئیں جبکہ کان باورچی خانے کی جانب لگے تھے۔ اب انہیں ویرو پہلے کی طرح بھولی نظر نہیں آتی اور چندن میں چالاکی کی کمی نظر آ رہی تھی۔ وہ سالوں سے بچھڑی ہوئی دو سہیلیوں کی طرح پیار محبت سے باتیں کر رہی تھیں۔ گھر کی دو بہوؤں کی طرح مل جل کر کام کر رہی تھیں۔ دو بہوئیں؟ ماں جی نے دل کو ڈانٹ دیا نہیں نہیں..... وہ خوامخواہ ویرو پر شک کر رہی تھیں۔ وہ ایسا نہیں کرے گی نہ ہی ایسا ہونے دے گی۔ کسی بھی طرح نہیں۔

کافی دیر بعد ویرو کمرے میں آ گئی۔ دروازے سے برقع اتار کر ماں جی کی چارپائی کی کنار پر بیٹھ گئی۔ "آج آپ بالکل خاموش ہیں ماں جی! مجھے دیکھ کر فکر مند ہوگئیں؟" ویرو نے مسکرا کر کہا۔

ماں جی کچھ جھینپ گئیں۔ وہ ویرو کی اس عادت سے واقف تھیں کہ وہ جو کچھ محسوس کرتی ہے کہہ ڈالتی ہے مگر دل اس کا صاف ہوتا ہے۔

"مجھے تو تیری فکر ہو رہی ہے لڑکی۔" ماں جی نے سوچا۔ جو کچھ کہنا ہے کہہ دوں۔ "تم اس طرح بے آسرا کب تک رہو گی؟"

ویرو کے چہرے پر درد جھلکنے لگا۔ ماں جی کی محبت سے اس کا دل بھر آیا، جگت کی ماں کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی۔ "عورت کو سسرال کے بغیر کہیں سکون نہیں ملتا ویرو ضد چھوڑ کر سامنے والے مکان میں واپس لوٹ جا۔" ویرو کے چہرے کے تاثرات بدل گئے سب کچھ جانتے ہوئے ماں جی یہ کہہ رہی تھیں۔

وہ کڑوے گھونٹ کی طرح تھوک نگل کر بولی۔ "یہ اب کس طرح ہو ماں جی؟ میرا اب اس دنیا میں کوئی

"نہیں۔" پھر آواز میں مضبوطی پیدا کرتی ہوئی بولی۔

"میں نے طلاق حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"طلاق......؟" ماں جی کا جسم لرز اٹھا۔ طلاق کو کیا کرے گی؟ یہ پوچھنا چاہتی تھیں۔ اس گھر میں آنے کی خواہش ہے تو وہ خواہش مار دو! یہ کہنا چاہتی تھیں مگر ماں جی اتنی سنگدل نہ ہوسکیں۔ افسوس کے ساتھ صرف اتنا بولیں۔ "ویرو! بغیر سوچے بڑھایا ہوا قدم اکثر بہت سے لوگوں کی بربادی کی وجہ بن جاتا ہے اتنا یاد رکھنا۔"

پھر ویرو کی واپسی تک ماں جی خاموش رہیں۔ چندن ویرو کو وداع کرنے دروازے تک آئی گھر کی چوکھٹ سے پیشتر برقعے کے پردے کے عقب سے ویرو بولی۔

"ان کو جیل میں ملنے سے پیشتر مجھ سے ضرور ملاقات کرنا چندن۔"

چندن نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم نہ کہتیں تب بھی میں آنے والی تھی۔ وہ مجھ سے تمہارے متعلق دریافت کریں گے۔" برقعے کی نقاب سے ویرو نے دیکھا چندن کے چہرے پر خلوص جھلک رہا تھا۔

"بہتر۔" کہتی ہوئی ویرو باہر چلی گئی۔ گلی کے کونے پر مڑنے تک چندن اس کی پشت کی جانب دیکھتی رہی ویرو کے لیے ہمدردی سے اس کا دل بھر گیا۔

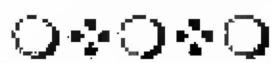


پولیس چیف دلاور خان کو ساڑھے تین مہینے کی محنت کا پھل قریب نظر آنے لگا۔ چین اور ہوشیار سنگھ کی پارٹیاں اسے تنگ کر رہی تھیں۔ اس نے چھ ماہ کے اندر اندر ان پر قابو پانے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن پچھلے ایک مہینے سے ہوشیار کی پارٹی کی سرگرمیوں میں کافی اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ سرعام ڈاکہ ڈالتے اور اس کے بعد نزدیک ہی کسی جگہ اپنی کامیابی کا جشن برپا کرتے۔ کرپال غرور سے کہتا۔ "پولیس جھک مارتی ہے یہاں موت کی پروا ہی کون کرتا ہے؟"

علاقے کے لوگ بھی کرپال کا نام سن کر کانپ اٹھتے تھے۔ وہ بہت خطرناک بنتا جا رہا تھا۔ اخبارات میں پولیس کے خلاف آوازیں اٹھنے لگی تھیں۔ پھر بھی دلاور خان نے بے پروائی کا مظاہرہ جاری رکھا۔ لوگوں کی تنقید یا اوپر والوں کی ڈانٹ کا اس کے پاس ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اسے یقین تھا کہ کرپال کا غرور اسے یقیناً بے پروا بنادے گا۔ تب وہ اس پر بھرپور وار کرسکے گا اور وہ دن قریب آ گیا۔

کرپال نے ایک طوائف کے کوٹھے پر آنا جانا شروع کردیا تھا۔ دو چار دن میں جب تک وہ وہاں کا ایک چکر نہ لگا لیتا اسے چین نہ آتا۔ آخر پولیس طوائف مینکا کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہوگئی۔ ایک دن جب اسے اطلاع ملی کہ آج رات کرپال ضرور آئے گا تو اس نے پولیس کو مطلع کردیا اور دلاور خان چھاپہ مارنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے سارنگی نواز اور تبلچی کی جگہ اپنے آدمیوں کا انتظام کرلیا۔



شام کی سرخی سمیٹ کر سورج مغرب میں غروب ہوچکا تھا۔ طوائف مینکا کے مکان کا جھومر روشنی سے جگمگانے لگا۔ مکان مینکا کا تھا مگر اس میں جانکی کی جوانی رقص کرتی تھی۔ ادھیڑ عمر کی مینکا بائی کوٹھے کا کاروبار سنبھالتی تھی۔ کوئی کہتا جانکی کو مینکا نے گود لیا ہے۔ کسی کا خیال تھا کہ اسے خریدا گیا ہے۔ ممکن ہے دونوں باتیں سچی ہوں۔ مالک کی طرح مینکا حکم دیتی اور جانکی کے پیر تھرکنے لگتے آواز کے سر جاگ اٹھتے۔ مینکا اسے ماں کی طرح سبق دیتی۔ "جانکی! لگا بجا کر دور سے مرد کو بہلانے کا ہمارا کاروبار ہے۔ غلطی سے بھی کسی کو قریب نہ آنے دینا۔" جانکی اس سبق کا مطلب سمجھتی تھی۔ طوائف کے لیے مال جتنا بہتر نہیں جس قدر جوبن کی حفاظت کی جائے اسی قدر زیادہ ملتا ہے۔

چند ماہ سے کرپال نے اس در پر آنا شروع کیا تھا۔ گاؤں کے سرے پر الگ جگہ چھوٹی سی کوٹھڑی میں آنے جانے کی اسے سہولت تھی۔ مینکا کو پہلے کرپال سے خوف محسوس ہوتا تھا مگر لمبی رقم خرچ کرنے والا یہ آدمی اسے سودمند

نظر آیا۔ البتہ اس کی ایک ضد کا خیال رکھا جاتا۔ "میں محفل میں آؤں اس وقت دوسرا گاہک نہیں ہونا چاہیے۔" وہ اس حد تک کہتا۔ "دوسرے گاہک کی ضرورت بھی کیا ہے تمہاری بچی کا خرچ میں پورا کروں گا۔ مجھے تو ایک ہاتھ سے چھین کر دوسرے ہاتھ سے دینا ہے۔" ڈاکو کی زندگی کا بھروسا کیا؟ مینکا سوچتی 'پولیس کی نظر میں آجائیں تو کاروبار خراب ہو جائے' بہرحال اس نے کرپال کو سنبھال لیا۔

"جوان! تم اپنی آمد کی پہلے سے اطلاع بھجوایا کرو تو دوسرا کوئی اس مکان میں نظر نہیں آئے گا۔"

پھر جانکی کرپال کی جانب جھکنے لگی۔ ایک دن بھی وہ نہ آتا تو وہ بے چین ہو جاتی۔ دوسروں کے سامنے رقص کرنے اور گانے میں اسے پہلے کی طرح دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ایک دو بار ٹوکنے پر بھی مینکا کی بات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تب مینکا بائی کو فکر ہونے لگی۔ لڑکی ہاتھ سے گئی تو کمائی کا وسیلہ بھی ختم ہو جائے گا۔

گزشتہ شام جانکی نے ایک اور جھٹکا دیا۔ اس نے چپ چاپ دو ایک الٹیاں کرلیں۔ مینکا دہل گئی۔ کیا وہ کرپال سے اس قدر قریب ہوگئی تھی؟ اس سے پوشیدہ رکھ کر..... "جانکی سے پوچھا۔

اس نے بڑی صفائی سے بہانہ بنایا۔ "ماں! مجھے کچھ نہیں ہوا تم خواہ مخواہ شک کر رہی ہو۔ پیٹ میں گڑبڑ ہو رہی ہے اس لیے ایسا ہوا۔"

مینکا نے ذہن پر بہت زور دیا اس نے کرپال کے ساتھ جانکی کو تنہائی میں رہنے نہیں دیا تھا پھر.....؟ اور وہ لرز گئی۔ ہاں ایک ماہ پہلے اس کا سر درد کر رہا تھا لہٰذا محفل ادھوری چھوڑ کر وہ سو گئی تھی۔ یقیناً کرپال اور جانکی نے اس وقفے سے فائدہ اٹھایا ہوگا تو کیا جانکی کی کوکھ میں ڈاکو کا بیج بویا جا چکا ہے؟ اس نے یقین کرنے کی غرض سے کہا۔

"جانکی! اب کرپال کا آنا جانا بند کرنا پڑے گا۔"

"کیوں ماں.....؟" وہ تڑپ کر بولی۔

"خواہ مخواہ پولیس کے چکر میں کیوں پڑا جائے؟ انسپکٹر صاحب کو بول چکی ہے کہ کرپال کبھی کبھی ہمارے ہاں آتا ہے۔" مینکا جانکی کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگی۔

"کل وہ آئے گا تو میں اسے پیچھے سے لوٹا دوں گی۔"

"نہیں نہیں ماں ... اسے کل آنے دو۔" جانکی عاجزانہ لہجے میں بولی۔ "آخری بار اسے آنے دو۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔"

مگر مینکا سمجھ گئی کہ جانکی کے پیٹ میں پاپ ہے وہ یقیناً کرپال کو بتائے گی کہ اس کی کوکھ میں کرپال کا بچہ ہے اور یہ جاننے کے بعد کرپال اسے ختم کردے گا یا اغوا کرلے گا ہمیشہ کے لیے۔ مینکا کو دونوں میں سے کوئی انجام منظور نہیں تھا۔

اس نے درمیان والا راستہ سوچا۔ کرپال ضرور آئے مگر اسے زندہ واپس نہیں لوٹنا چاہیے۔ اس طرح وہ پولیس کو خوش کرسکے گی اور کرپال کا کانٹا بھی نکل جائے گا۔

جانکی شام ڈھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ آج اس نے معمول سے کچھ زیادہ سنگھار کیا تھا آج کی محفل آخری تھی۔

کرپال نے اس رات سے فائدہ اٹھانے کی جب ضد کی تب اس نے پوچھا تھا۔ "اس کا نتیجہ غلط نکلا تب.....؟"

مگر اس نے جانکی کو بانہوں میں سمیٹ کر کہا تھا۔ "اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ کیا میرا بچہ طوائف کے کوٹھے پر پیدا ہوگا؟ تم جس دن ایسی خوشخبری سناؤ گی اسی دن تمہیں یہاں سے اغوا کرا لوں گا۔" پھر جانکی کے جسم کو زور سے دبا کر بولا۔ "مگر دیکھنا! کسی اور کا بچہ میرے گلے مت لگانا۔ اگر ایسا کیا تو....."

جانکی نے کرپال کے لبوں پر احمریں ہاتھ رکھ دیا۔ "نہیں نہیں کرپال سنگھ! تم پہلے شخص ہو۔"

"پھر میں ہی آخری مرد ہوں گا میری جانکی۔" کرپال نے کہا اور جانکی اس کی ہوگئی۔ یہی وجہ تھی کہ آج وہ سہاگ کا سنگھار سجا کر بیٹھی ہوئی تھی۔

دلاور خان کو آخری لمحے چال بدلنی پڑی۔ صوبیدار صاحب کے گھر مینکا خود خبر کرنے آئی تھی۔

"آپ لوگ ایسی حرکت نہیں کریں گے کہ جانکی کو خبر ہو جائے وہ بھولی ہے گھبرا گئی تو ڈاکو چونک جائے گا۔" پھر

بولی۔ "سارنگی طبلے والوں کو اسی طرح رہنے دیں۔ آپ لوگ محفل کا رنگ جم جانے کے بعد ہی چھاپہ ماریں گے۔"

"اس کے ساتھ کتنے لوگ آتے ہیں؟" دلاور خان نے مینکا سے پوچھا۔

"چار یا پانچ' مگر وہ لوگ نیچے شراب پیتے یا تاش کھیلتے رہتے ہیں۔" مینکا نے آنکھیں ادھ کھلی رکھ کر کہا۔ "رائفلیں ساتھ رکھتے ہیں' یہ خیال رہے۔"

"اچھی بات ہے۔ تم جاؤ' ہم دیکھ لیں گے۔"

"مگر صاحب! ایک بات کا خیال رکھیں۔" مینکا نے ہلکی گھبراہٹ سے کہا۔ "ہم اس میں ملوث ہیں' اس کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔ نہیں تو اس کے ساتھی ہم ماں بیٹی کو ماردیں گے۔"



کرپال! میں اب بھی کہہ رہا ہوں کہ ساتھ چلو' تم ہوگے تو کام جلدی بن جائے گا۔" ہوشیار نے پشت پر کارتوس کا پٹہ فٹ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار..... آج تم اکیلے کام کرو! میرا دل بے چین ہے۔"

"مگر تم اپنی بے چینی مٹانے کہاں جارہے ہو۔ میں جانتا ہوں کرپال!" ہوشیار مسکرا کر بولا۔ مگر اس میں ہلکی سی ناراضگی بھی تھی۔ "اس کوٹھے کی کشش تمہیں اب بہت ستاتی ہے' مگر دوست! ایک جگہ بار بار جانے میں خطرہ ہے۔"

"تم فکر نہ کرو ہوشیار! تھوڑے عرصے میں اس چکر کا خاتمہ ہوجائے گا۔ میں جانکی کو یہاں اٹھا لاؤں گا۔ آہستہ آہستہ اس کا دل میری جانب رجوع کر رہا ہے۔"

ہوشیار کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "کیا وہ ڈاکو سے شادی کرنے پر راضی ہوگی؟"

کرپال قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ "طوائف اور ڈاکو کیسا میل ہے؟ دونوں سماج کے دشمن۔"

ہوشیار نے زیادہ بحث نہیں کی۔ اس نقطے پر دونوں جنت کی پارٹی سے الگ ہوئے تھے۔ اب اس جھگڑے کو وجہ بنا کر پھوٹ ڈالنا بہتر نہیں تھا۔ ہوشیار بیس ساتھیوں کے ساتھ سادھو پور کے زمیندار کے گھر ڈاکہ ڈالنے روانہ ہوا۔ بادلوں بھرے آسمان کا اندھیرا کرپال کو جنسی دیوانہ بنا رہا تھا۔ چار با اعتماد ساتھی اور اپنے وفادار کتے شیر کو ساتھ لے کر روانہ ہوا۔ جانکی کے جوبن کا رس چوسنے کی خواہش اس کے جسم میں آگ بھڑکا رہی تھی۔

طبلے پر تھاپ پڑی..... سارنگی کے سر کمرے میں میٹھی آواز پیدا کرنے لگے۔ تکیے سے ٹیک کر بیٹھے ہوئے کرپال کی نظریں اندر والے کمرے کے دروازے پر بھٹک رہی تھیں۔ جانکی کی آمد کی گواہی دیتی ہوئی چھم چھم پائل چھلکنے لگی' کرپال اکڑ کر بیٹھ گیا۔ برابر پڑے ہوئے شیشے سے شراب انڈیل رہا تھا۔ اسی لمحے جانکی آ گئی' سولہ سنگھار اور ستر ہویں حیا کا وزن اٹھا کر ٹھمک ٹھمک کر چلتی ہوئی جانکی اسے بے حد خوبصورت نظر آرہی تھی۔ کرپال کی آنکھوں میں شعلے بھڑک اٹھے۔ اسی لمحے اس نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ آج وہ اسے اغوا کرے گا۔

سلام کرنے کے بعد جانکی قالین پر بیٹھ گئی۔ گھور کر دیکھتا ہوا کرپال ہنس دیا' آنکھ کے اشارے پر کرپال نے چونک کر دیکھا جام چھلک اٹھا تھا' مگر وہ برابر شراب بہا رہا تھا۔ شراب کا ریلا قالین پر بہنے لگا' جانکی کے حلق سے تیر چلنے لگے۔ "پیا بن نا ہی آوے چین۔"

ٹھمری کے ساتھ غزل کی آواز نے کرپال کو تڑپا دیا۔ جانکی آج دل سے گا رہی تھی۔ جیسے اسے بھی پیا بن چین نہیں آرہا تھا۔ مینکا بائی پان بناتے ہوئے ترچھی نظروں سے کرپال کو دیکھ رہی تھی۔ وہ نشے میں چور ہوتا جا رہا تھا' رائفل شانے سے اتار کر دیوار سے ٹکا دی۔ ٹھمری ختم ہوتے ہی مکان میں لمحہ بھر کو سناٹا چھا گیا۔

پھر جانکی کی پائل کی جھنکار کے ساتھ محفل کا رنگ جمنے لگا۔ دلاور خان اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ پائل کی جھنکار میں آسانی سے کام انجام دیا جاسکے گا۔ ایسا اس کا حساب تھا۔ آٹھ سپاہی ساتھ لے کر مخالف سمت والی جھاڑی سے باہر آگیا۔ "خبردار! میرے حکم کے بغیر کوئی

وار نہیں کرے گا۔ میں اسے زندہ گرفتار کروں گا۔" اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔

کرپال کے چار ساتھی آمنے سامنے بیٹھے ہوئے فانوس کے اجالے میں چارپائی پر تاش کھیل رہے تھے۔ شیر چارپائی کے نیچے چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ کرپال کو اس کتے پر فخر تھا۔ اسی وجہ سے اس نے کتے کا نام شیر رکھا تھا وہ جب بپھرتا تو شیر کی طرح مقابلے پر جم جاتا تھا۔

دلاور خان کے عقب میں سرکتے ہوئے سپاہی مکان کی عقبی سمت میں آ گئے۔ مکان کی پچھلی کھلی کھڑکی کی طرف دلاور خان دیکھنے لگا۔ وہاں سے مکان میں داخل ہو کر سیدھا اوپری منزل پر چھاپہ مارنے کو جی چاہا مگر جلد بازی بہتر نہیں تھی۔ پہلے نیچے بیٹھے ہوئے لوگوں پر قابو پانا ضروری تھا۔ کرپال کے چاروں ساتھیوں کے شانوں پر ایک ساتھ رائفلوں کا دباؤ دیا گیا۔ وہ بھڑک گئے۔ ان کے منہ کھل گئے مگر رائفل اٹھا کر مقابلہ کرنے کا موقع نہیں تھا۔ دلاور خان پستول کا نشانہ لے کر سامنے کھڑا تھا۔ اس کی پٹھانی آنکھوں سے خون چھلک رہا تھا۔ "خبردار! اگر آواز کی۔ اس صورت میں۔" دلاور خان نے آہستہ مگر سخت لہجے میں کہا۔ "چاروں کو بھون دوں گا۔"

آٹھ سپاہیوں میں گھرے ہوئے چاروں کے ہوش گم ہو گئے۔ رائفلیں چھن جانے کے بعد وہ مجبور ہو گئے۔ مگر اسی لمحے چارپائی کے نیچے سے اچانک کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ جھپٹ کر باہر آتے ہوئے کتے کو دیکھ کر دلاور خان دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ایک سپاہی نے موقع کی نزاکت سمجھ کر کتے کے سر پر رائفل کا کندہ مارا اور کتا لڑکھڑا کر گرا۔ اس کی درد میں ڈوبی ہوئی چیخ نکل گئی۔ کرپال کے ہاتھ سے شراب کا شیشہ چھلک گیا۔ نشے میں ڈوبی آنکھوں میں غصہ بھڑک اٹھا۔ جھپٹ کر رائفل اٹھا لی۔ اسی لمحے گیت سنگیت تھم گیا۔ جانکی کے پیروں کے گھنگرو اچانک تھم گئے۔ کرپال مکان کے بند دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ اسی لمحے دھماکے سے دروازے کھل گئے اور شیر جھپٹ کر اندر آ گیا۔ اس کے

عقب میں کوئی اوپری منزل کی سیڑھیاں تیزی سے طے کر رہا تھا۔ کرپال ہوشیار ہو گیا۔ جانکی اور مینکا کی جانب دیکھ کر دانت پیستا ہوا وہ کھلی کھڑکی کی جانب جھپٹا۔ مینکا ہلکی سی مسکرائی مگر جانکی لرز گئی۔ اس کے پیروں کی پائل اس کی کپکپاہٹ کی چغلی کھانے لگی۔ کرپال نے کھڑکی سے جست لگانے کے لیے جیسے ہی جسم کو بلند کیا اسی لمحے دلاور خان دروازے میں نظر آیا۔ اس نے فرار ہوتے ہوئے شکار کو روکنے کے لیے پستول کا ٹریگر دبایا۔ سن کی آواز کرتی ہوئی گولی کرپال کی ران میں گھس گئی۔ کرپال کے عقب میں جاتا ہوا کتا پستول کی آواز سے پلٹا۔ کتے کا ایسا خوفناک روپ دلاور خان نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر میں سے خون بہہ رہا تھا پھر بھی اس نے خونخوار بن کر دلاور پر جست لگائی۔ پولیس چیف نے کھڑکی سے جست لگاتے ہوئے کرپال پر ایک اور فائر جھونک دیا مگر کتے کی جھپٹ نے نشانہ خطا کر دیا۔ پٹھان کا غصہ بھڑک گیا۔ تیسری گولی اس نے کتے کے کھلے ہوئے منہ میں اتار دی۔ شیر اچھل کر کمرے کی دیوار سے ٹکرایا۔ سارنگی اور طبلہ بجانے والے پسینے سے بھیگ گئے اور کپکپانے لگے جانکی مینکا کے سینے سے لگ گئی۔ دلاور خان نے کرپال کے گرنے کا دھماکہ سنا۔ اس نے سوچا نیچے گرتے ہی وہ ڈھیر ہو جائے گا مگر جب کھڑکی میں جا کر دیکھا تو کرپال تیزی سے اندھیرے میں دوڑ رہا تھا۔ دور ایک درخت کے نیچے پانچ گھوڑے کھڑے نظر آئے۔ تب دلاور خان آگ بگولا ہو گیا۔ انہیں پہلے سے گھوڑوں کا خیال کیوں نہیں آیا؟ اندھیرے میں گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے کرپال پر اس نے فائر کیا مگر گولی خطا ہو گئی۔ پستول میں اب صرف ایک گولی باقی تھی نشانہ لے کر وہ فائر کرنا چاہتا تھا مگر جانکی اس نے عقب سے جھپٹی اور اس سے لپٹ گئی۔

"صاحب! اسے نہ مارنا" وہ چیختی ہوئی بولی۔ "میرے پیٹ میں اس کا بچہ ہے۔"

دلاور خان اس کی مداخلت پر چڑ گیا۔ مارے غصے سے

دھکا دیا اور جانکی دور جا گری۔ دلاور خان نے فائر کیا تب تک کرپال دور نکل چکا تھا۔ اس کا تعاقب کرتے ہوئے پولیس چیف تیزی سے دوڑا۔ ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے میں لگام تھامے کرپال گھوڑا بھگا رہا تھا۔ سامنے نظر آنے والی جھاڑی میں داخل ہونے کے لیے زور لگا تا تھا۔ پھر اسے کوئی پریشان نہیں کرسکتا تھا مگر جھاڑی کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اندھیرے میں چار مشعلیں جلتی نظر آنے لگیں۔ اس نے گھوڑے کو روک لیا۔ "کیا پولیس جھاڑی میں بھی چھپ کر بیٹھی ہوئی ہے؟" ہوا میں معلق مشعلیں اس کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ کرپال نے دانت پیس لیے۔ "رنڈی بے وفا نکلی۔" گھوڑے کو چلتا کر وہ دوسری سمت دوڑانے لگا۔ لمحے بھر تو اس نے سوچا کہ مکان پر واپس جا کر رمینکا اور جانکی کو پھونک دے مگر اس وقت حساب وصول کرنے کا موقع نہیں تھا۔ عقب سے فائرنگ ہوئی اور کرپال نے جھرپ بڑھائی۔ گھوڑا دیوانہ وار دوڑ رہا تھا۔ اس کی پشت کرپال کے خون سے بھیگ گئی تھی مگر نصف فرلانگ طے کرتے ہی مخالف سمت سے مشعلیں نظر آئیں۔ تیسری سمت جھپٹتے ہی اچانک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور کرپال سمجھ گیا کہ پولیس نے چاروں اطراف سے اسے گھیر لیا ہے۔ کرپال دور جا گرا۔ مزید دو فائر نے گھوڑے کو ڈھیر کردیا۔ زمین پر گرتے ہوئے کرپال نے آڑ لینے کے لیے اطراف میں نظر دوڑائی۔ چاروں جانب جلتی ہوئی مشعلوں کا گھیرا دیکھ کر اس نے محسوس کیا کہ موت کا فرشتہ اس کے قریب ہو رہا ہے۔ بایاں پیر سن ہوگیا تھا۔ زمین پر گھسیٹتا ہوا وہ کچھ دور والے درخت کی جانب بڑھا۔ مشعلیں نزدیک آرہی تھیں۔ اس نے سوچا اگر وہ ان کی نظروں سے باہر نکل جائے تو بچ سکتا ہے۔ پولیس شاید یہی مان رہی ہوگی کہ میں گھوڑے کے قریب پڑا ہوا ہوں۔ یہی ایک امید تھی جس کے بل پر کرپال نے پھر ہمت کی۔

بڑی مشکل سے درخت پر چڑھ سکا۔ زخمی پیر تیزی سے فرار ہونے میں مدد نہیں دے سکتا تھا لہٰذا پولیس کی نظروں سے بچنے کے لیے ایسا کیا۔ پھر اسے یہ بھی خیال ہوا کہ وہ اوپر رہ کر آسانی سے نشانے پر فائر کرسکتا ہے حالانکہ اس ارادے میں وہ زیادہ دیر جم نہیں سکتا تھا۔ وہ اکیلا تھا اور مقابلے پر بہت ساری پولیس تھی۔ درخت پر چڑھتے ہوئے شاخیں کھڑکھڑائیں اور سنسنی کرتی ہوئی گولی چھوٹی۔ اب مقابلہ ضروری تھا اس نے فوراً فائرنگ شروع کردی مگر اچانک پولیس کی رائفلیں خاموش ہوگئیں۔ کرپال کو حیرت ہوئی مگر اسی لمحے دلاور خان کی گرج سنائی دی۔ "کرپال اب ضد بیکار ہے، تم زندہ نہیں بچ سکو گے۔ لہٰذا اپنے آپ کو ہمارے سپرد کردو۔"

مگر وہ خاموش رہا پھر دلاور خان نے کہا۔ "تابع ہوجاؤ ورنہ فائرنگ کرتا ہوں۔"

"ایک شرط سے تابع ہوتا ہوں، مجھے ایک قتل کی اجازت دی جائے۔ میں اس رنڈی کی جان لینا چاہتا ہوں۔"

دلاور خان کو ایسی امید نہیں تھی۔ وہ ہر قیمت پر کرپال کو زندہ پکڑنا چاہتا تھا فوراً جواب دیا۔ "پاگل شدھن اس کی کوکھ میں تیرا بچہ ہے۔"

کرپال کے سر پر برق گری۔ جانکی اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے اس خیال سے اس کا دل دہل گیا۔ قدرت نے اس سے بڑا غلط مذاق کیا تھا۔ موت کے سائے میں اسے یہ خبر ملی تھی۔

"بول کرپال! دو منٹ کا وقت دے رہا ہوں۔" دلاور خان کی چیخ سے کرپال کپکپا کر رہ گیا۔ اسے پہلی بار موت کا ڈر محسوس ہوا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

